اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

یادگارِ علامہ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامین

نمبر (۶)

''ہمایوں'' بابت ماہِ دسمبر ۱۹۳۵ء

تصویر: ——— ڈوسٹوؤسکی

سالانہ چندہ ——— ششماہی ہے (مع محصول) ——— قیمت فی پرچہ ۸

مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ

سالانہ ۶ر —— ششماہی سے (مع محصول) —— قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

آئندہ پرچہ جو یکم جنوری ۱۹۳۶ء کو شائع ہوگا "ہمایوں" کا سالنامہ اور اس کا چودھواں سالگرہ نمبر ہوگا۔ یہ پرچہ حسبِ سابق معیار مضامین اور تصاویر کی افراط کے باعث "ہمایوں" کے ماہانہ پرچوں سے ممتاز ہوگا۔

عام رسائل کا دستور ہے کہ وہ اپنا سالنامہ یا بعض دوسرے ضخیم نمبر شائع کرتے وقت یا تو ایک مہینے کا پرچہ شائع نہیں کرتے یا خریداروں کو سالنامہ وغیرہ قیمت طلب پیکٹ کے ذریعہ سے بھیجتے ہیں اور اس نمبر کی قیمت اُن سے الگ وصول کر لیتے ہیں۔ "ہمایوں" کا ابتدا ہی سے یہ شیوہ نہیں رہا۔ نہ اُس وقت تک یہ طریقہ مناسب معلوم ہوتا ہے جب تک کہ سالنامہ سال کے بارہ پرچوں سے الگ نہ چھپے اور اس کے اہتمام سے ماقبل یا مابعد کی کوئی اشاعت ملتوی نہ ہو جائے مگر یہ درست ہے کہ حجم اور تصاویر وغیرہ کے غیر معمولی اضافہ سے رسالے کے مصارف بہت بڑھ جاتے ہیں اور اس کی کسی نہ کسی شکل میں تلافی ضرور ہونی چاہیئے۔

ہم آپ سے اس کے سوا اور کسی قسم کی تلافی کے طالب نہیں کہ آپ آئندہ سال "ہمایوں" کی خریداری کا سلسلہ جاری رکھیں اور اس کے ساتھ ہی کم از کم ایک نیا خریدار اس کے لئے مہیا فرمائیں۔

گزشتہ سال سالگرہ نمبر کے علاوہ ہم نے دو زائد خاص نمبر روسی ادب اور فرانسیسی ادب سے مخصوص کئے تھے

اُردو رسائل کے خاص نمبروں میں عموماً کوئی خاص بات پیدا نہیں کی جاتی۔ بلکہ حجم کے اضافے کے ساتھ مضامین کے انتخاب میں معیار کی بلندی کا بھی مطلق خیال نہیں کیا جاتا اور اچھے خاصے رسائل رطب و یابس سے بھرے نظر آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایڈیٹر کی طرف سے مضامین حاصل کرنے کی پریشانیوں اشاعت و طباعت کی دقتوں اور فلکِ کج رفتار کی کج ادائیوں کا طویل رونا رویا جاتا ہے جس کو پڑھ کر خریدار ناحق پریشان ہوتے ہیں۔ بھلا اگر حالت یہ ہے تو آپ کو کون یہ درد سر مول لینے پر مجبور کرتا ہے۔ ہمارے خیال میں اگر حجم کے بجائے خاص نمبروں کے معیار کی طرف زیادہ توجہ صرف کی جائے تو اہلِ نظر ضرور اُن کی قدر کریں۔ معیارِ مضامین کے متعلق خاص نمبروں میں جو بے پروائی برتی جاتی ہے اس نے خاص نمبر کے نام کو بٹہ لگا دیا ہے اور اب بعض اہلِ نظر خاص نمبر کو محض ایک سوقیانہ چیز سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی اچھا پرچہ خاص نمبر شائع کرے تو یہ حضرات دلی رنج کے ساتھ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ آہ! افسوس اس کو بھی تجارتی پریشانیوں نے اس حد تک گرا دیا! اگر خاص نمبر میں واقعی کوئی خاص بات پیدا کی جائے تو اس غریب کا نام یوں رسوا نہ ہو۔ نہ اہلِ نظر اس کی اشاعت پر تاسف کا اظہار کریں۔

ہم معزز معاصر "معارف" کے ممنون ہیں جس نے "ہمایوں" کے فرانسیسی ادب نمبر پر حوصلہ افزا تبصرہ کرتے ہوئے ذیل کے الفاظ لکھے ہیں:

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پہلے "ہمایوں" کا "روسی ادب نمبر" بھی اسی طرز پر نکل چکا ہے۔ رسائل کے خاص نمبر اگر اسی قسم کے موضوعوں پر اسی طرز سے شائع ہوں تو ہندوستانی زبان کی مفید خدمت انجام پائے"۔

جہاں نما

جنیوا میں یورپ کی پہلی مسلم کانفرنس

۱۲ ستمبر ۱۹۳۵ء کو جنیوا میں یورپ کی اوّلین مسلم کانفرنس کا افتتاح ہوا - اس میں یورپی مسلمانوں کی مختلف ملتوں، طبقوں اور جماعتوں کے تقریباً ستر نمائندے شامل تھے - اس انجمن کے موسسین امیر شکیب ارسلان، احسان بے الجابری، ڈاکٹر نقی علی اور جنابِ علی الغایتی ہیں - مختلف اقوام وملل کے حسب ذیل نمائندوں کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: -

سلیم آفندی مفتی صدر جمعیتہ العلمائے سراجیوو (یوگوسلافیا)' واصل علیشان مفتیِ اعظم اسکوب (بوسینا)' ڈاکٹر یعقوب سنکیوکز مفتیِ اعظم مسلمانانِ پولینڈ' سر عمر ہیوبرٹ سٹیوارٹ رینکن اور لیڈی رینکن (برطانیہ عظمےٰ)' عبد الحمید بوراموک صدر مسلم الیوسی ایشن وارسا (پولینڈ)' کاؤنٹ سیف الاسلام بارسلینی ایمیڈی مسلمان مستشرق وصدر اورینٹل رائل اکیڈیمی نیپلز (اٹلی)' مادام لارا ویگلیری اطالوی مستشرق خاتون' عبدالباقی العمری بے مشہور مصری وکیل' بولی علی حاجی صدر انجمن اسلامی پیرس - ڈاکٹر درویش کارکوٹ چیف ایڈیٹر مسلم ریویو گلاسنیک (بلغاریا)' پروفیسر محمد کنتار ڈچ معتمد جمعیتہ العلمار (سراجیوو) مہدی قائم معتمد اعزازی اسلامک کلچر الیوسی ایشن وینیا (آسٹریا)' پروفیسر احمد ذکی ولیدی رکن اسلامک کلچر الیوسی ایشن (وئینا)' سردار اقبال علی شاہ - افغان مصنف د علی محی الدین دامیئر بیوگ صدر مسلم الیوسی ایشن (سوئٹزرلینڈ)' جے ایل فان بیتھم محمد علی پریزیڈنٹ ولندیز مسلم الیوسی ایشن - لاہے (ہالینڈ)' محمد بے سلیم العرفاتی سابق جج مصر ومدیر جریدۂ "عرفات"، و نائب صدر اعزازی اسلامک کلچر الیوسی ایشن وئینا و نائب صدر ویسٹرن اسلامک الیوسی ایشن' ڈاکٹر ذکی علی بانیٔ اسلامک کلچرل الیوسی ایشن (آسٹریا) ورکن تاسیسی اسلامک سوسائٹی (ہسپانیہ) نیز نائب صدر ویسٹرن اسلامک الیوسی ایشن - اور محمد رسولاف معتمد مسلم الیوسی ایشن (ہنگری) -

امیر شکیب ارسلان نے بہ حیثیتِ صدر کانفرنس کا خیر مقدم کیا - اس کانفرنس میں حسب ذیل مغربی ممالک کے نمائندے موجود تھے: فرانس، برطانیہ عظمےٰ، یوگوسلافیا، پولینڈ، آسٹریا، جرمنی، سپین، اٹلی، البانیہ، سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ، ہنگری -

مشرقی ممالک جن کے نمائندے انفرادی حیثیت سے شامل تھے حسب ذیل ہیں: مصر، ٹرکی، شام، فلسطین، ایران، افغانستان، آذربائیجان، عراق، ہندوستان نیز ممالکِ شمالی افریقہ -

پیرس کی مسجد کے امام نے قرآن مجید کی تلاوت کی اور پھر امیر شکیب ارسلان نے خلافت کے سقوط سے قبل اور اس کے بعد اسلامی دنیا کی ہیئتِ عمومی پر تبصرہ کیا اور مسلمانوں کو اتحاد و تقویتِ اسلام کی طرف توجہ دلائی۔

اس کے بعد کانفرنس نے پولینڈ کے دارالحکومت واسو ویا میں ایک مسجد کی تعمیر کی تجویز پر بحث کی اور اس مقصد کے لئے چندہ جمع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ڈاکٹر یعقوب سنکوکز مفتیٔ اعظم پولینڈ نے پولینڈ کی حکومت کی مذہبی رواداری اور اپنی مسلمان رعایا کی بہوا خواہی کا تذکرہ کیا۔ ڈاکٹر ذکی علی نے تجویز کی کہ کانفرنس کی طرف سے پولینڈ کی حکومت کے مسلمان رعایا سے ہمدردانہ اور روادارانہ سلوک کے لئے شکریہ ادا کیا جائے۔ یہ تجویز باتفاقِ آرا منظور کر لی گئی۔

اس کے بعد ڈاکٹر ذکی علی نے یورپ اور اسلام کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ انہوں نے اس بات پر خاص زور دیا کہ یورپ میں اسلام کی تبلیغ کے لئے وسیع ذرائع اختیار کئے جائیں اور مغربی ملکوں کے سامنے اسلام کو اس کی اصلی صورت میں پیش کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش صرف کر دی جائے۔ اس کے بعد انہوں نے اسلامی رواداری، اسلامی اخلاق، اسلام کے معاشرتی قوانین اور نوع انسان کے لئے اسلام کی اہمیت کے مسائل پر روشنی ڈالی۔

افتتاحی اجلاس کے آخر میں مہمانوں کی مشروبات و ماکولات سے تواضع کی گئی۔

دوسرے اجلاس میں جناب فان بنتیھم محمد علی ولسندریزی نے ہالینڈ اور اس کی نوآبادیوں میں اسلام اور مسلمانوں کی حالت پر تبصرہ کیا۔ انہوں نے کانفرنس کے ارکان سے لاہے (ہالینڈ) میں ایک مسجد اور ایک اسلامی مدرسے کے قیام کے لئے استدعا کی اور بتایا کہ ہالینڈ کی مسلمان رعایا ساڑھے پانچ کروڑ افراد سے متجاوز ہے۔

مشہور اطالوی مستشرق کاؤنٹ برنارڈ باربیلینی اسیڈی، رکنِ مجلسِ حکومتِ اطالیہ نے کانفرنس کے سامنے اپنے قبول اسلام کا اقرار کیا اور بتایا کہ اسلام نے میرے دل پر ایک سچے اور مثالی مذہب کے طور پر اثر کیا ہے۔ انہوں نے کانفرنس کے ارکان کی مبارکباد کے شور میں سیف الاسلام کا نام اختیار کیا۔

۱۳ ستمبر کو پھر کانفرنس کا اجلاس ہوا اور ایک سوئٹسرستانی مسلمان علی محی الدین دامبیرگ نے سوئٹزرلینڈ میں اسلام کی رفتارِ ترقی کی دلچسپ داستان سنائی۔

جناب عبدالحمید ہوراموک صدرِ مجلسِ اسلام پولینڈ نے اپنے ملک کے مسلمانوں کے حالات کا تذکرہ کیا۔

سر عمر ہیوبرٹ سٹیوارٹ رینکن نے "اسلام اور برطانیۂ عظمیٰ میں اس کا ارتقاء" کے موضوع پر ایک دلچسپ تقریر کی۔ انہوں نے بتایا کہ اس وقت برطانیہ میں تیس ہزار مسلمان ہیں جن میں سے پانچ ہزار خالص انگریز ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر خالد شیلڈرک کی اسلامی خدمات کو بہ طورِ خاص سراہا۔

محمد بے سلیم اور ڈاکٹر ذکی علی نے کانفرنس کی طرف سے ڈاکٹر خالد شیلڈرک کی اسلامی خدمات کا اعتراف کیا اور اُن کا شکریہ ادا کرنے کی تجویز پیش کی۔ یہ تجویز نعرہ ہائے تحسین کے درمیان بہ اتفاق آرا منظور ہوئی۔

دن ڈھلنے پر تمام مسلمانوں نے جماعت کے ساتھ نماز جمعہ ادا کی۔

جمعہ کے بعد اجلاس دوبارہ شروع ہُوا اور ڈاکٹر یعقوب سنکوکر نے ایک پُر از معلومات تقریر کی جس میں انہوں نے اسلامی رواداری کے موضوع پر روشنی ڈالی اور ضمناً پولینڈ میں اسلام کی تاریخ پر تبصرہ کیا۔ اس دَوران میں انہوں نے نہایت خوبی سے پولینڈ کے مسلمانوں کی معاشری حیثیت کا نقشہ کھینچا۔

جناب محمد رسولووک نے ہنگری میں اسلام کی تاریخ کا موضوع چھیڑا اور بُڈاپسٹ (ہنگری) میں ایک مسجد اور مسلمان بچوں کے لئے ایک اسلامی مدرسے کے قیام کی تجویز پیش کی۔

ڈاکٹر درویش کارکوٹ یوگوسلافی مسلمان منصف اور جرنلسٹ نے "یوگوسلافیا میں اسلام" کے موضوع پر ایک نہایت ورددار تقریر کی۔ یوگوسلافیا میں مسلمانوں کی تعداد بارہ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔

۱۴ ستمبر کو جناب علی الغایتی نے جنیوا میں ایک مسجد کی تعمیر کی تجویز پیش کی تاکہ یہ مسلمانوں کے لئے ایک بین الاقوامی مرکز کا کام دے سکے۔ کانفرنس نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔

اس کے بعد آسٹریا کے ہمدردِ اسلام مستشرق ڈاکٹر ہربرٹ جنکس رکنِ اعزازی اسلامک کلچرل ایسوسی ایشن ویَینا کی ایک تقریر پڑھی گئی۔ اس تقریر میں "اسلام اور مغربی ضروریات سے اس کی مطابقت" کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

پروفیسر محمد کنتا رڈرچ نے یوگوسلافیا کی اسلامی انجمنوں کا تذکرہ کیا اور نہایت مفید اعداد و شمار فراہم کئے۔

امام واصل علیشان اسکوبی نے جنوبی بوسینا کے مسلمانوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہاں ۲۹۳ مساجد اور ۱۶۲۹ امام ہیں۔

شمالی افریقہ کے تین نمائندوں نے جو آتش نوا مقرر مولی علی حاجی کی سرکردگی میں آئے تھے یکے بعد دیگرے "فرانس میں اسلام" کے موضوع پر تقریر کی اور اس ملک میں مسلمانوں کی بے روزگاری کی دردانگیز حالت بیان کی۔

۱۵ ستمبر کو کانفرنس نے حسبِ ذیل قراردادیں منظور کیں:-

حکومتِ یوگوسلافیا کو اس کی رواداری اور اپنے ملک میں مسلمانوں سے بے تعصبانہ برتاؤ رکھنے کے لئے ایک سپاسنامہ پیش کیا جائے۔

ولندیزی حکومت سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنی مسلمان رعایا کے کروڑوں افراد کی فلاح و بہبود پر زیادہ توجہ صرف کرے۔

آئندہ کانفرنس کا نظامِ عمل شیعہ اور سُنّی کے مسئلہ کا مصالحانہ فیصلہ اور تمام باہمی اختلافات کو زیادہ سے زیادہ دُور کر دینے

کے ذرائع تجویز کرنا قرار پایا۔

فلسطین کے مفتیٔ اعظم امین الحسینی کی اسلامی اور عربی خدمات کا اعتراف ہُوا اور شکریہ ادا کیا گیا۔

مجلسِ اقوام کے نام یہ اپیل بھیجنے کا فیصلہ ہُوا کہ وہ فلسطین میں یہودیوں کی مصیبت انگیز آبادکاری میں دخل دے کر عربوں کے جائز حقوق کی نگہداشت کرے۔ نیز اسی قسم کی ایک درخواست انگریزی حکومت اور مختلف اسلامی حکومتوں کی طرف بھیجنے کا فیصلہ ہُوا۔

یورپی مسلمانوں کے مفاد اور اُن کے حقوق کے تحفظ کی تجاویز کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

کانفرنس میں یہ تجویز بھی پیش ہوئی کہ "مسلم کانفرنس یورپ" کی ایک مستقل کمیٹی بنا دی جائے۔ یہ تجویز فوراً منظور ہو گئی اور عہدہ دار منتخب کر لئے گئے جن کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

امیر شکیب ارسلان (صدر) عبدالباقی العمری بے، سید ضیاء الدین طباطبائی، ڈاکٹر ذکی علی (معتمدین) علی الغایتی، محمد بے سلیم العرفانی اپنی اسلامی خدمات کے لحاظ سے اعزازی رُکن مقرر کئے گئے۔

کانفرنس کے خاتمے پر صدر نے ایک تقریر کی جس کے بعد یوگوسلافیا کے مفتیٔ اعظم سلیم آفندی کی امامت میں نماز ہوئی اور اس کے بعد زندہ باد اسلام کے نعروں کے ساتھ اجلاس کا خاتمہ ہُوا۔

یورپی مسلمانوں کی یہ اپنی وضع کی پہلی کانفرنس ہے اور اس کے بانی اور نمائندے تمام دُنیائے اسلام کے شکریے کے مستحق ہیں۔ اخوتِ اسلامی اور اتحاد بین المسلمین کا جو شاندار مظاہرہ جنیوا کی اس کانفرنس میں ہُوا اس کی مثال یورپ میں اس سے قبل نہیں ملتی۔ جنگِ عظیم اور بالخصوص سقوطِ خلافت کے بعد اتحاد بین المسلمین کا نظریہ خواب و خیال ہو گیا تھا اور دوسرے مغربی ممالک کی طرح اسلامی ممالک میں بھی اسلامیت کے بجائے صرف نسلیت اور وطنیت کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ ایک ایسے زمانے میں اس کانفرنس کے نمائندوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حقیقی اسلامی روح مغرب کے سیلابِ وطنیت کی تباہ کاریوں کے باوجود زندہ و پائندہ ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ اسلامی ممالک کا اتحاد دُنیا کے لئے سیاسی و معاشرتی امن و عافیت کا نقیب ثابت ہوگا۔

اطالویوں کا چائے کے خلاف پراپیگنڈا

اٹلی کے ساتھ دول یورپ کے اقتصادی ترکِ موالات سے جہاں اور بہت سے دلچسپ نتائج نکلنے کی توقع ہے وہاں اطالوی اخبارات کا چائے کے خلاف پراپیگنڈا بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ پراپیگنڈا تجارتی بائیکاٹ کے فوراً بعد شروع ہُوا ہے اور اس سے مقصد غالباً اُن مشکلات سے عہدہ برآ ہونا ہے جو موجودہ صُورت میں اٹلی کو چائے مہیّا کرنے میں پیش آئیں گی۔ اخبارات لکھ رہے ہیں کہ چائے ایک نہایت ناگوار اور طبیعت کو بدمزہ کرنے والی چیز ہے اور اسے دودھ شکر اور نیبو کی مدد

سے گوارا بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔لیکن دراصل یہ اس قابل نہیں کہ انسان اسے استعمال کرے۔ یہ اخبارات چائے کے بجائے بعض اطالوی پھولوں کے عرق کے استعمال کی تلقین کرتے ہیں جو مفرح ہیں اور اٹلی اور اس کی مستعمرات میں بہ کثرت مل سکتے ہیں۔ اطالوی پراپیگنڈے کی اصلیت خواہ کچھ ہو چائے کے مضر ہونے میں کلام نہیں۔ تجربہ اور معتبر ڈاکٹروں کی آرا اس کی تائید کرتی ہیں۔"ہمایوں" میں کسی دوسری جگہ اس موضوع کے متعلق ایک مضمون شائع ہو رہا ہے جس میں چائے کے مضر اثرات پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔

ہندوستان میں چائے کا رواج مغربیوں کی تقلید اور مغربی تاجروں کے پراپیگنڈا کے اثر سے ہُوا ہے۔ ان لوگوں کے پراپیگنڈا کی یہ حالت ہے کہ اپنے تجارتی مفاد کے لئے مضر سے مضر اشیاء کی تعریف کا راگ بھی الاپنے لگتے ہیں۔ رہا تقلید کا سوال سو وہ تو شراب بھی پیتے ہیں۔ کیا شراب بھی ہمارے لئے مفید ہے اور ہماری خوراک کا جزو بننی چاہئے۔ چائے کا مولد و منشا چین ہے۔ اگر دُنیا نے چین کی تقلید میں چائے کا استعمال شروع کیا ہے تو تعجب ہے افیون کے معاملے میں یہ تقلید کیوں ترک کر دی گئی۔ چائے کے مضر اثرات نہایت آہستہ آہستہ رونما ہوتے ہیں۔ اسی لئے یہ بے معلوم لیکن دیرپا اثرات سیدھے سادھے اور ناواقف لوگوں کی صحت کو بگاڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

عہدِ حاضر کی لڑکی

یورپ کے عہدِ حاضر کی آزاد خیال لڑکیوں پر پُرانے خیال کے لوگ بہت سے اعتراض کرتے ہیں لیکن مسٹر لائڈ جارج موجودہ لڑکی کو اور اس تعلیم کو جو اسے موجودہ لڑکی بناتی ہے' پرانی لڑکی اور اس کی تعلیم و تربیت پر بہرحال ترجیح دیتے ہیں۔

مسٹر لائڈ جارج نے یہ بتاتے ہوئے کہ موجودہ سکول ملکۂ وکٹوریا کے قدامت پرست عہد کے خاتمے کے قریب کھولے گئے بیان کیا کہ قدیم عہد کی نوجوان خواتین (اُس عہد میں لڑکیاں مفقود تھیں صرف خواتین موجود تھیں) کے مدارس کی تعریف زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ مضحکہ کا ایک نہایت مسرفانہ سامان تھے۔ لیکن اگر سنجیدہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اُن سکولوں کا وجود عورتوں سے صریح بے انصافی اور ظلم پر مبنی تھا۔

عزلت

درین زماں کہ عقیم است جملہ صحبت ہا
کنارہ گیر و غنیمت شمار "عزلت" را (صایب)

عزلت کے متعلق یہ مضمون ارسال خدمت ہے۔ اردو کی تاریخوں میں جو کچھ عزلت کے متعلق لکھا گیا ہے وہ اس قدر کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ پھر قیامت یہ ہے وہ صحیح بھی نہیں۔ مجھ کو جس قدر مواد مل سکا میں نے اسے اس مضمون میں یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔

سید عبدالولی نام۔ عزلت تخلص۔ میرحسن[1] نے ان کا نام سید عبدالواسع لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ ان کے والد سید سعداللہ قدس سرہٗ ہیں۔ مصنف گلِ رعنا نے ان کو سلون ضلع رائے بریلی کا باشندہ لکھا ہے جس کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں ہے۔ سب تذکرہ نویس متفق ہیں کہ ان کا وطن سورت ہے۔

عزلت کی تعلیم و تربیت سورت میں ہوئی۔ اُنھوں نے کتب[2] درسی اپنے والدِ بزرگوار سے پڑھیں۔ معقولات میں بہت اچھی قابلیت پیدا کی۔ "کتبِ متداولہ[3] عربیہ آموختہ است۔ در فارسی نیز بہرہ اندوختہ"۔ فارسی عربی اور اُردو کے علاوہ بھاشا میں بھی دخل تھا۔ وہ نہایت ہی عالم و فاضل شخص تھے۔ حمید اورنگ آبادی لکھتے ہیں "ہیچ[4] احدے از فضلاء و علماء نمی توانست کہ بہ بحثِ علم مقابلِ ایشاں دم زند"۔ اُن کی طباعی ذہانت اور ہمہ دانی کی دلیل یہ ہے کہ اُن کو علوم کے علاوہ فنون میں بھی دسترس حاصل تھی۔ مصوری، موسیقی اور سنگیت میں غیر معمولی کمال رکھتے تھے۔

اُن کی وضع رندانہ تھی۔ تحفۃ الشعراء میں لکھا ہے کہ "ریش و بروت تراشیدہ بہ وضعِ رندان می باشد" درویش صفت شخص تھے طبیعت ایسی مرنجاں مرنج پائی تھی کہ ہر ایک ان کا گرویدہ تھا۔ بہت ہی خوش صحبت و خوش گو شخص تھے۔

سروِ آزاد[5] سے پتہ چلتا ہے کہ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۴ھ میں سورت سے دہلی پہنچے۔ میرحسن لکھتے ہیں "در[6] وقت محمد شاہ تازہ واردِ ہندوستاں بود"۔ اور قایم کا بیان ہے "در[7] عہد سلطنت مرزا احمد بہ دارالخلافت تشریف داشت"۔ محمد شاہ کا زمانہ (۱۷۱۹–۱۷۴۸ء) ۱۱۳۱–۱۱۶۱ھ کا ہے

---

[1] تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۳۶۔ [2] سروِ آزاد صفحہ ۲۳۶۔ [3] تذکرہ گردیزی۔
[4] گلشنِ گفتار صفحہ ۶۵۔ [5] سروِ آزاد صفحہ ۲۳۶۔ [6] تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۳۶۔
[7] مخزنِ نکات صفحہ ۶۵۔

تو اس زمانہ میں وہ سورت چھوڑ کر دہلی آگئے تھے۔ مرزا احمد کا عہد ہے (۱۷۴۸-۱۷۵۴ء) قائم کے بیان کے مطابق وہ ابھی دہلی میں تھے۔ نواب[1] محمد علی ویردی خان مہابت جنگ کے زمانے میں مرشد آباد گئے۔ نواب ان پر بہت مہربان تھے۔ عالمگیر بادشاہ بھی ان کے بہت معتقد تھے۔ نواب علی ویردی خان کے انتقال کے بعد دکن گئے۔ علی ویردی خان کا انتقال ۱۷۵۶ء میں ہوا۔ اس بنا پر وہ دکن ۱۷۵۶ء کے بعد گئے۔ گلشنِ بےخار میں لکھا ہے کہ لکھنؤ بھی آئے اور یہ بھی لکھا ہے کہ "خانہ[2] در یکے از قصبات لکھنؤ دارد شد با آنکہ تخلص عزلت است" چونکہ ان کے ہمعصر تذکرہ نویسوں یا دوسرے قدیم تذکرہ نویسوں نے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا لہذا ہم وثوق سے اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دکن میں پہلے اورنگ آباد گئے۔ بعد ازاں حیدر آباد پہنچے۔ جب وہ حیدر آباد آئے اُس زمانہ میں آصف جاہ[3] نظام الملک حکمران تھے۔ دربار آصفی[4] کے امرا میں ان کا شمار ہوا۔

عزلت جہانیاں جہاں گشت آدمی تھے۔ اسی سبب سے ان کے احباب کا حلقہ بہت ہی وسیع تھا۔ مولف "سروِ آزاد" سے سورت میں ملاقات ہوئی اور وہیں سے ربط ضبط بڑھا۔ دہلی میں خان آرزو اور میر تقی میر سے ملاقات ہوئی۔ میر نے ان کی بیاض سے کئی شعرا کے اشعار نقل کئے۔ حیدر آباد میں لچھمی نرائن شفیق مولف "چمنستانِ شعرا" سے دوستی ہوئی۔ شفیق نے اکثر شعر شمالی ہند کے شعرا کے ان کی زبانی سُنے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی کم نہیں۔ حبیب وغیرہ ان کے شاگرد ہیں۔ عزلت کا انتقال[5] ۱۱۹۸ھ میں ہوا۔

ان کا کلام فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ہے۔ میر تقی میر لکھتے ہیں "مشق[6] شعر فارسی ہم کردہ اما لیکن مزاج او شاں میلان ریختہ بسیار دارد"۔ اردو میں تمام اصنافِ سخن پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ ان کا دیوان لچھمی نراین شفیق نے دیکھا۔ لکھتے ہیں "کلیات[7] ہمہ بیت چاردہ ہزار خواہد بود۔ کلیات ریختہ اش کہ قریب دو ہزار صد است مع ساقی نامہ کہ در جواب درد مند گفتہ"۔ عزلت ایک ذی علم شاعر تھے۔ کلام کی پختگی۔ موزون الفاظ کا انتخاب اور گوناگوں مضامین کا اظہار ان کے اشعار کی خصوصیات میں سے ہیں۔ ان کی زبان وہی ہے جو میر و سودا کی ہے۔ ہاں دکنی کا کچھ اثر ضرور ہے۔ غزلیں اُن کی بہت پُر کیف ہوتی ہیں۔ ان کے اشعار میں ایک کیفیت ہوتی ہے:۔

میں وہ مجنوں ہوں کہ آباد نہ اُجڑا سمجھوں ۔۔۔ مشت خاک اپنی اُڑا کر اسے صحرا سمجھوں

شعلہ ساں محو ہوں ان شعلہ قدوں کے اوپر ۔۔۔ میں نہ جلنے ہی کو جانوں نہ تماشا سمجھوں

بسے ہے تجھ میں دل، پر دل کے تو جلنے کو کیا جانے ۔۔۔ شرر پر جو گزرتی ہے سو پتھر کی بلا جانے

---

[1] گلزار ابراہیم [2] سخنِ شعرا صفحہ ۲۲۵ [3] گلشنِ بےخار صفحہ ۱۳ [4] گلشنِ گفتار صفحہ ۶۵ [5] "دکن میں اردو"۔
[6] گلِ رعنا [7] نکات الشعرا صفحہ ۹۷ [8] چمنستانِ شعرا صفحہ ۴۴۵

غنیمت بوجھ لیویں میرے دردآلود نالوں کو | یہ دیوانہ بہت یاد آئے گا شہری غزالوں کو

عبث توڑا مرا دل ناز سکھلانے کے کام آتا | یہ آئینہ تھا تجھ خود بیں کے اترانے کے کام آتا

شکستہ کرکے مرا دل نظر نہ کر مجھ پر | یہ ٹوٹے آئینے میں مُنہ تری بلا دیکھے

اُس کو پہنچی خبر کہ جیتا ہوں | کسی بدخواہ سے سُنا ہوگا

عزلت بہت پُرگو شاعر تھے اس لئے رطب و یابس بھی کلام میں ہے۔ بعض وقت محض آورد ہوتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اکثر صنعت کا استعمال بہت بے ساختہ کرتے ہیں ؎

شانہ اُس زلف میں پھرتے یہ بجا کہتا ہے | بات کہتے ہی شبِ وصل چلی جاتی ہے

نخلِ اُمید بے وفاؤں سے | دِل سلامت پھرے تو پھل پایا

ان کا ایک قطعہ ہے جس کی طرزِ ادا تو نظامی اور عصمت کے قطعات سے ملتی ہے لیکن بہ اعتبارِ مضمون غالب کا مشہور قطعہ ع "اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" سے بہت مناسبت رکھتا ہے ؎ قطعہ

گیا میں فصلِ گل میں میکدے عشرت کے ساماں تھے | ادھر تو زمزمے قلقل کے اودھر شورِ باراں تھے

نہ تنہا سبحہ گرداں مغبچے تھے دورِ ساغر تھے | کہ ساجد جو طرف سے قبلہ گاہِ خُم کے مستاں تھے

سُنا جب میں نے یغما محتسب کا پھر گیا اِک دِن | تو کیا دیکھوں کہ چاروں گوشے میخانے کے ویراں تھے

بھر آئی چھاتی میری دیکھ وہ عشرت کدہ فانی | کہا میں کیا ہُوا کیدھر گئے وہ یاں جو مہماں تھے

گریباں پھاڑ رو رو کر کہا مجھ کو گلابی نے | کہ یاں پیالے تھے واں شیشے تھے یاں خُم تھے سُبو واں تھے

انھوں نے ساقی نامہ بھی کہا ہے۔ شفیق کا بیان ہے" در ساقی نامۂ خود کہ سی صد و سی و یک بیت است در یک روز گفتہ بیاز ظہور" ہمیں نام و تاریخ است" [1] ان کے ساقی نامہ سے یہاں دو شعر نقل کئے جاتے ہیں ؎

مرے پر مری خاک دے گی صدا | ارے مے پلا مے پلا مے پلا

تجھے جھوٹی سوگند کھانے کی سوں | مرا مصحفِ دل اُٹھانے کی سوں

---

[1] چمنستانِ شعرا۔ صفحہ ۲۷۶۔

عزلت نے بارہ ماسے۔ پہیلی۔ مکرنی۔ کبت۔ دوہے۔ جھولے کہے جن میں ان کا تخلص "نرگس" ہے۔ مثلاً بارا ماسے:۔

دل بے عشق عالم میں کہاں ہے	جو سچ بولوں تو نام عشق جاں ہے
چکوریں ماہ کی قرباں ہیں باشوق	گلے میں قمریوں کے سرو کا طوق
دیا پھیار دل چپندر بدن کو	نظر کر ماجرائے نل دمن کو
سسی اور پنّو، گوپی اور کنہیا	زلیخا اور یوسف ہیر و رانجھا
کوئی عالم میں بے معشوق ہے کد	خدا عاشق ہے شاہد ہے محمدؐ

بھادوں:۔

اُٹھے ہے ہوک جب کویل اُٹھے کوک	ہلکتی ہوں کہک کر موڑ دے بھوک

یہ واقعہ ہے کہ قطب شاہ کی طرح عزلت نے بھی ہندوستانی اشیا، روایات، رسوم اور تہوار مثلاً ہولی وغیرہ کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے۔ اس بنا پر ان کا شمار بھی سوداؔ اور نظیرؔ کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ ان کی مکرنیاں خسروؔ سے بہت ملتی ہیں۔ مثلاً:۔

سوال۔ "پانی کیوں باسی ہے؟"
سوال "من کیوں اُداس ہے؟"
} جواب۔ "پیا نہیں"

ان کی ایک مثنوی[1] "راگ مالا" بھی مشہور ہے۔

خدا کی حمد میں کہتا ہوں ہر دم	کیا اِک حرف سے پیدا دو عالم

عمارت ایک سرکوب فلک تھی	در و دیوار میں مہ کی جھلک تھی

قبا دلچسپ تھی سبز اس کے بر میں	کلاہ سر سغرق تھی گہر میں
اور اُس کی گود میں تھی اِک پری رُو	مُنہ اُس کا فتنہ خیز اور زلف جادو

(بشیر)

---

[1] "دکن میں اردو" صفحہ ۱۰۱

فلسفی سے خطاب

ترے خیال و تصوّر کی طاقتِ پرواز
قتیلِ خنجرِ ہستی، ہلاکِ تیغِ مجاز

ہے تجھ کو ناز حقایق کی جس بلندی پر
مرے خیال کے توسن کا فرشِ پا انداز

ترے شہود کی دُنیا ہے تیرہ و تاریک
مرے غیوب کا ہر پردہ ہے تجلّی ساز

مری نگاہ میں وہ ایک حرفِ بے معنیٰ
سمجھ رہا ہے تو جس اکتشاف کو اعجاز

ترے تصوّرِ ذہنی کی انتہا ذرّے
مرے یقین کی ہر ضَو پہ آفتاب کو ناز

مری صراحی و خم میں مئے الست کا جوش
ترے ایاغ و سبو میں شرابِ خانہ ساز

کمال تیرے تدبّر کا ہر نئی تحقیق
امام تیرے تفکّر کی ہر نئی آواز

ترے ندیم ترے دوست، مادّی ذرّے
خدا کے فضل سے روح القدس مرا ہمراز

ترا رباب ہے خود تیرے ہاتھ سے مجروح
بلا کی پست ہے تیرے ضمیر کی آواز

مبادیاتِ حقایق کی اور تو تحلیل!
کہاں زمین کی پستی، کہاں فلک کا فراز

ترے خیال میں برزخ کی زندگی ہے محال
مری نگاہ میں اک اک نفس حیات نواز

ترے فرشتے بھی اُس تک پہنچ نہیں سکتے

مرے یقین نے جو کر دیا دریچہ باز

وہی ہے میرے تیقن کا نقطۂ آغاز
ہو جس محاذ پہ دانش تری سپر انداز

ترے دماغ کی تخلیق خشک موضوعات
نہ جن میں عشق کی گرمی، نہ حسن کے انداز

میں کیوں سنوں تری باتیں، کہ تیری باتوں میں
نہ زندگی، نہ محبت، نہ کیف و سوز نہ ساز

ترا فسانہ وہ بے کیف و رنگ ہے جس کو
نہ غزنوی کی ضرورت، نہ احتیاجِ ایاز

مرا فسانہ وہ شے ہے، ہوا ہی جس میں صرف
جگر کا سوز، محبت کا درد، دل کا گداز

مرے خیال کی رفعت کو عرش بھی ہے ننگ
فلک[1] ہے تیرے تصور کی آخری پرواز

تو آئینہ کے فقط "نام" کا پجاری ہے
مری نگاہ میں ہے عکسِ حسنِ آئینہ ساز

مٹا ہوا ہے تو عقلِ فرنگ و یوناں پر
تو میری آنکھ کا سرمہ ہے خاکِ راہِ حجاز

تلاشِ حق کی ہے گر سن زبانِ ماہر سے
بگوشِ ہوش ذرا قولِ عرفیِ شیراز

"مدہ عنانِ تعلق بہ حسنِ ہر ذرہ
برآر دستے و بر دوشِ آفتاب انداز" (عرفی)

منظور حسین ماہر القادری

---

[1] ارسطو فلک کو قدیم مانتا تھا۔
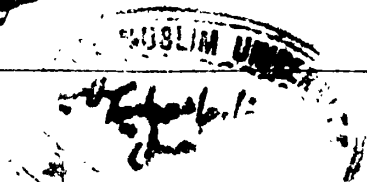
سٹالن

مجھے بارہا سٹالن کا نام اور اس کی تصویر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور ان دونوں سے میں نے یہی اندازہ کیا کہ وہ بہت تیز طرار، تنک مزاج اور ذی شان نواب ہوگا! لیکن حقیقت قطعی اس کے برعکس نکلی۔ پہلی مرتبہ مجھے ایسے ڈکٹیٹر سے ملاقات کرنے کا اتفاق ہوا ہے جس کی حفاظت میں مَیں اپنے بچے تک بھی دینے کو تیار ہوں! میں نے سن رکھا تھا کہ چیچک کے داغوں نے اس کا چہرہ خراب کر رکھا ہے۔ مگر اب تو اس کے چہرے پر داغ نہیں ہیں۔ میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ وہ اپنی پانزدہ سالہ بیوی کو گھر میں مقفل رکھتا ہے اور زار روس کے زریں برتنوں میں کھانا کھاتا ہے۔ اور کریملن میں ہر روز ایک ہی دروازے میں سے داخل نہیں ہوتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ وہ شہر سے باہر چھوٹے سے مکان میں اپنے دو لڑکوں سمیت رہتا ہے۔ دفتر میں جاتے وقت ایک ہی دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ ایک منکسر المزاج شہری کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ ہاں کبھی کبھار مزدوروں کے مانند زندگی کی گوارا مسرتوں میں حصہ لے لیتا ہے۔ یہی چند دوستوں کے حلقے میں بیٹھ کر جامِ شراب سے لذت آشنا ہونا!

جب میں نے اس سے ملاقات کی تو میں ایک ایسے تنہائی پسند شخص سے ملاقات کر رہا تھا۔ جسے نہ تو شہرت نے اندھا کیا، اور نہ زر و دولت کی ہوس نے ڈگمگایا۔ اسقدر طاقت و ثروت ہونے کے باوجود وہ کبھی جامے سے باہر نہیں ہوا، ممکن ہے اپنے دشمنوں کو زیر کرنے اور فتح و نصرت پانے پر وُہ دل ہی دل میں مسرور ہوتا ہو!

حوصلہ و محنت کے علاوہ (کہ یہ صفت ہر کام کرنے والے انسان میں پائی جاتی ہے) مجھے دو چیزیں اس کے کردار میں نمایاں نظر آرہی تھیں صبر اور بے اعتمادی! وہ سراپا عظمت معلوم ہوتا ہے۔ کیا اس کی قوتِ ارادہ اور کیا اس کی عقابی نگاہ اور سراپا!

روح کا وہ اندرونی ابتہاج جو صابر لوگوں میں جذبۂ محبت کی لہر دوڑائے رکھتا ہے اسمیں موجود نہیں، اس کے دل کی گہرائیوں میں صبر، بے اعتمادی کی پرورش کرتا ہے اور بے اعتمادی صبر کو پالتی پوستی ہے! اور وہ ہے کہ ان دونوں چیزوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔

سٹالن بالطبع نیک طبیعت، انسان ہے۔ مگر ہے ہٹ کا پکا، عام انسانی دل کی طرح اس کا دل بھی موہوم خیالات کا گرفتار ہے۔ مگر وہ صریحًا اس عیاشی کا منکر ہے! طبیعت کے لحاظ سے بہت حساس واقع ہوا ہے۔ کام کاج نے اور بھی سرد مہر اور اولوالعزم بنا دیا ہے!! بچپن سال تک اس کے دل و دماغ پر صرف ایک ہی خیال نے قبضہ جما رکھا تھا۔ جس پر اس نے اپنی جوانی، صحت غرض زندگی کی تمام لذتوں کو قربان کر ڈالا۔ یہ خیال نہیں کہ وہ حکمرانی کرے بلکہ یہ کہ وہ ایک ایسی حکومت معرضِ وجود میں لائے، جس کا ہر کل پرزہ اس کی مثالی حکومت کا کارندہ ہو، دورانِ گفتگو میں سٹالن نے مجھ سے کہا "میری زندگی کا اہم فرض یہ ہے کہ میں مزدور پیشہ جماعت کی اصلاح کروں، قومیت پسند حکومت کی بجائے میں اپنی تمام تر قوتیں ایسی سماجی حکومت کی تعمیر اور

قیام کے لئے صرف کرنا چاہتا ہوں جو دنیا بھر کے مزدوروں کے آرام و آسایش کی ذمہ دار ہو! اگر میرا ہر قدم اس کے استحکام کی جانب نہ اٹھا۔ تو میں اپنی زندگی کو بے معنی اور رائیگاں سمجھوں گا۔ ۱۹۱۷ء کے دوران میں اس نے آزادی کی عطا کردہ نعمتوں کو ترک کر ڈالا۔ گھر بار، ملک املاک، جب وہ خود انہیں ایک روسی سوشلسٹ ہوتے ہوئے تہ و بالا کرنے پر تلا ہوا تھا تو پھر اپنے لئے انہیں کیسے جائز سمجھتا! پہلے پہل اپنے والدین کے دوں پیشہ ہونے کی وجہ سے وہ سوشلسٹ نہ بن سکا۔ اس کا والد بیک وقت کفش دوز اور دہقان تھا۔ اور اس کی دلی آرزو تھی کہ میرا بچہ پادری بنے! اتفاق کی بات کہیئے کہ باپ کے اسی ارادے نے بچے کو انقلاب پسند بنا دیا، وہ یوں کہ بڑے میاں نے سٹالن کو تعلیم گاہ میں داخل کر دیا۔ اور آپ مزے سے اپنے کام کاج میں مشغول ہو گئے۔ یہیں سٹالن کی انقلاب پسند طبیعت نے اپنے جوہر دکھانے شروع کئے! میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا! میرے والدین غیر تعلیمیافتہ تھے۔ مگر مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آتے تھے۔ تعلیمی راہب خانہ کے رویہ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے میں سوشلسٹ ہو گیا۔ دجل و فریب کے سوا وہاں دھرا ہی کیا تھا۔ جب ہمیں نو بجے چائے پر بلایا جاتا تو ہماری غیر حاضری میں تمام میز دراز اور دراز کی تلاشی لی جاتی تھی۔ کاغذات کی تلاشی کی طرح ہماری روحوں کی بھی تلاشی لی جاتی۔ میرے لئے یہ ناقابل برداشت تھا۔ کرنا خدا کا کیا ہوا، کہ عین اس وقت روسی مارکسٹوں کا اولین خلاف قانون گروہ ٹرانس کاکیشیا میں آ گیا، انہوں نے مجھ پر اچھا خاصا اثر ڈالا، اور میں ان کی خلاف قانون تحریرات میں بہت دلچسپی لینے لگا۔"

جب یہ راز طشت از بام ہوا تو غریب ماں باپ تو سر پیٹ کے رہ گئے اور سٹالن راہب خانہ سے خارج کر دیا گیا۔ سولہ سال کی عمر میں وہ اسی جماعت کا ایک سرگرم رکن بن گیا۔ آپ کو معلوم ہے اس نے اپنے آپ کو تعلیم کس طرح دی؟ لینن مبہم سیا ہی سے یا نہایت باریک حروف میں اخبار نکالا کرتا تھا۔ جہازران ان اخبارات کو خفیہ طور پر اور اور ملکوں میں لے جاتے تھے۔ انہیں پڑھ پڑھ کر سٹالن نے اپنے ذخیرۂ معلومات میں بہت عمدہ اضافہ کر لیا! یہ کالوں اور تمباکو اور چمڑے کے کارخانوں کے مزدوروں کو بیدار کرنے کے لئے ان تھک کوششوں میں مشغول رہتا۔ گو خود جلد بندی کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا، پھر بھی کسی کونے کھدرے کے اندر رہ کر اس نے ایک اخبار بھی جاری کر دیا۔ اور یوں اچھی خاصی اہمیت حاصل کر لی! زار کی پولیس بھی اس کے تعاقب میں لگی رہتی تھی۔ اور مصنوعی داڑھی لگانے کے باوجود حضرت کئی دفعہ ان کی زد میں آئے! ۱۹۰۲ سے ۱۹۱۳ سال تک وہ چھ دفعہ گرفتار ہوا۔ اپنی عمر کے اٹھارہ خلاف قانون سالوں میں وہ دو تین دفعہ ہی روس سے باہر رہا ہو گا، اور وہ بھی محض چند مہینوں کیلئے!

جب لینن لندن کانگرس میں چند مسئلوں پر بگڑ بیٹھا، تو گو سٹالن اس وقت طفلس میں مقید تھا۔ پھر بھی اس نے لینن کی طرفداری کی۔ اور اس کے وقت آخر تک نہایت سرگرمی سے اس کی پیروی کرتا رہا +

روسی انقلاب نے تین زبردست شخصیتوں کو جنم دیا ہے! لینن، سٹالن اور ٹراٹسکی۔ اوّل الذکر تمام کا قائد اعظم تھا۔ اس کی وفات پر سٹالن اور ٹراٹسکی حریف ثابت ہوئے لیکن دونوں کی طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اگرچہ دونوں کا مقصد ایک ہی تھا۔ مگر صبر و استقلال اور تیز روی و ناشکیبائی میں آج تک ملاپ نہیں ہوا۔ جب لینن راہئ ملک عدم ہوا تو اس وقت کونسل میں ٹراٹسکی کے چار دوست تھے چونکہ اس وقت یہ زور و اثر میں فرد تھا اس لئے بآسانی حکومت حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی سی قسمت آزمائی کا حوصلہ اُس میں کہاں؟ نتیجہ

یہ ہوا کہ آخری جدوجہد میں سٹالن کامیاب ہوا، اور ٹراٹسکی اس بنا پر شہر بدر کر دیا گیا کہ حکومت کے حق میں اس کا وجود خطرناک ہے اب سٹالن کے لئے میدان صاف تھا!

اس کی ملاقات کے لئے مجھے زیادہ تکلفات سے دوچار نہیں ہونا پڑا - میرے ساتھ میرا ترجمان تھا جو بہت سی زبانوں میں نہایت آسانی اور روانی سے گفتگو کر سکتا تھا KREMLIN. کے پل پر ہم نے ایک فوجی کو اپنے نام بتائے - جب اُسے یقین ہو گیا کہ یہ وہی نام ہیں جن کا ٹیلیفون پر ذکر کیا گیا تھا تو اس نے ہمیں آگے بڑھنے کی اجازت دے دی - عمارت کے داخلی دروازہ پر پھر اسی عمل کو دہرایا گیا - اور بعدہ ہم سوویٹ یونین کی حکومت کے دفتر میں داخل ہو گئے! چار پانچ کمروں اور برآمدوں کو سادگی اور احتیاط سے آراستہ کر کے دفتر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے - سٹالن کے کمرے تک بڑے بڑے سُرخ حاشیئے والے قالین بچھے ہوئے تھے سٹالن نے جلد ہی ہمیں شرف باریابی بخشا، کمرہ لمبا تھا اور اس کے سرے پر ایک متوسط قد کا آدمی بیٹھا ہوا تھا - ہمارے آنے پر وہ اُٹھ کھڑا ہوا - وہ بھورے رنگ کی صدری پہنے ہوئے نہایت صاف ستھرا نظر آتا تھا - اس نے مجھے آزادانہ گفتگو کرنے اور سوال پوچھنے کی اجازت دے دی، اور کہا " ڈیڑھ گھنٹہ تک بافراغت آپ سے بات چیت کر سکتا ہوں "

سٹالن نے ہر دفعہ مجھے جامع جوابات دیئے - نہایت سلجھے ہوئے فقرات میں گفتگو کرتا تھا ایسے بولتا تھا جیسے کوئی فلاسفر آہستہ آہستہ دانائی کو باتوں میں پیوست کرتے ہوئے کسی قسم کے ہیجان کے بغیر بات کرتا ہو! اسے تمام باتیں اور واقعات تاریخ سمیت از بر تھے!

" آپ نے کافی عرصہ باغیانہ زندگی بسر کی ہے، تو کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کی حکومت میں بھی لوگوں نے خلاف قانون تحریکات جاری کر رکھی ہوں "؟

" کیوں نہیں، بہت ممکن ہے "۔

" کیا اس کی سب سے بڑی وجہ سازشوں کا خوف نہیں کہ آپ انقلاب کے بعد چودہ سال سے ہر طرح کے استبداد کو روا رکھتے ہوئے حکومت کر رہے ہیں "؟

" نہیں! چند مثالیں دیکر اس کی تشریح کئے دیتا ہوں - جب بالشویکی لوگوں نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی تو وہ دشمنوں سے نہایت نرمی اور رحم کے ساتھ پیش آتے رہے - جب جنرل کرسنو نے لینن گراڈ پر چڑھائی کی تو ہم نے اسے قید کر لیا - فوجی قانون کے ماتحت یا تو اُسے گولی کا نشانہ ہونا چاہیئے تھا یا قید، مگر ہم نے کیا کیا - اس کی قسم پر اعتبار کر کے اسے آزاد کر دیا - بعد میں یہ واضح ہو گیا کہ یوں کرنا مصلحت وقت کے سخت خلاف ہے - ایسے پر رحم کرنا گویا مزدور پیشہ جماعت پر ظلم کرنا ہے - آخر میں یہی فیصلہ ہوا کہ استبداد کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہے - خود ہمارے خلاف قانون زمانے کے حاصل کردہ تجربات ہمارے لئے مفید ہیں -

"اس استبداد کی پالیسی نے عام لوگوں میں خوف و ہراس پیدا کر دیا ہے، اور میرا خیال ہے آپ کا تجربہ انہی دہقانوں میں کامیاب ٹھہرے گا جنہیں خوف نے مطیع ہونا سکھایا ہے!"

"آپ غلطی پر ہیں۔ کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ محض خوف و استبداد پر چودہ سال تک حکومت کی بنیاد کھڑی رہ سکتی۔ یہ ناممکن ہے" اور کہیں ممکن ہو تو ہو، لیکن یہاں کے مزدور جو پے در پے تین انقلابات میں حصہ لینے کی وجہ سے مشاق ہو چکے ہیں اسکو کبھی گوارا نہیں کر سکتے"

"جب میں عوام کی طاقت اور اثر کے متعلق سنتا ہوں تو مجھے یہاں کے عوام کی بطل پرستی پر تعجب ہوتا ہے، یہ جذبہ جس قدر یہاں پھلا پھولا نظر آتا ہے شاید ہی کسی اور تختۂ ارض پر نظر آئے۔ جب آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ تاریخ عام لوگوں کی ہی ممنون ہے تو پھر یہ مجسمے اور نشانات بھی نظر نہیں آنے چاہئیں اور آپ کو بھی کسی سپاہی یا کسی اور شخص کی تعظیم نہیں کرنی چاہیئے"

"آپ غلطی پر ہیں۔ بلند مرتبہ لوگ اس حد تک ضرور قابل تعظیم ہیں جس حد تک وہ واقعات کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ البتہ ان سے غلطیوں کا سرزد ہونا ناممکن نہیں"۔

میں نے آخری سوال یہ کیا!

فرمائیے آپ قسمت پر یقین کرتے ہیں!

"معاً اس نے چہرہ کو سنجیدہ اور متین بنا لیا اور ذرا درشت آواز میں کہا! مجھے اس پر قطعی یقین نہیں۔ یہ اک تعصب ہے اور مجھے تو یہ خیال بھی لغو معلوم ہوتا ہے!"

"آپ ہزاروں تکالیف میں مبتلا رہے ہیں۔ کبھی شہر بدر ہوئے۔ کبھی مصروف جنگ رہے اور کبھی انقلاب میں سرگرم! تو پھر کیا اسے اتفاق کہیئے گا کہ آپ تباہی و بربادی سے صاف بچ نکلے، اور کوئی دوسرا اس کرسی پر آج متمکن نظر نہیں آتا"

"نہیں صاحب! اسے اتفاق نہ کہیئے، میرے خیال میں بہت سے خارجی و داخلی اسباب ہیں جن کی وجہ سے میں برباد نہیں ہوا۔ ورنہ ممکن تھا کہ میری جگہ آج آپ کسی اور شخص سے مصروف تکلم ہوتے! قسمت کا خیال پراسرار ہے اور مجھے اسرار پر اعتماد نہیں"۔

خدا کی شان اسی قلعہ میں جہاں تمام روس کے زار مقیم رہے اور عروج حاصل کرنے کے بعد موت سے ہمکنار ہوئے۔ جس کی فضا سے ابھی تک جنگ و جدال اور ریشہ دوانیوں کی بو آ رہی ہے۔ ہاں اسی قلعہ میں ایک کسان کا بیٹا قسمت پر بیٹھا ہنس رہا ہے!

"ماخوذ از نیشن"

دوست محمد خان

جل پری

سمندر میں دور بہت دور جا کر عمیق ترین گہرائیاں آجاتی ہیں۔ ایسی گہرائیاں جنہیں لمبی سے لمبی رسی کی مدد سے بھی نہ ماپا جا سکے۔ گرجاؤں کے بہت سے مینار سمندر میں اوپر تلے رکھ دیئے جائیں۔ تب بھی پانی کی سطح تک نہ پہنچ سکیں۔ وہاں کا پانی اتنا نیلا ہے جتنا آسمان اور اتنا ہی شفاف جتنا بلور۔ سمندر کا بادشاہ اور اس کی رعایا یہیں رہتی تھی۔ ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ سمندر کی تہ میں نیلی نیلی ریت کے سوا کچھ اور ہے ہی نہیں۔ نہیں، یہ حقیقت ہے کہ وہاں نرالی سے نرالی وضع کے پھول اور خوشنما سبزیاں اگی ہیں۔ جن کی پتیاں اور شاخیں اس قدر لچکدار ہیں کہ پانی کی لطیف ترین جنبش سے بھی ان میں ایک ہل چل مچ جاتی ہے اور یوں معلوم ہونے لگتا ہے جیسے ان میں جان پڑ گئی ہے۔ چھوٹی بڑی مچھلیاں انہیں شاخوں میں تیرتی پھرتی ہیں جیسے زمین پر پرند درختوں کی شاخوں میں پھدکتے نظر آتے ہیں۔ عمیق ترین حصے میں سمندر کے بادشاہ کا محل کھڑا ہے جس کی دیواریں مرجان کی ہیں۔ اور نکیلے محرابوں والی لمبی لمبی کھڑکیاں مصفّٰی ترین کہربا کی بنی ہیں۔ چھت سیپ کی ہے۔ اور جب پانی محل پر سے گذرتا ہے۔ تو کھڑکیاں کھلتی اور بند ہوتی رہتی ہیں۔ یہ منظر بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے کیونکہ جب سیپ کا منہ کھلتا ہے تو ہر سیپ میں چھپا ہوا موتی نظر آجاتا ہے۔ ایسا موتی جو کسی ملکہ کے تاج ہی کے لئے موزون ہو۔

سمندر کا بادشاہ کئی سال سے رنڈوا ہو چکا تھا۔ گھر کا انتظام اس کی بوڑھی ماں کیا کرتی تھی۔ وہ ایک بہت ہی دانا عورت تھی۔ اور ایک اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ خود اسے اس بات پر بے حد ناز تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی دم پر بارہ سیپیں پہنا کرتی تھی۔ اور بھی کئی عورتیں اعلےٰ خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن انہیں صرف چھ چھ سیپیں پہننے کی اجازت تھی۔ بہر حال وہ بہت ہی تعریف و توصیف کی مستحق تھی۔ خصوصاً اس لئے کہ وہ ننھی سمندری شہزادیوں کی جو اس کی پوتیاں تھیں۔ بڑی نگہداشت کیا کرتی تھی۔ یہ چھ خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ سب سے چھوٹی سب سے خوبصورت تھی۔ اس کا بدن گلاب کے پھول کی پتی کی طرح ملائم اور نازک تھا اور اس کی آنکھیں اتنی ہی نیلی تھیں جتنا عمیق ترین نیلا سمندر۔ لیکن اپنی دوسری بہنوں کے مانند اس کے بھی پاؤں نہیں تھے۔ اس کا پیکر ایک مچھلی کی دم پر ختم ہوتا تھا۔ شہزادیاں دن بھر قلعے کے بڑے بڑے کمروں یا ان زندہ پھولوں میں کھیلتی رہتیں جو دیواروں سے باہر اگے ہوئے تھے۔ کہربا کی کھڑکیاں کھلی رہتیں اور ان میں مچھلیاں آ آ کر یوں داخل ہوتیں جیسے جب ہم کھڑکیاں کھولتے ہیں تو ہمارے گھروں میں ابابیلیں آکر اڑنے لگتی ہیں۔ فرق صرف یہی تھا۔ کہ ابابیلیں تو ہم سے ڈرتی

ہیں لیکن مچھلیاں بلا خوف شہزادیوں کے پاس چلی جایا کرتیں۔ وہ انہیں اپنے ہاتھوں سے اچھی اچھی چیزیں کھلاتیں اور ان کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرتیں۔ قلعے کے باہر ایک خوب صورت باغ تھا جس میں سرخ رنگ کے چمکیلے اور گہرے نیلے رنگ کے پھول کھلے تھے کلیاں آگ کے شعلوں کی ہمشکل تھیں اور پھل سونے کی طرح چمکدار۔ شاخیں اور پتیاں اِدھر اُدھر ہلتی رہتیں۔ یہاں کی زمین نفیس ترین ریت کی بنی تھیں۔ اور اتنی ہی نیلی تھی جتنا جلتی ہوئی گندھک کا شعلہ۔ ہر چیز سے انوکھی شان کی ایک دھیمی دھیمی روشنی لپٹی رہتی جیسے اسے اوپر کی ہوا نے گھیر کر ہر چیز پر لا ڈالا ہو اور سمندر کی تاریک گہرائیوں کے باوجود نیلا آسمان یہاں سے چمکتا ہوا دکھائی دیتا۔ پرسکون موسم میں سورج ایک ایسے ارغوانی پھول کے مانند نظر آتا جس کی کٹوری سے روشنی کی ایک نہر بہ رہی ہو۔ باغ میں ہر ننھی شہزادی کے لئے زمین کا ایک ایک ٹکڑا موجود تھا وہ جب جی چاہے زمین کھود کر اس میں پودے لگا سکتی تھیں۔ کوئی اپنی پھولوں کی کھیتی وہیل مچھلی کی شکل میں بناتی اور کوئی اسے کسی ننھی جل پری کی شکل دیتی لیکن سب سے چھوٹی لڑکی کی کھیتی سورج کی طرح گول تھی۔ اس میں اس نے ڈوبتے سورج کی شعاعوں کے سے سرخ پھول بو رکھے تھے۔ یہ ایک عجیب و غریب لڑکی تھی۔ خاموش طبیعت اور غور و فکر کرنے والی۔ اس کی بہنیں تو تباہ شدہ جہازوں کی عجیب و غریب چیزیں پا پا کر خوش ہوا کرتیں لیکن اسے اپنے سرخ آفتابی پھولوں ایک خوبصورت مرمریں مجسمے کے سوا اور کسی چیز کی پروا نہ تھی۔ یہ مجسمہ ایک حسین لڑکے کا تھا جو سنگِ مرمر کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ یہ کہیں کسی تباہ شدہ جہاز سے سمندر کی تہ میں آگرا تھا۔ ننھی شہزادی نے اس مجسمے کے قریب گلاب کے پھول کے رنگ کا ایک بید مجنوں کا درخت لگا رکھا تھا۔ یہ نہایت شان سے بڑھا اور بہت جلد اس کی شاداب شاخیں مجسمے پر پھیل کر نیچے کی ریت کو چھونے لگیں۔ اس کا سایہ سرخی مائل نیلا تھا۔ جو شاخوں کی طرح اِدھر اُدھر ہلتا رہتا۔ یوں معلوم ہوتا کہ درخت کی چوٹی اور جڑ ایک دوسری کو چھیڑ رہی ہیں ایک دوسری کا مُنہ چومنے کے لئے مضطرب ہیں۔ ننھی شہزادی کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات نہ تھی کہ وہ اوپر کی دنیا کے متعلق کچھ باتیں سنے۔ وہ اپنی بوڑھی دادی سے جہازوں شہروں انسانوں اور حیوانوں کے متعلق ہر وہ بات جو اسے معلوم ہوتی سنا کرتی۔ اُسے یہ تصوّر بہت ہی خوشنما اور حیرت انگیز معلوم ہوتا کہ سمندر کے پھولوں میں خوشبو نہیں اور خشکی کے پھولوں میں خوشبو بھی ہے۔ جنگلوں کے درخت سبز ہوتے ہیں اور وہاں کے درختوں کی مچھلیاں ایسے شیریں گیت گاتی ہیں کہ اگر کوئی انہیں سُن لے تو خوش ہو جائے ــــ اس کی دادی پرندوں کو مچھلیاں کہتی تھی۔ اگر وہ نہ کہتی تو اس کی بات ننھی شہزادی سمجھ ہی نہ سکتی۔ کیونکہ اس نے کبھی پرندوں کو نہ دیکھا تھا۔

ایک دفعہ اس کی دادی اس سے کہنے لگی" جب تم پندرھویں برس میں قدم رکھو گی تو میں تمہیں سمندر میں اوپر کو جانے کی اجازت دے دوں گی تم چاندنی میں چٹانوں پر بیٹھ سکو گی۔ جہاں بڑے بڑے جہاز قریب سے گذر رہے ہوں گے اور پھر تم جنگل بھی اور شہر بھی دیکھ سکو گی"

آئندہ سال ایک بہن کی عمر پندرہ سال ہونے والی تھی لیکن چونکہ ہر چھوٹی بہن اپنی بڑی بہن سے ایک ایک سال چھوٹی تھی

اس لئے سب سے چھوٹی کو اوپر سمندر میں آکر ہماری طرح زمین دیکھنے کے لئے ابھی پانچ سال اور انتظار کرنا تھا۔ تاہم ہر ایک نے دوسری سے وعدہ کیا کہ وہ باقی سب کو اپنے پہلے سفر کا حال سنائے گی اور بتائے گی کہ اسے کون سی چیز سب سے زیادہ خوب صورت معلوم ہوئی ہے۔ کیونکہ ان کی دادی ان کو کافی باتیں نہ سنا سکتی تھی۔ کئی ایسی باتیں تھیں جن کے متعلق انہیں بہت کچھ اور معلوم کرنا تھا لیکن اپنی باری کے لئے کوئی شہزادی اتنی مضطرب نہ تھی جتنی سب سے چھوٹی شہزادی جسے سب سے زیادہ انتظار کرنا تھا۔ اور جو بہت قدر قدر چپ چاپ اور سوچ بچار میں رہنے والی لڑکی تھی۔ اکثر ہی راتوں کو وہ کھلی کھڑکی کے قریب کھڑی ہو کر گہرے نیلے پانیوں میں اوپر کی سمت دیکھا کرتی۔ یا ان مچھلیوں کا تماشا دیکھتی جو اپنے پنکھوں اور دُموں کو ہلاتی پانی اچھالتی آگے نکل جاتیں۔ اُسے چاند اور ستاروں کی ہلکی ہلکی جھلک نظر آیا کرتی۔ لیکن پانی میں یہ اسے نسبتہً بڑے معلوم ہوتے۔ جب اس کے اور چاند تاروں کے درمیان کوئی سیاہ بادلوں کی سی شے حائل ہو جاتی تو وہ سمجھ لیتی کہ یا تو کوئی ویل مچھلی اوپر سے گذر رہی ہے۔ اور یا یہ کوئی انسانوں سے بھرا ہوا جہاز ہے جنہیں مطلق خبر نہیں کہ ایک ننھی سی خوبصورت جل پری ان کے جہاز کے پیندے کی طرف اپنی گوری گوری بانہیں پھیلائے کھڑی ہے +

جب سب سے بڑی بہن کی عمر پندرہ سال کی ہوگئی تو اسے سمندر کی سطح پر آنے کی اجازت مل گئی۔ جب وہ واپس گئی تو اُسے صدہا باتیں سنانی تھیں وہ کہنے لگی کہ اوپر کی دُنیا کی حسین ترین چیز یہ ہے کہ کوئی چاندنی میں خاموش پانیوں کے قریب کسی ریتیلے جزیرے کے قریب لیٹ کر قریب کے شہر کی سمت دیکھتا رہے جہاں سینکڑوں ستاروں کی طرح روشنیاں جھلملاتی ہیں۔ یا وہاں کی موسیقی کے دل نشین نغموں چلتی ہوئی گاڑیوں اور انسانوں کی آوازیں سنے۔ اور پھر گرجاؤں کے میناروں سے نکلتی ہوئی سرور انگیز آواز سن کر خوش ہو۔ چونکہ وہ ابھی ان حیرتناک چیزوں کے قریب نہ جا سکتی تھی۔ اس لئے اس کے دل میں ان کے دیکھنے کی پہلے سے بھی زیادہ خواہش پیدا ہوگئی۔ سب سے چھوٹی بہن ان تمام باتوں کو نہایت توجہ سے سنا کرتی تھی ؟ بعد میں جب وہ کھلی کھڑکی کے قریب جا کر کھڑی ہوتی تو وہ گہرے نیلے پانیوں میں سے اوپر کو دیکھتی اور بڑے شہر اور وہاں کے رہنے والوں کی دوڑ دھوپ اور ان کی آوازوں کے متعلق سوچا کرتی۔ اور تصور ہی تصور میں سمندر کی عمیق ترین گہرائیوں میں بھی اسے گرجاؤں کی گھنٹیوں کی آواز آنے لگتی +

آئندہ سال دوسری لڑکی کو بھی سطح بحر پر ابھر کر جہاں اس کا جی چاہے سیر کرنے کی اجازت مل گئی۔ وہ اس وقت اوپر آئی۔ جب سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ کہنے لگی "یہی خوب صورت ترین نظارہ ہے"۔ اس وقت تمام آسمان پر سونے کا برادہ بکھر رہا تھا۔ آسمان پر ادھر اُدھر سرخی مائل نیلے رنگ کے بادل تیر رہے تھے۔ وہ حیران تھی کہ یہ کیا ہے۔ بادلوں سے بھی زیادہ تیز رفتار سے جنگلی بطخوں کا ایک بڑا جھنڈ آسمان کے آر پار ایک لمبی سی سفید چادر کی طرح اُڑتا ہوا ڈوبتے ہوئے سورج کے قریب غائب ہو گیا

وہ بھی سورج کی سیدھ میں تیرنے لگی۔ لیکن یہ لہروں میں غروب ہوگیا اور بادلوں کے خوبصورت رنگ غائب ہوگئے +

اب تیسری بہن کی باری آئی۔ وہ ان سب سے زیادہ بہادر تھی۔ وہ ایک ایسے چوڑے دریا میں جا تیری جو سمندر میں آکر گرتا تھا اس نے دیکھا کہ سمندر کے کنارے پہاڑیوں اور انگور کی بیلوں سے ڈھکے پڑے ہیں۔ محلات اور قلعوں کی چوٹیاں جنگل کے بلند درختوں سے اوپر اٹھکر جھانک رہی ہیں۔ پرندے چہچہا رہے ہیں۔ اس وقت سورج کی شعاعوں میں اس قدر تمازت تھی کہ ہر گھڑی غوطہ لگا کر اسے اپنے تپتے ہوئے گال ٹھنڈے کرنے پڑتے۔ اس نے دیکھا کہ ایک تنگ سی خلیج میں بالکل ننگے انسانی بچوں کا ایک پورے کا پورا گروہ پانی میں کھیل رہا ہے۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ بھی ان سے کھیلے لیکن وہ اسے دیکھتے ہی خوفزدہ ہوکر بھاگ گئے۔ پھر ایک چھوٹا سا کالا جانور پانی میں اتر آیا۔ یہ ایک کتا تھا۔ لیکن وہ نہ سمجھی کہ یہ کیا ہے۔ کیونکہ اس نے پہلے کبھی کوئی کتا نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر اس قدر خوفناک آواز میں بھونکا کہ وہ ڈر کر جلدی سے کھلے سمندر میں غوطہ لگا گئی۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ میں اس خوبصورت جنگل ان سبز سبز پہاڑیوں اور خوبصورت بچوں کو جو مچھلیوں کی سی دُمیں نہ ہونے کے باوجود تیر سکتے تھے کبھی نہ بھولوں گی +

چوتھی بہن ذرا زیادہ بزدل تھی۔ وہ سمندر کے وسط ہی میں رہی اس کا خیال تھا کہ سمندر بھی اتنا ہی دلکش ہے جتنا اس کا ساحل۔ وہ اپنے ارد گرد میلوں تک نظریں دوڑا سکتی تھی۔ اور آسمان شیشے کی کٹوری کی طرح نظر آرہا تھا۔ اس نے جہاز بھی دیکھ لئے تھے۔ لیکن اتنی دور سے کہ وہ اُسے بالکل بحری بگلے معلوم ہوئے۔ بڑی بڑی مچھلیاں لہروں میں چہلیں کرتی پھرتی تھیں اور بڑی بڑی ویل مچھلیاں اپنے نتھنوں سے یُوں پانی اُچھالتیں جیسے یکدم سیکڑوں فوارے چھوٹ پڑیں +

پانچویں بہن نے سرما میں جنم لیا تھا۔ سو جب اس کی باری آئی تو اس وہ سب کچھ دیکھ لیا جو اس کی دوسری بہنیں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ سمندر بالکل سبز معلوم ہوتا تھا۔ اور برف کے بڑے بڑے تودے تیرتے پھرتے تھے۔ ہر ایک ایک موتی کی طرح چمکدار تھا۔ لیکن انسان کے بنائے ہوئے گرجاؤں سے زیادہ بڑا اور زیادہ اونچا۔ ہر ایک کی شکل بڑی انوکھی تھی۔ اور وہ ہیروں کی طرح جگمگا رہے تھے وہ برف کے ایک بڑے سے تودے پر بیٹھ گئی اور ہوا اس کے لمبے لمبے بالوں سے کھیلنے لگی۔ وہ دل میں کہنے لگی کہ سب جہاز سمندر کے "برفانی پہاڑوں" سے اتنی تیزی سے اور اتنا دور دور رہ کر گذر جاتے ہیں جیسے یہ ان سے خوف زدہ ہیں" شام کے وقت جب سورج ڈوب گیا تو کالے کالے بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا۔ بادل کی گرج پیچ وتاب کھاتی ہوئی سنائی دینے لگی اور بجلی ہر گھڑی تڑپ تڑپ کر چمک چمک کر آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے لگی۔ اور سسکیاں لیتے ہوئے سمندر میں اچھلتے چھُولتے برفانی تودوں پر سرخ روشنیاں جھلملانے لگیں۔ تمام جہازوں کے بادبان خوفزدہ ہوکر کانپتے ہوئے سمٹ جاتے تھے۔ لیکن وہ تیرتے ہوئے برفانی تودے پر مطمئن بیٹھی یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ جب ہر آن نیلا ہٹوں میں سے کود کود کر بجلی آگے کو جھانکتی اور اپنے

چمکتے ہوئے تیر و نشتر سمندر کے سینے میں بھونک دیتی۔

جب پہلے پہل ان بہنوں کو سطح بحر پر آنے کی اجازت ملی تھی۔ تو ان میں سے ہر ایک ان نئی نئی خوبصورت چیزوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ جوان ہوگئی تھیں۔ جس وقت ان کا جی چاہتا ادھر آسکتی تھیں۔ یہی وجہ تھی۔ کہ انہیں اب ان نظاروں کی پروا نہ رہی تھی۔ اب وہ چاہتی تھیں کہ پھر پانیوں میں چلی جائیں اور جب ایک مہینہ گذر گیا تو وہ کہنے لگیں" اونہہ! اس سے تو نیچے ہی رہنا اچھا ہے۔ ہمارا وطن بدرجہا زیادہ خوبصورت اور زیادہ دلکش ہے" تاہم شام کے وقت پانچوں بہنیں ایک دوسری کے بازوؤں میں بازو ڈالے ایک قطار بنا کر سطح بحر پر آیا کرتیں۔ ان کی آوازیں انسانی آوازوں سے کہیں زیادہ دلکش تھیں۔ اور کسی طوفان کے آنے سے پہلے جب انہیں کسی جہاز کے ڈوبنے کا انتظار ہوتا وہ جہاز کے سامنے آکر ان عجیب و غریب چیزوں کی تعریف میں گیت گایا کرتیں جو انہیں جلد ہی سمندر کی گہرائیوں سے ملنے والی ہوتیں۔ یا وہ نہایت التجا سے گیت گا گا کر جہاز رانوں سے کہتیں" مت ڈرو! مت ڈرو! سمندر کی گہرائیوں میں ڈوبنے سے مت ڈرو" لیکن جہاز ران ان کے گیت کیا سمجھتے۔ وہ سمجھتے یہ طوفان کا شور و شغب ہے۔ لیکن ان لڑکیوں کو یہ عجیب و غریب چیزیں کبھی نہ ملتیں۔ کیونکہ جب جہاز ٹوٹتا اور آدمی ڈوب جاتے تو صرف ان کی لاشیں شاہ بحر کے محل تک پہنچ سکتیں۔

اور جب یہ بہنیں بازوؤں میں بازو ڈال کر اس انداز سے پانیوں میں سے ہوتی ہوئی اوپر آیا کرتیں تو ان کی سب سے چھوٹی بہن وہیں اکیلی کھڑی رہ جاتی وہ نہایت بے بسی سے ان کی طرف دیکھتی اور اس کی چیخیں نکلتے نکلتے رہ جاتیں۔ جل پریوں کے آنسو نہیں ہوتے کہ وہ رو ئیں اور اس وجہ سے انہیں کچھ زیادہ ہی تکلیف ہوا کرتی ہے۔ وہ کہتی" کاش میں پندرہ سال کی ہو جاؤں۔ میں خوب جانتی ہوں کہ مجھے اوپر کی دنیا اور اس کے تمام لوگ کتنے اچھے لگیں گے۔

آخر وہ بھی پندرہ سال کی ہوگئی۔ بڑھیا رانڈ اس سے کہنے لگی" اچھا اب تم جوان ہوگئی ہو آؤ اب تمہیں بھی میں تمہاری دوسری بہنوں کی طرح آراستہ کروں" چنانچہ اس نے چھوٹی جل پری کے بالوں میں نرگس کے سفید پھول گوندھ دیئے۔ جن کی ہر پتی تقریباً ایک موتی تھی۔ پھر بڑھیا نے حکم دیا کہ اس کی دُم میں آٹھ بڑی بڑی سیپیں باندھی جائیں۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کا خاندان عالی مرتبہ ہے۔

چھوٹی جل پری کہنے لگی" لیکن یہ تو مجھے بہت تکلیف دیتی ہیں"!

بوڑھی خاتون نے جواب دیا" پر عظمت بننے کے لئے تکلیف برداشت کرنی ضروری ہوتی ہے"۔

اگر ننھی جل پری کے اختیار میں ہوتا تو خوشی سے یہ تمام سنگھار کی چیزیں جھٹک کر پھینک دیتی اور یہ بوجھل ہار اتار کر پرے رکھ دیتی۔ کیونکہ اسے اپنے باغ کے سرخ سرخ پھول بہت زیادہ بھلے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن وہ مجبور تھی چنانچہ وہ" خدا حافظ" کہہ کر

ایک بلبلے کی طرح نہایت لطافت سے سطح پر آ گئی۔ اس نے اپنا سر لہروں سے اوپر بلند کیا۔ سورج ابھی ابھی غروب ہوا تھا۔ بادل قرمزی اور سنہری رنگوں سے رنگین ہو چکے تھے۔ شفق کی تمتماہٹ میں شام کا تارا اپنی پوری دلکشی کے ساتھ چمکتا ہوا نکل آیا۔ سمندر پرسکون تھا۔ اور ہوا نرم و نازک اور تازہ تین مستولوں والا ایک جہاز سطح بحر پر ساکن کھڑا تھا۔ اس کا صرف ایک بادبان کھلا تھا۔ کیونکہ ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ آتا تھا۔ ملاح نہایت سستی سے عرشۂ جہاز پر بیٹھے تھے۔ موسیقی اور گیتوں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ جب اندھیرا چھا گیا تو جہاز پر رنگ رنگ کی صدہا شعلیں جلنے لگیں یوں معلوم ہوتا جیسے تمام قوموں کے جھنڈے ہوا میں لہرا رہے ہوں۔ چھوٹی جل پری جہاز کے ایک کمرے کی کھڑکیوں کے قریب آ کر تیرنے لگی۔ ہر وقفے کے بعد جب لہریں اسے اوپر اٹھا لیتیں تو وہ کھڑکیوں کے شیشوں سے جھانک کر خوش پوشاک لوگوں پر ایک نظر ڈال سکتی۔ ان میں ایک نوجوان شہزادہ بھی تھا جو سب سے زیادہ حسین تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں سیاہ رنگ کی تھیں اور عمر سولہ سال۔ اس کی سالگرہ کا جشن بڑی مسرت سے منایا جا رہا تھا۔ ملاح عرشۂ جہاز پر ناچ رہے تھے۔ لیکن جب شہزادہ کمرے سے باہر آیا تو یکدم ہوا میں سیکڑوں ہوائیاں چھوڑ دی گئیں۔ فضا دن کی طرح روشن ہو گئی۔ چھوٹی جل پری اتنا ڈری کہ اس نے فوراً پانی میں غوطہ لگا دیا۔ اور جب اس نے پھر اپنا سر باہر نکالا تو اُسے یُوں معلوم ہوا جیسے اس کے گرد آسمان کے ستاروں کی بارش ہو رہی ہے۔ اس نے پہلے کبھی یہ نظارہ نہ دیکھا تھا۔ بڑی بڑی توپیں اپنے منہ سے اگل اگل کر آگ باہر پھینکنے لگیں اور نیلی نیلی ہواؤں میں شاندار رنگلیتو سے اُڑنے لگے اور صاف و شفاف سمندر میں گہرائیوں تک ان سب کا عکس پڑنے لگا۔ خود جہاز اس قدر تیزی سے چمک رہا تھا کہ تمام لوگ بلکہ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی نہایت آسانی سے صاف صاف نظر آ رہی تھی۔ اور اس وقت شہزادہ بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ رات کی شفاف ہوا میں گانے والوں کے نغمے ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ اور شہزادہ ہر ایک سے ہاتھ ملا کر مسکرا رہا تھا۔

بہت دیر ہو چکی تھی۔ لیکن اب بھی چھوٹی جل پری جہاز سے یا شہزادے سے نظریں پرے نہ ہٹا سکتی تھی۔ رنگ برنگ کی بتیاں اب بجھ گئیں۔ اب کوئی ہوائی فضا میں نہیں چھوٹتی تھی۔ توپیں بھی اب نہیں چل رہی تھیں۔ البتہ سمندر بے تاب ہو چکا تھا اور لہروں کے نیچے سے نالوں اور سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لیکن اب بھی چھوٹی جل پری پانیوں میں دھکے کھاتی ہوئی جہاز کے قریب ہی تھی۔ اس طرح اب بھی وہ کبھی کبھی اندر جھانک سکتی۔ تھوڑی دیر بعد یکایک جہاز کے بادبان تن گئے اور پُرعظمت جہاز نے اپنا رستہ لیا۔ لیکن بہت جلد لہریں زیادہ بلند ہو کر اُٹھنے لگیں۔ تاریک بادلوں نے آسمان کا چہرہ سیاہ کر ڈالا۔ دُور سے کبھی بجلی کی چھوٹی چھوٹی جھلکیاں بھی نظر آ جاتیں۔ ایک وحشتناک طوفان کی آمد آمد تھی۔ ایک دفعہ پھر بادبانوں کا پھیلاؤ ذرا کم کر دیا گیا اور عظیم الہیئت جہاز غضب آلود سمندر میں اپنا راستہ چیرتا اڑتا جھپٹتا شدت کی تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ لہریں پہاڑ بن گئیں جیسے یہ

ابھی ابھی مستولوں کی چوٹیوں سے بھی اوپر جا پہنچیں گی۔ جہاز ان کے درمیان راج ہنس کی طرح ڈبکیاں لگانے لگا۔ بار بار کف آلودہ بلند لہروں کے ہجوم میں اوپر ابھر آتا۔ چھوٹی جل پری کو یہ سب کچھ ایک دلچسپ کھیل معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن ملاحوں کو نہیں آخر کار جہاز ایک چیخ مار کر ٹوٹ گیا۔ لہروں کے تھپیڑوں نے عرشہ جہاز کو چکنا چور کر دینے کے بعد جہاز کے باقی موٹے موٹے تختوں کو بھی توڑ ڈالا۔ سب سے بڑا مستول نے کی طرح ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ جہاز اپنے پہلو پر گرا اور پانی جھپٹ کر اس کے اندر جا داخل ہوا۔ چھوٹی جل پری نے دیکھا۔ کہ جہاز کے لوگ خطرے میں ہیں۔ اسے خود بھی شہتیروں اور تختوں کی زد سے بچنے کے لئے جو اِدھر اُدھر ہچکولے کھا رہے تھے ذرا ہوشیار ہونا پڑا۔ ایک لمحے کیلئے تو اتنی سخت تاریکی چھا گئی کہ اس کی نظروں سے ایک ایک چیز اوجھل ہو گئی۔ لیکن دفعتہً بجلی کے چمکنے سے تمام نظارہ روشن ہو گیا اور اسے شہزادے کے سوا جہاز کا ایک ایک فرد نظر آ گیا۔ جب جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہوا تھا تو اس نے اسے گہری لہروں میں ڈوبتے دیکھا تھا۔ اور اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی کہ اب وہ اس کے ساتھ رہا کرے گا لیکن اب اسے یاد آ گیا کہ انسان تو پانیوں میں نہیں زندہ رہ سکتے۔ جب وہ میرے باپ کے محل تک پہنچے گا تو وہ بالکل مر چکا ہو گا لیکن میں ہرگز اسے مرنے نہ دوں گی" سو اس نے شہتیروں اور تختوں کے درمیان جو اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے تیرنا شروع کیا۔ وہ بالکل بھول گئی کہ یہ شہتیر اور تختے اس کے پرخچے اڑا سکتے ہیں۔ اس نے تاریک پانیوں کی گہرائیوں میں غوطہ لگایا۔ لہریں کبھی اسے اوپر لے جانے کی کوشش کرتیں کبھی نیچے۔ آخر کار کسی نہ کسی طرح وہ نوجوان شہزادے کے قریب پہنچ ہی گئی۔ جس کی طاقت اسے اس طوفان زدہ سمندر میں تیرنے سے جواب دے چکی تھی۔ اس کے اعضا بے حس تھے اور اس کی خوبصورت آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ مر چکا ہوتا اگر چھوٹی جل پری اس کی مدد کو نہ آ جاتی۔ اس نے اس کا سر پانی سے اوپر بلند کیا اور پھر اس کو اور اپنے آپ کو لہروں پر چھوڑ دیا کہ جہاں چاہیں بہا لے جائیں "۔

صبح ہوئی اور طوفان تھم چکا تھا۔ لیکن جہاز کا نام و نشان باقی نہ رہا تھا۔ سرخ سورج دُور سے چمکتا ہوا پانیوں میں سے نکل آیا اور اسکی شعاعیں شہزادے کے گالوں پر صحت کا اصلی رنگ واپس لے آئیں۔ لیکن ابھی اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ چھوٹی جل پری نے اس کی نرم و نازک کشادہ پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور اس کے بھیگے ہوئے بال پیچھے کی طرف ہٹائے۔ اسے وہ سنگ مرمر کے اس مجسمے کا ہمشکل معلوم ہو رہا تھا جو اس کے چھوٹے سے باغ میں پڑا تھا۔ اس نے بار بار اس کا منہ چومنا شروع کیا اور اس کا دل پہلے سے بھی زیادہ اس کے زندہ رہنے کی تمنا کرنے لگا۔ اس دوران میں اسے خشکی نظر پڑی۔ دُور آسمانی رنگ کے پہاڑ دکھائی دینے لگے۔ ان پر سفید سفید برف اس طرح معلوم ہو رہی تھی جیسے وہاں راج ہنسوں کے گروہ کے گروہ بیٹھے ہوں۔ ساحل کے نزدیک خوبصورت اور سرسبز جنگل نظر آ رہے تھے۔ قریب ہی ایک بڑی سی عمارت کھڑی تھی۔ وہ نہ سمجھ سکی کہ یہ کوئی گرجا ہے یا خانقاہ۔ باغ میں نارنگی اور لگلگ کے درخت لگے تھے اور دروازے کے سامنے بڑے بڑے اونچے قد کے کھجوروں کے درخت۔ یہاں سمندر ایک چھوٹی سی خلیج بن کر رہ جاتا تھا جس میں

پانی بالکل ساکن لیکن نہایت گہرا تھا۔ پس وہ حسین شہزادے کو لے کر ساحل تک تیرتی آئی جس پر ہر سمت سفید سفید ریت بچھی تھی وہیں اس نے اسے خوشگوار ہلکی ہلکی دھوپ میں لٹا دیا۔ لیکن اس طرح کہ اس کا سر اس کے جسم سے ذرا اوپر اُٹھا رہے۔ اس کے بعد اس بڑی سی سفید عمارت میں گھنٹیاں بجنے لگیں اور بہت سی نوجوان لڑکیاں باغ میں آگئیں۔ چھوٹی جل پری تیر کر ساحل سے پرے چلی گئی اور چند اُونچی اُونچی چٹانوں پر جو سطح بحر سے باہر نکلی ہوئی تھیں بیٹھ گئی۔ پھر اس نے اپنے چہرے اور گردن پر سمندر کا جھاگ مل لیا تاکہ اس کا ننھا سا چہرہ دکھائی نہ دے سکے اور انتظار کرنے لگی کہ دیکھیں بیچارے شہزادے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ اسے زیادہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔ جلد ہی ایک لڑکی اُدھر آنکلی۔ جہاں شہزادہ پڑا تھا۔ پہلے پہل تو وہ ڈر گئی —— لیکن صرف ایک لمحے کے لئے اس کے بعد وہ جا کر اپنے ساتھ اور بھی بہت سی سہیلیوں کو وہاں لے آئی۔ جل پری نے دیکھا کہ شہزادہ پھر زندہ ہو گیا ہے۔ اور آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ لیکن اس کی طرف دیکھ کر وہ ایک مرتبہ بھی نہ مسکرایا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ایک جل پری نے اس کی جان بچائی ہے۔ اس بات نے اسے بہت ہی مغموم کر دیا اور جب وہ لوگ اسے اس بڑی عمارت میں لے گئے۔ تو وہ شدتِ غم سے پھر پانی میں غوطہ لگا کر اپنے باپ کے محل کو واپس آگئی۔ وہ ہمیشہ سے چپ چاپ اور فکر مند رہا کرتی تھی۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ وقت سوچ بچار میں گذارنے لگی۔ اس کی بہنوں نے اس سے پوچھا کہ تم نے اپنے پہلے سفر میں کیا کیا کچھ دیکھا ہے لیکن وہ انہیں کچھ نہ بتاتی۔ اکثر ہی صبح اور شام وہ اس جگہ جایا کرتی جہاں اس نے شہزادے کو چھوڑا تھا۔ باغ میں پھل آچکا تھا۔ بلکہ اب اسے توڑ بھی لیا گیا تھا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف پگھل چکی تھی۔ لیکن شہزادہ اسے کبھی نظر نہ آتا تھا۔ وہ ہمیشہ پہلے سے بھی زیادہ مغموم ہو کر گھر چلی آتی۔ اس کے غم کو سب سے زیادہ آرام اس بات میں ملتا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے سے باغ میں بیٹھی رہے اور اس خوبصورت مرمریں مجسمے کے گرد اپنے بازو حمائل کر دے جو بالکل شہزادے کا ہم شکل تھا۔ اب اس نے اپنے پھولوں کی خبر لینی بھی چھوڑ دی۔ پھولوں کے پودے بڑی بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر پھیل کر راستوں پر بھی اُگ آئے۔ ان کے پودوں کے لمبے لمبے پتّے اور تنے درختوں کے گرد لپٹ گئے۔ اور تمام باغ تاریک اور اداس ہو گیا۔ آخر کار وہ اپنے سینے میں زیادہ دیر تک محبّت کے جذبات نہ چھپا سکی۔ اس نے اپنی ایک بہن کو تمام واقعہ سُنا دیا۔ دوسری بہنوں نے بھی یہ راز سُن لیا۔ بہت جلد یہ بات دوسری جل پریوں نے بھی سُن لی۔ جن کی ایک سہیلی جانتی تھی کہ شہزادہ کون ہے۔ اس نے بھی عرشۂ جہاز پر اس جشن کا نظارہ دیکھا تھا۔ اس نے انہیں بتا دیا کہ شہزادہ کہاں سے آیا تھا اور اس کا محل کدھر ہے +

"آؤ چھوٹی بہن" کہہ کر دوسری شاہزادیوں نے ایک دوسری کے بازوؤں میں بازو ڈال دیئے اور ایک لمبی قطار بنا کر سطح بحر پر ابھر آئیں۔ اُس جگہ کے بالکل قریب جہاں ان کے خیال میں شہزادے کا محل کھڑا تھا۔ محل زرد رنگ کے ایک نہایت ہی چمکیلے پتھر کا بنا تھا جس کے زینے میں لمبی لمبی سیڑھیاں تھیں۔ ایک سیڑھی تو بالکل پانی کو چھو رہی تھی۔ چھتوں پر شاندار سنہرے گنبد نظر آ رہے

تھے اور ستونوں کے درمیان جنہوں نے تمام عمارت کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا مرمر کے مجسمے کھڑے تھے جو بالکل زندہ معلوم ہوتے تھے۔ اور بلند کھڑکیوں کے بلوریں شیشوں میں سے عالی شان کمرے جن میں بیش قیمت پردے لٹکے تھے نظر آرہے تھے۔ دیواروں پر خوبصورت تصویریں لٹکی تھیں۔ جنہیں دیکھ کر جی خوش ہوجاتا تھا۔ سب سے بڑے کمرے کے مرکز میں ایک فوارہ چل رہا تھا جس کی کرنوں کی سی شوخ اور چمکیلی دھاریں بلند ہو ہو کر گنبد کو چھو رہی تھیں۔ سورج کی شعاعیں بلوریں گنبد سے چھن چھن کر فوارے کے پانی اور سارا گرد اُگے ہوئے خوشنما سبزے سے کھیل رہی تھیں۔ اب چونکہ جل پری کو معلوم ہوچکا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے اس نے بہت سے دن اور بہت سی راتیں محل کے قریب ہی گذار دیں۔ اب وہ ساحل کے بہت نزدیک آآ کر تیرا کرتی اتنا نزدیک آآکر جتنا نزدیک آنے کی پہلے کبھی کسی جل پری کو جراٴت نہ ہوئی تھی۔ اور ایک دفعہ تو وہ درحقیقت تنگ خلیج کے اندر مرمریں برآمدے کے نیچے تک آگئی جس کا چوڑا سا سایہ پانی پر پڑ رہا تھا۔ اب یہیں بیٹھ کر وہ شہزادے کی طرف دیکھا کرتی۔ اور شہزادہ سمجھا کرتا کہ اس نورانی رات میں اس وقت میں یہاں بالکل تنہا ہوں۔ جل پری بارہا شام کے وقت اسے لہراتی ہوئی جھنڈیوں والی خوبصورت کشتی میں جس میں اس کے ساتھ والے گانا سننے میں مشغول ہوتے تھے سمندر کی سیر کرتے دیکھ چکی تھی اس وقت وہ سرسبز ناگر موتھے کے پردوں سے باہر نکل آتی۔ اور اگر ہوائیں اس کی لمبی سی سیمیں نقاب کو پکڑ کر کھینچتیں تو لوگ دُور سے دیکھ کر سمجھتے کہ کوئی راج ہنس پر پھیلائے بیٹھا ہے۔ اکثر ہی راتوں کو جب مچھیرے اپنی اپنی مشعلیں لے کر خشکی سے سمندر میں آنکلتے۔ اور شہزادے کے کارناموں کی داستانیں سناتے تو وہ انہیں بڑی توجہ سے سنا کرتی۔ وہ یہ یاد کرکے خوش ہوا کرتی کہ میں نے اس وقت اس کی جان بچائی تھی جب وہ نیم مُردہ ہوکر لہروں میں ہچکولے کھاتا پھرتا تھا۔ اس کا سر میرے سینے سے چھو چکا ہے اور میں نے کس طرح دل کھول کر اس کے بوسے لئے تھے۔ لیکن شہزادے کو ان باتوں کا کچھ علم نہ تھا۔ بلکہ اسے تو خوابوں میں بھی کبھی وہ دکھائی نہ دی

اب جل پری کے دل میں انسانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ انس پیدا ہونے لگا۔ اس کا دل اس دنیا کی سیر کا اور بھی آرزومند رہنے لگا۔ جو اس کی دنیا سے اتنی زیادہ بڑی نظر آتی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی انسان جہازوں میں بیٹھ کر سمندروں پر اڑتے پھرتے تھے اور ان بلند پہاڑیوں پر بھی چڑھ سکتے تھے جو کہیں بادلوں سے بھی بہت زیادہ اونچی تھیں۔ ان کی زمینیں ان کے جنگل اور ان کے کھیت اس کی نظر سے بھی پرے دُور دُور تک پھیلے تھے۔ کتنی ہی باتیں تھیں جو وہ جاننا چاہتی تھی۔ اس کی بہنیں اس کے تمام سوالوں کا جواب نہ دے سکتی تھیں۔ وہ پھر اپنی دادی کی طرف رجوع کیا کرتی جو اوپر کی دنیا کے متعلق سب کچھ جانتی تھی اور اسے سمندر کے اوپر کے حصے کی زمین کہا کرتی +

ایک دن جل پری اپنی دادی سے پوچھنے لگی کہ "اگر انسان نہ ڈوبیں تو کیا پھر وہ ہمیشہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ کیا وہ اس طرح نہیں مرتے جیسے ہم لوگ سمندروں میں مرجاتے ہیں"+

بوڑھی دادی کہنے لگی" نہیں - وہ بھی مرجاتے ہیں - بلکہ ان کی عمریں ہماری عمروں سے چھوٹی ہوتی ہیں - ہم لوگ تو بعض دفعہ تین تین سو سال تک زندہ رہتے ہیں لیکن جب یہاں ہمارا خاتمہ ہوجاتا ہے تو ہم سطح بحر پر جھاگ بن کر رہ جاتے ہیں - بلکہ یہاں تو ان لوگوں کی قبریں بھی نہیں ہوتیں جن سے ہم محبت کر چکے ہوتے ہیں - ہماری روحیں فانی ہیں - ہم پھر کبھی نہیں جئیں گے بلکہ سمندر کی کٹی ہوئی سر سبز نے کی طرح تباہ ہوجائیں گے - اس کے برعکس انسانوں کی رُوح ہوتی ہے - جو فنا نہیں ہوتی - جب انکے جسم خاک بن جاتے ہیں - تو ان کی رُوح زندہ ہوتی ہے - یہ صاف اور دُھلی ہوئی ہواؤں میں سے ہوتی ہوئی اوپر چمکتے ستاروں سے بھی پرے چلی جاتی ہے اور جیسے ہم پانی کی سطح پر ابھر کر خشکی کے نظارہ پر نگاہ ڈالتے ہیں بالکل اسی طرح روحیں اوپر بلند ہوکر وہاں کا عجیب و غریب نظارہ دیکھتی ہیں جو ہم کبھی نہیں دیکھ سکیں گے +

چھوٹی جل پری نہایت غمگین ہوکر کہنے لگی" ہماری روح بھی کیوں غیر فانی نہیں؟ میں بخوشی اپنی عمر کی تمام صدیاں صرف ایک دن انسان بننے کے لئے دوں گی تاکہ مجھے بھی ستاروں سے پرے کی عالی شان دنیا دیکھنے کی امید ہو +

بوڑھی جل پری کہنے لگی" تمہیں ایسی باتوں کا خیال نہیں کرنا چاہیئے - ہم انسانوں سے زیادہ خوش اور زیادہ بہتر حالت میں ہیں"

چھوٹی جل پری کہنے لگی" تو کیا میں مرجاؤں گی؟ نہ لہروں کی موسیقی سن سکوں گی - نہ خوبصورت پھول دیکھ سکوں گی - نہ لال لال سورج؟ کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں جس سے میری روح بھی غیر فانی ہوجائے"

بوڑھی اماں کہنے لگی" یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ کوئی انسان تم سے اتنی محبت نہ کرنے لگ جائے کہ تم اس کے دل کی تنہا مالک بن جاؤ - یہاں تک کہ اس کے ماں باپ سے بھی زیادہ پیاری ہوجاؤ - اس کے تمام خیالات اور تمام محبت تم پر مرکوز ہوجائے - اور پادری اس کا دایاں ہاتھ تمہارے دائیں ہاتھ میں دے دے اور وہ آدمی تم سے وعدہ کرے کہ وہ اس وقت بھی اور بعد ازاں بھی تم سے سچی محبت کرتا رہے گا - ایسا کرنے سے اس آدمی کی رُوح تمہارے جسم میں آجائے گی - پھر تم انسانوں کی آئندہ خوشیوں میں حصہ لینے لگو گی" وہ" تمہیں بھی روح دے گا - اور اس کے جسم میں بھی برقرار رکھے گا - لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا - تمہاری" مچھلی کی دم" جسے ہم سب اتنا خوبصورت سمجھتے ہیں زمین پر بہت بدصورت چیز سمجھی جاتی ہے - کوئی ٹھیک بات تو انہیں معلوم ہی نہیں - وہ سمجھتے ہیں کہ خوبصورتی کے لئے دو موٹے موٹے ڈنڈے بہت ضروری ہیں جنہیں وہ ٹانگیں کہتے ہیں"

جل پری ایک آہ بھر کر نہایت غمناک نگاہوں سے اپنی مچھلی کی دم کی طرف دیکھنے لگی - بوڑھی اماں کہنے لگی" آؤ خوشی منائیں اور اس تین سو سال کے عرصے میں جو ہمیں زندہ رہنے کے لئے دیا گیا ہے اٹکھیلیاں کرلیں ناچ کود لیں - اور درحقیقت زندہ رہنے کے لئے یہ مدت کافی ہے - اس کے بعد ہمارا حشر جو کچھ ہوگا ہوجائے وہی ہمارے لئے بہتر ہوگا - آج شام ہم ایک درباری رقص میں حصہ لینے جارہے ہیں"+

یہ ان نظاروں میں سے ایک نظارہ تھا جو ہم زمین پر کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ رقص کے وسیع کمرے کی دیواریں اور چھت موٹے لیکن شفاف بلور کے بنے تھے۔ سینکڑوں دیوقامت صدف کچھ گہرے سرخ رنگ کے اور کچھ گھاس کے سے سبز رنگ کے قطار باندھے ہر طرف موجود تھے اور ان میں نیلی روشنی جگمگا رہی تھی جس نے تمام کمرے کو روشن کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ تمام سمندر میں چکا چوند پیدا ہو رہی تھی۔ لاتعداد مچھلیاں بڑی اور چھوٹی بلور کی دیواروں کے قریب دوڑتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے بعض کے پروں میں ارغوانی روشنی کی جھلکیاں نظر آ رہی تھیں اور بعض کے پر سونے اور چاندی کی طرح دمک رہے تھے۔ ایک چوڑی ندی بڑے بڑے کمروں میں سے ہوتی ہوئی بہے چلی جا رہی تھیں۔ کنواری اور بیاہی ہوئی جل پریاں اور ان کے شوہر سب اپنی ہی موسیقی کے تال پر رقص کر رہے تھے۔ ان سب کی آوازیں اتنی شیریں تھیں جتنی زمین پر کبھی کسی کی نہیں ہوئیں۔ ننھی جل پری ان سب سے شیریں آواز سے گا رہی تھی۔ تمام مجلس تالیاں بجا بجا کر اور اپنی دُمیں ہلا ہلا کر اسے داد دے رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے خود اس کا دل بھی بے انتہا مسرور ہو گیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ نہ تو زمین پر اور نہ سمندر میں مجھ جیسی شیریں آواز کسی کی ہے۔ لیکن فوراً ہی اسے پھر اوپر کی دنیا کا خیال آ گیا کیونکہ اس کے دل سے من موہنے شہزادے کی یاد جاتی ہی نہ تھی۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی غم تھا کہ میری بھی روح کیوں اس کی طرح غیر فانی نہیں۔ سو وہ چپکے سے اپنے باپ کے محل سے کھسک آئی۔ ادھر محل میں مسرتوں کا ایک طوفان بپا تھا اور ادھر وہ اپنے باغ میں اکیلی غمگین بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پانی میں بگل کی آواز سُنی اور اس نے سوچ لیا کہ یقیناً شہزادہ کشتی میں بیٹھا آ رہا ہے۔ وہ شہزادہ جو میری آرزوں کا مرکز ہے۔ اور جس کے ہاتھوں میں میں اپنی زندگی کی تمام خوشیاں دے دینا چاہتی ہوں۔ میں اس کے لئے مشکل سے مشکل بات کر گذروں گی میں ضرور غیر فانی رُوح حاصل کروں گی۔ میری بہنیں محل میں رقص کر رہی ہیں لیکن میں سمندر کی جادوگرنی کے پاس جاتی ہوں جس سے ہمیشہ مجھے ڈر لگتا رہتا ہے وہ مجھے مدد اور کوئی مشورہ ضرور دے گی۔"

اور پھر جل پری اپنے باغ سے باہر نکلی اور اس سڑک پر ہولی جو منہ میں کف لاتے ہوئے گردابوں کی سمت جاتی تھی اور جس کے پار بدہ دگرنی کا گھر تھا۔ وہ پہلے کبھی کسی ایسی جگہ نہیں گئی تھی۔ نہ تو وہاں پھول اگے تھے نہ گھاس بلکہ ہر طرف چٹیل بھوری اور ریتلی زمین پھیلی تھی۔ وہاں کے پانیوں میں گرداب پن چکیوں کے کف آلود پہیوں کی طرح گھومتے ہر چیز کو اپنے آپ میں سمیٹتے اتھاہ سمندر کی گہرائیوں تک لے جاتے تھے۔ جادوگرنی کی مملکت تک پہنچنے کے لئے اسے ان پیس ڈالنے والے گردابوں میں سے گزرنا پڑا بہت فاصلے تک یہ سڑک بلبلے پیدا کرنے والی گرم گرم کیچڑ سے گذرتی تھی۔ اس علاقے کو یہ جادوگرنی "میری نہاتا تی دلدلیں" کہا کرتی تھی اس سے پرے ایک عجیب وغریب جنگل کے مرکز میں اس کا مکان کھڑا تھا۔ یہاں کے تمام درخت اور پھول جاندار تھے۔ آدھے درخت اور آدھے حیوان۔ ان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت سے سروں والے عفریت زمین میں اگے ہوئے ہیں۔ ٹہنیاں ان کے

لمبے لمبے پتلے بازو تھے اور انگلیاں لچکدار کیچوؤں کی طرح - ان درختوں کا ایک ایک حصہ جڑ سے لے کر چوٹی تک ہلتا تھا - سمندر سے جو چیز بھی ان کے قریب آتی وہ اسے زور سے پکڑ لیتے - کوئی چیز ان کے پنجوں سے بچ کر نہیں نکل سکتی تھی - جل پری یہ بھیانک منظر دیکھ کر اتنی خوف زدہ ہوئی کہ وہاں کی وہیں کھڑی رہ گئی - اس کا دل خوف سے دھک دھک کرنے لگا - وہ لوٹنے ہی کو تھی کہ اسے شہزادے اور غیر فانی روح کا جس کی اسے اس قدر تمنا تھی خیال آ گیا - اور اس کے دل میں پھر ہمت آ گئی - اس نے اپنے بکھرے ہوئے لمبے لمبے بال اپنی گردن کے گرد لپیٹ لیئے تاکہ یہ جاندار چیزیں انہیں پکڑ نہ لیں - اس کے بعد اس نے اپنے سینے کے آر پار اپنے ہاتھ باندھ لیئے اور جیسے پانی میں ایک مچھلی تیرتی ہے کود کر گولی کی طرح ان بدشکل جاندار درختوں کے بازوؤں اور انگلیوں میں سے جو اس کے گرد پھیلے تھے ہوتی ہوئی آگے بڑھی - اس نے دیکھا کہ ہر جاندار درخت نے اپنے لاتعداد بازوؤں میں ایک ایک چیز پکڑ رکھی ہے ——— انسانی اور حیوانی ہڈیوں کے سفید ڈھانچے جو سمندر میں غرق ہو کر گہرے پانی میں آ گئے تھے - چپو اور جہازوں کے پرزے اُن کے لپٹے ہوئے بازوؤں میں جکڑے ہوئے تھے - ایک ننھی جل پری بھی اُن کے بازوؤں کے جال میں پھنسی ہوئی تھی اور یہ بات ننھی شہزادی کو اور بھی زیادہ دردانگیز محسوس ہوئی +

اب وہ جنگل میں ایک دلدلی زمین پر آئی جہاں پانی کے موٹے موٹے سانپ کیچڑ میں بل کھا کھا کر اپنے شتری رنگ کے بدشکل جسم دکھا رہے تھے - جنگل کے وسط میں ایک مکان کھڑا تھا - یہ سمندر میں غرق شدہ انسانوں کی ہڈیوں سے بنایا گیا تھا - سمندری جادوگرنی وہیں ایک بڑے مینڈک کے سامنے منہ کھولے بیٹھی تھی - اور وہ اس میں سے کچھ نکال نکال کر کھا رہا تھا - بالکل اس انداز سے جیسے بعض لوگ چڑیا کو اپنے منہ سے کھلاتے ہیں - وہ بدصورت بن ناگوں کو "میرے ننھے چوزے" کہہ کر پکارتی تھی - اس نے انہیں اپنے سینے پر رینگنے کی اجازت دے رکھی تھی +

سمندری جادوگرنی کہنے لگی "میں جانتی ہوں تم کیا چاہتی ہو - بڑی بے وقوف ہو - لیکن تم اپنی بات کر کے رہو گی - میری خوبصورت شہزادی! تم غم مول لے رہی ہو! تم اپنی مچھلی کی دم سے نجات پانا چاہتی ہو اور چاہتی ہو کہ اس کے بجائے وہاں دو چھڑیاں لگ جائیں ——— زمین پر کے انسانوں کی طرح تاکہ شہزادے کو تم سے محبت ہو جائے اور تمہیں غیر فانی روح مل جائے"

یہ کہہ کر جادوگرنی نے کچھ مایوسی کے انداز میں اس قدر بلند آواز سے قہقہہ لگایا کہ اس کے سینے سے تمام سانپ اور مینڈک نیچے جا گرے اور زمین پر رینگنے لگے +

اور پھر تھوڑی دیر بعد جادوگرنی کہنے لگی "تم عین وقت پر آئی ہو کیونکہ کل سورج نکلنے کے بعد میں ایک سال تک تمہاری مدد کے قابل نہ رہ سکتی تھی - میں تمہارے لئے ایک دوا تیار کرونگی - تم اسے لیکر تیرتی ہوئی سورج نکلنے سے پہلے خشکی پر جا پہنچنا اور کنارے پر بیٹھ کر اسے پی جانا - پھر تمہاری دم غائب ہو جائیگی اور تمہیں بھی وہ چیز لگ جائے گی - جسے انسان ٹانگیں کہتے ہیں - اس وقت

تمہیں سخت عذاب ہوگا ۔ تمہیں ایسا معلوم ہوگا جیسے کوئی تلوار تمہارے جسم کو چیر رہی ہے ۔ لیکن جو کوئی بھی تمہیں دیکھے گا ۔ یہی کہے گا کہ تم کوئی خوبصورت ترین عورت ہو! تم اسی طرح سلیقے سے تیر سکو گی جیسے اب تیر سکتی ہو ۔ کسی رقاصہ کے پاؤں تم جیسی نزاکت سے زمین کو نہ چھوئیں گے ۔ لیکن ہر قدم اٹھاتے وقت تمہیں یہی محسوس ہوگا کہ تم چاقوؤں پر چل رہی ہو اور ساتھ ہی تمہارا خون بھی ضرور بہے گا ۔ اگر تم یہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو تو میں تمہیں مدد دوں گی "

چھوٹی شہزادی غیر فانی رُوح اور شہزادے کا تصور کر کے کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگی " میں تیار ہوں "

جادوگرنی کہنے لگی " لیکن پھر سوچ لو ۔ کیونکہ جب ایک دفعہ تم انسان بن جاؤ گی ۔ تو پھر کوئی طاقت تمہیں از سرِ نو جل پری نہیں بنا سکے گی ۔ تم پانیوں میں سے ہوتی ہوئی اپنی بہنوں کے پاس یا اپنے باپ کے محل میں نہ جا سکو گی ۔ لیکن اگر تم شہزادے کی محبت حاصل کر سکیں ۔ اتنی محبت کہ وہ تمہارے لئے اپنے ماں باپ کو بھی بھولنے کے لئے تیار رہو ۔ یہاں تک کہ اس کی روح کو بھی تم سے محبت ہو جائے اور وہ کسی پادری سے کہے کہ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر ہمیں میاں بیوی بنا دو ـــــ تو پھر تمہیں غیر فانی روح حاصل ہو سکے گی ۔ لیکن جس دن وہ کسی دوسری عورت سے شادی کرے گا ۔ اس سے دوسرے ہی دن صبح کو تمہارا دل ٹوٹ جائے گا اور تم سمندر کی لہروں کے درمیان جھاگ بن کر رہ جاؤ گی "

جل پری کہنے لگی " میں پھر بھی تیار ہوں " اور اس کا چہرہ موت کی طرح زرد ہو گیا +

بوڑھی جادوگرنی کہنے لگی " لیکن تمہیں مجھے اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی اور میں کوئی معمولی سا مطالبہ نہیں کروں گی سمندر کی گہرائیوں میں رہنے والوں میں سے کسی کی بھی اتنی شیریں آواز نہیں ہے جتنی کہ تمہاری ۔ تم سوچتی ہو گی کہ تم اس کی مدد سے ہی شہزادے کو مسحور کر و گی لیکن یہ آواز تمہیں مجھے دینی پڑے گی ۔ تمہاری سب سے زیادہ دلکش چیز مجھے اپنی دوا کیلئے قیمت کے طور پر چاہیئے ۔ مجھے اپنا خون بھی اس میں ملانا پڑے گا تا کہ یہ اتنی تیز ہو جتنا دو دھارا خنجر +

جل پری کہنے لگی " لیکن اگر آواز تم نے لے لی تو میرے پاس رہے گا کیا "

" تمہارے پاس ! ؟ تمہارے پاس خوبصورت سراپا دلکش چال اور ایک ہی نگاہ میں بہت کچھ کہہ ڈالنے والی آنکھیں ۔ یقیناً تم ان سب کی مدد سے انسان کا دل چھین سکتی ہو ۔ تمہاری جرأت اب کدھر گئی ؟ ڈر گئی ہو ؟ اپنی چھوٹی سی زبان باہر نکالو ۔ تاکہ میں اسے کاٹ ڈالوں ! اور پھر تمہیں زود اثر دوا دوں "

جل پری کہنے لگی " اچھا "

اس کے بعد جادوگرنی نے دوا تیار کرنے کے لئے اپنا برتن آگ پر رکھا +

" صفائی بڑی اچھی چیز ہے " کہہ کر اس نے اپنی مٹھی میں سانپوں کا ایک گٹھا لیا اور اس سے رگڑ رگڑ کر برتن کو صاف کرنے لگی

اس نے اپنے سینے میں کوئی کانٹے کی سی چیز چبھوئی اور کچھ کالا کالا خون برتن میں جا گرا۔ اس میں سے جو بھاپ اُٹھی اس نے اس قدر خوفناک شکلیں اختیار کرنی شروع کیں کہ چاہے کوئی بھی ہو ان کی طرف ذرا ڈر ہی کر دیکھے۔ ہر گھڑی جادوگرنی برتن میں کوئی نہ کوئی چیز ڈالتی۔ دوا ابلنے لگی اور اس میں سے روتے ہوئے مگرمچھ کی چیخوں کی آواز نکلنے لگی۔ جب بالآخر یہ جادو کی دوا تیار ہو گئی تو یہ شفاف ترین پانی بن گئی +

جادوگرنی کہنے لگی "لو تمہاری چیز تیار ہو گئی" اس کے بعد اس نے جل پری کی زبان کاٹ ڈالی تاکہ وہ گونگی ہو جائے۔ اور پھر کبھی نہ بول سکے۔ نہ گا سکے +

جادوگرنی کہنے لگی" جب تم جنگل سے گزرنے لگو اور جاندار درختوں کی انگلیاں تمہیں پکڑ لیں تو اس میں سے کچھ قطرے ان پر چھڑک دینا۔ اس سے ان کی انگلیوں کے ہزارہا ٹکڑے ہو جائیں گے۔ لیکن چھوٹی جل پری کو ایسا کرنے کا موقع ہی نہ ملا کیونکہ جب انہوں نے جل پری کے ہاتھ میں یہ چمکدار سیال شے دیکھی جو کسی ستارے کی طرح چمک رہی تھی تو وہ خود ہی مارے دہشت کے کود کر پیچھے کو جا گرے

پس وہ بڑی تیزی سے جنگل اور دلدلوں اور ہیبتناک گردابوں میں سے گذر گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے باپ کے محل میں رقص گاہ کی روشنیاں بجھ چکی ہیں اور سب سو گئے ہیں۔ لیکن اس نے جرأت نہ کی کہ ان میں جائے۔ کیونکہ اب وہ گونگی ہو چکی تھی۔ اور ان سب کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہؤا کہ اس کا دل ٹوٹ رہا ہے۔ وہ چپکے سے باغ میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنی ہر بہن کے پھولوں کی کیاری سے ایک ایک پھول لیا۔ محل کی طرف منہ کر کے ہزارہا مرتبہ اپنا ہاتھ چوما۔ اور گہرے نیلے پانیوں میں اوپر ابھرنا شروع کیا۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا کہ اسے شہزادے کا محل دکھائی دینے لگا۔ وہ خوبصورت مرمریں سیڑھیوں کے قریب آئی۔ اس وقت چمکیلا چاند روشن تھا ـــــ اجلا اور بلند ـــــ پھر چھوٹی جل پری نے جادو کی دوا پی لی۔ اور اسے یوں محسوس ہؤا کہ اس کے نازک جسم کو ایک دو دھارا خنجر کاٹتا چلا جا رہا ہے۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ اور کسی مُردہ چیز کی طرح وہیں پڑی رہی۔ جب سورج آ کر سمندر پر چمکنے لگا تو اُسے ہوش آ گیا۔ اب بھی اسے ایک تیز چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اب اس کے سامنے نوجوان اور خوبصورت شہزادہ کھڑا تھا۔ اس کی کوئلے کی سی سیاہ آنکھیں چھوٹی جل پری پر اس طرح گڑی تھیں کہ جل پری نے شرم سے آنکھیں جھکا لیں۔ اب اسے معلوم ہؤا کہ اس کی مچھلی کی دم غائب ہو چکی ہے اور اسکی جگہ دو سفید سفید ٹانگیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ دو چھوٹے چھوٹے پیر بھی ہیں اور دونوں ٹانگیں اور دونوں پیر اتنے ہی خوبصورت ہیں جتنے کسی حسین سے حسین ننھی دوشیزہ کے ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے پاس کپڑے نہ تھے۔ سو اس نے اپنے آپ کو اپنے لمبے لمبے اور گھنے بالوں میں چھپا لیا۔ شہزادے نے اس سے پوچھا" تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟" وہ اس کی طرف اپنی دکھ بھری ملائمت آمیز گہری نیلی آنکھوں سے دیکھنے لگی لیکن بول نہ سکی۔ شہزادے نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اسے محل میں لے گیا

جیسا کہ جادوگرنی نے کہا تھا ہر قدم آگے رکھتے وقت اُسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ سوئیوں یا نشتروں پر چل رہی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اُس نے خوشی سے برداشت کر لیا اور شہزادے کے ساتھ ساتھ وہ بے نکان پانی کے بلبلے کی سی نزاکت کے ساتھ چلنے لگی۔ اس کی انوکھی اور دلنشیں چال کا انداز دیکھ کر ہر شخص حیران سا رہ جاتا۔ اسے بہت جلد ریشم کا لباس پہنا دیا گیا اور وہ محل کی حسین ترین مخلوق نظر آنے لگی۔ لیکن وہ گونگی تھی۔ نہ بول سکتی تھی نہ گا سکتی تھی۔

اب خوبصورت کنیزیں ریشم کا مطلا لباس پہن کر شہزادے اور اس کے ماں باپ کے سامنے آ گئیں اور گانے لگیں اور ایک نے تو باقی سب سے زیادہ اچھا گایا۔ شہزادے نے پہلے تالیاں بجائیں اور پھر مسکرا کر جل پری کی طرف دیکھنے لگا۔ چھوٹی جل پری کے لئے یہ ایک نہایت غمناک بات تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ میں اس کنیز سے کتنا زیادہ اچھا گا سکتی تھی۔ وہ دل ہی دل میں کہنے لگی "کاش یہ بات میرے شہزادے کو بھی معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے ساتھ رہنے کی خاطر ہمیشہ کے لئے اپنی آواز دے ڈالی ہے"۔

اس کے بعد کنیزوں نے موسیقی کے تال پر خوبصورت پریوں کی طرح رقص کرنا شروع کیا۔ اب جل پری نے اپنے پیارے پیارے گورے بازو اٹھائے اپنے پیروں کے اگلے سروں پر کھڑی ہوئی اور ایک بالکل ہی نرالے انداز سے رقص کرنا شروع کیا۔ اس سے پہلے کبھی کسی نے اس انوکھی شان سے رقص نہیں کیا تھا۔ ہر لمحے کے بعد اس کے حسن کی کشش بڑھنے لگی۔ کنیزوں کے گیتوں کے مقابلے میں اس کی سحر آفریں تیز نگاہیں دلوں میں زیادہ سرعت سے اترنے لگیں۔ سب پر ایک بے خودی طاری ہو گئی۔ سب سے زیادہ اثر شہزادے کے دل پر ہوا۔ جو اسے "میری پیاری" کہا کرتا تھا۔ اس نے پھر بے تکان رقص کرنا شروع کیا تاکہ شہزادہ اور بھی زیادہ خوش ہو۔ اگرچہ ہر بار جب اس کے قدم فرش سے چھوتے تھے تو ساتھ ہی اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے پاؤں میں بہت سے چاقو اُتر گئے ہیں۔

شہزادہ اس سے کہنے لگا "تم میرے پاس ہی رہنا" اور اُسے اجازت مل گئی کہ وہ اس کے دروازے کے قریب ایک مخملیں گدیلے پر سو سکے۔ شہزادے نے اُس کے لئے ایک مردانہ جوڑا بھی سلوا لیا تاکہ اُس کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو سکے۔ ایک دن وہ دونوں بھینی بھینی خوشبوؤں والے جنگلوں میں سے گذرے جہاں سرسبز شاخیں ان کے کندھوں کو چھو رہی تھیں۔ اور ننھے پرندے ہرے ہرے پتوں میں بیٹھے چہچہا رہے تھے وہ شہزادے کے ہمراہ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ گئی۔ اگرچہ اُس کے نازک پیروں سے خون بہ رہا تھا۔ یہاں تک کہ زمین پر ان کے نشان بھی بنتے جاتے تھے لیکن وہ کسی قسم کے دکھ کا اظہار کرنے کے بجائے بار بار ہنس دیتی تھی۔ وہ اوپر چڑھتے گئے یہاں تک کہ بادل ان کے نیچے رہ گئے اور دُور سے وہ اس طرح معلوم ہوتے جیسے پرندوں کے جھنڈ دُور دراز ملکوں کو جا رہے ہوں۔

جب وہ محل میں ہوتی اور جب تمام محل والے سو جاتے تو وہ مرمر کی چوڑی سیڑھیوں پر جا بیٹھتی کیونکہ اُسے جلتے ہوئے

پیروں کو سمندر کے پانی میں ڈبونے سے آرام محسوس ہوتا تھا اور پھر وہ ہر اس چیز کے متعلق سوچتی جو وہ گہرائیوں میں چھوڑ آئی تھی +

ایک شب اس کی بہنیں بازوؤں میں بازو ڈال کر تیرتی اور غمناک گیت گاتی ہوئی وہاں آئیں۔ جل پری نے انہیں اشارے سے بلایا اور انہوں نے اس کو پہچان لیا اور اسے بتایا کہ اس نے انہیں کس قدر غمگین کر رکھا ہے۔ اس کے بعد وہ ہر روز اس جگہ آنے لگیں اور ایک دفعہ تو اُس نے دُور فاصلے پر اپنی دادی اماں کو بھی دیکھ لیا جو کئی سال سے سطح بحر پر نہیں آئی تھی۔ اِس کے علاوہ اسے تاج پہنے ہوئے اپنا بوڑھا باپ بھی نظر آیا۔ انہوں نے اس کی طرف اپنے بازو پھیلا دیئے۔ لیکن انہوں نے خشکی کے اس قدر نزدیک بھی آنے کی جرأت نہ کی جتنی اس کی بہنیں کر چکی تھیں +

جوں جوں دن گذرتے گئے شہزادے سے اس کی محبت بڑھنے لگی اور وہ بھی اس سے ایک چھوٹے بچے کی طرح محبت کرنے لگا۔ لیکن اسے اپنی بیوی بنانے کا خیال اس کے دل میں کبھی نہ آیا۔ جب تک وہ اس سے شادی نہ کر لیتا اِسے غیر فانی روح حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ اور جس دن وہ کسی دوسری عورت سے شادی کر لیتا اس سے دوسری صبح کو وہ گھل کر سمندر کا جھاگ بن جاتی +

ایک دن جب شہزادے نے اسے اپنی آغوش میں لے کر اس کی خوبصورت پیشانی کو چوما تو یُوں محسوس ہوا جیسے جل پری کی آنکھیں کہہ رہی ہیں "کیا تمہیں مجھی سے سب سے زیادہ محبت نہیں"؟

شہزادہ کہنے لگا "ہاں تم مجھے بہت عزیز ہو کیونکہ تمہارا دل ایک بہترین دل ہے اور تم مجھے بہت ہی اپنی معلوم ہوتی ہو۔ تم اس نوجوان دوشیزہ کی ہم شکل ہو جسے ایک دفعہ میری آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔ لیکن جسے میں اب تمام عمر نہ دیکھ سکوں گا۔ میں ایک جہاز میں تھا جو ٹوٹ گیا تھا اور لہروں نے مجھے کنارے پر ایک مقدس مندر کے قریب لا پھینکا۔ جہاں بہت سی دوشیزہ لڑکیاں عبادت کے لئے آئی تھیں۔ ان میں سے سب سے چھوٹی نے مجھے کنارے پر دیکھ لیا اور میری جان بچا لی۔ میں نے صرف اسے دو ہی مرتبہ دیکھا تھا اور دنیا میں صرف وہی ایک لڑکی ہے جس سے میں محبت کر سکتا ہوں لیکن تمہاری شکل بھی اس جیسی ہے اور تم نے اس کی تصویر میرے دل سے نکال دی ہے وہ اسی مقدس مندر میں آئی تھی اور میری خوش بختی نے اِسی جگہ میرے لئے تمہیں بھیج دیا اور ہم کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونگے +

چھوٹی جل پری کہنے لگی "آہ وہ نہیں جانتا کہ میں نے ہی اس کی جان بچائی تھی۔ میں اسے سمندر سے اوپر اُٹھا کر اس جنگل میں لائی تھی جہاں مندر کھڑا ہے۔ میں جھاگ میں بیٹھی رہی یہاں تک کہ انسان اس کی مدد کو آ گئے۔ میں نے وہ خوبصورت دوشیزہ دیکھی ہے جسے وہ مجھ سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ اس کے بعد اس نے ایک گہری آہ بھری لیکن وہ آنکھوں میں آنسو نہ لا سکی "وہ کہتا ہے کہ دوشیزہ اس مندر کی رہنے والی ہے۔ وہ دنیا میں پھر واپس نہ آئے گی۔ یہ دونوں اب ایک دوسرے سے نہ ملیں گے اور میں ہوں کہ شہزادے کے قریب ہوں اور ہر روز اسے دیکھتی ہوں۔ میں شہزادے کی حفاظت کروں گی اس سے محبت کروں گی۔

اور اس کے لئے اپنی زندگی قربان کر ڈالوں گی"۔

بہت جلد لوگ یہ کہتے سنے گئے کہ "شہزادہ ضرور شادی کرنے والا ہے۔ ایک ہمسایہ سلطنت کے بادشاہ کی خوبصورت لڑکی اس کی بیوی بنے گی"۔ چنانچہ اس کے لئے ایک خوبصورت جہاز بھی تیار کیا جائے گا۔ اگرچہ شہزادہ خود یہی کہتا تھا کہ میں تو صرف بادشاہ سے ملنے جا رہا ہوں لیکن لوگ جان گئے کہ درحصل وہ اس کی لڑکی سے ملنے جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت کو بھی جانا تھا۔ چھوٹی جل پری نے یہ بات سنتے ہی مسکرا کر سر ہلا دیا۔ وہ اوروں کی بہ نسبت شہزادے کے خیالات سے زیادہ واقف تھی +

شہزادہ اس سے کہنے لگا "مجھے ضروری سفر پر جانا ہے۔ مجھے ضرور اس خوبصورت شہزادی کو دیکھنا ہے۔ میرے والدین مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ لیکن وہ مجھے اس بات پر مجبور نہیں کر سکیں گے کہ میں اسے بیوی بنا کر گھر لے آؤں۔ میں اس سے محبّت نہیں کر سکتا۔ وہ مندر والی دوشیزہ کی طرح تو نہیں جو تمہارے جیسی تھی۔ اگر مجھے ضرور ہی کسی بیوی کو گھر لانے کے لئے مجبور کیا گیا تو میں بھلا تمہیں کیوں نہ چنوں گا! میری نہ بول سکنے والی لڑکی! تم بات نہیں کرتیں لیکن تمہاری آنکھیں مجھ سے بہت کچھ کہہ ڈالتی ہیں! اور پھر شہزادے نے اس کے گلاب کے پھول سا منہ چوم لیا۔ اور اس کے لمبے لمبے ہوا میں لہراتے ہوئے بالوں سے کھیلنے لگا اور پھر اس نے اپنا سر اس کے دل پر رکھ دیا۔ اور جل پری کو انسانی لذتوں اور غیر فانی روح کے خیال آنے لگے +

اور جب وہ اس جہاز کے عرشے پر کھڑے تھے جو انہیں قریب کی ہمسایہ سلطنت کے بادشاہ کی طرف لے جانے والا تھا تو شہزادہ اس سے کہنے لگا "اے معصوم لڑکی تم سمندر سے ڈرو گی تو نہیں" پھر وہ اسے طوفانی اور پرسکون موسم اور سمندر کی گہرائیوں میں رہنے والی عجیب و غریب مچھلیوں کی باتیں سنانے لگا اور بتانے لگا کہ غوطہ زنوں نے سمندر میں کیا کیا دیکھا ہے وہ اس کی باتیں سن سن کر مسکرا دیتی کیونکہ سب سے زیادہ وہ خود جانتی تھی کہ سمندر کی تہ میں کیا کیا عجائبات ہیں +

چاندنی رات میں جب جہاز کے تمام لوگ سو گئے، سوائے اس آدمی کے جو پتوار کے قریب بیٹھا کبھی کبھی چپو مار دیتا تھا تو وہ عرشۂ جہاز پر آ بیٹھی اور صاف پانیوں میں دیکھنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے اپنے باپ کا محل اور اس میں اپنی بوڑھی دادی اماں سر پر چاندی کا تاج پہنے تیز رفتار جہاز کی سمت ٹکٹکی لگائے نظر آ سکتی ہے اور سچ مچ ہی اس کی بہنیں لہروں پر آ پہنچیں اور اپنے سفید سفید ہاتھ ملتے ہوئے اس کی طرف نہایت کرب آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ اُس نے ان کی طرف اشارہ کیا اور مسکرانے لگی اور انہیں بتانا چاہا کہ میں یہاں ہر طرح سے خوش اور مطمئن ہوں لیکن اسی دوران میں جہاز کا لڑکا وہاں آ موجود ہوا اور جب پری کی بہنیں اسے دیکھ کر غوطہ لگا گئیں تو اس نے سمجھا کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ سمندر کا جھاگ تھا +

دوسری صبح جہاز ایک خوبصورت شہر کی بندرگاہ میں آپہنچا جو اس بادشاہ کی ملکیت تھا جس کے گھر شہزادہ جارہا تھا۔ گرجا میں گھنٹیاں بج رہی تھیں اور بلند میناروں سے نفیری کے نغموں کی دلکش آواز سنائی دے رہی تھی۔ جس سڑک سے وہ گزرے، اس کے دونوں طرف سپاہی قطاریں باندھے ہاتھ میں جھنڈے اور چمکتی سنگینیں لئے کھڑے تھے۔ وہاں ہر روز ایک میلہ رہتا اور ہر روز رقص ہوتے اور دعوتیں ہوتیں۔

لیکن شہزادی ابھی نہیں آئی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ مقدس مذہبی درس گاہ میں بیٹھی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ اور ہر وہ بات سیکھ رہی ہے جو بادشاہوں کی لڑکیوں کے لئے سیکھنی ضروری ہوتی ہے۔ آخر کار وہ آگئی اور اس کے بعد چھوٹی جل پری کو بھی جو یہ معلوم کرنے کے لئے بے تاب تھی کہ کیا وہ سچ مچ خوبصورت ہے اعتراف کرنا پڑا کہ واقعی اس نے حسن کا اس سے زیادہ مکمل نمونہ نہیں دیکھا۔ اس کا بدن نازک اور خوش نما تھا۔ اور اس کی لمبی لمبی سیاہ پلکوں کے نیچے دو مسکراتی ہوئی آنکھیں سچائی اور پاکیزگی کے نور سے روشن ہو رہی تھیں۔

شہزادہ کہنے لگا "اچھا تو یہ تم ہو جس نے اس وقت میری جان بچائی تھی جب میں مُردہ ہو کر ساحل پر پڑا تھا"۔ یہ کہہ کر اُس نے شرماتی ہوئی دلہن کے گرد اپنے بازو حمائل کر دیئے اور اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا اور پھر جل پری سے کہنے لگا میں بہت خوش ہوں میری تمام امیدیں بر آگئی ہیں۔ تم بھی میری خوشی سے خوش ہو گی کیونکہ تمہیں مجھ سے سچی عقیدت ہے"۔

چھوٹی جل پری نے شہزادے کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اس نے دل میں کہا کہ میرا دل ٹوٹ چکا ہے۔ شادی کی صبح میرے لئے موت کا پیغام ہو گی اور میں سمندر کا جھاگ بن جاؤں گی۔ گرجا کی تمام گھنٹیاں ٹن ٹن کرنے لگیں اور سرداروں نے گھوڑوں پر سوار ہو کر ہر جگہ شہر میں شہزادے کی منگنی کا اعلان کر دیا۔ گرجاؤں کی قربان گاہوں پر خوشبودار تیل کی بیش قیمت مشعلیں روشن کر دی گئیں چھوٹے پادریوں نے اگر دان ہلانے شروع کئے اور بڑے پادری نے دولہا اور دلہن کے ہاتھ ملا دیئے اور انہیں برکت دی۔ چھوٹی جل پری جو ریشمی لباس پہنے ہوئے تھی دلہن کے لبادے کا پچھلا حصہ اٹھا کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ لیکن اس کے کان جشن کی موسیقی کے نغمے نہیں سن رہے تھے۔ نہ اس کی آنکھوں نے اس مقدس رسم کو ادا ہوتے ہوئے دیکھا اسے اس مہلک رات کا خیال آرہا تھا جو نزدیک سے نزدیک تر آرہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ میں نے اس دنیا میں سب کچھ کھو دیا ہے۔ اسی شام دولہا اور دلہن جہاز پر سوار ہو گئے۔ توپیں گرج رہی تھیں جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اور جہاز کے وسط میں ایک خیمہ نصب کیا گیا تھا جس کا کپڑا نہایت ہی قیمتی تھا اور جس پر سونے کا کام کیا گیا تھا۔ خیمے میں دولہا اور دلہن کے رات بسر کرنے کے لئے خوش قطع اور نفیس صوفے رکھ دیئے گئے۔ جہاز کے بادبان ہوا سے بھر گئے۔ موافق ہوا چلنے لگی۔ اور جہاز پُرسکون سمندر پر نہائت نرمی اور ملائمت سے آگے بڑھا۔ جب اندھیرا چھا گیا تو بہت سی رنگارنگ مشعلیں روشن کر دی گئیں اور ملاح خوشی سے عرشۂ جہاز پر ناچنے لگے

چھوٹی جل پری کو بے اختیار یاد آگیا کہ وہ پہلے پہل کس طرح سطح بحر پر ابھری تھی - اس وقت بھی ایک جہاز پر اسی طرح جشن منایا جارہا تھا - وہ بھی رقص میں شریک ہوگئی اور ہوا میں یوں رقص کرنے لگی جیسے ایک ابابیل پھرتی اور نزاکت سے ہوا میں اپنے شکار کا تعاقب کرتی ہے - ہر دیکھنے والا حیران ہو ہو کر اور تالیاں بجا بجا کر اسے داد دینے لگا - اس نے اس سے پہلے کبھی اس قدر خوش ادائی اور نفاست سے رقص نہیں کیا تھا - اس کے نازک پاؤں تیز چاقوؤں سے زخمی ہو گئے - لیکن اس نے کوئی پروا نہ کی اسے اپنے دل میں چاقوؤں کے زخم سے کہیں زیادہ دردناک چبھن محسوس ہو رہی تھی وہ جانتی تھی کہ یہ آخری شام ہے جب میں شہزادے کو دیکھ رہی ہوں اس شہزادے کو جس کے لئے میں نے اپنے گھر اور اپنے رشتہ داروں کو چھوڑا - جس کے لئے میں نے اپنی خوبصورت آواز دے ڈالی لیکن شہزادے کو اس کی کچھ خبر بھی نہیں اُس نے سوچا کہ یہ آخری شام ہے جب ہم دونوں ایک ہی ہوا میں سانس لے رہے ہیں تاروں بھرے آسمان اور گہرے سمندر کو اکٹھے دیکھ رہے ہیں - اس کے بعد ایک لازوال رات ——— ایک ایسی رات جس میں نہ کوئی خواب آسکتا تھا نہ خیال اس کا انتظار کر رہی تھی - چھوٹی جل پری روح سے محروم تھی اور اب وہ اسے حاصل کرنے میں کامیاب بھی نہ ہوسکتی تھی - نصف شب کے بعد بھی بہت دیر تک جہاز پر جشن مسرت برپا رہا اور چھوٹی جل پری بھی موت کا خیال دل میں چھپائے دوسروں سے مل کر رقص کرتی رہی، ہنستی رہی - شہزادے نے اپنی حسین دلہن کا بوسہ لیا - وہ اس وقت اس کے سیاہ اور چمکیلے بالوں سے کھیل رہی تھی - اس کے بعد وہ دونوں بازو میں بازو ڈال کر شاندار خیمے میں آرام کرنے کے لئے چلے گئے اور جہاز پر خاموشی چھا گئی - صرف پتوار ڈالنے والا آدمی جاگتا تھا - چھوٹی جل پری نے اپنے گورے بازو جہاز کے ایک کنارے پر سمندر کی طرف لٹکا دیئے اور یوں جھک کر صبح کی پہلی شرمگین ادا کا نظارہ کرنے کے لئے مشرق کی طرف دیکھنے لگی - اسے سورج کی پہلی کرن کا انتظار تھا جو اُس کے لئے موت کا پیغام لانے والی تھی - اس نے دیکھا کہ اس کی بہنیں طوفان زدہ سمندر میں باہر نکل آئی ہیں - وہ بھی اتنی ہی زرد رو ہو رہی تھیں جتنی وہ خود تھی ——— لیکن آہ اب ان کے لمبے لمبے خوبصورت بال ہوا میں لہرا نہیں رہے تھے - وہ کٹ چکے تھے *

جل پریاں کہنے لگیں " ہم نے تمہارے لئے اپنے بال جادوگرنی کو دے دیئے تاکہ تم آج رات نہ مر جاؤ - اُس نے ہمیں ایک چاقو دیا ہے یہ ہے وہ ! دیکھو اس کی دھار کتنی تیز ہے ! تم سورج نکلنے سے پہلے پہلے اسے شہزادے کے دل میں بھونک دینا ! جب اس کا گرم گرم خون تمہاری ٹانگوں پر گرے گا تو وہ دونوں یکایک ایک ہو جائیں گی - اور ان دو موٹی چھڑیوں کے بجائے فوراً تمہاری مچھلی کی دم بن جائے گی - تم ایک دفعہ پھر جل پری بن جاؤ گی اور مرنے سے پہلے ——— سمندر کا جھاگ بننے سے قبل تین سو سال تک زندہ رہ سکو گی - اب جلدی کرو ! سورج نکلنے سے پہلے اسے موت کے گھاٹ اُتار دو - ہماری بوڑھی دادی اماں نے تمہارا اس قدر ماتم کیا ہے کہ اس کے سر کے سفید بال فرط رنج سے اس طرح گر رہے ہیں جیسے ہمارے

جادوگرنی کی قینچی کے نیچے گرتے تھے۔ شہزادے کو مار ڈالو! جلدی کرو! کیا تمہیں صبح کی پہلی سرخ روشنیاں نہیں نظر آ رہیں؟ چند ہی لمحوں میں سُورج نکل آئے گا اور تم مر جاؤ گی"۔

اس کے بعد اس کی بہنوں نے ایک گہری اور نہایت افسردہ سانس لی۔ اور لہروں کے نیچے ڈوب گئیں ٭

چھوٹی جل پری نے شیشے کا قرمزی پردہ پیچھے ہٹایا اور دیکھا کہ خوبصورت دُلہن شہزادے کے سینے پر اپنا سر رکھے سو رہی ہے ٭

اس نے جھک کر شہزادے کی خوشنما پیشانی کا بوسہ لے لیا۔ اور پھر آسمان کی طرف دیکھا جس میں پھول کی سی سُرخی لحظہ بلحظہ بڑھ رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے تیز چاقو پر ایک نگاہ ڈالی اور دوسری شہزادے کے چہرے پر۔ اور شہزادے کے چہرے پر اس کی نظریں گڑ گئیں۔ اس نے خواب میں آہستہ سے اپنی دلہن کا نام لیا۔ آہ اس کے خوابوں میں بھی وہی تھی چھوٹی جل پری کے ہاتھ میں چاقو لرز گیا اسکے بعد اس نے اسے اپنے سے بہت دُور لہروں میں پھینک دیا۔ اور جہاں یہ گرا وہاں کا پانی سُرخ ہو گیا۔ چھینٹیں خون بن کر اوپر تک اُٹھیں۔ چھوٹی جل پری نے ایک مرتبہ پھر شہزادے پر ایک طویل اور ناتوان نیم مردہ سی نگاہ ڈالی اور پھر یکایک اپنے آپ کو جہاز پر سے سمندر میں گرا لیا۔ دفعتہً اسے یُوں محسُوس ہوا کہ اس کا جسم آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر جھاگ میں تبدیل ہو رہا ہے ٭

(ترجمہ) مہدی علی خاں

دوست کو دیا ہوا روپیہ جاتا بھی رہے گا تو دوست پھر بھی تمہارا دوست ہے۔ لیکن ادھار دو تو تمہارا دوست جاتا رہے گا۔ بفرضِ محال اگر تمہارا روپیہ واپس بھی مل جائے ٭ (ملیورلٹن)

جیتے جی ہمیں کسی دوست سے لطف نہیں ملتا۔ ملنا ہمارا اگر ہو گا تو قبر کے اس پار ہی۔ دوست مرتا ہے تو ہماری رُوح کو وہ کتنا اپنے ہمراہ لے جاتا ہے۔ ہم اس کے ساتھ گویا نصف مر جاتے ہیں! (جیننگ)

گلچیں

چھوٹی جل پری کو بے اختیار یاد آگیا کہ وہ پہلے پہل کس طرح سطح بحر پر ابھری تھی۔ اس وقت بھی ایک جہاز پر اسی طرح جشن منایا جا رہا تھا۔ وہ بھی رقص میں شریک ہوگئی اور ہوا میں یوں رقص کرنے لگی جیسے ایک ابابیل پھرتی اور نزاکت سے ہوا میں اپنے شکار کا تعاقب کرتی ہے۔ ہر دیکھنے والا حیران ہو ہو کر اور تالیاں بجا بجا کر اسے داد دینے لگا۔ اس نے اس سے پہلے کبھی اس قدر خوش ادائی اور نفاست سے رقص نہیں کیا تھا۔ اس کے نازک پاؤں تیز چاقوؤں سے زخمی ہو گئے۔ لیکن اس نے کوئی پروا نہ کی اسے اپنے دل میں چاقوؤں کے زخم سے کہیں زیادہ دردناک چُبھن محسوس ہو رہی تھی وہ جانتی تھی کہ یہ آخری شام ہے جب میں شہزادے کو دیکھ رہی ہوں اس شہزادے کو جس کے لئے میں نے اپنے گھر اور اپنے رشتہ داروں کو چھوڑا۔ جس کے لئے میں نے اپنی خوبصورت آواز دے ڈالی لیکن شہزادے کو اس کی کچھ خبر بھی نہیں اُس نے سوچا کہ یہ آخری شام ہے جب ہم دونوں ایک ہی ہوا میں سانس لے رہے ہیں تاروں بھرے آسمان اور گہرے سمندر کو اکٹھے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد ایک لازوال رات ——— ایک ایسی رات جس میں نہ کوئی خواب آ سکتا تھا نہ خیال اس کا انتظار کر رہی تھی۔ چھوٹی جل پری روح سے محروم تھی اور اب وہ اسے حاصل کرنے میں کامیاب بھی نہ ہو سکتی تھی۔ نصف شب کے بعد بھی بہت دیر تک جہاز پر جشنِ مسرت برپا رہا اور چھوٹی جل پری بھی موت کا خیال دل میں چھپائے دوسروں سے مل کر رقص کرتی رہی، ہنستی رہی۔ شہزادے نے اپنی حسین دلہن کا بوسہ لیا۔ وہ اس وقت اس کے سیاہ اور چمکیلے بالوں سے کھیل رہی تھی۔ اس کے بعد وہ دونوں بازو میں بازو ڈال کر شاندار خیمے میں آرام کرنے کے لئے چلے گئے اور جہاز پر خاموشی چھا گئی۔ صرف پتوار ڈالنے والا آدمی جاگتا تھا۔ چھوٹی جل پری نے اپنے گورے بازو جہاز کے ایک کنارے پر سمندر کی طرف لٹکا دیئے اور یوں جھک کر صبح کی پہلی شرمگین ادا کا نظارہ کرنے کے لئے مشرق کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے سورج کی پہلی کرن کا انتظار تھا جو اُس کے لئے موت کا پیغام لانے والی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی بہنیں طوفان زدہ سمندر میں باہر نکل آئی ہیں۔ وہ بھی اتنی ہی زرد رو ہو رہی تھیں جتنی وہ خود تھی ——— لیکن آہ اب ان کے لمبے لمبے خوبصورت بال ہوا میں لہرا نہیں رہے تھے۔ وہ کٹ چکے تھے۔

جل پریاں کہنے لگیں "ہم نے تمہارے لئے اپنے بال جادوگرنی کو دے دیئے تاکہ تم آج رات نہ مر جاؤ۔ اُس نے ہمیں ایک چاقو دیا ہے یہ ہے وہ! دیکھو اس کی دھار کتنی تیز ہے! تم سورج نکلنے سے پہلے پہلے اسے شہزادے کے دل میں بھونک دینا! جب اس کا گرم گرم خون تمہاری ٹانگوں پر گرے گا تو وہ دونوں یکایک ایک ہو جائیں گی۔ اور ان دو موٹی چھڑیوں کے بجائے فوراً تمہاری مچھلی کی دم بن جائے گی۔ تم ایک دفعہ پھر جل پری بن جاؤ گی اور مرنے سے پہلے ——— سمندر کا جھاگ بننے سے قبل تین سو سال تک زندہ رہ سکو گی۔ اب جلدی کرو! سورج نکلنے سے پہلے اسے موت کے گھاٹ اُتار دو۔ ہماری بوڑھی دادی اماں نے تمہارا اس قدر ماتم کیا ہے کہ اس کے سر کے سفید بال فرطِ رنج سے اس طرح گر رہے ہیں جیسے ہمارے

جادوگرنی کی قینچی کے نیچے گرتے تھے۔ شہزادے کو مار ڈالو! جلدی کرو! کیا تمہیں صبح کی پہلی سرخ روشنیاں نہیں نظر آ رہیں؟ چند ہی لمحوں میں سُورج نِکل آئے گا اور تم مرجاؤ گی۔"

اس کے بعد اس کی بہنوں نے ایک گہری اور نہایت افسردہ سانس لی۔ اور لہروں کے نیچے ڈوب گئیں +

چھوٹی جل پری نے خیمے کا قرمزی پردہ پیچھے ہٹایا اور دیکھا کہ خوبصورت دُلہن شہزادے کے سینے پر اپنا سر رکھے سو رہی ہے +

اس نے جھک کر شہزادے کی خوشنما پیشانی کا بوسہ لیا۔ اور پھر آسمان کی طرف دیکھا جس میں پھول کی سی سُرخی لحظہ بلحظہ بڑھ رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے تیز چاقو پر ایک نگاہ ڈالی اور دوسری شہزادے کے چہرے پر۔ اور شہزادے کے چہرے پر اس کی نظریں گڑ گئیں۔ اس نے خواب میں آہستہ سے اپنی دلہن کا نام لیا۔ آہ اس کے خوابوں میں بھی وہی تھی چھوٹی جل پری کے ہاتھ میں چاقو لرز گیا اسکے بعد اس نے اسے اپنے سے بہت دُور لہروں میں پھینک دیا۔ اور جہاں یہ گرا وہاں کا پانی سُرخ ہو گیا۔ چھینٹیں خون بن کر اوپر تک اُٹھیں۔ چھوٹی جل پری نے ایک مرتبہ پھر شہزادے پر ایک طویل اور ناتوان نیم مردہ سی نگاہ ڈالی اور پھر یکایک اپنے آپ کو جہاز پر سے سمندر میں گرا لیا۔ دفعتہً اسے یُوں محسُوس ہؤا کہ اس کا جسم آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر جھاگ میں تبدیل ہو رہا ہے +

(ترجمہ) **مہدی علی خاں**

دوست کو دیا ہؤا روپیہ جاتا بھی رہے گا تو دوست پھر بھی تمہارا دوست ہے۔ لیکن ادھار دو تو تمہارا دوست جاتا رہے گا۔ بفرضِ محال اگر تمہارا روپیہ واپس بھی مل جائے + (ملبور لٹن)

جیتے جی ہمیں کسی دوست سے لطف نہیں ملتا۔ ملنا ہمارا اگر ہو گا تو قبر کے اس پار ہی۔ دوست مرتا ہے تو ہماری روح کو وہ کتنا اپنے ہمراہ لے جاتا ہے۔ ہم اس کے ساتھ گویا نصف مرجاتے ہیں! (جیننگ)

گلچیں

پپیہے سے خطاب

راگنی پیہو کی سکھلائی ہے کس نے تجھکو
طرز یہ آگئی کس طرح پپیہے تجھ کو

رین برکھا کی یہ تاریک یہ ہُو کا عالم
کس کی یاد آگئی اس وقت نہ جانے تجھ کو

دیکھ کر اس کی چمک جوش میں کیوں آتا ہے
دمبدم کرتی ہے کیا برق اشارے تجھ کو

بول اُٹھتا ہے جو یوں سرد ہوا پاتے ہی
مژدہ کیا دیتے ہیں پُروا کے یہ جھونکے تجھ کو

کیوڑے کی یہ مہک مولسری کی یہ بُو
کس کا پہنچاتی ہے پیغام پرندے تجھ کو

کس کو رہ رہ کے سُناتا ہے رسیلی تانیں
کس کے اس وقت نظر آتے ہیں جلوے تجھ کو

پیہو پیہو کی صدا دے کے بلاتا ہے کسے
یہ طلب کس کی ہے اے ہجر کے مارے تجھ کو

ہائے کیا درد میں ڈوبی ہوئی لے ہے تیری
میرے سینے سے کوئی لا کے لگا دے تجھ کو

جی مرا کیوں نہ بھر آئے تری پی پی سُنکر
مبتلا میں بھی ہوں گر عشق ہے پیارے تجھ کو

ایک بیدار ہوں میں جاگ رہا ہے اِک تُو
لوٹتے مجھ کو گزرتی ہے تڑپتے تجھ کو

میں اِدھر اشک فشاں، تُو ہے اُدھر محوِ فغاں
ویسے ہی مجھ کو بھی ہیں جیسے ہیں صدمے تجھ کو

پھر بھی ہے فرق بہت حال میں ہم دونوں کے
کہ مجھے ضبط عطا ہو گیا نالے تجھ کو

محوِ فریاد فقط رات کو تُو ہوتا ہے
میرے دل پر ہے وہ بپتا کہ سدا روتا ہے

میر سعادت حسین نجیب

چائے کے مہلک اثرات

یہ مضمون جو "ماڈرن ریویو" سے لیا گیا ہے۔ سر پی سی رائے کی انگریزی کتاب "زندگی اور اس کے تجربات" کی زیر طبع دوسری جلد کا ایک باب ہے۔

بنگال کے لوگ چائے نوشی سے تقریباً بے خبر تھے۔ لیکن لارڈ کرزن نے جو شہنشاہیت اور تاجرانہ غارت گری کے مبلغ اعظم تھے وہاں بھی اس کے رواج دینے کی ہر ممکن کوشش کی اور یہ کام یورپ کی ایک مقتدر جماعت "یورپین ٹی ایسوسی ایشن" کے سپرد کر دیا۔ اس جماعت کو کافی سرمایہ بہم پہنچا دیا گیا۔ چنانچہ اس نے نہایت وسیع پیمانہ پر کام شروع کر دیا۔ چائے کی دکانوں پر ہندوستانیوں کو مفت چائے تقسیم کرنے کا انتظام کیا گیا نیز عوام مفت چائے پینے کے لئے مدعو بھی کئے جاتے تھے +

بنگال کے پڑھے لکھے لوگ جو یورپ کے ہر فعل کی تقلید کے لئے پہلے ہی سے تیار تھے اس دام فریب میں نہایت آسانی سے پھنس گئے۔ تعلیم یافتہ طبقہ کے علاوہ چائے نوشی کی عادت قلیوں، مزدوروں اور گاڑی بانوں میں بھی بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح پھیل گئی اور اب تک روزافزوں ترقی پر ہے +

آج کل کلکتہ میں خاطر خواہ کامیابی کے پیش نظر "ٹی ایسوسی ایشن" نے قصبوں اور بڑے بڑے سٹیشنوں پر بھی چائے کا پروپیگنڈا شروع کر دیا ہے اور لوگ اس کا اثر نہایت آسانی سے قبول کر رہے ہیں +

چائے کا ایک پیالہ ——— "وہ پیالہ جو فرحت بخشتا ہے لیکن بدمست نہیں کرتا"۔ سرد ملکوں میں شاید فرحت بخشتا ہو لیکن گرم آب و ہوا میں اس کے استعمال کی قطعاً ضرورت نہیں۔ مغربیوں کی خوراک میں غذائیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے ان کی صحت پر چائے کا مضر اثر بہت کم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کلکتہ یا بمبئی کا ایک کلرک جس کی تنخواہ اس کے مصارف کے لئے ناکافی ہوتی ہے اور جسے ایسا کھانا بھی میسر نہیں ہوتا جو صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے، جب دو گھنٹے متواتر دفتر کا کام کرتے کرتے تکان محسوس کرتا ہے تو فوراً چائے کا پیالہ منگواتا ہے لیکن تھوڑی دیر کام کرنے کے بعد اس کی طبیعت پھر سست ہو جاتی ہے اور اُسے پھر چائے پینے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس طرح پے بہ پے وہ چائے کی تقریباً نصف درجن پیالیاں پی جاتا ہے لیکن اس کی حالت جوں کی توں رہتی ہے۔ کلرک چائے نوشی کے حق میں یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اس سے بھوک مر جاتی ہے اور اس طرح اسے بہتر قسم کی غذا کی ضرورت نہیں رہتی +

میں یہاں صرف چائے کے مضر صحت اثرات اور اس کے متعلق طبّی نقطۂ نظر ہی پیش نہیں کرنا چاہتا بلکہ میں یہ بھی بتانا

چاہتا ہوں کہ اگر اقتصادی لحاظ سے دیکھا جائے تو چائے ہمارے ملک کو بہت نقصان پہنچا رہی ہے۔ بنگال میں جتنی چائے پیدا ہوتی ہے اس میں سے ۹۶ فیصدی یورپین تاجروں کے کھیتوں کی پیداوار ہوتی ہے اور اس کا صرف ۴ فیصدی حصہ ہندوستانیوں کے کھیتوں میں پیدا ہوتا ہے۔

عوام میں چائے نوشی کا مرض نہایت سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے اور اگر آیندہ دس سال تک یہی حالت رہی تو بنگال کی پانچ کروڑ آبادی میں سے اگر ہر شخص کے چائے کے سالانہ خرچ کا اوسط ایک روپیہ ہو تو صرف بنگال ہی سے یورپ کو پانچ کروڑ روپیہ کی آمدنی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ فی کس ایک روپیہ سالانہ ایک معمولی تخمینہ ہے تاہم اس حساب سے بھی ملک سے نہایت گراں قدر رقم ہر سال باہر چلی جائے گی۔

اس گراں قدر رقم میں سے ایک حقیر حصہ جو مزدوروں کو بطور معاوضہ دیا جاتا ہے نکالا جا سکتا ہے۔

ذیل میں چائے اور کافی کے متعلق قابل ڈاکٹروں کی آرا درج کی جاتی ہیں جن سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا استعمال صحت کے لئے کس قدر تباہ کن ہے۔

"زمانۂ قدیم میں بنگال کے امرا اور غربا، دونوں کا ناشتہ گڑ اور چنے، ادرک اور چنے، بھنے ہوئے چاول اور چنے یا" پن بھات" اور دودھ پر مشتمل ہوتا تھا۔ ان چیزوں میں حیاتین کی مقدار بھی کافی ہے اور باہمی امتزاج کے لحاظ سے ان میں بہتر تبدیلی کی گنجائش نہیں خوشحال لوگ اس غذا کے ساتھ مکھن اور شکر قندی اور کبھی دہی کا بھی اضافہ کر لیتے تھے۔ غذائیت کے اعتبار سے یہ بہترین ناشتہ کہلا سکتا ہے۔

"تقریباً تیس سال گذرے "انڈین ٹی ایسوسی ایشن" نے صرف تجارتی مصلحتوں کی بنا پر ہندوستان میں چائے کو ایک غذا کے طور پر مشتہر کرنے میں غیر معمولی سرگرمی سے کام لیا۔ چونکہ ہندوستان میں غربا کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس لئے یہ غیر ممکن تھا کہ وہ اپنے سابقہ کھانے کے ساتھ ہی چائے کے مصارف بھی برداشت کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے صرف چائے کو ایک نعم البدل سمجھ کر اپنے قدیم ناشتے کو ترک کر دیا۔

"یہ انجمن محض تجارتی اغراض کیلئے لوگوں کو اپنا اصلی ناشتہ ترک کرنے کی پرزور ترغیب دیتی رہی۔ لیکن اور تو اور خود محکمۂ حفظانِ صحت نے بھی اس کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا۔ نہ بے خبر عوام چائے کے مضر صحت اثرات سے آگاہ کئے گئے اور نہ ان پر یہ واضح کرنے کی زحمت گوارا کی گئی کہ چائے کا جوشاندہ جس میں مشتبہ قسم کے دودھ کا ذرا سا سراغ ملتا ہے غذائیت سے قطعاً عاری ہوتا ہے۔

"تیس سال سے "انڈین ٹی ایسوسی ایشن" چائے کے پراپیگنڈا میں مشغول ہے لیکن ملک کے کسی گوشے سے اس خود غرضانہ فعل کے خلاف ہنوز کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ ایسوسی ایشن اس ناقابل ستایش مقصد میں کامیاب ہو گئی ہے اور اس نے ملک کے باشندوں کی بہترین غذا کے بجائے ایک ایسی چیز کے رواج کو فروغ دیا ہے جو غذا کی جگہ لے کر بھولے بھالے لوگوں کی

صحت کو بالکل تباہ کردے گی۔"

این ۔ آر ۔ سین گپتا ۔ ایم ۔ ڈی ۔

"چائے محرک قلب اور محرک اعصاب ہوتی ہے۔ صحیح طریقہ پر بنی ہوئی چائے بھی اگر زیادہ پی جائے (اور بعض لوگ خواہ کم بھی پئیں) تو بدہضمی، عصبی کمزوری، اختلاج قلب، دورانِ سر اور بے خوابی کی شکایات پیدا ہوجاتی ہیں۔ غذا کے طور پر یا تکان کو بظاہر دُور کرنے کے لئے اگر چائے پی جائے تو یہ صحت کے لئے خاص طور پر مضر ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس کے استعمال سے انسان اس وقت بھی کام کرتا ہے جب اُس کے دماغ کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔"

جے ۔ والٹر کار ۔ ایم ۔ ڈی ۔ ایف ۔ آر ۔ سی ۔ ایس (لنڈن)

چائے کی پیالی کے خطرناک اثرات

کیمبرج کے ڈاکٹر ڈبلیو ۔ ای ۔ ڈکسن نے ڈینبیگ کے مقام پر "برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن" کے ایک اجلاس میں "نشہ آور اشیا اور ان کا استعمال" کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ محرکات کے استعمال اور صحت پر ان کے اثرات کے متعلق موصوف نے جن خیالات کا اظہار کیا ذیل میں اُن کا اقتباس درج کیا جاتا ہے:۔

"اگر چائے مسلسل پی جائے تو یہ بہت ضرر رساں ہے۔ کسی سرور انگیز چیز کی خواہش انسان میں قدرۃً پیدا ہوتی ہے چنانچہ تمباکو بعض اوقات نشہ آور اشیاء کا مقابلۃً کم مضر بدل سمجھا جاتا ہے۔

"نشہ آور اشیاء میں کیفین بہت عام اور نسبۃً کم مضر ہوتی ہے۔ تاہم اس کے لگاتار استعمال سے عصبی اور دماغی کمزوری کا پیدا ہو جانا یقینی ہے۔ چائے اور کافی میں کیفین کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ چائے کی ایک پیالی میں اس کی مقدار ایک گرین سے کم نہیں ہوتی۔ لہٰذا ایک عام چائے پینے والا آدمی پانچ گرین سے آٹھ گرین تک کیفین روزانہ نگل جاتا ہے۔ اور یہ کچھ ناقابل توجہ مقدار نہیں۔ کیفین کے مسلسل استعمال سے دورانِ سر، عصبی کمزوری، چڑچڑاپن اور بدہضمی پیدا ہوتی ہے اور ان شکایات کے ردعمل کے نتائج اس سے بھی زیادہ مضر ہوتے ہیں۔ یہ تمام اثرات کیفین کے روزانہ چھ یا سات گرین استعمال کرنے سے پیدا ہوسکتے ہیں۔

"ملک میں چائے کے عام استعمال نے اعلےٰ اور اوسط طبقے کی صحت پر ایسا بُرا اثر ڈالا ہے کہ ہمارے شہروں اور قصبوں میں "چائے کی بدہضمی" ایک عام وَبا کی صورت اختیار کرچکی ہے۔ اگر دن میں پانچ یا چھ پیالیاں ایسی چائے کی پی جائیں جس میں دودھ کی مقدار اور شکر کی آمیزش کافی ہو تو بھی کچھ عرصہ کے بعد قبض، تولنج ریحی، معدے میں ترشی اور طبیعت میں گرانی کی شکایت ہوجاتی ہے اور بعد میں نیند اور بھوک بھی مفقود ہوجاتی ہیں۔ آخرکار معدے کے پھیلاؤ اور اختلاج قلب کا مرض ہوجاتا ہے۔"

ڈاکٹر جان فشر لکھتے ہیں "کیفین جو چائے کا اہم ترین عنصر ہے اپنے اثرات میں کوکین سے ملتا ہے۔ اس سے کوکین ہی کی طرح پہلے چستی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن دوسری نشہ آور اشیا کی طرح بعد میں اثر بالکل اُلٹا ہوتا ہے اور جسم کو دوبارہ محرکات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس قسم کی اشیا کا استعمال کچھ دیر بعد جسم کی پہلے سے بھی بدتر حالت بنا دیتا ہے

چائے بے دلی، اضطراب، بے آرامی اور محرکات کی خواہش پیدا کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس سے سوءِ ہضم۔ بے خوابی۔ کمیٔ خون اور قبض کی شکایت پیدا ہونے کے علاوہ اکثر نشہ آور اشیا مثلاً شراب وغیرہ کے استعمال کی ترغیب ہوتی ہے یہاں تک کہ بعض اوقات جنون تک نوبت پہنچتی ہے۔ کافی بھی چائے جیسی ہی بری چیز ہے اور کوکو اس سے بہتر نہیں"۔

ڈاکٹر جے بیٹی ٹیوک کہتے ہیں کہ "یہ ہنوز ایک فیصلہ طلب سوال ہے کہ آیا وسکی کی بوتل زیادہ مہلک ہے یا چائے دانی"۔

فاروق علی خاں

ایک خط

اسمبلی کے شاندار کتاب گھر میں نیلے نیلے سنگ مرمر کے خوبصورت ستونوں کے پہلو میں یہ خط لکھا جا رہا ہے۔ یہ عمارت کونسل ہوس کے مرکز میں جو گنبد ہے اس کو سنبھالے کھڑی ہے۔ اس گنبد میں تقریروں کی بازگشت صدا کم ہوتی ہے۔ پہلو کی گردش میں کتابوں کی الماریاں لکھنے کی میزیں ہیں۔ عین گنبد کے نیچے تین میزوں پر ہندوستان بھر کے اخبار رلدے ہیں۔ کچھ نشست کی سُرخ مخملی گدے دار کرسیاں ہیں۔ اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے ممبر بیٹھے ہیں۔ اخبار پڑھتے ہیں خط لکھتے ہیں۔ نیلے نیلے سنگ مرمر کے ستون خاموش کھڑے تعجب کرتے ہیں کہ یہ باشندے کیوں آتے جاتے کبھی پڑھتے ہیں کبھی لکھتے ہیں کبھی سوتے ہیں۔ شاہزادہ ویلز کی قدِ آدم تصویر اور دو تین بت (ایک گوکھلے کا، لارڈ چیلمسفورڈ اور لارڈ ریڈنگ کی تصویر کبھی کبھی لگا ہوں کو اسیر کرتی ہے۔ مگر زندہ انسان بتوں اور تصویروں سے نہیں بہلتا لکھتا ہے، پڑھتا ہے، بولتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔

کیا یہ ستون کبھی کچھ نہ کہیں گے؟ تم بتاؤ بشیر؟
میں تمہیں یاد کرتا ہوں یہ ستون کیا بھلا رہے ہیں؟

فلک پیما

تجلّیات

بن کے قرارِ جاوداں آ دلِ بے قرار میں
گرمِ فغاں ازل سے ہوں تیرے ہی انتظار میں

اے کہ ترے جمال میں غرق ہیں مہر و ماہتاب
اے کہ تری بہار ہے گلشنِ روزگار میں

اے کہ صبا کی موج میں تیری ہی مستیٔ خرام
اے کہ ترا ہی رنگ و بُو گلبن و لالہ زار میں

اے کہ ہے آبشار میں تیرا ہی رقصِ بیخودی
اے کہ ہے تیرا ہی سرود بربطِ جُوئبار میں

میرے دل و جگر میں ہے یوں ترا عشق موجزن
جیسے رواں ہو آبِ جُو سینۂ کوہسار میں

رُخ سے نقاب کو الٹ سجدۂ شوق کر قبول
اے کہ چھپا ہوا ہے تو پردۂ روزگار میں

اختر صہبائی

دوستوسکی کا ایک خط

ڈوسٹوؤسکی ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوا اور اس نے سینٹ پیٹرز برگ کے انجینئرنگ کالج میں تعلیم حاصل کی تعلیم سے فارغ ہونے پر اُسے ملازمت مل گئی لیکن چونکہ اس کو طبعًا ادبیات سے لگاؤ تھا وہ جلد ہی ملازمت سے مستعفی ہو کر تصنیف کے کام میں مشغول ہو گیا۔

اس کا پہلا ہی ناول (غریب لوگ) اس قدر مقبول ہوا کہ لوگ اسے "نیا گوگل" کہنے لگے۔

۱۸۴۹ء میں جب وہ بالکل نوجوان تھا زار کی حکومت نے اس پر سازش کا الزام عائد کیا اور وہ جلا وطن کر کے سائبیریا بھیج دیا گیا جہاں سے وہ دس سال کے بعد واپس آیا۔ سائبیریا کے تجربات سے اس نے قید کی زندگی کے متعلق ایک کتاب لکھی جو اس کی طبیعت، اس کے فلسفے اور اس کی روحانیت کی آئینہ دار ہے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ اس کے تمام ناولوں میں قید اور جبر و استبداد کی ان مصیبتوں کے گہرے نقوش موجود ہیں۔

ڈوسٹوؤسکی کی تصانیف میں جہانِ ٹالسٹائی " بااعر حنیف کی سی فنی تکمیل نہیں ہاں وہ نفسیاتی تجزیہ اور مطالعۂ کردار کے لحاظ سے اپنا جواب بھی نہیں رکھتیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی کتابیں نفسیاتی فلسفے کے بعض مابعد انکشافات کی نقیب ہیں

۱۸۸۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔ (حامد علی خاں)

دوستوسکی کی تصانیف، علم، اخلاق، فلسفے اور مذہب کے نقطۂ نظر سے بہت بلند پایہ اور بیش بہا ہیں وہ محض قصّے کہانیاں نہیں ہیں، محض انسانی زندگی کی حقیقت نما تصاویر نہیں ہیں ان کا شمار فی الحقیقت ان الہامی کتابوں میں ہونا چاہیئے جنہوں نے ایک قوم کے جاں بلب عقیدوں اور حوصلوں میں جان ڈال کر ویرانوں کو آباد کیا ہے اور ایک نئی دنیا تعمیر کی ہے۔ ایک انگریزی نقاد کا خیال ہے کہ " دوستوسکی نے فنِ ناول نویسی کا خاتمہ کر دیا " اور یہ اس اعتبار سے بالکل صحیح ہے کہ دوستوسکی نے اپنے ناولوں میں جو مقاصد پیش نظر رکھے ان سے بڑھ کر حوصلہ کرنا ناول نویس کے لئے ممکن نہیں۔

دوستوسکی انسانی نفسیات کا ماہر تھا وہ خود اپنی تصنیف میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ " میں انسانی نفسیات کی تہ تک پہنچ کر انہیں قلم کی ایک جنبش سے بیان کر جاتا ہوں " مشہور مفکر نطشے کے الفاظ ہیں کہ " میں نے نفسیات کا علم دوستوسکی سے سیکھا ہے "۔

دوستوسکی کے پلاٹ سب اُلجھے ہوئے ہیں۔ اکثر جگہ اس نے معمولی باتوں کو جو ناول کے موضوع سے کوئی خاص تعلق

ڈوسٹووسکی

نہیں رکھتیں ۔ بہت بے جا طوالت دے دی ہے۔ اس کے بیان میں ایک ہذیانی کیفیت ہے۔ خالص ادبی خوبیوں کا اُس کے یہاں نام تک نہیں۔ اس کی تمام کتابوں میں شاید ہی دو چار ایسے جملے ملیں جو پیچیدہ نہیں ہیں۔ اور الفاظ کے انتخاب میں اس نے عام طور پر فصاحت کا خون کیا ہے"۔

دوستووسکی کی سیرت پر غور کرتے وقت دو باتوں کا خیال رکھنا ازبس ضروری ہے کیونکہ ان کا اس کے فلسفۂ حیات سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ایک تو موت سے وہ مڈبھیڑ جب اس کے قتل کا حکم دیا گیا تھا۔ دوسرے مرگی کا مرض جس کے پہلے دورے سائبریا میں پڑے۔ موت سے مڈبھیڑ کا قصہ دوستووسکی نے اپنے بھائی کو ایک خط میں لکھا ہے۔ اس خط کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ دوستووسکی کے بیشتر خطوط کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ اگر قارئین روس کے اس مایۂ ناز مفکر کے مکتوبات سے دلچسپی رکھتے ہیں تو ہم فرصتِ آئندہ میں اُن خطوں کا ترجمہ پیش کرنے کی سعی کریں گے جو اس نے مشہور شاعر میکوف کو لکھے ہیں:۔

پیٹر اینڈ پال فورٹرس

۲۲- دسمبر ۱۸۴۹ء

میرے بھائی، میرے رفیق! اب آخری فیصلہ ہو گیا ہے! مجھے چار سال قید بامشقت کی سزا کا حکم سنا دیا گیا ہے۔ آج ۲۲ دسمبر کو ہمیں سیمی نوف ڈرل گراؤنڈ[1] میں پہنچایا گیا۔ ہم نے صلیب کو بوسہ دیا اور اس کے بعد ہمیں وہ سفید قمیصیں پہنا دی گئیں جو ہمارا کفن ہونے والی تھیں۔ ہم میں سے تین موت کے ستون سے باندھ دیئے گئے۔ میں صف میں چھٹا تھا۔ ہم تین تین کر کے مارے جانے والے تھے۔ اس لئے میری باری لازماً دوسرے تینوں میں تھی۔ میری زندگی اور موت میں صرف چند[2] لمحے باقی تھے۔ اس وقت میرا دل تمہاری اور تمہارے بیوی بچوں کی یاد سے معمور تھا۔ ان آخری لمحات میں میرے عزیز بھائی، تمہاری اور صرف تمہاری یاد مجھے ستا رہی تھی۔ دفعتہً سپاہیوں کو (جو گولی چلانے والے تھے) واپسی کا حکم ملا۔ اور وہ تینوں جو ستون کے ساتھ بندھے ہوئے تھے کھول دیئے گئے۔ اس کے بعد ہمیں زار کا فرمان پڑھ کر سنایا گیا جس میں اس نے ہماری جان بخشی کی تھی۔ اب سزائے موت چار سال کی قید میں تبدیل کر دی گئی ہے۔ صرف پام کو رہا کیا گیا ہے جو فوج میں

---

[1] ایک مقام جہاں عموماً مجرموں کو گولی کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔

[2] دوستووسکی کے ساتھیوں میں سے ایک منجمد کر دینے والی سردی اور موت کے لرزے کی تاب نہ لا کر پاگل ہو گیا۔ خود دوستووسکی کی کیفیت جنون سے کچھ کم نہ تھی۔ ان چند لمحوں میں جبکہ وہ موت کے کھلے ہوئے جبڑوں میں جا رہا تھا اس کے دل پر جو کچھ گذری وہ اس نے کئی ناولوں میں ضمناً بیان کی ہے۔ دوستووسکی کا فلسفۂ حیات اور اس کے احساسات اس ہولناک واقعے کے بعد کبھی ایک طبعی انسان کے سے نہیں ہو سکتے تھے۔

اپنے پُرانے عہد میں دوبارہ جا سکتا ہے ؎

عزیز بھائی! مجھے ابھی ابھی معلوم ہؤا ہے کہ آج یا کل ہمیں یہاں سے بھیجا جا رہا ہے۔ میں نے تم سے ملنے کے لئے استدعا کی مگر جواب ملا کہ یہ ناممکن ہے۔ مجھے صرف یہ خط لکھنے کی اجازت ہے۔ سو اس کا جواب مجھے جلد از جلد دینا ؎

جب ہم سیمی نوف گراؤنڈ میں پہنچائے جا رہے تھے میں نے اُس وقت حوالات کی گاڑی کی کھڑکیوں سے لوگوں کا ایک جمِ غفیر دیکھا۔۔۔۔۔۔ شاید میری موت کے حکم کی خبر تمہارے کانوں تک بھی پہنچ چکی ہے۔ اور تمہیں بہت صدمہ ہؤا ہے لیکن اب تمہیں مطمئن ہو جانا چاہیئے۔ برادرِ عزیز میں بالکل افسردہ نہیں ہوں اور نہ میں نے غم کو اپنے پاس پھٹکنے دیا ہے۔ زندگی ہر جگہ زندگی ہے۔ زندگی وہی ہے جو ہمارے اندر ہے نہ کہ وہ جو باہر ہے ؎

میرے ہمراہ اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے۔۔۔۔۔۔ عوام کے درمیان معمولی انسان کی حیثیت میں رہنا، ہمیشہ اس طرح زندگی بسر کرنا اور مصائب کی پروا نہ کرنا۔۔۔۔۔۔ یہ ہے زندگی۔۔۔ یہی ہے زندگی کا اصل مقصد میں اس چیز کو بخوبی سمجھ چکا ہوں۔ یہ خیال میرے گوشت پوست، رگ رگ اور نخ نخ میں سرایت کر گیا ہے۔ اور یہ بالکل صداقت پر مبنی ہے ؎

وہ سر جو تخیلات کی تخلیق کرتا تھا۔ جو آرٹ کی رفعتوں میں اپنا مسکن بنائے ہوئے تھا اور جو روح کی بلند ترین ضروریات سے آگاہ اور ان کا عادی تھا۔۔۔۔۔۔ وہ سر اب میرے شانوں سے علیحدہ ہو چکا ہے۔ وہاں ان تخیلات کے دھندلے آثار باقی ہیں جو میں صفحۂ قرطاس پر منتقل نہیں کر سکا ہوں۔ یہ افکار میرے ذہنی عذاب کا ضرور باعث ہوں گے۔ یہ حقیقت ہے لیکن میرے دل میں ابھی تک وہ خون اور گوشت موجود ہے جو محبت بھی کر سکتا ہے۔ مصیبت بھی جھیل سکتا ہے۔ خواہش بھی کر سکتا ہے اور آخر یہی تو زندگی ہے۔۔۔۔۔۔ بھائی، لو اب الوداع! میری خاطر اب دل کو رنجیدہ نہ کرنا!

اب میں چند ضروری باتوں کی طرف پلٹتا ہوں۔ گرفتاری پر میری کتابیں اور مسودوں کے بہت سے پریشان اوراق جن میں "بچے کی کہانی" کے عنوان سے ایک مکمل افسانہ بھی شامل ہے مجھ سے لے لئے گئے تھے۔ یہ تمام چیزیں غالباً تمہیں مل جائیں گی میں یہاں اپنا بڑا کوٹ اور پرانے کپڑے چھوڑے جاؤں گا تم انہیں منگوا لینا ؎

برادرِ عزیز، مجھے بہت طویل سفر کرنا پڑے گا۔ اس لئے روپوں کا میرے پاس ہونا ازبس ضروری ہے۔ یہ خط دیکھتے ہی اگر تم انتظام کر سکو تو مجھے فوراً کچھ روپے روانہ کر دو۔ ہاں، خط ضرور لکھنا۔ اس کے علاوہ اگر تمہیں ماسکو سے کچھ روپیہ آئے تو دیکھنا مجھے فراموش نہ کر دینا۔ بس مجھے یہی کہنا تھا!۔۔۔۔۔۔ میں مقروض ہوں لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟

بچوں کو پیار اور ان کی والدہ کو سلام۔ اُن کے دلوں میں میری یاد تازہ رکھنے کی کوشش کرتے رہا کرو۔ یہ خیال رکھنا کہ وہ کہیں مجھے بھول نہ جائیں اس لئے کہ ہم شاید پھر ایک بار ملیں گے۔ میرے عزیز بھائی، اپنی اور اپنے اہل و عیال کی پوری طرح خبرگیری

کرنا۔ تمہیں اطمینان اور سکون سے زندگی بسر کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اپنے بچوں کے مستقبل کا خیال ہر وقت تمہارے پیش نظر رہے
ان دنوں میری روح جان بخش روحانیت سے معمور ہے۔ مجھے ایسا پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا کیا میرا جسم آنے والی صعوبتوں کو جھیل
سکے گا؟ اس سوال کا جواب مجھے معلوم نہیں۔ میں یہاں سے بیماری کی حالت میں جا رہا ہوں۔ مجھے خنازیر کی شکایت ہے لیکن پھر
کیا ہے۔ برادر عزیز، میں پہلے ہی سے دنیا میں اتنے مصائب سے دوچار ہو چکا ہوں کہ اب مجھے کوئی چیز خوفزدہ نہیں کر سکتی۔ جو کچھ
ہونا ہے بصد شوق ہو لے!

جس وقت مجھے موقع ملا میں فوراً تمہیں اپنے متعلق لکھوں گا۔ میکوفوں کو میری طرف سے الوداع اور سلام عرض کرنا میں
ان کا بہت ممنون ہوں کہ وہ میری قسمت میں بہت دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ یوجینیا پطروف کا میری طرف سے نہایت خلوص سے شکریہ ادا کرنا
میں اس کی صحت اور خوش بختی کے لئے دست بدعا ہوں۔ محترمہ کی یاد میرے دل میں تادم آخر زندہ رہے گی۔

نکولی اپولونووچ، اپولون میکوف اور دیگر احباب کی خدمت میں سلام شوق۔ یانوفسکی سے مل کر اس کو بتانا کہ میں اس کا تہ دل
سے ممنون ہوں۔ ان سب حضرات کی خدمت میں جنہوں نے مجھے فراموش نہیں کیا میرا سلام پہنچا دینا اور جو مجھے بھول چکے ہیں
انہیں یہ پیغام دینا کہ ان کی یاد میرے دل میں بدستور باقی ہے۔

برادرم اینڈری کو خط کے ذریعے سے میری موجودہ سزا کی اطلاع بھیج دو۔ اسی طرح چچا چچی اور بہنوں کو بھی مطلع کر دینا۔
شاید ہم ایک بار پھر ملیں۔ اس لئے میرے عزیز بھائی، خدا کے لئے اپنی صحت کا اچھی طرح خیال رکھنا۔ اس وقت تک ہمیں زندہ رہنا
چاہیئے جب ہم پھر ایک دوسرے سے ملیں گے وہ وقت ضرور آئے گا جب ہم باہم بغلگیر ہوں گے اور اپنی جوانی کے ایام کا
تذکرہ کریں گے ——— ان سنہرے ایام کا جن کی آغوش میں ہماری جوانی اور امیدیں پلی ہیں۔ جنہیں میں اس وقت اپنے دل سے
اکھاڑ کر اپنے خون کے ساتھ یہاں دفن کئے جا رہا ہوں۔

کیا یہ صحیح ہے کہ اب میرے ہاتھ قلم کو ترستے رہیں گے؟ میرا خیال ہے کہ شاید چار سال کے بعد مجھے قلم پکڑنا نصیب ہو۔ میں تمہیں
ہر وہ سطر بھیجوں گا جو میرے قلم سے نکلے گی۔ اے کاش مجھے صرف لکھنے کی اجازت دے دی جائے!! کتنے افکار، کتنے تخیلات
جو میں نے تخلیق کئے تھے تباہ ہو جائیں گے! اب میرے ذہن کی یہ چنگاریاں یا تو بجھ جائیں گی۔ یا رگوں میں زہر بن کر حلول کر جائینگی
ہاں! اگر مجھے لکھنے کی اجازت نہ دی گئی تو میں یقیناً برباد ہو جاؤں گا ——— مجھے پندرہ سال کی قید منظور ہے اگر قلم میرے ہاتھ
میں رہنے دیا جائے!

---

۵۱ مشہور روسی شاعر میکوف کی والدہ۔
۵۲ میکوف کا باپ۔

مجھے خط ضرور لکھتے رہا کرنا۔ خط مفصل اور واقعات سے لبریز ہوں - ہر خط میں گھر کے متعلق پوری تفصیل ہو۔ یعنی معمولی سے معمولی واقعے تک کا ذکر ہو۔ دیکھنا کہیں بھول نہ جانا، ایسی تفصیلات میرے لئے امید افزا، اور جان بخش ثابت ہوں گی - یہاں قلعے میں تمہارے خطوط مجھے بہت تازگی اور فرحت بخشتے تھے۔ اڑھائی مہینے کا یہ طویل عرصہ جس میں خط لکھنے اور خط وصول کرنے کی ممانعت تھی کس قدر صبر آزما تھا ——— میں تمام عرصہ علیل رہا!

تمہارے روپے نہ بھیجنے پر مجھے سخت فکر لاحق رہتی تھی۔ اس کے بظاہر یہ معنی تھے کہ تم خود اپنی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے بچوں کو ایک بار پھر پیار اور دُعا۔ ان کے ننھے حسین چہرے ایک منٹ کے لئے میری آنکھوں سے جدا نہیں ہوتے۔ میری آرزو ہے کہ ان کا مستقبل منور اور پُر از مُسرّت ہو۔ میرے بھائی، خدا تمہیں بھی خوش و خرم رکھے*

خدا کے واسطے میرے لئے اپنے آپ کو ہرگز مغموم نہ کرنا، یقین رکھو میں بالکل ملول نہیں ہوں۔ میں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ وقت دُور نہیں جب ہم پھر ایک دوسرے سے ملنے والے ہیں۔ آج میں مَوت کے سر پنجوں میں تھا لیکن اسی ایک خیال نے مجھے اس کی گرفت میں بھی زندہ رکھا۔ میرے آخری لمحات قریب تھے لیکن دیکھ لو میں اس وقت زندہ ہوں*

اگر کوئی شخص میرے متعلق اپنے دِل میں کدُورت رکھتا ہے، میں نے کسی سے کبھی جھگڑا کیا ہے، یا میں نے کسی کے دل پر اپنا بُرا اثر چھوڑا ہے تو اس سے ملو اور میری طرف سے التجا کرو کہ وہ مجھے معاف کر دے۔ میرے دِل میں ذرّہ بھر میل نہیں ہے۔ اس وقت میری یہی خواہش ہے کہ میں اپنے احباب میں سے کسی کے گلے ملوں اس سے دِل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ موت سے پہلے اپنے عزیزوں کو الوداع کہتے وقت میں یہ بات محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت میرا یہ خیال تھا کہ میری مَوت کی خبر تمہیں ہلاک کر دیگی لیکن اب تمہیں کوئی فکر نہیں کرنی چاہیئے۔ میں زندہ ہوں اور اس وقت تک زندہ رہوں گا جب ہم دوبارہ بغلگیر ہوں گے۔ اب صرف یہی خیال میرے دِل میں آباد ہے*

تم میری غیر موجودگی میں کیا کرتے رہے ہو؟ آج تم کیا سوچتے رہے ہو؟ ——— کیا تمہیں ہمارے متعلق کچھ علم ہے؟ ——— اُف، آج کس غضب کی سَردی تھی۔

کاش، میرا خط تمہارے پاس جلد پہنچ جائے ورنہ مجھے کامل چار مہینے تک تمہارے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکے گا۔ گذشتہ دو مہینوں کے دَوران میں جن لفافوں میں تم نے روپے روانہ کئے تھے وہ میں نے دیکھے ہیں۔ اُن پر تمہارے ہاتھ کا لکھا ہُوا پتہ ظاہر کرتا تھا کہ تم بخیر و عافیت ہو۔

جب میں ماضی کی طرف رُخ پھیر کر یہ دیکھتا ہوں کہ بہت وقت فضول ضائع ہُوا ہے۔ بیشتر ایام خوابوں، غلط کاریوں اور بیکاری میں گذرے ہیں اور میں نے متعدد بار اپنے ضمیر کے خلاف کام کیا ہے تو میرا دل خون روتا ہے*

زندگی نعمت ہے، زندگی مسرّت ہے! ہر وہ لمحہ جو ضائع ہو چکا ہے شادماں عرصۂ زندگی ہونا چاہیئے تھا!! اب کہ میں اپنی

زندگی بدل رہا ہوں مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میری روح نئے قالب میں داخل ہو رہی ہے۔ برادرِ عزیز! مَیں سچ کہتا ہوں کہ میں ہرگز ناامید نہ ہوں گا۔ میں اپنی روح اور دل کی پاکیزگی برقرار رکھوں گا۔ میں اگر نیا قالب اختیار کر رہا ہوں تو یہ تبدیلی یقیناً بہتر ہوگی ——— یہی میری واحد امید اور یہی میری واحد تسکین ہے!

جیل کی زندگی نے پہلے ہی سے میری خواہشات جسمانی کو جو ناپاک تھیں تقریباً بالکل برباد کر ڈالا ہے۔ اب مصائب مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے تمہیں اندیشہ نہیں کرنا چاہیئے کہ مجھے کوئی مادی تکلیف ہلاک کر دے گی ——— یہ نہیں ہو سکتا! ——— آہ! صحت اور تندرستی!!

خدا جانے میں تمہیں پھر کب خط لکھ سکوں گا! بہرحال میں تمہیں اپنے سفر کی پوری تفصیل روانہ کروں گا۔ اگر میں صرف اپنی صحت کو برقرار رکھ سکا تو سب کچھ درست ہو جائے گا!

الوداع، الوداع میرے بھائی! میں ——— سے عالم تصور میں بغلگیر ہوتا ہوں۔ تمہارا بوسہ لیتا ہوں۔ مجھے یاد رکھنا لیکن اپنی یاد کے ساتھ غم کی آلائش نہ ہو۔ میں پھر التجا کرتا ہوں کہ خدا کے لئے میری خاطر اپنے آپ کو ہرگز ہرگز مغموم نہ کرنا ——— میں دوسرے خط میں اپنے متعلق لکھوں گا +

اب جو کچھ میں نے کہا ہے وہ تمہیں یاد رکھنا چاہیئے۔ اپنی زندگی کا ایک نقشہ تیار کر لو۔ ایک لمحہ بھی فضول ضائع نہ کرو۔ اپنے بچوں کے مستقبل کا تمہیں ہر وقت خیال رکھنا چاہیئے ——— کاش میں تمہیں صرف دیکھ سکوں ——— ان آنکھوں سے دیکھ سکوں!!

خدا حافظ! لو اَب میں ہر اُس چیز سے جدا ہوتا ہوں جو مجھے عزیز ہے۔ یہ جدائی کس قدر دردانگیز ہے! خود کو دو ٹکڑے کر دینا۔ دل کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا کس قدر غم افزا ہے! الوداع، الوداع! میں تم سے پھر ملوں گا ——— اس کا مجھے یقین ہے، کامل وثوق ہے۔ میں امید کا دامن تھامے ہوئے ہوں۔ دیکھنا بدل نہ جانا۔ مجھ سے محبت کرتے رہنا۔ اپنے دل میں میری محبت کو کبھی سرد نہ ہونے دینا۔ تمہاری محبت کا خیال میری زندگی کا سب سے عزیز حصہ ہوگا۔ الوداع، ایک بار پھر الوداع! سب کو الوداع!!

تمہارا بھائی

فیودر دوستووسکی

۲۲ دسمبر ۴۹ ۱۸ء

گرفتاری پر میری بہت سی کتابیں لے لی گئی تھیں۔ ان میں صرف دو ممنوعہ کتب ہیں کیا تم باقی اپنے لئے حاصل نہ کرلوگے؟ لیکن ایک بات کا خیال رہے کہ ان میں ایک کتاب "The works of Valerian Markov" یوجینیا بطروف کی ملکیت ہے۔ میں نے اس سے مستعار لی تھی۔ گرفتاری کے وقت میں نے پولیس افسر سے کہا تھا کہ یہ کتاب اس کی مالکہ کو پہنچا دی جائے

چنانچہ اس غرض کے لئے میں نے پتہ بھی لکھوا دیا تھا۔ معلوم نہیں یہ کتاب اُسے مل چکی ہے یا پولیس والوں کے ہاں پڑی ہے۔ تم اس کے متعلق اچھی طرح دریافت کر لینا۔ میں نہیں چاہتا کہ تریچینیا کی یہ عظیم الشان یادگار چھن جائے۔ خدا حافظ ۔۔ الوداع!

تمہارا بھائی
الیف دوستوو سکی

معلوم نہیں ہمیں پیدل سفر کرنا پڑے گا یا گھوڑوں پر جانا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ ہم گھوڑوں پر ہی سفر کرینگے۔ شاید!
اپنی بیوی سے ایک بار پھر میرا سلام کہو۔ بچوں کو پیار۔ کریو یوسکی کو سلام شوق ۔۔ شاید.......
اپنی گرفتاری۔ قید اور رہائی کے متعلق پوری تفصیل لکھو۔

کفایت علی خاں قادری

رادھا کا گیت

پیتم میں تم سے کیا مانگوں
جیون کی آشاؤں کے پھول
یا پریم کی مرجھائی ہوئی کلیاں
ستاروں نے رو رو کر چندرماں سے پریم کی کرنیں مانگ لیں
کوئل نے رُوٹھ رُوٹھ کر بہار سے آنسوؤں کے ہار مانگ لئے
پیتم میں تم سے کیا مانگوں
جیون کی آشاؤں کے پھول
یا پریم کی مرجھائی ہوئی کلیاں

عظیم قریشی

بقیہ نظم یادگارِ حالی جوبلی

گزشتہ مہینے جب کاپیاں پریس میں جاچکی تھیں حضرت احسن مارہروی کے مسدس کا تتمہ موصول ہوا تھا جو افسوس ہے کہ مسدس کے ساتھ شامل نہ ہو سکا۔ حالی کے صد سالہ جشنِ ولادت کے موقع کے لئے ان اشعار کا خاص طور پر اضافہ کیا گیا تھا۔ "ھمایوں"

ہے یہی سکۂ حالی کے چلانے کی سبیل — ملک وملت کے محبوں نے کیا ہے جو اپیل
تا باقوال نہ محدود رہے یہ تخئیل — بلکہ ہو بالعمل اس کام میں سعیِ تکمیل
کوئی تدبیر اگر وقت پہ چل جائے گی
کام بن جائے گا تقدیر سنبھل جائے گی

عزمِ راسخ ہے تو مفہومِ عزیمت سمجھو — نہ مشقت کی طوالت کو ہزیمت سمجھو
وقت کی قدر کرو وقت کی قیمت سمجھو — مغتنم ہے یہ گھڑی اس کو غنیمت سمجھو
کی ہے گھر بیٹھے عطا تم کو خدا نے دولت
صدر ہیں والیٔ بھوپال سکندر صولت

یہ صدارت طرب افزا بھی ہے مسعود بھی ہے — اس سے وابستہ تمنا بھی ہے بہبود بھی ہے
اور الطافِ گراں مایہ کی افزود بھی ہے — کہ وہ دریا بھی ہے اور گوہرِ مقصود بھی ہے
لطف ہو جائے اگر صدرِ فلک رفعت کا
تال بھوپال کا میدان ہو پانی پت کا

احسن اب بہرِ طلب ہاتھ اٹھا، مانگ دعا — کہ رئیس اور ریاست پہ رہے فضلِ خدا
جب تک افلاک پہ تابندہ ہیں ناہید و سہا — اوجِ اقبال رہے سایہ فگن مثلِ ہما
جتنے ہیں حالی موالی وہ کہیں سب آمیں
یادگار آج کی قائم رہے تا دورِ زمیں

احسن

نمبردار

چاند سنگھ نے گرج کر کہا۔" پہلے میرے کھیت کو پانی دیا جائے گا۔ اور پھر باقی کسان باری باری لے لیں گے۔"
سارے کسان ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ کسی کو اتنی ہمت نہ پڑی کہ منہ سے ایک حرف بھی نکال سکتا۔ گو وہ دل سے یہ نہیں چاہتے تھے کہ سب سے پہلے چاند سنگھ کے کھیتوں کو پانی دیا جائے۔
وہ پھر ذرا تیزی سے بول اُٹھا۔" چپ کیوں ہو گئے ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟ آدمی نہیں ہو کیا؟"
کسانوں نے آہستہ سے کہا "جیسا حکم ہو نمبردار جی!"
نمبردار گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اور گاؤں کی طرف چل دیا۔
پنجو لال اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ نمبردار کے ظلم کے خلاف وہ دل ہی دل میں کڑھتا تھا لیکن کچھ پیش نہ چلتی تھی۔ چاند سنگھ نے اپنے جادو سے ہر ایک کو مطیع کر رکھا تھا۔
نمبردار کے چلے جانے کے بعد اس نے کسانوں کو پاس بلایا اور کہا:" یہ نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔ پانی پہلے کسانوں کے کھیتوں کو دیا جائے گا اور پھر نمبردار کے کھیتوں کو۔"
اس پر ایک کسان نے طنزاً کہا۔" اس کے آگے کیا تمہاری زبان بند تھی جو اب ڈینگیں مارتے پھرتے ہو؟"
پنجو لال نے غصہ میں کہا۔" میں تم سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ جبھی اس کے سامنے چپ رہا۔ لیکن اب ظلم کی ہو گئی ہے اور کوئی کسان اسے برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ خواہ اس میں کسی کی جان پر ہی کیوں نہ بن جائے۔"
ایک کونے سے دو تین کسانوں نے کہا۔" تم ابھی بچے ہو پنجو۔ چاند سنگھ کے ساتھ ٹکر لینا آگ کے ساتھ کھیلنا ہے۔ ایسی بات ہو جائے تو وہ ہماری کھال کھچوا دے۔"
پنجو لال نے کہا۔" کھال کھچوانے کے لئے میں آگے بڑھا ہوں۔ جس طرح میں تم سے کہوں گا۔ اسی طرح کرو گے۔ تو عمر بھر چین کی بنسری بجاؤ گے۔ نہیں تو جب تک چاند سنگھ کی نمبرداری ہے تمہارے سر پر لاٹھی اور ہمارے نام کے ساتھ گالی لگی رہے گی۔ کہو کیا چاہتے ہو عزت یا غلامی" ؟ سب کسان ایک زبان ہو کر بولے۔" عزت کون نہیں چاہتا لیکن جو ہی بات ہے۔ سو ہی ہے ——————"
پنجو لال نے کہا۔" تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں ہر ایک مصیبت سر پر لینے کو تیار ہوں۔ لیکن تم استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ اب چاند سنگھ ہم پر زیادہ دیر اپنا ظلم جاری نہیں رکھ سکتا۔ آتش فشاں پہاڑ کی چوٹی پر بنائی ہوئی حویلی زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی۔"

چاندسنگھ کی نمبرداری سارے ضلع میں مشہور تھی۔ اس کا نام سُن کر بڑے بڑے شیروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ گاؤں میں ایک بھی ایسا کسان نہ تھا۔ جسے چاندسنگھ سے نہ پچھاڑا ہو۔ ایک بھی ایسی عورت نہ تھی جس کا اس نے مذاق نہ اُڑایا ہو۔ اور اس پر بھی کسی کی کیا مجال تھی کہ چاندسنگھ کی شکایت کرتا۔ چاندسنگھ راتوں رات اس کا گھر نہ جلا دیتا؟

اس کی دیدہ دلیری کی صرف ایک وجہ تھی۔ وہ افسروں کو ہر طرح سے خوش رکھتا تھا۔ کسی کو روز اس کے ہاں سے ڈالی جاتی تھی۔ کسی کو زندہ چکور پیش کر کے خوش کرتا۔ کسی کو شیر کی کھال سے راضی کرتا۔ ان باتوں سے پولیس اور تحصیل وغیرہ کے تمام افسر اس کے مدّاح تھے۔ چپراسی منتیں کر کے اس کے گاؤں میں سمن لے کر جاتے۔ ناممکن تھا۔ کہ چاندسنگھ اُن کی مٹھی گرم کئے بغیر انہیں لوٹا دیتا لیکن کون جانتا تھا کہ وہ چیز جو اُسے ہر ایک کی آنکھوں پر بٹھا دیتی تھی، جو اس کے ظلم و تشدد کی پردہ دار تھی، کن بے زبانوں کے خون کا نچوڑ ہے؟

پنجو لال کے کہنے پر کسانوں نے تہیہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو، چاندسنگھ کی نمبرداری قبول نہیں کریں گے۔ اور شام کو جب تمام کھیتوں میں رات آ کر لیٹنے لگی اور ندی سیں سیں کرتی جانے لگی۔ پنجو لال اپنے گھر سے نکلا۔ ایک ایک کر کے ہر ایک کسان کے گھر گیا اور سب سے کہا "میرے ساتھ ہو لو۔ اپنے کھیتوں کو پانی سے بھر لو۔ لیکن کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ کوئی بھی اس کے ساتھ جانے پر راضی نہیں ہوا۔ سب کہتے لگے "صبح جب نمبردار اپنے کھیتوں میں پانی نہیں دیکھے گا تو کیا ہوگا۔ "ہم کون اپنی ماں بہن کی رسوائی کرائے گا۔ کون اپنے ہی چراغ سے اپنے ہی گھر کو آگ لگوائے گا۔"

لیکن یہ سُن کر بھی پنجو لال کی ہمت نہ ٹوٹی۔ وہ اسی اندھیری رات میں کھیتوں کی طرف جا نکلا۔ اور ندی کے پانی کو کسانوں کے کھیتوں میں لے جانے لگا۔ جب ایک کھیت پانی سے بھر جاتا۔ دوسرے کھیت میں بھر دیتا۔ وہ بھر جاتا تو تیسرے کھیت میں بھر دیتا اور اسی طرح پتہ نہیں وہ اکیلا رات بھر میں کتنے کھیتوں کو پانی سے بھر چکا۔

صبح سویرے سارے کسان اپنے اپنے کھیتوں کی طرف آنے لگے۔ اپنے اپنے کھیت پانی سے بھرپور دیکھ کر کچھ خوش بھی ہوئے اور کچھ گھبرائے بھی پنجو لال انہیں دیکھ کر مسکرایا ---- اور کہا "اب مونچھوں پر تاؤ دیتے پھرتے ہو۔ کل کی بات شاید بھول گئے تھے رات کو!"

اُن میں سے ایک بوڑھے کسان نے کہا "یہ بیٹا اچھا نہیں کیا۔ چاندسنگھ کو خبر ہوگی تو خدا جانے کیا کر بیٹھے گا۔ تعجب نہیں اگر کچّی فصل ہی کھیتوں سے اکھڑوا دے۔ میں اس کی رگ رگ پہچانتا ہوں۔ نمبردار کیا ہے آگ کا شعلہ ہے"!

پنجو لال نے مسکرا کر کہا۔ دیکھا جائے گا کیا کرتا ہے۔ تم تو صاف بچ نکلے ہونا"؟

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ چاندسنگھ ایک اونچے گھوڑے پر آتا ہوا دکھائی دیا۔ کسان اسے دیکھ کر جہاں کھڑے تھے وہیں جم گئے اور ان کے دل مارے خوف کے دھک دھک کرنے لگے۔

دو تین کسان آگے بڑھے اور گھوڑا تھاما۔ چاندسنگھ گھوڑے سے اُترا کھیتوں کو دیکھ کر کہنے لگا "اوہو یہ تو سب پانی سے

دیئے گئے ہیں رات بھر پانی بھرتے رہے کیا؟"
کسانوں نے کوئی جواب نہ دیا +
چاند سنگھ آہستہ آہستہ اپنے کھیتوں کی طرف جانے لگا اور کسانوں کا خون رگوں میں منجمد ہونے لگا۔
اپنے کھیت سوکھے دیکھ کر حیران ہو گیا۔ آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ للکار کر پوچھا "ارے میرے کھیت ویسے کے ویسے
ہیں اور تمہارے کھیت پانی میں نہا رہے ہیں۔ میں نے نہیں کہا تھا پہلے میرے کھیتوں میں پانی بھرنا۔ یہ کس کی شرارت ہے؟"
پنجو لال نے آگے بڑھ کر کہا "آپ کے کھیتوں کو بھی پانی دیا جائے گا۔ نمبردار جی۔ ذرا ہم غریبوں کے کھیت بھر جائیں تو ــــ"
چاند سنگھ نے کہا۔ اچھا یہ بات ہے پہلے تم لوگوں کے کھیت اور پھر نمبردار کے ــــ اتنی جرأت! ابھی مزا چکھا دیتا ہوں"
پنجو لال نے کہا "کیا ہمیں اتنا بھی حق نہیں کہ عمر میں ایک دفعہ پہلے اپنے کھیتوں کو پانی دیں اور پھر آپ کے کھیتوں کو
رات کو ان کھیتوں میں پانی نہ بھرا جاتا تو گاؤں کا گاؤں اجڑ جاتا۔ تمام کھیت سوکھ رہے تھے آپکے کھیتوں کی یہ حالت نہ تھی"
چاند سنگھ نے گرجتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے تم نے دو چار لفظ اُلٹے سیدھے پڑھ لئے ہیں اور یہ اُنہی کا فتور ہے۔
ن میرا نام بھی چاند سنگھ ہے۔ سارا پرگنہ میرے نام سے لرزتا ہے"
اس کے بعد اس نے اپنا ہنٹر اُٹھایا اور پنجو لال کی طرف بڑھ کر اس زور سے چلانے لگا کہ سب کسان لرزنے لگے۔ اور جب
ڑ چلانا بند کر دیا اور جانے لگا تو پنجو لال بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا تھا +
کسانوں نے اس کے جانے کے بعد ایک دوسرے سے دبی زبان میں کہا۔ ہم نے چھوکرے سے نہ کہا تھا کہ چاند سنگھ سے
لینا خالہ جی کا گھر نہیں"
لیکن چاند سنگھ کے پنجو لال کو پیٹنے سے ایک عجیب بات ہوئی۔ وہ سب کسانوں کی ہمدردی کا مرکز بن گیا۔ گاؤں کے
ڑھے جوان عورتیں اور بچے چاند سنگھ کے خلاف بھڑک اُٹھے۔ پنجو لال کیا پٹا گیا۔ گاؤں میں آگ سی لگ گئی۔ جس میں
بنے اپنے آپ کو جھلستے ہوئے محسوس کیا۔ شام کو ہر گھر میں اسی بات کا چرچا رہا۔ سب کہنے لگے "چاند سنگھ کون ٹھہرا
کھیتوں میں پانی دینے کے لئے پنجو کو ادھ مُوا بنا دے۔ آخر انصاف کہیں بھی نہیں رہا +
دوسرے دن پنجو لال ہوش میں آیا۔ اس نے دیکھا کہ سارا گاؤں اس کے حجرے میں ٹوٹ کر جمع ہو گیا ہے سب اُس کے اشارے پر
مٹنے کو تیار ہیں"۔ بزدل کسانوں میں جوش کی یہ فراوانی دیکھ کر اتنا خوش ہوا جیسے اسے گدی مل گئی ہو +
وہ مشکل سے کھاٹ پر اٹھ کر بیٹھا۔ اور خوشی سے کہنے لگا "اب بھی موقع ہے۔ جس طرح کہے دیتا ہوں۔ عمل کرو۔ پھر دیکھو
زت ہمارے پاؤں کس طرح چومتی ہے"

کسانوں نے کہا۔ اب جو بھی بات کہوگے، کرنے کو تیار ہیں۔ ہمیں معلوم نہ تھا۔ تمہارا دل اتنا بڑا ہے"۔

پنجو لال نے کہا۔ خیر پچھلی باتوں کو جانے دو۔ میں ایک عرضی لکھائے دیتا ہوں اسے ابھی وقت شہر پہنچا دو لیکن چاند سنگھ کو خبر نہ ہو۔

تیسرے دن گاؤں کیا تھا ایک اچھی خاصی چھاؤنی بن گیا تھا۔ ایک طرف افسروں کے خیمے لگے تھے۔ دوسری طرف پولیس والوں کی چھولداریاں تھیں۔ گاؤں کے "بچے بچے" میں جوش بھرا تھا ـــ چاند سنگھ یہ تماشا دیکھ رہا تھا اور انگلیاں دانتوں میں دباتا تھا۔ لیکن اب بھی اسے یہ امید تھی کہ سارے افسر میرے زرخرید غلام ہیں۔ مجھے کیا نقصان پہنچے گا۔ اُلٹا پنجو لال ہی باندھا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ دینے والے کسانوں کے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ دیا جائے گا۔

جو اہلکار اس سے سبب پوچھتا۔ اُسے ڈٹ کر غرور سے کہتا " یہ ایک چھوکرے کی شرارت ہے۔ جس نے کسانوں کو بھڑکا دیا ہے سب کو جہنم میں نہ پہنچاؤں تو چاند سنگھ نام نہیں صرف آپ لوگوں کی مہربانی چاہیئے"۔

لیکن جس وقت تحقیقات شروع ہوئی اس وقت کسی نے بھی نمبردار کے حق میں کوئی بات نہ کہی۔ کھاٹ پر پڑے ہوئے پنجو لال کے لئے سب کے دِل میں ہمدردی کا احساس پیدا ہوگیا تھا۔ ہر ایک کسان نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک چاند سنگھ کی نمبرداری ہے۔ ہم ایک پائی بھی لگان نہ دیں گے، خواہ ہمیں جلتی آگ میں دھکیل دیا جائے"۔

چاند سنگھ اس پر قہقہہ مارتا اور کہتا " آج تک تمہاری حفاظت نہ کرتا تو اس گاؤں میں آج اُلو بولتا۔ اسی کا بدلہ چکا رہے ہو"

لیکن بڑھتی ہوئی بے چینی کو کون روک سکتا تھا۔ یہ اس جھیل کے پانی کی طرح ہوتی ہے جس پر باندھ ٹوٹ جانے کے بعد قابو پانا مشکل ہوجاتا ہے۔ چنانچہ سارے افسر چاند سنگھ کے خلاف ہوگئے۔ اسی چاند سنگھ کے خلاف جس کی وہ چند دن پیشتر ثنا خوانی کرتے تھے۔ اب وہی چاند ان کے آگے دوست کی حیثیت میں نہیں ملزم کی حیثیت میں کھڑا تھا۔

چاند سنگھ یہ دیکھ رہا تھا اور تاؤ پر تاؤ کھا رہا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ وہ افسر جو کبھی اس کے اشاروں پر چلتے تھے ایک دن اسی کے خلاف ہو جائیں گے۔ وہ تو اپنی نذروں اور ڈالیوں کے نشے میں مست تھا۔

دوسرے دِن تحقیقات ختم ہوئی اور اسی وقت چاند سنگھ سے نمبرداری لی گئی اور نیا نمبردار کسانوں کے حسبِ خواہش پنجو لال مقرر کر دیا گیا۔ جس پر گاؤں بھر میں تالیاں پیٹی گئیں۔ شادیانے بجائے گئے۔

چاند سنگھ سے نمبرداری کیا لی گئی جیسے اس کا بیٹا مر گیا۔ اتنی سخت سزا کا اسے گمان تک نہ تھا۔ وہ اسی رات اپنے بال بچوں سمیت گاؤں سے بھاگ نکلا۔ کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ چاند سنگھ کدھر گیا۔

پنجو لال کی نمبرداری میں جو ترقی خیر پور نے کی وہ شاید ایک صدی میں بھی نہ کرسکتا۔ اس نے بڑی کوشش سے مدرسہ کھلوا دیا۔ ایک ترقی انجمن کھولدی اور ڈاک خانہ۔ تار گھر۔ شفا خانہ اور سرائے قائم کی۔ اس کے ہاں نہ کسان پانی بھرتے تھے نہ بچے کھلایا کرتے تھے

سور ڈنگر چراتے تھے نہ اس کے کھیتوں کی اس طرح نلائی کرتے تھے۔ جس طرح وہ چند سال پہلے چاند سنگھ نمبردار کے ہاں کیا کرتے تھے +

وہ ہر شام گاؤں کے پنڈال میں کسانوں کو جمع کرتا۔ زراعت کے نت نئے طریقے انہیں بتاتا۔ تعلیم اور انجمن اتحادی وایڈ سے انہیں آگاہ کرتا۔ غرض کہ بنجو لال اب گاؤں کا نمبردار ہی نہیں مانا جاتا تھا۔ بلکہ دیوتا کی طرح پوجا بھی جاتا تھا +

ایک رات وہ کھیتوں سے دیر سے آیا۔ راستے میں اس نے ایک آدمی آگے آگے جاتے دیکھا جو چھپ چھپ کر اور دیکھ کر جا رہا تھا۔ بنجو لال کو شک پڑ گیا۔ اس نے اس کو پکارا اور کہا "تم کون ہو بھئی"؟ وہ آدمی رک گیا۔ اور جب بنجو لال اس کے قریب پہنچا تو اُس نے جھٹ اس سے کہا "تم ـــ کون ہو؟"

بنجو لال نے کہا "نہیں پہچانتے۔ میں نمبردار ہوں"

اس آدمی نے ہکلاتی ہوئی آواز میں کہا ـــ "تم نمبردار ہو؟ ـــ بنجو لال؟"

بنجو لال نے کہا ۔ "ہاں ـــ کیا بات ہے ۔ تم چونک کیوں گئے؟

اس آدمی نے فوراً بنجو لال کو گلے سے پکڑا اور بغل سے ایک چھری نکال کر کہا۔ "اب زندہ نہیں جانے دوں گا۔ سات سال ہوئے تم نے مجھے اس گاؤں سے بیعزت کرا کے نکلوا دیا تھا۔ یاد ہے؟"

بنجو لال نے کہا۔ تم کون ہو؟ چاند سنگھ نمبردار تو نہیں ہو؟"

اس آدمی نے کہا "ہاں نمبردار تھا۔ لیکن اب تمہارا قاتل ہوں"

بنجو لال نے متانت سے کہا "اگر تمہیں میرے قتل سے سکون حاصل ہو گا تو لو۔ میں اپنی گردن خود جھکا دیتا ہوں جس طرح جی چاہے قتل کر دو ـــ"

لیکن چاند سنگھ کا ہاتھ خنجر اٹھاتے اٹھاتے رک گیا +

بنجو لال نے اوپر دیکھا تو چاند سنگھ رو رہا تھا +

اُس نے روتے ہوئے کہا ۔ بنجو لال میں تمہیں قتل کر رہا ہوں اور تم ـــــ"

بنجو لال نے جواب دیا "نہیں تم قتل نہیں کر رہے ہو بلکہ میں تم سے چھینی ہوئی نمبرداری کی قیمت ادا کر رہا ہوں +

پریم ناتھ رونق کاشمیری

نیند چور

میرے بچے کی آنکھوں سے نیند کس نے چرائی ؛ میں ضرور معلوم کروں گی

گگری کمر پر رکھ کر ماں قریب کے گاؤں کو پانی لینے گئی ، دوپہر کا وقت تھا ، بچوں کے کھیلنے کا وقت ختم ہو گیا تھا ، تالاب میں بطیں خاموش تھیں ، برگد کے سائے میں گڈریے کا لڑکا پڑا سوتا تھا ، آموں کے جھنڈ کے قریب دلدل میں سارس خاموش کھڑے تھے ،

اسی اثنا میں نیند چرانیوالی آئی اور بچے کی آنکھ سے نیند چرا کر بھاگ گئی ،

جب ماں واپس آئی تو اُس نے دیکھا بچہ کمرے میں چاروں طرف پھر رہا ہے ،

میرے بچے کی آنکھوں سے نیند کس نے چرائی ؛ میں ضرور معلوم کروں گی

میں اُسے گرفتار کر کے زنجیر میں جکڑ دوں گی ، میں تاریک غاروں میں تلاش کروں گی جہاں سنگریزوں پر سے ہوتا ہوا ایک چھوٹا سا جھرنا گرتا ہے۔

میں بگولوں کے مدہوش کن سایوں میں جستجو کروں گی جہاں کبوتروں کی آوازیں گونجا کرتی ہیں اور تاروں بھری راتوں میں پریوں کی پازیبوں کی جھنجھناہٹ سنائی دیتی ہے۔

شام کو بانس کے جنگلوں کی سرگوشیوں میں جھانکوں گی جہاں جگنو ضیا پاشی کرتے ہیں اور ہر ملنے والے سے پوچھوں گی ، " اگر نیند چور کا مسکن جانتے ہو تو مجھے بتا دو "

میرے بچے کی آنکھوں سے نیند کس نے چرائی ؛ میں ضرور معلوم کروں گی

کاش میں اُسے گرفتار کر لوں تو کیا ہی اچھا سبق دوں ،

میں اُس کے گھونسلے پر حملہ کروں گی اور دیکھوں گی کہ وہ چرائی ہوئی نیند کہاں جمع کرتی ہے ، میں اُسے تباہ کر دوں گی اور گھر لے جاؤنگی

میں اُس کے دونوں بازو خوب کس کر باندھ دوں گی اور دریا کے کنارے لے جا کر مچھلی کی شکار گاہ پر ناگر موتھے اور کنول کے بیچ میں چھوڑ دوں گی

شام کو جب خرید و فروخت بند ہو جائے گی اور گاؤں کے بچے اپنی ماؤں کی گود میں آ بیٹھیں گے تب رات کی چڑیاں آئیں گی اور قہقہے لگا لگا کر اُسے طعنہ دیں گی :-

"اب تم کس کی نیند چراؤ گی"

(ٹیگور)

ترجمہ سعد منیر الدین

محبت کی شام

(سانیٹ)

لبِ دریا ہے میں ہوں اور اک دوشیزۂ رعنا
قریب حجلۂ شب آگیا ہے مہرِ نور آگیں
شفق پھولی ہوئی ہے رقص میں ہے سبزۂ زریں
شرابِ حسن میں ڈوبی ہوئی تخئیل کی دنیا

ہوا ہوں میں بہشتِ رنگ و بو میں عشق کا بندہ
سرودِ موجِ بادِ نرم ہے بزمِ گل و مل میں
تبسم چہرۂ گل پر، تموج زلفِ سنبل میں
طلسمِ امتزاجِ نور و ظلمت ہے درخشندہ

سبک رو مچھلیاں سونے کے پانی میں اچھلتی ہیں
کبھی کویل کی کو کو سے دلِ وحشی تڑپتا ہے
پرندے آشیانوں میں بسیرا لینے جاتے ہیں

ٹھہر! او حسن کی دیوی! تمنّائیں مچلتی ہیں
ترا نظارۂ دلکش بہارِ روح افزا ہے
فرشتے بھی محبّت کا مقدّس گیت گاتے ہیں

محمد حسین خاں کاوش
حیدرآبادی

سلطنت عفہ کے کسی حصہ میں الیاس نامی ایک شخص رہا کرتا تھا۔ اس کے باپ نے، جو الیاس کی شادی کے ایک برس بعد انتقال کر گیا تھا اس کے لئے کوئی جائداد نہ چھوڑی۔ باپ کی موت کے وقت اس کے پاس سات گھوڑوں، دو بیلوں اور چند بھیڑوں کی قلیل پونجی تھی لیکن اس نے اس کو ترقی دینا شروع کیا۔ وہ اور اس کی بیوی صبح سے رات گئے تک محنت کرتے دوسروں سے پہلے اُٹھتے اور بعد کو بستر پر جاتے۔ جو ملتا اسی پر گذارہ کر لیتے مگر کسی سے قرض وام لینا گناہ سمجھتے۔ اس طرح اس کی پونجی سال بسال بڑھتی رہی اور اس نے کافی دولت جمع کر لی۔

پینتیسویں سال کے آخر میں اس کے پاس ۲۰۰ گھوڑے، ۱۵۰ گائیں اور ۱۲۰۰ بھیڑیں ہو چکی تھیں۔ اجرت پر کام کرنے والے مزدور اس کا کام کرتے، اور مزدور عورتیں گھوڑیاں اور گائیں دوہتیں، کوس بناتیں، پنیر اور مکھن تیار کرتیں ——— الیاس کے پاس ہر چیز کی افراط تھی اور ضلع کا ہر شخص اس کو حسد کی نگاہ سے دیکھتا، لوگ کہتے:۔

"الیاس خوش قسمت انسان ہے، اس کے پاس خدا کی تمام نعمتیں موجود ہیں، یہ دُنیا اس کے لئے یقیناً ایک دلفریب و خوشگوار جگہ ہو گی"۔

شرفا و رؤسا نے الیاس کی شہرت کا حال سُنا اور اس سے ملاقات کی۔ دُور دُور سے لوگ اس کی ملاقات کو آتے اور وہ ہر ایک کو خوش آمدید کہتا، کھانے پینے سے تواضع کرتا اور جاتے وقت دوبارہ آنے کا وعدہ لیتا۔ جب کبھی کوئی آتا اس کے لئے چائے، شربت، کوس اور گوشت تیار رہتا، جب ملاقاتی آتے ایک بھیڑ ذبح کی جاتی اور کبھی کبھی دو، اور اگر مہمانوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی تو گھوڑے ذبح کر دیئے جاتے تاکہ کھانا کم نہ پڑے۔

الیاس کے تین بچے تھے، دو لڑکے اور ایک لڑکی اور اس نے سب کی شادیاں کر دی تھیں۔ جب وہ غریب تھا اس کا لڑکا اس کے ساتھ کام کرتا، مویشی چراتا اور رات کو رکھوالی بھی کرتا۔ مگر جب سے خدا نے اسے خوشحال کیا تھا اس کے لڑکے خراب ہو گئے تھے، اب نہ وہ کام میں ہاتھ بٹاتے اور نہ گھر کے انتظام میں بوڑھے باپ کی مدد کرتے۔ جو سب میں بڑا تھا وہ شراب پینے لگا تھا، لڑکی پرائے گھر کی تھی اور چھوٹے صاحب باپ کی نافرمانی پر تلے ہوئے تھے، کہتے تھے ہمیں الگ گھر کر دو۔ لڑکا باپ سے الگ ہو گیا ——— الیاس نے بیٹے کو ایک مکان اور کچھ مویشی دے دیئے اور اس طرح اُس کی دولت

میں بٹہ لگنا شروع ہوا۔ پھر اس کی بھیڑوں کو ایک مہلک بیماری ہوگئی اور بہت سی مرگئیں، پھر ایک سال بارش بالکل نہ ہوئی اور اناج کے کھیت برباد ہوگئے، ایک سال جاڑا بہت شدید تھا اور اس میں بہت سے مویشی مرگئے، پھر سرکار کی طرف سے اس کے بہترین گھوڑے ضبط کر لئے گئے اور اس کی دولت روز بروز کم ہوتی گئی۔ اس کی جسمانی طاقت بھی کمزور ہو چلی تھی، ستر برس کی عمر تھی، مگر کوئی ہاتھ تھامنے والا نہ تھا کرتا تو کیا کرتا؟ آخر کار اس نے اپنے بیش قیمت پوستین کے کوٹ، نفیس نفیس قالین، گھوڑوں کی رکابیں اور مہمانوں کے خیمے فروخت کرنا شروع کئے مگر یہ کے دن؛ زندگی کا پیٹ اس پر بھی نہ بھر سکا اور اس کو انتہائی مصیبت سے دوچار ہونا پڑا! اس کو اپنے بقیہ مویشی فروخت کرنا پڑے اور قبل اس کے کہ وہ اس کیفیت کو سمجھتا، وہ اپنا تمام مال ومتاع کھو چکا تھا یہاں تک کہ اب اس کے اور اس کی بیوی کے لئے سوائے جسم کے کپڑوں، ایک اونی کوٹ، ایک چینی کے پیالے اور دو جوتوں کے کچھ نہ تھا، اس لئے الیاس اور اس کی بیوی کو نوکری کی تلاش ہوئی ——— لڑکا باپ سے جدا ہوکر کسی دور دراز ملک میں بس گیا تھا، لڑکی مر چکی تھی اور اس دُنیا میں اِن دونوں کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہ تھا۔

الیاس کے پڑوسی محمد شاہ کو اس پر رحم آگیا۔ محمد شاہ ایک نیک اور بے آزار شخص تھا، وہ نہ امیر ہی تھا اور نہ بالکل غریب مگر دال روٹی سے خوش اور چین سے بسر کرتا تھا۔ اسے الیاس کا گذرا ہوا زمانہ یاد تھا اور وہ اس کے ان سلوکوں کو نہ بھول سکا جو اس نے اپنے خوشحالی کے زمانے میں سب کے ساتھ کئے تھے۔ ایک دن اس نے الیاس سے کہا:-

"بابا! آؤ ہمارے ساتھ رہو، گرمیوں میں تم سے جو کام ہو سکے کر دیا کرنا، تمہاری بیوی "شام شماجی" گھوڑیوں کو دوہ کر کومس بنادیا کرے گی اور بس۔ میں اپنی حالت کے موافق تم دونوں کو خوش رکھوں گا اور جب کبھی تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو، فوراً مجھ سے کہنا، تم ضرور اس کو پالوگے!"

الیاس نے محمد شاہ کا شکریہ ادا کیا اور وہ اور اس کی بیوی محمد شاہ کے ساتھ رہنے لگے۔ شروع شروع میں چونکہ عادت نہ تھی اس لئے یہ زندگی بہت کٹھن معلوم ہوئی مگر رفتہ رفتہ وہ اس کے عادی ہوگئے۔ وہ اتنا ہی کام کرتے جتنا اُن کی طاقت اجازت دیتی جب تھک جاتے تو چھوڑ دیتے۔

ان دونوں کو اپنے ساتھ رکھنے میں محمد شاہ نے خود اپنی بھلائی دیکھی ——— کسی زمانے میں وہ خود آقا تھے اور جانتے تھے کہ کیونکر کسی گھر کا انتظام کیا جاتا ہے، وہ کاہل نہ تھے اور جہاں تک ہوسکتا سب کام کرنے کی کوشش کرتے اور مطمئن نظر آتے۔ تاہم محمد شاہ کے دل کو یہ عبرت انگیز خیال تکلیف دیتا تھا کہ جو لوگ سینکڑوں غلاموں کے آقا رہ چکے ہوں وہ خود کسی دوسری جگہ تلاش معاش کے لئے بھٹکیں؛

ایک دفعہ محمد شاہ کے رشتہ دار کسی دُور دراز شہر سے اس کی ملاقات کو آئے۔ ان کے ساتھ ایک مُلّا بھی تھا۔ محمد شاہ

نے الیاس سے ایک بھیڑ ذبح کرنے کو کہا۔ الیاس نے اس کو ذبح کرنے کے بعد پکایا اور مہمانوں کے لئے بھیج دیا۔ مہمانوں نے گوشت کھایا، چائے پی اور اس کے بعد کوس پینے لگے، جب کہ وہ اپنے میزبان کے ساتھ قالین پر بیٹھے ہوئے بات چیت کرنے اور کوس پینے میں مشغول تھے، اتفاقاً الیاس ان کے سامنے سے نکل گیا۔ محمد شاہ نے اس کو جاتے دیکھ کر اپنے مہمانوں سے کہا:۔

"کیا آپ لوگوں نے اس بڈھے کو دیکھا جو ابھی گیا ہے —— ؟"

انہوں نے جواب دیا "ہاں! کیوں اس میں کیا خاص بات ہے؟"

"صرف یہ —— کہ ایک زمانہ تھا جب وہ ہم لوگوں میں سب سے زیادہ دولتمند تھا۔ آپ لوگوں نے اس کا نام ضرور سُنا ہوگا، الیاس!"

ایک نے جواب دیا "بیشک میں نے اس کا نام سُنا ہے! میں نے اس سے قبل اس کو کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کی شہرت چاروں طرف ہے۔"

محمد شاہ بولا "ہاں اور اب اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ میرے پاس مثل نوکروں کے رہتا ہے۔ اس کی بیوی "شام شماجی" بھی اس کے ساتھ ہے، وہ دودھ دوہتی ہے۔"

مہمان متعجب ہو گیا، سر ہلاتے ہوئے بولا:۔

"قسمت پہیئے کی طرح گھوم جاتی ہے۔ ایک ترقی کی انتہائی منزل پر ہوتا ہے تو دوسرا قعرِ مذلت کی آخری گہرائی میں، کسے معلوم ہے کہ ان دونوں کو اپنی اس حالت پر کتنا رنج ہوگا؟"

محمد شاہ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا "کون کہہ سکتا ہے —— لیکن وہ خاموش ہے اور مطمئن!"

مہمان نے پھر پُوچھا "کیا میں اس سے کچھ باتیں کر سکتا ہوں؟ میں اس سے اس کی موجودہ زندگی کے بارے میں کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔"

آقا نے جواب دیا "کیوں نہیں" اور الیاس کو آواز دی:۔

"بابا یہاں آؤ اور ہمارے ساتھ ایک پیالی کوس پیو، اپنی بیوی کو بھی لیتے آنا۔"

الیاس اپنی بیوی کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا، ہاتھ اُٹھا کر اپنے مالک و مہمان کی خوشنودی چاہتے ہوئے دُعا کی اور پھر چوکھٹ سے لگ کر بیٹھ گیا، اس کی بیوی پردے کی آڑ میں اپنی مالکہ کے پاس جا بیٹھی۔

کوس کا ایک پیالہ اسے دیا گیا، وہ مہمان و مالک کی صحت کی دُعا کرتے ہوئے کسی قدر جُھکا پھر پیالہ لے کر رکھ دیا۔

مہمان نے سوال کیا "بابا! میرا خیال ہے تم ہم لوگوں کو دیکھ کر رنجیدہ ہو گئے ——— یہ منظر یقیناً تمہاری گذشتہ شان و شوکت یاد دلا کر تمہیں تکلیف دے رہا ہوگا ———؟"

الیاس مسکرایا اور بولا:۔

"اگر میں آپ سے کہوں کہ حقیقی مسرت و غم کیا ہے تو آپ کو یقین نہ آئے گا۔ بہتر ہے آپ میری بیوی سے دریافت کریں وہ عورت ہے اور جو اس کے دل میں ہوتا ہے زبان پر آجاتا ہے، وہی آپ سے کل حقیقت بیان کرے گی۔"

مہمان نے بلند آواز سے پوچھا "دادی! مجھے بتاؤ کہ کیونکر تمہاری گذشتہ مسرتیں آج کل کی تکالیف کے مساوی ہیں!"

اور "شام شماجی" نے پردہ کی آڑ سے جواب دیا:۔

"میں اور میرا شوہر کامل پچاس برس تک مسرت کی تلاش میں رہے مگر وہ نہ ملی، لیکن یہ دو برس ہوتے ہیں کہ ہماری زندگی بظاہر اس غربت میں گزر رہی ہے لیکن ہمیں وہ "مسرت" مل گئی ہے جس کے لئے ہم ہمیشہ پریشان رہے اور اب ہمیں اس سے زیادہ کی خواہش نہیں۔"

مہمان سخت تعجب میں تھے اور خود محمد شاہ بھی۔ یکایک وہ اُٹھا اور پردہ ہٹا دیا تاکہ بوڑھی عورت کا چہرہ دیکھے کہ آیا وہ سچ کہہ رہی ہے یا جھوٹ۔ اس نے دیکھا کہ عورت ہاتھ باندھے کھڑی تھی اور اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے مُسکرا رہی تھی۔

مہمان نے دوبارہ سوال کیا "آخر تمہیں کیونکر مسرت ملی؟"

"کیونکہ جب ہم امیر تھے تو فکریں ہمیں گھیرے رہتی تھیں، اور ہمیں بمشکل موقع ملتا تھا کہ ایک دوسرے سے بات کریں یا اپنی حالت کو سمجھیں یا خدا کی عبادت کریں۔ ہمارے ملنے والے آتے اور ہم یہی سوچا کرتے کہ ان کے لئے دستر خوان پر کیا کیا چیز ہونا چاہئیں، انہیں کونسا نادر تحفہ دیا جائے تاکہ وہ ہمیں دوسروں میں بدنام نہ کریں۔ پھر جب وہ چلے جاتے تو ہمیں اپنے نوکروں کو دیکھنا پڑتا جو ہمیشہ کام چور رہتے اور اچھی غذا پاتے اور جب ہم اُن سے بازپرس کرتے تو انہیں چور سمجھتے اور اس طرح ہم گناہ کرتے۔ ہماری اکثر راتیں جاگتے ہوئے گزرتیں کہ کوئی بھیڑیا ہمارے بچھڑوں کو نہ پھاڑ کھائے، یا کوئی چور ہمارے گھوڑے نہ چُرالے جائے۔ ہم سونے جاتے تو یہ خیال سوہانِ روح ہوتا کہ کٹے ہوئے خشک کھیتوں میں کوئی دشمن آگ نہ لگا دے، ہم بار بار اپنا اطمینان کرنے کے لئے اُٹھتے اور اس طرح ہماری نیند حرام ہوتی۔ جاڑے سے قبل ہمیں اپنے مویشیوں کا خیال کہ ان کے لئے چارہ کافی ہے کہ نہیں۔ ہم ایک فکر سے چھٹکارا پاتے تو دوسری سامنے کھڑی نظر آتی، اسے ہٹاتے تو تیسری، چوتھی، پھر پانچویں ——— اس کے علاوہ مجھ میں اور میرے شوہر میں کبھی نہ بنتی، وہ کہتا ہمیں یہ کرنا چاہئے اور وہ کرنا چاہئے، اس کو رد کرتی اور کہتی کہ یہ ہونا چاہئے اور وہ ہونا چاہئے پھر اس پر ہم دونوں جھگڑ بیٹھتے اور ایک اور گناہ کے مرتکب ہو۔

گناہ کی زنجیر کبھی نہ ٹوٹتی اور ہم مسرّت سے محروم رہتے۔

"اور اب ــــ ؟"

"اب جب ہم صبح سویرے اُٹھتے ہیں تو محبت کے پیارے لفظوں میں ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے سے کوسوں دُور ہماری زندگی چین سے گذر رہی ہے، ہمیں کوئی فکر نہیں۔ سوائے اس کے کہ ہمارا مالک ہر طرح خوش رہے۔ ہم اسی قدر کام کرتے ہیں جس قدر ہماری ہمت اجازت دیتی ہے، ہم ہر کام کو دل لگا کر کرتے ہیں تاکہ ہمارے مالک کو ہم سے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے بلکہ نفع حاصل ہو۔ جب ہمارا کام ختم ہوجاتا ہے تو ہم اطمینان سے کوس پیتے ہیں، کھانا ہمیں تیار ملتا ہے، اور ہم اسے نعمت سمجھ کر کھاتے ہیں۔ جاڑا جب ناقابلِ برداشت ہوجاتا ہے تو ہم کسی کونے میں آگ روشن کر کے تاپتے ہیں۔ پھر ہمارے پاس پوستین کے کوٹ بھی ہیں۔ اب ہمیں کافی مُہلت ہے کہ ایک دوسرے سے بات کریں، اپنی حالت کو سمجھیں اور خدا کی عبادت کریں۔ ہم نے نصف صدی جس "مسرت" کی تلاش میں گزاری وہ ہمیں اس آخری عمر میں مل ہی گئی اور اب بہت خوش ہیں ــــ"

مہمان ہنس پڑے لیکن الیاس نے کہا:۔

"دوستو! مت ہنسو! یہ ہنسی مذاق کا موقع نہیں ہے ــــ یہ زندگی کی حقیقت ہے، شروع شروع میں ہم بھی اپنی ضائع شدہ دولت پر روئے تھے، لیکن اب خدا نے ہمیں سچائی دکھا دی اور ہم اسے اپنی تسلّی کے لئے بلکہ آپ لوگوں کی آئندہ زندگی کے لئے بیان کرتے ہیں"

مُلّا نے کہا ؎

"یہ بہت عاقلانہ گفتگو ہے، الیاس بالکل سچ کہتا ہے، پاک کتاب میں بھی یہی لکھا ہے، رہے نام اللہ کا ــــ" مہمانوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

(ماخوذ از ٹالسٹائی) ــــــــ **سالک لکھنوی**

جتنا غنی ہُوا کوئی محتاج تر ہُوا
زنہار دوست فقر سے بڑھ کر غنا نہیں

دل اور شاعر

میرے دل نے ایک روز مجھ سے کہا "میں آرام کا طلبگار ہوں"

میں نے کہا "دنیا کی ہر چیز اس کی آرزومند ہے"

اس نے ہنس کر کہا "سوائے شاعر کی ذات کے"

میں نے کہا "مجھ کو تڑپنے اور تڑپانے میں جو آرام ملتا ہے وہ دنیا میں کسی کو نصیب نہیں"

وہ کسی قدر تضحیک آمیز ہنسی ہنسا اور یوں مخاطب ہوا :۔

"تیری ہر چیز دنیا سے نرالی ہے، تیری عبادت، تیرا مذہب، تیرا تمدن، تیری زندگی، تیری موت، تیرا آرام، تیری اذان، تیری نماز ——— تیری زندگی میں فوق البشر کا راز پنہاں ہے، مجھے تیرے سینے میں ایک لحظے کا آرام نہیں، میں خود نہیں جانتا کہ میں کس طرح تیرے سینے کے آتشکدے میں زندہ ہوں جہاں چوبیسوں گھنٹے آتشِ نمرود کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں ——— اے کاش! مجھے ایک لمحہ آرام کی اجازت ملتی"!

میں نے کہا "تجھے آرام سے کون روکتا ہے"

اس نے کہا "تیرے جذبات"

میں نے کہا "مجھے اپنے جذبات پر قدرت حاصل نہیں ہے"

اس نے کہا "کاش! تو قادر ہوتا"

میں نے کہا "تجھ کو صرف آرام سے غرض ہے"

اس نے کہا "اور تجھ کو اظہارِ جذبات سے"

میں نے کہا "میری آواز قوم کی آواز ہے"

اس نے کہا "میری حرکت میں تیری زندگی کا راز ہے"

میں نے کہا "تیری بات حقیقت سے دُور ہے"

اس نے کہا "خدا کے لئے پھر ایسا نہ کہنا"

میں نے کہا "کیوں" ؟

اُس نے کہا "تُو میری حقیقت سے نا آشنا ہے!"

میں نے کہا "میں اس وقت سے تجھے جانتا ہوں جب تو میرے سینے میں داخل بھی نہ ہُوا تھا"

اس نے کہا "دیکھ! چھوٹا مُنہ بڑی بات نہ کر"

میں نے کہا "میں تیرا حاکم ہوں، پاسِ ادب تیرا فرض ہے"

اس نے کہا "میں تیری حکومت کا مالک ہوں"

میں نے کہا "ثبوت؟"

اس نے کہا "دیکھ لے"

میں نے کہا "بسم اللہ"

اس نے کہا "میں خاموش ہو رہا ہوں، اب تو اپنی حکومت کا استعمال کر!"

میں نے کہا "مجھ کو حیاتِ جاوید اور شہرتِ لازوال نصیب ہو رہی ہے اور تُو مر رہا ہے"

ڈاکٹر محمد عباس علیخان لمعہ

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے

کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

غزل

کہوں کیا شورشِ عہدِ شباب اوّل سے آخر تک
تڑپ، فریاد، نالہ، اضطراب' اوّل سے آخر تک

کبھی آغاز ناکامی' کبھی انجام محرومی
نہیں ہوتی محبّت کامیاب' اوّل سے آخر تک

جوانی کی اُمنگیں اور اُن کا حشر کیا کہیے
سراسر سخت ہذیاناتِ خواب' اوّل سے آخر تک

وہی ہے شغلِ مے نوشی سے مطلب غم غلط کرنا
وہی ہے تلخیٔ جامِ شراب' اوّل سے آخر تک

جوابِ خط کا اندازِ نکوہش چھُپ نہیں سکتا
نہاں ہر لفظ میں شانِ عتاب' اوّل سے آخر تک

جفاجو۔ سنگدل۔ بے رحم۔ کافر۔ عشوہ گر۔ قاتل
یہ ہیں اے شادؔ سب اُنکے خطاب' اوّل سے آخر تک

شادؔ عارفی

"کاتبیات"

اخباروں اور رسالوں کے پڑھنے والے "کاتب کی غلطی" کی اصطلاح اکثر سنتے ہیں لیکن وہ اس کا صحیح مفہوم نہیں جانتے کیونکہ کاتب کی اصلی غلطی انہیں کبھی نہیں دکھائی گئی بلکہ ایڈیٹر عموماً اپنی ہی غلطیوں اور فروگذاشتوں کو کاتبوں کے سر تھوپ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کاتب کی غلطی سے مراد اب بلاتکلف ایڈیٹر کی غلطی ہی لی جاتی ہے اور یہ لئے اس حد تک بڑھی ہے کہ بعض مضمون نگار کاتب کی ہر مہمل سے مہمل غلطی کو ایڈیٹر کی "اصلاح" سمجھ لیتے ہیں اور جھاڑ بن کر اُس غریب سے لپٹ جاتے ہیں۔ بھلا یہ بات اُن کی سمجھ میں کیونکر آئے کہ کوئی شخص بہ قیام ہوش و حواس اُن کے واضح اور صاف مسودہ کو نقل کرتے وقت کچھ کا کچھ لکھ سکتا ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں۔ کاتب کی غلطی یعنی کاتب کی حقیقی غلطی واقعی عجیب و غریب اور برتر از قیاس و خیال و گمان و وہم ہوتی ہے۔ اس کے چند نمونے جو مختلف کاتبوں کے نتائج افکار ہیں ناظرین کے تفنن طبع کے لئے یہاں درج کئے جاتے ہیں:-

دِلّی سے دُور تک : اصل عنوان تھا "اردو شاعری دِلّی کے دَور تک۔" اِس کو کاتب نے نہایت وضاحت کے ساتھ بہ خطِ جلی "دِلّی سے دُور تک" لکھا۔

دیوانہ مصطفٰے آبادی
عطاء اللہ کلیم ایم اے آبادی

مضمون نگاروں کی فہرست میں جناب دیوانہ مصطفٰے آبادی کے نام کے نیچے کلیم صاحب کا نام لکھا گیا تو کاتب صاحب نے مصطفٰی آباد کے مقابلے میں ایک نیا شہر ایم اے آباد بسا دیا۔

جدائی کے مصائب حد سے گزرے سہ نہیں سکتے
گزرتی ہے جو کچھ دل پر کسی سے کہہ نہیں سکتے
رہی ہوں منتظر اب تک مگر اب آہ نہیں سکتے

مسودہ صاف تھا اور یہ بھی ظاہر تھا کہ متکلمہ ایک عورت ہے۔ اس کے باوجود سکتی کے بجائے ہر جگہ سکتے لکھنا تو خیر مناسب تھا ہی مگر آخری مصرع میں رہ نہیں سکتی کو آہ نہیں سکتے لکھ کر ایک شاہکار پیدا کرنے کی جو کامیاب کوشش کی گئی ہے اُس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔

دُورٗ از کار : ان حضرت کا خیال تھا کہ جہاں بھی د اور و کے حروف یکجا لکھے دکھائی دیں اُن کے اُوپر اندھا دُھند ۲ کا ہندسہ لکھ دینا چاہیئے۔

"زار" اُس کا دلِ "راز" چھپایا نہیں جاتا : سبحان اللہ! کیا اِصلاح ہے۔ شعر کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا اور لُطف یہ کہ مادّہ کا کوئی ذرّہ ضائع بھی نہیں ہونے پایا۔

پیت کا "تانا" توڑ گئے تم : اس مصرع کی کتابت غالباً جلاہوں کے محلّے میں ہوئی ہوگی۔ تبھی پیت کے ناتے پر "تانے"

بانے" کی پھبتی سُوجھی ہوگی۔

دوسرے بچّوں کو بھی" اُن سے" مٹھائی دی: اس پہیلی میں تنے کا نون اُس کے سین سے بدل دیا گیا ہے اور دوبارہ یہ بتایا گیا ہے کہ" مادّے کا کوئی ذرّہ ضائع نہیں ہوتا"۔

گاڑی میں سوار ہو کر" جلدی": ظاہر ہے کہ جلدی اور چل دی میں زیادہ فرق نہیں۔ پھر لطف یہ کہ فقرہ بامعنی بھی ہوگیا ہے۔ اُستادانہ اصلاح ہے

ایک سو روپیہ" نو بجے" کے عوض بہت کم ہے: نو بجے کی ایک ہی کہی۔ غریب مضمون نگار نے" نو بچے کے عوض بہت کم ہے" لکھا تھا ورنہ سَو روپیہ تو شاید دس بچے کے عوض بھی کم نہ ہو۔

بڑھیا بیتاب ہوگئی اور" شوربے کا گھونٹ" جو وہ لیتی تھی دوبارہ نیچے گرجاتا: "شوربے کا گھونٹ" مشورے کا گھونٹ بنا دیا گیا ہے کیونکہ ہو گھونٹ عموماً مشورے ہی کا تو ہوتا ہے۔ شوربے کا گھونٹ تو کبھی دیکھا نہ سُنا۔

گویا" تسوٗ" مجھے اُفق سے جھانک رہی ہے: مطمئن رہیئے" تسوٗ" کسی آسیبِ سماوی کا نام نہیں۔ یہ تُو ہے

پندرہ سولہ سالہ برس کا لڑکا ملا: یہاں سالہ کے بر محل اضافے نے یقیناً قیامت ڈھادی ہے۔

نہ اسے سکتہ ہے نہ جمود یہ" قومیت" ہے اسے گورستان لے جائیے: غالباً کاتب صاحب قومی تحریکات کے مخالف تھے اور کتابت کرتے ہوئے" قومیت" کی موت کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ورنہ افسانہ نویس نے" یہ تو میّت ہے" کے الفاظ لکھے تھے۔

یہ قلمدان اسے بہت" ہر دل عزیز" تھا: چشمِ بد دُور! عزیز کو ہر دل عزیز لکھ کر مطلع کو مطلعِ آفتاب بنا دیا۔

جرمن ادب عورتوں کی سو انحمریوں سے" تھی مایہ" ہے: یہاں تہی مایہ کو تھی مایہ لکھا ہے۔ اگرچہ اصلاح کی نزاکت قابلِ داد ہے لیکن توجہ کو توجہ، واحد کو واحہ، مادام کیوری کو بادام کیوری اور مشرقی خاندیس کو سنہری خاندیس لکھنے والوں نے اگر تہی مایہ کو تھی مایہ لکھ دیا تو کون سا بڑا کمال کیا۔

راقم کے خیال میں" کاتبیات" کا شاہکار وہ اصلاح ہے جو ایک عنوان میں کی گئی تھی اور جس پر چرکیں اور جعفر زٹلی کی روحیں بھی ایک دفعہ وجد میں آکر ضرور جھوم گئی ہوں گی۔ عنوان تھا" نُور کا تڑکا"۔ کاتب نے اس میں کیا ردّ و بدل کی۔ اس کا اعادہ دشوار ہے ع یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے۔ ہاں اتنا بتایا جاسکتا ہے کہ اس کے بعد اس اہم معاملے کے متعلق مجھے دیر تک کاتب صاحب سے بالمشافہ مبادلۂ خیالات کرنا پڑا اور جب وہ بظاہر قائل ہوگئے تو میں نے نہایت وضاحت سے عنوان کو درست طور پر لکھ دیا اور انہیں اصلاح کر دینے کی تاکید کر کے قدرتہً مطمئن ہوگیا لیکن جب سالہ چھپ کر آیا تو کاتب اور رنگساز کی متفقہ کوششوں کے باوجود" نور کا تڑکا" کے بجائے لوز کا تڑکا کے الفاظ چھپے ہوئے دیکھے۔ اس پر راقم الحروف خودکشی تو خیر کیا کرتا سر پیٹ کر رہ گیا ع عمرش دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است۔ ورنہ آپ ہی کہیے اگر مگر غور و خوض پر بھی کاتب صاحب از راہِ کرم کوگ کا نعم البدل قرار دینے کا فیصلہ نہ کر لیتے تو کوئی اُن کا کیا بگاڑ لیتا؟

حامد علی خاں

محفلِ ادب

اپنی مرحوم محبوبہ سے

حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے ڈیڑھ سو سال قبل چین پر نوجوان شہنشاہ وُو۔ تی کی حکومت تھی۔ ایک دن یکایک اس کی محبوبہ لی۔ فو۔ جین کا انتقال ہو گیا۔ شہنشاہ کو اس کی دائمی مفارقت کا بے حد صدمہ ہُوا۔ اس نے ملک بھر کے نامور جادوگروں کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا اور کہا کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ لی۔ فو۔ جین کی رُوح سے اس کی ملاقات کرائیں۔ کہتے ہیں کہ جادوگروں نے سچ مچ ایک پردۂ سیمیں پر شہنشاہ کی محبوبہ کا عکس دکھا دیا۔ ذیل کی نظم اسی سوگوار شہنشاہ کی لکھی ہوئی ہے جس کے ایک ایک مصرع سے یاس و حسرت ٹپک رہی ہے:-

سرسراہٹ ریشمیں ملبوس کی خاموش ہے — فرشِ قصرِ مرمریں کا گرد میں روپوش ہے
پائے نازک کی صدا آتی نہیں ایوان سے — شمعِ زریں خواب گہ کی، تیرگی بردوش ہے
بام و در پر برگ ہائے خشک کے انبار ہیں — صحنِ گلشن غنچہ و گل سے تہی آغوش ہے

آہ، وہ جانِ جہاں دُنیا سے رخصت ہو چکی!
دل میں جو مہمان تھی، مہمانِ تربت ہو چکی!

(اختر شیرانی) — "رومان"

ایک بین الاقوامی زبان کی تجویز

آج جبکہ سائنس کی ترقیوں سے زمین کی طنابیں کھنچ رہی ہیں اور وسائل آمدورفت کی محیر العقول اختراعات سے دور دراز ممالک دفعتہً ایک دوسرے سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ایک ایسی بین الاقوامی زبان پیدا کی جائے جو ہر ملک میں آسانی کے ساتھ سمجھی جا سکے۔ اس ضرورت کا احساس عرصہ سے تھا، چنانچہ بہتیری زبانیں اس مقصد کے لئے تجویز بھی ہوئیں لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی کامیاب نہ ہو سکی، اب اور تھنولوجیکل انسٹی ٹیوٹ، کیمبرج، (ادارۂ صحت الفاظ) کے ڈائرکٹر مسٹر

لڈن (C. K. Ogden) نے ادارۂ مذکور کی طرف سے ایک نئی زبان کا اعلان کیا ہے، اور ان کا دعوےٰ ہے کہ یہ زبان بین الاقوامی ضروریات کے لئے بالکل کافی ہوگی، اس زبان کا نام انہوں نے "بنیادی انگریزی" (Basic English) رکھا ہے اور اس پر ایک دلچسپ مقالہ بھی لکھا ہے جو سنڈے اسٹیٹسمین مورخہ ۲۵ اگست ۳۵ء میں شائع ہوا ہے، ناظرین معارف کے لئے ہم اس کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں :-

گذشتہ تین صدیوں میں تین سو سے زیادہ مصنوعی زبانیں تجویز کی جاچکی ہیں، ان میں سے اکثر فنا ہوگئیں، جو باقی رہ گئی ہیں، ان میں اسپرانٹو (Esperanto) زیادہ مشہور ہے، ان میں سے کوئی بھی کسی زندہ زبان کی بنیاد پر قائم نہیں کی گئی، وہ سب نئی زبانیں تھیں جن سے بجز اس کے کہ زبانوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور کچھ حاصل نہ ہوا، حالانکہ زبانوں کے نقطۂ نظر سے اس وقت دنیا کی بڑی ضرورت افراط نہیں بلکہ تفریط ہے۔

انگریزی پہلے ہی سے پچاس کروڑ آدمیوں کی مادری یا دفتری زبان ہے، دس سال ہوئے ہم میں سے بعض اشخاص نے محسوس کیا کہ اگر اسے آسان بنا دیا جائے تو تجارت، سائنس اور تمام دوسرے اغراض کے لئے یہ ایک بین الاقوامی زبان بن سکتی ہے، چنانچہ کیمبرج کے ارتھولوجیکل انسٹی ٹیوٹ (Orthological Institute) نے یہ کام شروع کر دیا ہے اور "بنیادی انگریزی" اس کی دہ سالہ محنت کا نتیجہ ہے، ہم لوگوں نے ساڑھے آٹھ سو الفاظ چن لئے ہیں، جن سے بیس ہزار الفاظ کا کام لیا جاسکتا ہے، تجربہ سے ثابت ہوگیا ہے کہ استعمال کے چند ضروری اصولوں کے ساتھ وہ چوبیس گھنٹوں میں یاد ہو سکتے ہیں، اکثر غیر ممالک کے طلبہ اگر اس زبان پر روز دو گھنٹے صرف کریں تو ایک مہینہ میں عبور حاصل کرسکتے ہیں۔

انگریزی لغت کے معتبر الفاظ کا شمار پانچ لاکھ ہے، ان میں سے پروفیسر تھورن ڈائک (Thorn Dike) نے بیس ہزار الفاظ منتخب کرلئے ہیں جو اکثر بچوں کی کتابوں میں استعمال ہوتے ہیں، بہت کمسن بچوں کے لغت میں بھی دو ہزار سے تین ہزار تک الفاظ ہوتے ہیں، سرخیوں اور اشتہاروں کے لکھنے والے تقریباً سات ہزار الفاظ استعمال کرتے ہیں، اوسط ناظرین کو پچیس ہزار الفاظ سے واقفیت رہتی ہے، پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ صرف ساڑھے آٹھ سو الفاظ سے تمام ضروری مطالب ادا کئے جاسکیں؟

اکثر انگریزی افعال (Verbs) غیر ضروری ہیں، ان کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے، ہزاروں ایسے ہیں جن کا مفہوم آسان تر افعال کے ساتھ ظرف، حرف جر، یا اسم کو شامل کرکے ادا کیا جاسکتا ہے، مثلاً (Accelerate) کے معنی ہیں To go more quickly (جلد جانا) اور Climb کے معنی ہیں To go up (اوپر چڑھنا) اسی طرح To break the law کے معنی ہیں To go against the law (قانون شکنی کرنا) اور To Kick کے معنی ہیں To give a Kick (ٹھوکر مارنا) ان مثالوں میں چار افعال یعنی Accelerate, Climb, Break, Kick,

یسے ہیں جو چھوڑے جاسکتے ہیں، ماہرینِ ادارہ نے نہایت کاوش اور محنت سے تمام غیر ضروری افعال کو خارج کر کے صرف اٹھارہ فعال کو منتخب کر لیا ہے، ان میں بھی بعض صرف اس لئے رکھ لئے گئے ہیں کہ ان سے دوسرے الفاظ کو مدد ملتی ہے، وہ ضروری فعال مندرجہ ذیل ہیں:-

Come. Get. Give. Go. Keep. Let. Make. Put. Seem. Take. B[e]. Do. Have. May. Will.

ر یہ مناسب طریقہ سے استعمال کئے جائیں تو ان سے تمام دوسرے الفاظ کا کام لیا جاسکتا ہے،

واضح طور پر مفہوم کے سمجھنے کے لئے جن اسمار کی ضرورت ہے ان کی تعداد چار سَو ہے، اسی طرح ضروری صفات ہ Adjectives کی تعداد سَو اور افعال اور ان الفاظ کی جن سے افعال کو مدد ملتی ہے، مجموعی تعداد بھی سَو ہے، ان کے لاوہ دو سَو الفاظ اُن اسمار کے ہیں جن کی تصویر لی جاسکتی ہے، مثلاً پنسل اور گاڑی وغیرہ اور پچاس الفاظ مقابل صفات کے لئے ہیں، مثلاً تنگ اور سُست "بنیادی انگریزی" کے الفاظ بس اسی قدر ہیں، ان کے علاوہ پچاس الفاظ ایسے ہیں عام طور پر رائج ہیں، اور ہر ملک میں سمجھے جاتے ہیں، مثلاً ہوٹل، تھیٹر، وولٹ، ٹیلیگرام، پولیس، میڈم، سر، القاب ثلاً پرنس اور پریزیڈنٹ، علوم کے نام، اعداد، جغرافیائی نام، اور وہ الفاظ جو پیمائش اور سکّوں سے متعلق ہیں، یہ سب پہلے ہی سے بین الاقوامی استعمال میں رائج ہیں، اور ساڑھے آٹھ سَو کی فہرست میں شامل نہیں ہیں۔

اگر تمام دنیا کے ماہرینِ سائنس کسی مجلس میں اکٹھے ہوں، اور ان (۸۵۰) بنیادی الفاظ کے ساتھ عام سائنٹیفک اصطلاحات کے ایک سَو الفاظ نیز پچاس دوسرے الفاظ جو کسی معین سائنس کے لئے مخصوص ہوتے ہیں، استعمال کریں تو وہ ایک دوسرے کا مطلب بغیر کسی دشواری کے سمجھ سکتے ہیں، ان ایک ہزار الفاظ کے ذریعہ ہر علم سے واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے۔

(ع۔ز) ——— (معارف)

مطبوعات

مکتوباتِ نیاز } یہ حضرت نیاز فتح پوری مدیر "نگار" کے تقریباً سوا دو سو خطوط کا مجموعہ ہے جو بہ حسن اہتمام مجلد شائع ہوا ہے۔ طرزِ مخاطبت کی بے تکلفی اور بے ساختگی سے غالب کے خطوط کا خیال آتا ہے۔ حضرتِ نیاز کا اندازِ تحریر پرشکوہ لیکن دلکش اور شگفتہ ہے۔ خطوں میں جا بجا زبان و ادب کے مباحث اور تنقیدی اشارات ملتے ہیں جنہوں نے کتاب کو دلچسپ ہونے کے علاوہ مفید بھی بنا دیا ہے۔ قیمت ۱۲ر۔ پتہ :۔ نگار بُک ایجنسی لکھنؤ۔

پروین و ثریّا } یہ بلجیم کے مشہور ڈرامانگار میٹرلنک کے ایک المیہ ڈرامے کا دلکش ترجمہ ہے جو مولانا شاہد احمد صاحب بی، اے آنرز ایڈیٹر "ساقی" کے قلم کا رہینِ منت ہے۔ شاہد صاحب اس سے قبل میٹرلنک کے بعض اور ڈراموں کے تراجم سے اردو والوں کو روشناس کر چکے ہیں اور اُن کا بہار آفریں قلم اہلِ فن سے بارہا اپنا لوہا منوا چکا ہے۔ یہ ڈراما پاکیزہ اور بے غرض محبت کے ایثار کی ایک دلاویز مثال ہے۔ قیمت مجلد عمہ۔ پتہ :۔ ساقی بُک ڈپو دہلی۔

نقشِ دوام } ہمیں مسرت ہے کہ حضرت عدم نے نقشِ دوام کے نام سے دو سو صفحات پر اپنے کلام کا مجموعہ شائع کر دیا ہے۔ قارئینِ "ہمایوں" حضرتِ عدم کے پاکیزہ اندازِ بیان اور نادر طرزِ تخیل سے پوری طرح واقف ہیں کیونکہ اُن کا بہترین کلام عموماً "ہمایوں" ہی میں شائع ہوتا رہا ہے۔ عہدِ حاضر میں غزل گوئی کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے۔ اچھی غزل لکھنے والے باقی نہیں رہے اور اب اردو شاعری میں نظم کا دَور دورہ ہے۔ حضرتِ عدم اس نئے دَور کے نقیبوں کی صفِ اولیں میں بیٹھنے کے مستحق ہیں۔ قیمت دو روپے۔ پتہ :۔ حکیم عبدالغنی موچی بازار راولپنڈی۔

سلسبیل } یہ پروفیسر آل احمد صاحب سرور ایم اے (علیگ) کی نظموں اور غزلوں کا مجمُوعہ ہے۔ غزلیں کم ہیں اور جذبات سے خالی ہونے کی وجہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ مجموعہ کا بیشتر حصہ نظموں پر مشتمل ہے۔ ہماری رائے میں سرور صاحب غزل کے شاعر نہیں نظم کے شاعر ہیں۔ نظموں کا اندازِ بیان شگفتہ اور موضوع دلکش اور دلچسپ ہیں۔ اگر سرور صاحب نظم لکھتے رہے تو ہمیں اُمید ہے کہ اردو شاعری میں ایک قابلِ قدر اضافہ کریں گے۔ موجودہ مجموعہ یقیناً پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت عمہ۔ پتہ :۔ پروفیسر آل احمد صاحب سرور انگلش ڈیپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

مختصر تاریخ ادبِ اُردو } یہ کتاب سید اعجاز حسین صاحب لکچرر شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی کی تالیف ہے جس میں انہوں نے خسرو سے لے کر موجودہ دَور تک کے بعض اردو اُدبا و شعرا کا تذکرہ کیا ہے اور اُن کے متعلق مختصر آرا کا اظہار بھی کیا ہے لیکن بعض جگہ جہاں زیادہ تحقیق اور مطالعہ کی ضرورت ہے قیاسات سے کام لیا گیا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ ایڈیشن کے موقع پر نظرِ ثانی

سے یہ فروگزاشتیں باقی نہ رہیں گی۔ کتاب بہرحال قابلِ قدر اور طلبہ کے لئے بالخصوص مفید ہے۔ قیمت مجلد ۱۲؍ جنابِ مؤلف سے طلب فرمائیے۔

اردو میں ڈرامانگاری } اس مختصر کتاب میں اردو ڈراما کے متعلق ایک جامع بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ہمیں مسرت ہے کہ اس کے مؤلف سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآبادی اپنی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ کتاب میں اردو ڈراما کی ابتدا سے لے کر اس کے حال و مستقبل تک سے بحث کی گئی ہے اور ہر دور کے لکھنے والوں کے متعلق متانت سے اظہارِ رائے کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اُردو ادب میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔ قیمت ۱۲؍۔ پتہ:۔ آرکیڈیا نیوز ایجنسی اندرون نوبت شاہ۔ قادر کوٹلہ حیدرآباد دکن

مجنوں کی ڈائری } از قاضی عبدالغفار صاحب۔ یہ ایک آزاد خیال اور وارفتہ مزاج نوجوان کا روزنامچہ ہے جس میں موجودہ زمانے کی بعض معاشری پیچیدگیوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب میں افسانے کا لطف ہے اور اندازِ تحریر دلکش ہے۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ:۔ دارالادب پنجاب بارود خانہ لاہور۔

لیلیٰ کے خطوط } یہ بھی قاضی عبدالغفار صاحب کی تصنیف ہے اور درحقیقت مجنوں کی ڈائری کا جواب ہے۔ لیلیٰ ایک آزاد خیال لڑکی ہے جو ایک طوائف کے گھر میں پلی ہے۔ یہ کتاب بھی اسی رنگ میں لکھی گئی ہے جس میں مجنوں کی ڈائری لکھی گئی۔ قیمت ۱۲؍۔ پتہ:۔ دارالادب پنجاب بارود خانہ لاہور۔

رسائل:۔

نغمۂ روح } یہ دہلی کے مشہور نوجوان شاعر حضرت اختر انصاری کے قطعات اور غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ اختر صاحب کا تخیل جدت آفریں ہے اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے قطعات میں بہت خوبی سے لطیف نکتے بیان کرتے ہیں۔ اندازِ بیان دلکش ہے لیکن اس میں مزید پختہ کاری کی گنجائش ہے۔ قطعات کی طرح نظموں کے موضوع بھی اچھوتے ہیں۔ غزل بھی غنیمت ہے اور نغمۂ روح بلاشبہ پڑھنے کے قابل ہے۔ پتہ: مولوی محمد افضل محلہ ناہر خاں۔ بدایوں۔

ساقی (چغتائی نمبر) مولانا شاہد احمد صاحب کو خاص نمبر شائع کرنے میں خاص سلیقہ ہے۔ ہر سال ساقی کے متعدد خاص نمبر نہایت اہتمام سے شائع ہوتے ہیں۔ اُردو میں مزاحیہ مضامین کی کمی کو ملحوظ رکھ کر شاہد صاحب نے ساقی کا یہ نمبر پورے کا پورا ملک کے مشہور مزاحیہ نگار مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کے دلکش مضامین سے مرتب کیا ہے۔ اس کا حجم ۲۰۰ صفحات کے قریب ہے اور مرزا صاحب کے سترہ مضامین پر مشتمل ہے۔ اس نمبر سے ہمارے صحافتی ادب میں ایک دلکش اضافہ ہوا ہے۔ پتہ:۔ دفتر ساقی دہلی۔

ندیم (بہار نمبر) حضرت انجم مدیرِ "ندیم" بہی خواہانِ اردو کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اردو صحافت کے مرکز سے ایک دور دراز مقام (گیا) سے ایک بلند پایہ اردو رسالہ جاری کر رکھا ہے اور اسے نہایت کامیابی سے چلا رہے ہیں۔ حال ہی میں ندیم کا "بہار نمبر" ۲۲۰ صفحات پر نہایت اچھے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ لاہور کے رسائل کے خاص نمبر مشہور ہیں لیکن ندیم کا یہ نمبر باوجودیکہ گیا میں طباعت و اہتمام کی وہ آسانیاں حاصل نہیں جو لاہور میں ہیں لاہوری رسائل کے خاص نمبروں سے کسی طرح کم نہیں۔ مضمون تمام بہاری مضمون نگاروں کے قلم سے ہیں۔ اس جدت کا مقصد یہ ہے کہ اس صوبے میں اُردو زبان کے متعلق جو جمود طاری ہو چکا ہے وہ توڑا جائے۔ جنابِ انجم کی یہ مخلصانہ کوشش قابلِ ستائش اور حوصلہ افزائی کی مستحق ہے۔ اس پرچے میں ادبا کی تصاویر کے علاوہ دوسری رنگین و یک رنگ تصاویر بھی شامل ہیں جو بہاری مصوروں کے موقلم کی تخلیق ہیں۔ ان میں بہن جی کی رنگین تصویر "سماع" نہایت قابلِ قدر اور مصورانہ چابک دستی کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ ہم مصور کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ یہ پرچہ ادبی تاریخی تنقیدی معاشری و تمدنی مضامین کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ ہے۔ اکثر مضامین قابلِ ذکر ہیں۔ قیمت عہ۔ پتہ مہتمم

دہلی سے ایک انقلابی اور معیاری مصوّر ماہ نامے کا اجرا

"کلیم"

زیرِ ادارت

"شبیر حسن خاں جوش" ملیح آبادی

سالانہ چندہ عہ

سائز کلاں ۲۲×۱۸ کتابت و طباعت روشن

صفحات ۱۰۸۔ ٹائیٹل دورنگی۔ کاغذ قسم اعلےٰ

تصاویر آٹھ صفحوں پر آرٹ پیپر

مدت دراز سے میری تمنا تھی کہ ہندوستانی علم و ادب، اور ہندوستانی ذہن و فکر کو عصرِ حاضر کی سطح تک بلند کرنے کی خاطر ایک ایسا ماہنامہ جاری کروں جو اپنے تمام ظاہری و باطنی خصوصیات کے لحاظ سے زندہ اقوام کے جدید ترین معیارِ صحافت پر پورا اُتر سکے۔

اس وقت حقیقی معیارِ ادب، اُستوار آزادئ فکر اور صحیح انتقاد کے نقطۂ نظر سے ہمارا علمی فلاس اس درجہ شرمناک ہے کہ ہم دوسری قوموں کو مُنہ نہیں دکھا سکتے۔

جب تک جمود و جہل کا یہ عالم رہے گا اور جس وقت تک مُلک کے ادبیات میں ایک ناقابلِ مقابلہ عظیم انقلاب نہ پیدا کر دیا جائے گا کسی ذہنی برتری، سیاسی بیداری، اور مادی ترقی کا تصور تک محال ہے۔

اس لئے اب جب کہ حیدر آباد سے پنشن ہو جانے کے باعث میرے پاس کافی وقت ہے، اور مفکرین کی ایک جماعت بھی میرا ہات بٹانے پر آمادہ ہے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ باقی زندگی اسی جدّ و جہد میں گزار دوں گا۔

لیکن ظاہر ہے کوئی کام سرمائے کے بغیر نہیں چل سکتا، اور میرے واسطے یہ بھی ناممکن ہے کہ میں سرمائے کی خاطر اہلِ دولت کی آستاں بوسی کرتا پھروں اس لئے اب صرف یہی ایک صورت نظر آتی ہے کہ اگر اپنی قوم سے مجھے اجرائے رسالہ کی خاطر سرِ دست ایک ہزار خریدار مل جائیں جو اپنا پیشگی چندہ منی آرڈر کر دیں تو میں جلد تر رسالہ جاری کر دوں۔

میں دو ماہ تک انتظار کروں گا کہ میرے برادرانِ وطن میری اس مخلصانہ تجویز کا کیونکر خیر مقدم کرتے ہیں۔

میں نے اب تک جس خلوص و بے لوثی سے ملک کی خدمت کی ہے اُس سے مجھے توقع ہے کہ میری قوم مجھ پر اعتماد کر کے مجھے اپنی خدمت کا موقع ضرور دیگی۔

آخر میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اپنی قوم سے یہ میری اپیل، کسی نوع کے تاجرانہ تخیل سے آلودہ نہیں ہے۔

میری ذاتی معاش کے واسطے میری تصانیف، میری پنشن اور میری آبائی جائداد کافی ہے۔

(نوٹ)

۱۔ "کلیم" کا نام پہلے "کاخ بلند" تجویز ہوا تھا لیکن بعض احباب کے مشورے کے مطابق نام بدل دیا گیا ہے۔

۲۔ سرِ دست میں دھولپور میں ہوں اور میرا پتہ صرف "دھولپور" (راجپوتانہ) کافی ہے۔

"جوش" ملیح آبادی

پنڈت ٹھاکر دت شرما ویدیہ موجد امرت دھارا کی چند مجرب ادویات جو کہ ہزارہا انسانوں کو نفع پہنچا چکی ہیں

دوائی بواسیر عہ۳ } خونی و بادی ہر قسم کی بواسیر کے واسطے بےنظیر ہے سلوں کی بیماری دنوں میں۔ قیمت دو روپے نمونہ ۴ر

دوائی طحال عہ۲ } تاپ تلی کیواسطے بےنظیر دوائی ہے ہاضمہ کو تیز کرتی ہے۔ قیمت دو روپے نمونہ چار آنے ۴ر

کرکول } ہاضمہ کی بےنظیر دوائی ہے بھوک بڑھاتی اور معدے و آنتوں کی تمام تکالیف دور کرتی ہے۔ قیمت ۶۰ گولی عہ ۳۰ گولی عہ نمونہ ۴ر

دت ویریچن } جلاب کیواسطے بےنظیر ہے جیسے جلاب لینے ہوں اس سے اچھی طرح ہو جاتے ہیں قیمت ایکروپیہ نصف ۸ر نمونہ ۲ر

آرام جان } جن کو قبض دائمی رہتی ہے وہ ان کو کھایا کریں آہستہ آہستہ بیماری دور ہو جائے گی۔ قیمت ۳۲ گولی عہ ۱۶ گولی ۸ر

اکسیر ا } کمزوری و ضعف کی بےنظیر دوائی ہے تمام مردانہ طاقتیں بحال ہو جاتی ہیں بڈھے کو جوان بناتی ہے قیمت ۴۸ گولی للعہ ۲۲ گولی عہ نمونہ ۸ر

اکسیر ۲ } یہ دوائی جریان کیواسطے ہی خواہ کسی وجہ سے ہو نیز بدخوابی کو بھی نافع ہی قیمت ۴۲ گولی عہ نمونہ ۸ر

اکسیر نمبر ۳ } یہ دوائی احتلام کیواسطے ہے۔ غیر شادی شدہ طالبعلموں کی حفاظت کرتی ہے قیمت ایکروپیہ نمونہ چار آنے ۴ر

طلاء ۳ } جنہوں نے اپنے پاؤں آپ کلہاڑا مارا ہے ان کے واسطے یہ عام طلا ہے۔ قیمت ایکروپیہ نمونہ ۴ر

سوماوتی } عورتوں کے سفید پانی۔ جریان۔ لیوکوریا۔ سیلان رطوبت کی اکسیر دوائی ہے۔ قیمت عہ نمونہ ۱۲ر

بال سکھ } بچوں کی امراض بدہضمی قبض۔ دست۔ کھانسی۔ بخار وغیرہ کیواسطے بےنظیر دوائی ہے۔ قیمت عہ نمونہ ۴ر

سارسا پرلا مرکب } پرانا آتشک جب خون خراب کردے یہ دوائی خون صاف کرکے جسم کو کندن کیطرح کر دیتی ہے قیمت عہ نمونہ ۴ر

سوزش شاف } سوزاک کی بےنظیر دوائی جلن سوزش وغیرہ اول ہی دن موقوف چند دنوں میں بالکل آرام آتا ہے قیمت عہ نمونہ ۴ر

گندرسن دھارا رجسٹرڈ } سخت سے سخت درد کو ہٹانے سے ہٹانے اپھارہ عرق النساء گرہنی کو غیرہ پیٹ میں فوراً کئی ایک ہی دافع ہے دست پیچش وغیرہ کو آرام آتا ہے ہیضہ کے دست و قے کو بھی نافع ہے قیمت فی تولہ عہ ۶ ماشہ

عرق بخار رجسٹرڈ } موسمی بخار ملیریا ہر قسم روزانہ۔ تیہ چوتھیہ وغیرہ سب اس ایک شیشی کے تین دن کھانے سے قطعی دور ہو جاتے ہیں۔ قیمت فی شیشی خوراک تین یوم صرف آٹھ آنے ۸ر

درد شکن رجسٹرڈ } اس دوائی کی ایک ہی بوٹی کھانے سے پانچ منٹ کے اندر چاہے کسی قسم کا درد ہو اور آنکھ۔ دانت۔ ناک کان۔ کمر جوڑ وغیرہ کسی جگہ درد ہو جاتا رہتا ہے قیمت صرف ایکروپیہ نمونہ چار آنے ۴ر

بلا دور } ان گولیوں سے افیون کی عادت چھوٹ جاتی ہے سینکڑوں چھوڑ چکے ہیں۔ قیمت فی شیشی عہ

اکھ روشن } آنکھوں کی تمام امراض دھند۔ جالا۔ پانی۔ خارش وغیرہ کو اکسیر ہے قیمت فی تولہ ۱۲ر ۶ ماشہ ۶ر

چت موہنی رجسٹرڈ } چہرے کے داغ کیل چھائیاں وغیرہ دور ہو کر چہرہ صاف ہوتا ہے اور چھائیں نہیں پڑتیں قیمت عہ نمونہ ۴ر

دل سندری رجسٹرڈ } یہ تیل جو چہرہ کو چمکاتا ہے اور داغ کیل وغیرہ کو دور کرتا ہے چہرہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ قیمت فی شیشی عہ نمونہ ۴ر

بال اڑانے کی بےنظیر دوائی } اس دوائی کو پانی میں گھول کر لگانے سے ایک منٹ کے اندر سخت سے سخت اور نرم سے نرم جگہ کے بال بہ صفائی کمال جڑھ سے دور ہو جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبیہ ۶ر نمونہ ۱ر

منجن ۱ } دانتوں کی امراض مثل خون جانا پانی نکلنا۔ درد دندان بدبوئے دہن کو نافع ہے قیمت صرف ۴ر نمونہ ۱ر

باغ پھول تیل رجسٹرڈ } بالوں پر تمام تیلوں کا سرتاج ہو بالوں کو نرم و ملائم کرتا ہی بیاہی قائم رکھتا ہی صرف خوشبو ہی نہیں مفید بھی ہی قیمت فی شیشی ۱۲ر

خط و کتابت و تار کا پتہ :- امرت دھارا ۔ لاہور

المشتہر

منیجر امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون امرت دھارا روڈ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

نہایت ضروری اعلان

قارئین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ حسبِ اعلان سابق "گلفروش" کے ان پہلے ایک سو خریداروں کو جن کی فرمائشیں ۱۵ نومبر سے پہلے پہنچ گئی تھیں "سوہنی گال" کی ایک سو کاپیاں بالکل مفت دے دی گئیں لیکن فرمائشیں متعینہ تعداد سے بہت زیادہ تھیں۔ اسلیے ہم ایک سو نئے لوگوں کی فرمائشیں پوری نہ کر سکے اسی سلسلہ میں خبر مسرت کیسے ساتھ سنی جائیگی کہ مولانا ظفر نیازی مالک کامیاب بکڈپو نے اپنی تالیف "ایکٹریس کی آپ بیتی" (جس میں دنیائے فلم کے نہایت لرزہ خیز اور شرمناک لیکن بالکل سچے واقعات بیان کئے گئے ہیں) کی صرف ایک سو جلدیں اس غرض سے پیش کی ہیں کہ ان پہلے ایک سو خریداروں کو جو ۱۰ دسمبر ۱۹۳۵ء تک اخبار "گلفروش" کا سالانہ چندہ تین روپیہ آٹھ آنے بذریعہ منی آرڈر بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیدیں بالکل مفت دیدی جائیں۔ آج ہی اپنی فرمائش بھیج دیجئے ورنہ کہیں پہلے کی طرح مایوس نہ ہونا پڑے کیونکہ ایک سے زیادہ ایک جلد بھی کسی کو نہ دی جائیگی اور نہ ۱۰ دسمبر کے بعد کسی صورت بھی یہ رعایت ملے گی۔

اخبار ہفتہ وار "گلفروش" ہنسیر گلی دہلی

بجلی کی منظور شدہ درسگاہ

سکول فار الیکٹریشنز لدھیانہ ہے

جو گورنمنٹ رکگنائزڈ ہے۔ اس میں قابلیت کے طلباء داخل ہوتے ہیں سکول کا اپنا پاور ہاؤس ہے جس میں اے سی و ڈی سی ہر دو قسم کے جنریٹر ہیں سٹی اینڈ گلڈز انسٹیٹیوٹ کے امتحان کیلئے بھی طلباء کو تیار کیا جاتا ہے جناب وزیر تعلیم اور چیف الیکٹریکل انجینئر پنجاب اس سکول کی تعلیم ضبط اور نظم و نسق پر اطمینان فرما چکے ہیں۔ انسپکٹر آف انڈسٹریز پنجاب نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ایسی اچھی تعلیم کی توقع صرف انگلستان کے سکولوں ہی سے کی جا سکتی ہے۔

پراسپکٹس مفت بھیجے جاتے ہیں

"مینیجر"

بچوں کی طاقت بڑھانے والی مشہور دوائی
ڈونگرے کا بال امرت
یہ
ڈونگرے کا بال امرت
میٹھا ہونے کے سبب چھوٹے بچے بہت خوشی سے پیتے ہیں۔ چھوٹے
بچوں کی کھانسی، بخار، بدہضمی، ہیضہ وغیرہ امراض جو اکثر ناطاقتی کی وجہ سے
ہوتے ہیں اس کے استعمال سے رفع ہو جاتے ہیں اور اس سے بچوں کا بدن تھوڑے
عرصے میں گوشت سے بھر کر جسم میں طاقت بڑھتی ہے۔
لاہور ایجنٹ
بھگت رام پوری اینڈ سنز سوتر منڈی۔ لاہور

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے

اعلیٰ طبقہ کی خواتین سر میں لگانے کیلئے اس کارخانہ کا تیار کردہ بانو ہیئر آئل استعمال کرتی ہیں۔

طبقۂ نسواں میں اس کارخانہ کا عطر سہاگ اور عطر عروس نہایت مقبول ہے

یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے

سید عبداللطیف پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمالیہ ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱/ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸/

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳ لارنس روڈ۔ لاہور

Title and Picture Printed at the Halftone Press, Lahore

نومبر ۱۹۴۵

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(ہمایوں)

بیادگارِ علامۂ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔اے

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ نومبر ۱۹۳۵ء
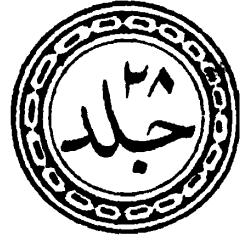
(تصویر:- رُوت قومی کے رشتہ دار بوعز کے کھیت میں بالیں چن کر کھڑی ہے۔

چندہ سالانہ ۵ صر — ششماہی سے مع محصول ڈاک — قیمت فی پرچہ ۸ر

جہاں نما

ہندوستان اور جدید نظام حکومت

ستمبر کے "نائنٹینتھ سنچری" کا مقالۂ افتتاحیہ مارکوئس آو لوتھین کے ایک مبسوط تبصرۂ نظامِ حکومت ہند پر مشتمل ہے۔ صاحبِ موصوف ہندوستان کی طرف سے نظامِ جدید کے سرد مہرانہ خیر مقدم سے قطعاً بددل نہیں ہوئے۔ انہیں یہ تسلیم ہے کہ اس نظامِ حکومت نے ہندوستان کے دل میں خوشی کی کوئی لہر پیدا نہیں کی لیکن وہ کہتے ہیں کہ تقریباً ہر اس عظیم الشان نظامِ حکومت کا جو دستبردِ روزگار کا مقابلہ کر سکا اپنی ابتدائی حالت میں یہی خاصہ رہا ہے۔

مجلسِ فلیڈلفیا کا کام اس قدر ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا کہ ایک عرصے تک نظامِ حکومت امریکا کی کامیابی مشتبہ رہی حالانکہ یہ نظامِ حکومت گلیڈسٹن کے الفاظ میں وہ سب سے بڑا سیاسی نظامِ عمل ہے جو آج تک کسی ایک وقت میں انسان کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچا۔ مغربی افریقہ کا نظامِ حکومت بھی ابتدا میں تلخ ترین جرح و نقد کا ہدف بنا اور بالآخر تباہ ہوتے ہوتے بچا کیونکہ کیپ کالونی اور ٹرانسوال دونوں مرکزِ حکومت کو دوسرے کی طرف منتقل کرنے پر کسی طرح رضامند نہ ہوتے تھے۔ آسٹریلیا میں بھی تقریباً ایسے ہی واقعات کا اعادہ ہوا۔ ان تمام نظام ہائے حکومت کی غیر ہر دلعزیزی کا سبب یہ تھا کہ مجوزہ ہندوستانی نظامِ حکومت کی طرح اُن کی بھی ہر سطر متخالف مفاد اور متضاد خیالات کے درمیان مصالحت کی ایک کوشش تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی فریق بھی پوری طرح مطمئن نہ ہو سکا اور ہر شخص مستقبل کے خیال سے ہراساں اور متذبذب ہو گیا۔

اس کے برعکس لارڈ لوتھین نے اُن نظام ہائے حکومت کی مثال پیش کی ہے جو کسی خاص جماعت کے اقتدار یا کسی خاص سیاسی نقطۂ خیال کی نمائندگی کرتے تھے اور جن کا نفاذ مسرت و بہجت کے ہنگامہ خیز نعروں کے درمیان ہوا لیکن جو تقریباً تمام نیست و نابود ہو چکے ہیں۔ ۱۹۰۹ء کا ترکی نظامِ حکومت، ۱۹۱۲ء کی چینی پارلیمنٹ اور ویمر کا نظامِ حکومت اس کی مثالیں ہیں۔

جدید نظامِ حکومت پر متعدد اعتراضات کیے جاتے ہیں مثلاً ملکی حکومت میں ریاستوں کا الحاق، فرقہ وار فیصلہ، جائداد کے حقوقِ مفوضہ کا معاملہ اور سب سے بڑھ کر تحفظات جنہوں نے ہندوستان کو اس طرح جکڑ لیا ہے کہ ملک ذمہ دارانہ طریقے سے ترقی کے راستے پر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

لارڈ لوتھین ان تمام اعتراضات کو گنانے اور یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ موجودہ نظام ہندوستان کے مطالبات کو پورا کرنے سے قاصر

ہے یہ خیال رکھتے ہیں کہ یہ مطالبات بجز جدید نظامِ حکومت کو معرضِ عمل میں لانے کے پورے بھی نہیں ہو سکتے۔ اُن کا خیال ہے کہ مجالسِ وضعِ قانون کے اندر یا باہر نظامِ حکومت میں ہر قسم کی رخنہ اندازی ملک کی سیاسی ترقی کے راستے میں حائل ہوگی اور صرف تعاون ہی سے (جس میں ضابطہ کے اندر رہ کر مخالفت بھی شامل ہے) ہم فرقہ پرستی کے دفعیہ کے علاوہ نظامِ حکومت کے بدتر ہنوز تصفیہ طلب مسائل کا حل سوچ کر ملک کو اقتصادی اور سیاسی ترقی کی شاہراہ پر ڈال سکتے ہیں تاکہ بالآخر ہندوستان نوآبادیوں کا درجہ حاصل کر لے۔

مضمون کے آخر میں لارڈ لوتھین نے یہ خوب کہا ہے کہ کسی ذمہ دار حکومت کی کامیابی اس قدر نظامِ حکومت کی شرائط پر منحصر نہیں جتنی اخلاقی جرأت، رائے عامہ کی قوت اور سیاسی کارکنوں کی دیانت پر منحصر ہے۔

روسی سودیٹ کی خوش آئند اصلاحات

حال ہی میں روس کے متعلق میجر گریم پول کا ایک مضمون ماڈرن ریویو میں شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ اگر روس کا تجربہ کامیاب ثابت ہوا تو دنیا پر اس کا بڑا زبردست اثر ہوگا۔ موجودہ روس کی نمایاں ترین خصوصیات میں سے ایک وہاں کے بازاروں کی حیرت انگیز صفائی ہے جس کی سب سے بڑی وجہ کارکنوں کا تعاون ہے۔

روس کے بازاروں میں سے گزرنے والے کو تیس سے لے کر پچاس پچاس گز کے فاصلہ پر دیواروں کے ساتھ ساتھ خاک انداز پڑے دکھائی دیتے ہیں۔ لوگ جلے ہوئے سگرٹ، سگرٹوں کے ڈبے اور ردی کاغذ وغیرہ زمین پر پھینکنے کے بجائے ان میں ڈال دیتے ہیں۔ اس شخص کو جو کاغذ یا کوڑا کرکٹ باہر پھینکتا ہوا نظر آئے ایک روبل جرمانہ کیا جاتا ہے لیکن وہاں یہ احساس کہ فرد قوم کے لئے اور قوم فرد کے لئے ہے اس قدر قوی ہے کہ کوئی شخص اِن احکام کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ چنانچہ ہمیں اس فرمانبرداری کے جذبے اور نتیجۃً وہاں کے بازاروں کی غیر معمولی صفائی کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اگر یہ قاعدہ یہاں یا کسی اور بڑے دارالسلطنت میں جاری رہے تو اس کا مطلب صفائی کے سالانہ مصارف میں لاکھوں پاؤنڈ کی بچت ہے۔

روس کے کارکنوں کو بہتر غذا اور بہتر لباس میسر ہوتا ہے اور وہ اپنے غیر ملکی بھائیوں کے مقابلہ میں زیادہ خوش ہیں۔ کارکنوں کی حالت بیان کرتے ہوئے میجر گریم پول لکھتے ہیں:-

ہر اُس تختۂ زمین سے جو لوگوں کے لئے چمن یا تفریح گاہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے پورا پورا کام لیا جاتا ہے۔ تعمیر کا کام بھی جاری ہے اور کارکنوں کے لئے مکان اور فرود گاہیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ ان میں سے اکثر عمارتیں جدید ترین ضروریاتِ آسائش کو پیش نظر رکھ کر بہت اچھی طرح بنائی اور مکمل کی گئی ہیں۔ ہر گھر کے ساتھ وسیع باغ اور بچوں کے کھیلنے کا میدان ہے۔ بچوں کے رکھ رکھاؤ اور حفاظت

کا خیال خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ جنسی امتیازات حتی الامکان اُٹھا دیئے گئے ہیں اور عورتیں اور مرد دونوں یکساں کام کرتے ہیں۔ کام کو جاتے وقت عورتیں اپنے بچوں کو سرکاری پرورش گاہوں میں چھوڑ سکتی ہیں جہاں غسل خانے، بستر، کھلونے، کھیل کا سامان، ڈاکٹر اور نرسیں وغیرہ ہر وقت موجود ہوتی ہیں۔ یہاں بچوں کی حفاظت اور اُن کی خوراک کا بہت اچھی طرح خیال رکھا جاتا ہے اور کام سے فارغ ہونے پر مائیں بچوں کو اپنے ساتھ گھر لے جا سکتی ہیں۔

اس قسم کی پرورش گاہیں سٹیشنوں پر بھی موجود ہوتی ہیں جہاں تھکی ہوئی مائیں بچوں کو آرام اور حفاظت میں چھوڑ کر خود گاڑی کا انتظار کر سکتی ہیں۔ ہم نے ایک محل کے ملحقہ میدانوں میں بہت سے بچوں کو نرسوں کی حفاظت میں کھیلتے دیکھا۔ داخل کرنے سے پہلے ہر بچے کا طبی معائنہ کیا جاتا ہے تاکہ کوئی مریض بچہ دوسرے بچوں کو مبتلائے مرض نہ کر دے۔ بچے بہت مسرور اور خوشحال معلوم ہوتے ہیں۔

حبشہ کی تاریخی اور جغرافیائی حیثیت

افریقہ کی آخری خود مختار سلطنت جسے اٹلی نے نیست و نابود کر دینے کا تہیہ کیا ہے دو ہزار سال سے قائم ہے۔ اس میں قدیم ترین عیسائیوں کی ایک جنگجو اور محبِ وطن قوم آباد ہے جس پر نسلاً بعد نسل ایک ایسے خاندان کے بادشاہ حکمران رہے ہیں۔ جسے بنی خود مختاری جان کی طرح عزیز ہے۔ بیرونی حملہ آور دو ہزار سال کی اس مدت میں حبشہ پر متواتر یورشیں کرتے رہے لیکن یہ پُراسرار سرزمین اب تک غیر مفتوح رہی ہے۔

اہلِ حبشہ جو قدیم ترین اقوام میں سے ہیں خدا ترس لوگ ہیں اور اُن کا شہنشاہ اپنے آپ کو حضرت سلیمانؑ اور بلقیس ملکۂ سبا کی اولاد سے بتاتا ہے۔ یہ لوگ تیسری صدی میں عیسائی ہوئے تھے جب یورپ کو مسیحی مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ حبشہ کی تاریخ نہ صرف اپنی قدامت کے لئے بلکہ ہر حملہ آور پر فتح و نصرت کی ایک مسلسل فہرست ہونے کے لحاظ سے بھی اپنے باشندوں کے لئے مایۂ ناز ہے۔ غیر ملکیوں کے سامنے سرِ اطاعت خم کرنے کا خیال اہلِ حبشہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد ایک ہزار سال تک حبشہ کی تاریخ پر راز کا پردہ پڑا رہا لیکن پھر بھی کبھی کبھی اس کی بربری شوکت و شان اور زینت کے وقت میں اس کی شجاعت و شہامت کی جھلکیاں نظر آتی رہیں۔ جب کفارِ عرب نے مسلمانوں کا قافیہ تنگ کر دیا اور وہ حبشہ کی طرف ہجرت کر کے گئے تو نجاشی نے انہیں پناہ دی۔ اس کے نتیجہ کے طور پر عرب کے بدوی قبائل اور اہلِ حبشہ کے درمیان جنگ ٹھن گئی۔ یہ جنگ تاریخ کی اوّلین جنگوں میں سے ایک ہے۔ شہنشاہِ حبشہ کو اس میں نتیجہ ہلاکت ہوئی۔ اس کے سالہا سال بعد ترکوں کے دل میں حبشہ کے فتح کرنے کا خیال پیدا ہوا لیکن وہ بھی ناکام رہے اور شہنشاہِ حبشہ کو فتح حاصل ہوئی۔ اس ملک پر اسی طرح کتنے ہی اور حملے ناکام رہے۔ اس کی آزادی پر آخری حملہ گزشتہ صدی کے آخر میں اٹلی نے کیا تھا لیکن وہ بھی ناکام رہا۔ اٹلی کے موجودہ حملہ میں شاید گزشتہ شکست کا انتقام بھی کام کر رہا ہے۔ گزشتہ حملہ کا خوفناک درقاتانہ جواب

حبشہ نے فی الفور دبا تھا اور اڈووا کے معرکے میں حبشیوں نے اطالوی کشتوں کے پشتے لگادیئے تھے۔ دس ہزار اطالوی تہ تیغ ہوئے اور تین ہزار قید کر لئے گئے۔ جو بچ کر اٹلی پہنچے وہ خوف و دہشت کے ایسے افسانے اپنے ساتھ لیکر گئے جواب تک اٹلی کے حافظہ میں محفوظ تھے اور جنہوں نے موجودہ حملہ میں اطالویوں کے جذباتِ انتقام کو بڑی حد تک اُبھارا۔ بہرحال اُس موقع پر بھی ملک کی طبعی خصوصیات اور باشندوں کی بہادری کے طفیل حبشہ کو حسب معمول کامیابی حاصل ہوئی۔

جغرافیائی خصوصیات

حبشہ ایک بلند سطح مرتفع پر واقع ہے۔ جگہ جگہ پہاڑیاں، ندی نالے اور گھاٹیاں وغیرہ ہیں جن کی وجہ سے اس ملک کا فتح کرنا بہت دشوار ہے۔ اس کے تین لاکھ پچاس ہزار مربع میل نہایت زرخیز اور پیداآور ہیں۔ یہ گویا بحر صحرا میں ایک بہت بڑا نخلستان ہے۔ حبشہ کی یہی زرخیزی وہ کشش ہے جس کے باعث اس ملک پر ایک سے زاید مغربی طاقتوں کی ہوس پرور نظریں جمی ہوئی ہیں۔ جہاں حکومتِ حبشہ نے مغربی ممالک کو اپنے ملک میں تجارت اور آمدورفت کے وسائل مہیا کرنے میں آسانیاں بہم پہنچائی ہیں وہاں اہلِ حبشہ اپنے استقلال کے بھی سختی سے محافظ رہے ہیں۔ اب جبکہ اٹلی نے حبشہ کی آزادی پر ایک کاری ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا ہے اس ملک کی قسمت بہت سی اُن دوسری سلطنتوں کی قسمت سے وابستہ ہے جو حبشہ کی طرح مجلسِ اقوام کی رکن ہیں۔ حبشہ مجلسِ اقوام کے اوّلیں اراکین میں سے ہے اور حبشہ کے معاملہ میں مجلس کی ناکامی خود اُس مجلس کے بنیادی اصول کی ناکامی ہوگی جس پر جنگ کے بعد دنیا نے اپنی حفاظت کی ذمہ داری کے متعلق اب تک پورا پورا اعتماد رکھا ہے۔

موجودہ جنگ کی بڑی وجوہ دو ہیں: تجارتی توسیع کی حرص اور شہنشاہی اقتدار کی ہوس۔ سیاسی نقطۂ نظر سے حبشہ کا محلِ وقوع بہت اہم ہے اس کے گرداگرد برطانی، فرانسیسی اور اطالوی مقبوضات واقع ہیں۔ برطانیہ کے قبضہ میں سرحد کے دو ہزار مربع میل اور اطالیہ کے پاس ایک ہزار سے کچھ زاید مربع میل ہیں۔ موجودہ اطالوی حبشی مناقشے کا برطانی مفاد سے گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ نیل جو مصر کی آبادی کی روحِ رواں ہے اس کا منبع حبشہ ہی کے پہاڑوں میں ہے۔

حبشہ پر حملہ اور اطالوی نقطۂ نظر

اطالیہ اور حبشہ کی آویزش کے متعلق "انگلش ریویو" میں لیوگی ولیری نے اطالوی نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے ایک پُرزور مقالہ لکھا ہے۔ صاحبِ مضمون انگریزوں پر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ موجودہ پیش قدمی میں اٹلی نے وہی طرزِ عمل اختیار کیا ہے جو خود انگریزوں نے اُس ابتدائی زمانے میں اختیار کر رکھا تھا جب برطانی نوآبادیاں قائم نہ ہوئی تھیں۔ چنانچہ ولوال کا حادثہ یا سرحد کی حفاظت کے متعلق اطالیہ کی عدم استعداد ہی تنہا وہ اسباب نہیں جو افریقہ میں اٹلی کی پیش قدمی کا موجب ہوئے ہیں۔ اس جنگ کا اصلی سبب اٹلی کے طرزِ عمل کا جواز راقمِ مضمون نے یُوں ثابت کیا ہے:۔

"برطانی نقطۂ نظر یہ ہے کہ اٹلی کا موجودہ اقدام لیگ کے وقار اور اقوام کی باہمی حفاظت کے نظام کو صدمہ پہنچائے گا اور اگر عہدِ ماضی میں برطانیہ نے وسیع نوآبادیاں حاصل کیں اور ان کے حاصل کرنے میں عموماً تشدد سے کام لیا تو اس کے لئے یہ آج ممکن نہیں کیونکہ اب لیگ اس قسم کے اقدامات کو روکنے کے لئے موجود ہے ۔ اٹلی کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ اب جبکہ برطانیہ کو ہر وہ چیز حاصل ہو چکی ہے جس کی اُسے ضرورت تھی اس کے لئے لیگ کے راگ گانے ہی میں خیر ہے تاکہ لیگ ایک سپاہی کی طرح دوسروں کے ہر ایسے کام میں حائل ہو جو اپنے وقت میں برطانیہ نے نہایت آزادی سے انجام دے لیا ۔ اس صورتِ حالات میں برطانیہ اپنے آپ کو منافقت کے الزام سے بری قرار نہیں دے سکتا کیونکہ وہ لیگ سے ایک خدائی فوجدار کا کام لیکر ہر ملک کو اس کی "حیثیتِ موجودہ" پر قائم رکھنا چاہتا ہے ۔ یہ "حیثیتِ موجودہ" برطانیہ کے لئے تو بہت مفید ہے لیکن دوسرے ممالک کے لئے غیر معمولی طور پر ناموافق ہے"

یہ تو اٹلی اور انگلستان کے باہمی خیالات ہیں لیکن کیا اٹلی نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ دوسروں کے ہاتھوں اپنے ملک کی تباہی کے متعلق حبشہ والوں کے کیا خیالات ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی کیا دولِ یورپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ اُن کی حیثیت موجودہ جس کا علی حالہا قائم رکھنا لیگ کا فرض ہے کمزور قوموں کے خون سے آلودہ ہے اور اس کا دامن ان ننگِ انسانیت دھبوں سے جلد از جلد پاک ہونا چاہئے ہر وہ حیثیتِ قائمہ جس کا وجود انصاف کے خون کا شرمندۂ احسان نہیں بلاشبہ حفاظت کے قابل ہے لیکن جس کی حالت اس کے برعکس ہے خود لیگ کا فرض ہے کہ اس کو کالعدم قرار دے ۔ کیونکہ جانبدارانہ انصاف لیگ کے عدم و وجود کو برابر کر دے گا ۔

پنسلوینیا کی قابلِ تقلید مثال

پنسلوینیا میں چار لاکھ پچاس ہزار حبشی آباد ہیں جو اب تک اپنے ملک میں تقریباً ہندوستان کے اچھوتوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے حال ہی میں ایک نئے قانون کے مطابق ان کو اپنے سفید فام بھائیوں کے ساتھ پوری طرح درجۂ مساوات عطا کر دیا گیا ہے ۔ ہر ہوٹل کے دروازے حبشیوں کے لئے قانوناً کھول دیئے گئے ہیں ۔ وہ تیرنے کے ہر عام تالاب کو استعمال کر سکتے ہیں ۔ وہ گاڑیوں اور بسوں میں جہاں چاہیں آزادانہ بیٹھ سکتے ہیں ۔ وہ تھیٹروں اور دوسری تفریح گاہوں میں حسب منشا کسی سفید فام عورت کے نزدیک نشست حاصل کر سکتے ہیں اور تھیٹر وغیرہ کا منیجر انہیں اس سے روکنے کا مجاز نہیں ۔ ریاست کے حبشیوں کی مساوات کے مسودۂ قانون نے یکم ستمبر کو مجلس وضع قوانین کے دونوں ایوانوں سے گزر کر ایک مسلّمہ قانون کی حیثیت حاصل کر لی ۔ یہ امر بہت غنیمت ہے کہ امریکا کی کم از کم ایک ریاست نے تو قانوناً حبشیوں کے درجۂ مساوات کو تسلیم کر کے انہیں معاشری ترقی کا موقع دیا تاکہ وہ ریاست کے سفید فام باشندوں کے برابر ہو سکیں ۔

روتھ

رُوت
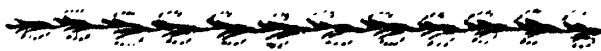
رُوت اور نعومی کی "افسانوی" محبت کی حکایت "وثیقۂ قدیم" میں درج ہے۔ موت نے پردیس میں نعومی سے اُس کا شوہر چھین لیا۔ اُس سے نعومی
ے دو لڑکے تھے جن کے ساتھ شوہر کے مرنے کے بعد اُس نے دس برس اور پردیس میں کاٹے۔ ان دونوں لڑکوں نے وہیں دو لڑکیوں سے شادی کر لی۔
ہیں سے ایک لڑکی کا نام رُوت تھی۔ آخر نعومی کے دونوں لڑکوں کو بھی موت لے گئی اور اُس نے واپس وطن جانے کا ارادہ کیا۔ رخصت ہونے سے پہلے اُس نے
ونوں بہوؤں کو بلا کر کہا "بیٹیو! جس طرح تم نے میری اور میرے مرحوم بچوں کی خدمت کی ہے خدا تمہیں اس کا اجر دے۔ اب میں وطن جا رہی ہوں۔
م دونوں اپنے اپنے ماں باپ کے گھر جاؤ۔ خدا تمہیں تسکین دے اور تم نئے گھروں میں آباد ہو۔" یہ کہہ کر اُس نے دونوں کو پیار کیا۔

لڑکیوں نے کہا "نہیں اماں ہم تمہارے ساتھ ہی تمہارے وطن جائیں گے۔ ہم تمہیں نہ چھوڑیں گے۔"

نعومی نے کہا "نہیں میری بیٹیو! میرے ساتھ جا کر کیا کرو گی۔ میں اب بہت بوڑھی ہو گئی ہوں۔ میرے اور بیٹے بھی نہیں کہ اُن سے
نہیں بیاہ دوں۔ یہ جوانی کا رنڈاپا کس طرح کٹے گا۔ جاؤ میری بیٹیو! خدا تمہارا بھلا کرے۔"

اس پر دونوں رونے لگیں اور بڑی بہو نے ساس کے ہاتھوں کو چوما اور رخصت ہوئی لیکن رُوت نعومی سے لپٹ گئی۔

نعومی نے کہا "دیکھو میری بیٹی تمہاری بہن اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی ہے۔ اب تم بھی جاؤ۔"

اس پر رُوت نے کہا:-

مجھے کیوں اپنا ساتھ چھوڑنے پر مجبور کرتی ہو
جدھر تم جاؤ گی میں تمہارے پیچھے پیچھے جاؤں گی
جہاں تم رہو گی، میں بھی وہیں رہوں گی
تمہارے عزیز میرے عزیز ہوں گے
اور تمہارا خدا میرا خدا
جہاں تم مرو گی؛ میں بھی وہیں مروں گی
اور اُسی مٹی میں دفن ہوں گی
اب موت ہی مجھے تم سے جدا کر سکے گی

نعومی یہ سُن کر مجبور ہو گئی اور دونوں اکٹھی نعومی کے وطن پہنچیں۔ یہاں رُوت نعومی کے ایک رشتہ دار کے کھیتوں میں مزدوری کر کے اپنا اور نعومی کا پیٹ بھرنے لگی۔
کچھ عرصے کے بعد نعومی کے ایما سے رُوت نے اس رشتہ دار سے شادی کر لی اور جب رُوت کے بچہ پیدا ہوا تو نعومی نے اُسے گود میں لیا اور
اپنے بچے کی طرح اُس کی پرورش کرنے لگی۔ بچے کی پیدائش کے موقع پر ہمسائے کی سب عورتیں یہی کہتی تھیں کہ نعومی کا بیٹا پیدا ہوا ہے۔
اس لڑکے کا نام عوبید رکھا گیا۔ یہ ایشا کا باپ تھا جو داؤد کا باپ تھا۔

دو عورتوں کی محبت کی یہ قدیم مذہبی حکایت بدیع المثال ہے۔ رُوت کو شوہر سے زیادہ نعومی سے اُنس تھا۔

حامد علی خاں

مرزا محمد رفیع سوداؔ کی غزل گوئی پر ایک نظر

مرزا محمد رفیع سوداؔ کا وہ کارنامہ جو اُن کی حیاتِ جاوید کا باعث ہُوا نہ اُن کی غزل ہے نہ رُباعی نہ مرثیہ نہ مخمس بلکہ قصیدہ ہے۔ اس موضوع کو ہم آئندہ پیش کریں گے۔ فی الحال ہم اُن کی غزلیات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اردو شاعری کا رنگِ تغزل معراجِ ترقی پر پہنچ چکا تھا اس سے پہلے کسی عہد نے اس پر فضیلت نہیں پائی لیکن اس صف کے مردِ میدان میر تقی میرؔ تھے جن کی غزلوں سے سوداؔ کی غزلوں کا عموماً موازنہ کیا جاتا ہے۔ میرؔ کے درد و حزن اور یاس و نامرادی کا جواب سوداؔ کے یہاں نہیں اور نہ غالباً انہوں نے اس کے لئے کبھی کوشش کی لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سوداؔ کے یہاں یہ چیزیں نہیں ہیں۔ سوداؔ کی طبیعت اس قدر یاس پسند نہ تھی بلکہ طبیعت میں انتہا درجہ کا مزاح اور شگفتگی تھی لہذا انہوں نے درد کے خیالات پیش کئے لیکن اس طرح نہیں کہ پڑھ کر دل کی رگیں ٹوٹ جائیں بلکہ اس طرح کہ درد کا لطف رہ رہ کر انسان حاصل کرے گویا ایک ڈرامانویس ہے جو لوگوں کو اپنے اندازِ جادو بیانی سے موقع دیتا ہے کہ رہ رہ کر یاس و حزن کے حملے برداشت کریں۔

مرزا سوداؔ علم بلاغت کے بڑے زبردست ماہر معلوم ہوتے ہیں۔ ایک اشارہ نفسِ مضمون کی طرف اس طرح کر دیتے ہیں کہ واقعے کا خاکا پیشِ نظر ہو جائے اور تفسیر آپ کا ذہن خود سمجھ لے۔ میرؔ کی وجہ سے جو یاس اُردو شاعری میں پیدا ہو چلی تھی اگر سوداؔ کو بھی اسی کی دُھن لگ جاتی تو اُردو شاعری مضامینِ یاس کا مجموعہ ہو کر رہ جاتی اور ممکن تھا کہ سوداؔ کا پاؤں لغزش کر جاتا۔ اور وہ اُن نازک مقامات کو اس خوبی سے ادا نہ کر سکتے جو میرؔ ہی کا حصّہ ہے۔ اس لئے کہ روزِ ازل سے سوداؔ ایسی طبیعت لائے تھے جس میں سمندر کا سا جوش تھا چنانچہ آپ ملاحظہ فرمائینگے کہ ان کی غزلوں میں ہر جگہ یہ دو چیزیں نمایاں ہیں۔ بندش کی چُستی مصرعوں کو آپس میں دست و گریباں کئے رکھتی ہے۔ اُن کا زور غزلوں میں بھی خاص کر اُن زمینوں میں بہت زیادہ نمایاں ہے جو مشکل کہی جا سکتی ہیں یعنی بالفاظِ دیگر مشکل زمین ہیں سوداؔ کا قلم نہایت خوبی سے چلتا ہے۔ مثلاً

کسے طاقت ہے شرحِ شوق اُس مجلس میں کرنے کی	اُٹھا دینے کی ڈر سے سانس واں لیتے ہیں رہ رہ کر
دماغ آشفتہ یاں ہوتا ہے غنچے کے چٹکنے سے	چمن میں ہم سے اے بلبل پرے ٹک جا کے چہ چہ کر
بچشمِ فہم کھولے ہے اُسے ذی ہوش اے یارو	رکھوں ہوں لفظ و معنی کو جو میں مصرع میں تہ کر

خدا جانے اُس وقت کی قدردانی تھی یا لوگ ہی نازک دماغ ہوتے تھے کہ بات کی تاب ہی نہ لا سکتے تھے۔ میر تقی میرؔ کی

یہ خصوصیت افسانے کی طرح مشہور ہے۔ مگر سودا بھی اس میدان میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ غزلوں میں خودداری اور خودنمائی کا اظہار جا بجا کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ خیال کی بلندی اس حد تک ہے کہ غالب اور میر کے سوا مشکل سے کوئی دوسرا شاعر وہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ وسیع النظری کا یہ عالم ہے کہ جس مسئلہ کو بڑے بڑے صوفیوں نے حل کیا ہوگا اُس کو وہ اپنی غزل میں بلا ژرمنی کے ساتھ ایک معمولی بات کی طرح بیان کرجاتے ہیں۔ مثلاً

راز دیر و حرم افشا نہ کریں ہم ہرگز ورنہ واں کیا ہے جو ہو اپنی نظر سے باہر

عشق | ہندو ہیں بت پرست مسلماں خدا پرست پوجوں میں اُس کسی کو جو ہو آشنا پرست

یعنی اُن کے نزدیک جس کا دل سراپا محبت ہے وہی قابلِ قدر ہے ورنہ ہندو مسلمان دونوں بیکار ہیں۔

سودا کا عشق اپنی جگہ نہایت مکمل معلوم ہوتا ہے اُن کے طرزِ بیاں سے معلوم ہوتا ہے کہ عشق کی دنیا میں کافی مدت تک رہنے سے دل اُس کی لذت اور اثرات سے اس قدر خوگر ہوگیا ہے۔ کہ معمولی تکالیف و مصائب سے سیری نہیں ہوتی مثلاً۔

دلِ ناآشنائے نالہ سے صد رہ جرس بہتر نہ ہوں مژگاں جو خوں آغشتہ اُن سے خار و خس بہتر

عام دُنیا کی نظروں کو دُنیائے عشق کے قوانین ذلیل اور معیوب نظر آتے ہیں گر جو لوگ اس دُنیا کے رہنے والے ہیں اُن سے کوئی پوچھے تو وہ بتائیں گے کہ اس کے آئین تمام زمانے سے نرالے ہیں چنانچہ ایک موقع پر کہتے ہیں:۔

شہیدِ رسمِ ملکِ حسن دل میرا ہے اے ہمدم کہ سمجھے قتل فریادی جہاں ہر داد رس بہتر

سودا کے نزدیک وہ دل دل کہلانے کا مستحق نہیں ہے نہ وہ انسان انسان ہے جس کے خمیر میں عشق اور محبت کے بے چین ذرات شامل نہ ہوں اس موضوع پر اُردو کے اور بہت سے شعرا نے طبع آزمائی کی ہے بالخصوص غالب نے مگر سودا اس لحاظ سے اور بھی قابلِ قدر ہیں کہ غالب سے پہلے اُنہوں نے اُردو کی دُنیا میں اس قسم کے خیال کا اظہار کیا۔ فرماتے ہیں:۔

دلِ ناآشنائے نالہ سے صد رہ جرس بہتر نہ ہوں مژگاں جو خوں آغشتہ اُن سے خار و خس بہتر

عشق میں جو کچھ حالت ہوتی ہے وہ معمولی نگاہوں سے نظر نہیں آتی لیکن جو کچھ اہلِ دل کا مسلک ہے اُس کا اندازہ سودا نے جا بجا نہایت ہی خوبی کے ساتھ کیا ہے:۔

عاشق فنا میں اپنی بہبود جانتے ہیں جی کا زیاں جو ہوئے سو سود جانتے ہیں

غزلیات میں چونکہ عشق سے زیادہ سروکار ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سودا کے یہاں سے داستانِ حسن و عشق کو کسی قدر واضح طور پر بیان کریں۔ سب سے پہلی چیز جو اس قسم کی شاعری میں دیکھی جاتی ہے درد۔ سوز۔ گداز ہے جس کے متعلق ہم

ابتدا ہی میں مختصر طور پر اپنے خیال کا اظہار کر چکے ہیں لیکن وہاں یہ گنجائش نہ تھی کہ ہم سودا کی افتادِ طبیعت اور باطنی کیف پر کچھ گفتگو کر سکتے۔ سودا کا دِل تاثیرِ محبت میں ڈوبا ہؤا ہے۔ لہٰذا اُن کے کلام میں اس قسم کے خیالات بیشتر ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص آپ بیتی بیان کر رہا ہے اور چونکہ وہ سرگذشت دل کی ہوتی ہے لہذا بناوٹ اور تصنّع سے بے لوث اور اثر میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے لیکن اس تصویر کا ایک رُخ اور بھی ہے جس کا پوشیدہ رکھنا تنقید کے صحیح معنوں کے خلاف ہوگا۔ لہٰذا اُسے بھی دکھا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سودا بالطبع ہنسنے ہنسانے والے آدمی تھے جس کی وجہ سے کبھی ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جو اُن کے شایانِ شان نہ تھیں یعنی کلام میں سوقیانہ پن اور ابتذال پیدا ہو جاتا ہے اور اگرچہ اس قسم کے اشعار اور خیالات عموماً جنابِ شیخ کے متعلق لکھے گئے ہیں لیکن پھر بھی معیوب اور سخت معیوب معلوم ہوتے ہیں خواہ یہ ہنسنے ہنسانے کے لئے لکھے گئے ہوں یا اُن کا مذاق ہی ایسا ہو ہم انہیں کسی طرح پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ ہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ یہ خارستان خال خال ہے۔ عموماً اُن کے کلام سے انبساط اور انشراح پیدا ہوتا ہے۔ کلام میں مزہ پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں اور یہ کوشش بے سود نہیں ہوتی بلکہ وہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اس مزے میں مزا یہ ہے کہ معنویت اور بلاغت دونوں نمایاں رہتی ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

الٰہی ہے سکت نعم البدل کے تجھ کو دینے کی ۔۔۔ مجھے اس کے عوض تو کچھ نہ دے پر پھیر لے دل کو

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلا اے شیخ ۔۔۔ تو مجھے گبر کہے گبر مسلماں مجھ کو

کو ہمن تک ہی تھی جس دِل کی مجھ کو قیمت ۔۔۔ قسمت کہ یک نگہ پر میں اُس کو ڈال آیا

اخلاقیات | اُردو شاعری میں تنگ نظروں کو بجز گل و بلبل کے اور کوئی چیز مشکل سے ملتی ہے اور یہ بدگمانی غزل کے میدان میں آکر درجۂ یقین تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر جن کو خدا نے آنکھیں دی ہیں اور تعصب و تنگ نظری کے پردے ہٹانے کی بھی سکت رکھتے ہیں اُن کو بہت جلد نظر آتا ہے کہ یہ خیال نہ صرف غلط ہے بلکہ جہالت کی دلیل ہے۔ غزل باوجود غزل ہونے کے اپنا دامن اس قدر وسیع رکھتی ہے کہ چمنِ دہر کا مشکل سے کوئی ایسا گُل ہوگا جو اِس میں نہ ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ وارداتِ قلب اور حسن و عشق کے افسانوں کو اس میدان میں غلبہ حاصل ہے لیکن زندگی کے مختلف شعبے اور کائنات کے گوناگوں مسائل اس خوبی کے ساتھ اُردو غزلوں میں نظم کئے گئے ہیں کہ جہاں کہیں نظم کر دیئے گئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ مؤثر پیرایہ میں انہیں بیان کرنا مشکل تھا۔ فلسفے اور تصوف کے علاوہ غزلوں میں اخلاقیات کا ایک بیش بہا خزانہ شعراء اردو نے جمع کر دیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ابھی کبھی

انتخاب نے ان جواہر پاروں کو ایک جگہ جمع نہیں کیا لیکن با ایں ہمہ جہاں کہیں بھی منتشر حالت میں یہ پڑے ہوئے ہیں اپنی آب و تاب کے زور پر حقوق ہیں نظروں کو فوراً متوجہ کر لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ کسی ایک شاعر یا عہد سے وابستہ نہیں ہے بلکہ اُردو کے ابتدائی عہد سے لے کر آج تک یہی رنگ چلا آتا ہے۔ وَلی، میر، درد وغیرہ کے علاوہ سودا نے بھی اخلاق کے مسائل پر جو طبع آزمائی کی ہے وہ اس قدر دلکش ہے کہ ہم اُس کو بغیر پیش کئے ہوئے نہیں رہ سکتے۔

سب سے پہلے ہم اُس چیز کو لیتے ہیں جو دُنیا میں ہر شخص کی نظروں میں خار ہے ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

ہرگز نہ مر تو قصر فریدوں کے رشک سے ——— جا گہ کر اپنی دوست دلِ خوب وزشت میں

اس معاملہ میں سودا کا مطمح نظر صرف دُنیا کے مال و دولت تک محدود نہیں بلکہ وُہ سب سے بیش بہا شئے یعنی جانِ شیریں کی طرف بھی نظر اُٹھا کر دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ کس خوبی سے کہا ہے:۔

کسی کی مرگ پر سوداؔ نہ کیجے چشم تر ہرگز ——— بہت سا رویئے اُن کو جو اس جینے پہ مرتے ہیں

بخوفِ طوالت ہم زیادہ اشعار پیش نہیں کرتے اور اخلاق کے دوسرے شعبوں کی طرف نظر اُٹھاتے ہیں۔

قناعت | قناعت کے متعلق جو کچھ خواجہ آتش نے کہدیا ہے وہ اُردو کے لئے باعثِ فخر و ناز ہے لیکن جو کچھ اُن کے پہلے سودا نے کہا ہے اُس کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؛

نظر میں اُن کی جن کو دولت استغنا کی بخشی ہے ——— مگس سے ہے ہُما بہتر ہُما سے ہے مگس بہتر

ایک جگہ اور فرماتے ہیں:۔

اسباب سے جہاں کے کچھ اب پاس گو نہیں ——— یہ فکر تو نہیں ہے یہ ہے اور وہ نہیں

بے ثباتیِ دنیا | اہلِ مذہب نے اس دنیا کو گھر بنا کے رہنے سے منع کیا ہے۔ عربی، ہندی، فارسی شاعری ان خیالات سے مملو ہے لیکن اُردو کے شعراء نے جو کچھ اس موضوع پر کہا ہے وہ کسی سے کم نہیں۔ اُردو کے ابتدائی دَور سے یہ خیال کہ دُنیا فانی ہے یہ رہنے کی جگہ نہیں دار القرار کہیں اور ہے شعراء کے دلوں میں جاگزیں تھا چنانچہ قطب شاہ وغیرہ نے اپنے یہاں اس خیال کو جگہ دی ہے لیکن جس خوبی سے سودا نے اس موضوع کو دلچسپ بنایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ نہ تو نصیحت کی تلخی معلوم ہوتی ہے نہ شعر کی لذّت میں فرق آتا ہے نہ نصیحت کی تاثیر میں کمی معلوم ہوتی ہے بلکہ دلکشی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

کرے ہے سرنگوں اس بات میں کثرت تعلق کی ——— ثمر کا بیشتر ہونا جھکا دیتا ہے ڈالی کو

چند اور اشعار ملاحظہ فرمایئے:۔

کیا اس چمن میں آن کے لے جائے گا کوئی | دامن کو میرے سامنے گُل جھاڑ کر چلا

کسی کی برگ پر سودا نہ کیجو چشم تر ہرگز | بہت سا رویئے اُن کو جو اس جینے پہ مرتے ہیں

دُنیا سے علیحدگی | دُنیا سے تنفّر پیدا کرنے کے لئے طرح طرح سے مضمون پیدا کئے ہیں مثلاً :۔

غفلت میں زندگی کو نہ کھو گر شعور ہے | یہ خواب زیرِ سایۂ بالِ طیور ہے

حرص | انسان کو قناعت کی نعمت سے سرفراز کرنے کے لئے حرص کی مذمت بھی ضروری تھی چنانچہ جس خوبی سے سودا نے اپنے اس فرض سے سبکدوشی حاصل کی ہے اُس کی مثالیں بھی اُن کے کلیات میں بہت ہیں۔ مگر ہم صرف ایک شعر پر فی الحال قناعت کرتے ہیں :۔

ہرگز نہ مر تو قصرِ فریدوں کے رشک سے | جا گہ کر اپنی دوستِ دل خوب و زشت میں

اصولِ زندگی | اسی سلسلہ میں یہ بھی عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جا بجا دُنیا میں زندگی بسر کرنے کے طریقے سودا نے اتنے جامع بتا دیے ہیں کہ شاید نثر میں تشریح کے لئے پوری کتاب کی ضرورت ہو ملاحظہ ہو :۔

غلام اُس کی ہیں ہمت کا ہوں کہ جو اپنے | جگر کے خون کو خوانِ تونگری جانے

مقامِ عدل پہ جس دم سریر آرا ہو | ہر ایک خورد و کلاں میں برابری جانے

وہی ہو رائے مبارک میں اس کی گوشہ نشین | کہ جس میں خلقتِ عامہ کی بہتری جانے

ملازموں سے نہ لاوے یہ اُس کو بر سر کار | کہ جس سے کارِ خلائق کی اَبتری جانے

ہمیشہ جود و کرم میں سمجھ ہر ایک کی قدر | مساوی از امرا تا بہ لشکری جانے

اس قسم کے بے شمار اشعار موجود ہیں مگر طوالت کے خوف سے گھبراتا ہوں۔

تصوّف | اُردو شاعری میں تصوّف کی دلکشی کا اتنا غلبہ ہُوا کہ ہر شخص تصوّف کے دو چار شعر موزوں کر لیتا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ خود صُوفی ہے یا رند۔ اور ہمارے نزدیک یہ بحث بیکار بھی ہے۔ اس لئے کہ دُنیائے شاعری میں بحث شعر اور کیف سے ہے نہ کہ شاعر اور اُس کی ذات سے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ کیا کہا گیا۔ اس سے کیا غرض کہ کس نے کہا۔ اس لحاظ سے سودا گو صوفی نہ تھے مگر اُن کے شعر میں اگر تصوّف کے نکات نظر آجاتے ہیں تو اُس پر تنقیدی نگاہ نہ ڈالنا گویا انصاف کے خلاف کرنا ہے۔

یوں تو تصوّف کے چند مسائل ایسے ہیں جو ہر شاعر کے یہاں مل جائیں گے لیکن ہم سودا کے یہاں سے یہ چیزیں پیش

کرنا عبث سمجھتے ہیں۔ اُن کے یہاں سے چند خاص مسائل کو لے کر تھوڑی سی گفتگو کریں گے۔

دِل۔ صوفیوں کے نزدیک دل کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ شاید کسی اور کے نزدیک نہیں۔ تمام صوفیوں نے اس پر اتنا زور دیا ہے کہ اُس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ منازلِ سلوک میں اگر دل ہی پر بھروسہ کیا جائے تو منزلِ مقصود تک پہنچ جانا مشکل نہ ہوگا۔ شاعروں نے تصوف کے اس عجیب وغریب عنوان کو خوب خوب نبا ہا ہے۔ میر تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں:۔

طریقِ عشق میں ہے رہنما دل　　پیمبر دل ہے، قبلہ دل، خدا دل

اس خیال کو ترقی دینا ناممکن تھا لیکن سودا نے جس رنگ میں کہا وہ بھی دیکھنے کے قابل ہے:۔

لے کے کعبے سے کیا سیر ہیں بُت خانے تک　　خانۂ دل ہی کی تعمیر بہت اچھی ہے

یہ خیال بھی جس قدر وسیع ہے محتاجِ بیان نہیں۔

رضاء۔ سالک راہِ محبت کے لئے سب سے بڑی چیز جس کی ہر قدم پر پابندی ضروری ہوتی ہے رضا ہے۔ خواہ انسان کسی عالم میں یا کسی حالت میں ہو محبوب کی فرمانبرداری ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں عقل سے کام لینا رضا، کو صدمہ پہنچاتا ہے، خواہ بات سمجھ میں آئے یا نہ آئے آنکھ بند کر کے عمل کرنا چاہیئے۔ اس موضوع پر سودا کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

یاد میں یار کے جو آپ کو سمجھیں ہیں فنا　　لے غرض دین سے نے اُن کے تئیں دُنیا سے

خدمتِ خلق۔ صوفیائے کرام کے نزدیک خدمتِ خلق بہترین عبادت ہے۔ مغرب کے بعض بے خبر اہلِ قلم اس بات سے بالکل ناواقف ہیں اور اپنی ناواقفیت کے دُور کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے بلکہ اپنی جہالت کو آئینِ علم سمجھ کر کہتے ہیں کہ مغرب و مشرق میں بالخصوص صوفیوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ وہاں کے صوفی خدمتِ خلق کے بجائے جنگل کی زندگی زیادہ پسند کرتے ہیں اور اس معاملہ میں انسانی ہمدردی کے جذبے کو اپنے لئے غیر ضروری سمجھتے ہیں برخلاف اس کے مغرب کا صُوفی بجائے گوشہ نشینی و صحرانوردی کے تمام زندگی وقف کر دیتا ہے خدمتِ خلق کے لئے۔ لیکن اُن کا یہ دعوےٰ حقیقت سے اُتنا ہی دُور ہے جتنا یہاں سے خود یورپ۔ ہمارے یہاں کا ایک بہت بڑا صُوفی شاعر خدمتِ خلق کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ:۔

فقیری بجز خدمتِ خلق نیست　　بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست　　(سعدی)

اُردو کے شعراء نے بھی اس بات کو بآوازِ بلند بار بار پکار کے کہا ہے کہ انسانی ہمدردی سب سے بڑی عبادت ہے۔ سودا نے بھی ایک نہایت خوبصورت کنایہ کے ساتھ اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے کہتے ہیں:۔

شیخ کعبے میں خُدا کو تو عبث ڈھونڈے ہے　　طالب اُس کا ہے تو ہر ایک کی کر دلجوئی

تابمقدور کسی سے بمروت پیش آ   سنگ ہے آئینۂ رو کے لئے بے روئی

شوخی | کلام میں ہلکی سی شوخی کبھی کبھی تاثیر کو چمکا دیتی ہے لیکن اگر ضرورت سے زیادہ ہو تو متانت اور سنجیدگی کا خون ہوجاتا ہے۔ سودا نے باوجود بہت بڑے ہجو گو ہونے کے غزل میں بڑی حد تک متانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ شوخی کا اظہار خواہ وہ معشوق ہی کی طرف سے ہو دائرۂ تہذیب سے باہر نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک مقام پر کہتے ہیں:۔

جنسِ دل کتنی ہے ناکارہ بہ بازار بتاں   ایک پوچھے یوں تو بولے دوسرا کس کام کو

رشک | مرزا غالب رشک کے مضامین کو معراجِ کمال تک پہنچا گئے ہیں اُن کا جواب اس میدان میں کوئی دوسرا نہیں ہوا ور نہ ہوسکتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا سے بھی اُن کو رشک آیا ہے۔ اس قسم کے خیالات نے لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا کہ غالب دنیا میں رشک کا پیام لے کر آئے تھے۔ اس وقت اس موضوع پر بحث کرنا منظور نہیں۔ ہم کو صرف اتنا بتانا ہے کہ سودا نے بھی رشک کے مضامین کو نہایت خوبی سے غزلوں میں نظم کیا ہے۔ ایک شعر میں ہے:۔

بس ہو تو رکھوں آنکھوں میں اُس آفتِ جاں کو   اور دیکھنے دوں میں نہ زمیں کو نہ زماں کو

تخاطب | غزل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ شاعر شعر اپنے لئے کہتا ہے اُس کو دُنیا سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور نہ وہ عوام کی پسند کا لحاظ رکھتا ہے لیکن اپنی مصیبت بیان کرنے کے لئے یا اظہارِ جذبات کے لئے کبھی معشوق اور کبھی شیخ وغیرہ کو مخاطب کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ سودا نے جہاں کہیں ان مواقع کو نباہا ہے شعر میں جان پیدا ہوگئی ہے۔ کبھی "یارب" کبھی "اے دل" وغیرہ شعر میں لکھ کر ایک یاس و حسرت کا مرقع سامنے رکھ دیتے ہیں۔ معشوق کو کبھی میاں، کبھی پیارے کبھی صنم کہہ کر پکارتے ہیں۔

زبان | سودا کا زمانہ زبان کے اعتبار سے نہایت ناہموار تھا۔ فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ ہندی اور بھاشا کے کریہہ فقرے شاہراہِ ترقی کے لئے وہ خاردار جنگل اور سخت پہاڑ تھے کہ قدم اُٹھانا دشوار تھا۔ اس طرف اُن کے اُستاد شاہ حاتم نے توجہ کی تھی مگر ایک آدمی کے بس کا کام نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے یہ خدمت سودا کے سپرد کی۔ سودا نے بہت کچھ راستہ صاف کیا لیکن پھر بھی معائب سے دامنِ زبان پاک نہ ہوسکا۔ سودا کی ان خدمات کا تذکرہ کہیں آگے آئے گا۔ فی الحال ہم کو اتنا بیان کردینا ہے کہ باوجود اس کے کہ سودا اُردو کی طرف ہمہ تن متوجہ تھے مگر پھر بھی فارسی کی پوری عبارت اور کچھ ایسے الفاظ اُن کے کلام میں ہیں کہ جو اُردو کے لئے کم سے کم اس زمانہ کی نظر سے نامناسب ہیں۔ مثلاً:۔

ہوں میں وہ وحشیٔ رم خوردہ کہ در دشتِ عدم   پات کھڑکے ہے تو مانندِ صدا جاتا ہوں

نصیحت کرنے سے سودا کو تو سمجھا نہ اے ناصح   کہ بایں پختہ مغزی میں خیالِ خام کرتا ہوں

اور اسی طرح حق لطف، بسیار نازک ہے وغیرہ اُن کے اشعار میں جابجا نمایاں ہیں۔ اور بالکل یہی حال ہندی الفاظ کے استعمال کا بھی ہے۔ چٹیالے، جتن، اُجگ، پھڑمت وغیرہ۔

مختصر یہ کہ اُن کی غزلیات میں فارسی اور ہندی دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ ملی ہے جس سے کہیں کہیں ثقالت پیدا ہو جاتی ہے لیکن اُس کے یہ معنی نہیں کہ اُن کی زبان کا یہ رنگ غالب ہے۔ اُن کی زبان عموماً نہایت نرم اور پُرلطف ہے۔ اگر ایک جگہ فارسی یا ہندی کے الفاظ اُردو غزل کے دامن پر بدنما نظر آتے ہیں تو سو جگہ اُنھوں نے فارسی اور ہندی کو سمو کر ایسی گلکاری کی ہے کہ جس کا جواب مشکل سے مل سکتا ہے۔ زبان کی خوبی یہ ہے اور بالخصوص غزل میں کہ شعر کو اپنے ساتھ لے کر دلوں میں اس طرح سے گھر کرلے کہ رگ و پے میں تاثیر کا دریا دوڑنے لگے۔ سوداؔ نے اپنا یہی اصُول رکھا ہے اُن کے تمام کلام میں سلاست، فصاحت اور دلکشی موجود ہے۔ اتنا ضرور ہے جیسا کہ اوپر عرض کیا کہ الفاظ کہیں کہیں نامانوس معلوم ہوتے ہیں اور جس کی خاص وجہ ہماری زبان کی روزافزوں ترقی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُس زمانے میں یہ الفاظ عام رہے ہوں اور اس ترقی یافتہ دَور میں وہ ہمارے لئے نامانوس اور اجنبی بن گئے ہوں۔ بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دو ایک فیصدی ایسے الفاظ مل جاتے ہیں جو کسی اعتبار سے پسندِ خاطر نہیں ہوسکتے۔

سوداؔ کی زبان غزل میں پھسپھسی نہیں ہے۔ الفاظ زوردار ہوتے ہیں۔ طرزِ بیان کی وجہ سے اور بھی زور آجاتا ہے حدودِ غزل کی نزاکت کا خیال قریب قریب ہر موقع پر رہتا ہے۔ ہمارے نزدیک سوداؔ کی غزلیات کو دیکھنے کے بعد یہ الزام کہ سوداؔ کی زبان غزل میں بھی قصیدے کی سی ہے درست نہیں۔ اور اسی اعتبار سے یہ بھی تنگ نظری کی دلیل ہے کہ سوداؔ غزل گو نہیں بلکہ قصیدہ گو ہیں۔ غالباً یہ دھوکا دو وجوہ سے ہوتا ہوگا۔

اوّل قصیدہ میں اُن کا پایہ تمام شعراء سے بلند ہے لہٰذا یہ خیال کیا گیا ہوگا کہ وہ قصیدہ ہی کہہ سکتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ اشعار کی بندش، مضمون کی چستی، مصرعوں کی باہم آمیزی جو مہارتِ فن کی دلیل ہے اور غزل کے لئے مایۂ ناز خصوصیت ہے وہی کم نظری کی عینک لگانے والوں کو اُن کی غزلوں میں قصیدے کا دھوکا دلاتی ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ قصیدے کی زبان سے سوداؔ کی غزلیات کی زبان بالکل جُدا گانہ ہے —— اُن کی غزلوں میں نہ تو پُرشکوہ الفاظ ہیں۔ نہ ادق بیانات ہیں نہ ایسی غیر معمولی ترکیبیں ہیں جو قصیدوں کے لئے مخصوص ہیں۔ غزلوں میں عموماً معمولی الفاظ ہیں۔ مگر ہاں بندش اور طرزِ بیان کی خوبیوں نے اُن میں وہ جوہر پیدا کردیا ہے کہ جس پر بلندیٔ تخیّل ہزار بار نثار ہو۔

محاورات | محاورات کو جب کبھی استعمال کرتے ہیں ہمیشہ موقع و محل کا لحاظ رکھتے ہوئے شعر میں اُس سے خوبی پیدا کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تاثیر اور رمز دونوں زیادہ ہوجاتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ محاورے اور شعراء کی طرح زبردستی

نہیں لاتے بلکہ جب ضرورت ہوتی ہے تب ہی اُن سے کام لیتے ہیں۔ ہر طبقے کے لوگوں کے محاورات اُسی وقت لاتے ہیں جب اُس موقع کا کوئی بیان اُسی طبقے کے کسی فرد کے ساتھ مخصوص ہو۔ معشوق کی زبان سے ویسے ہی محاورے ادا کراتے ہیں جو اُس کے شایانِ شان ہوں۔ مثلاً :-

چھیڑ نے چھونے دوں دامن نہ میں نامحرم کو ؎ پونچھوں عارض سے عرق اُس کے تو یوں کہتا ہے

عاشق کی زبان سے ویسے ہی محاورات صرف ہوتے ہیں جو ایک دلِ گرفتہ کے لئے مناسب ہوں۔ مثلاً :-

کنگھی نے آڑے ہاتھوں کیا زلف کو لیا ہے ؎ کیا جانئے کہ کس کے دِل کا لہو پیا ہے

آڑے ہاتھوں لیا ہے کو سودا نے کس حسن و خوبی سے اپنے شعر میں جگہ دی ہے۔

فارسی کے محاورات کو اُردو میں صرف کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی اُن کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے مصرعوں میں صرف کرتے ہیں مثلاً :-

بجز عمرِ گذشتہ کی وہ ڈھونڈو سو کہاں ہے ؎ جوئندہ کو ہر چیز ہے یابندہ جہاں ہیں

پیارے یہ ہمیں سے ہے ہر کار سے دھر دے ؎ سجھ تیغ تلے کہہ تو رستم سے کہ سر دھر دے

خواہ اسے آپ جدت پسندی سمجھیں یا تصرف یا اُردو پرستی کہ فارسی چیز کو وہ اس طریقے سے اُردو میں سمونا چاہتے ہیں۔ کہ بالکل ہی اُردو معلوم ہونے لگے۔ جہاں کہیں شیخ وغیرہ کے متعلق طبع آزمائی کی ہے وہاں اُسی مذاق کے محاورات لاتے ہیں مثلاً :-

پگڑی کو تیری اُن نے کیا آگے دھر لیا ہے ؎ شملہ پڑا ہے اتنا کیوں تیرے پیچھے زاہد

ایک چور بال ہے یاں وہ کاٹھ میں دیا ہے ؎ شانہ ہیں شیخ جی کے ڈاڑھی پھنسی نہ سمجھو

اُس زمانے کا مذاق ظاہر ہے کہ آج کے زمانے کے اعتبار سے اگر پوری طرح نہیں تو بیشتر مختلف ہو چکا ہے۔ یہی حال الفاظ اور محاورات کا بھی ہے کہ سودا کے عہد سے لے کر اب تک بہت کچھ تغیر دیکھ چکے ہیں چنانچہ بعض مقامات پر ایسے الفاظ ملتے ہیں کہ آج اُردو میں نامانوس ہیں مثلاً مجھ پر کے بجائے میرے پر۔

الفاظ اسی سلسلہ میں اچھا ہے کہ سودا کے انتخابِ الفاظ پر بھی کچھ گفتگو ہو جائے۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے اُس کے لئے سودا عموماً نرم اور عام فہم الفاظ لانا روا رکھتے ہیں۔ فارسی کے ذخیرے سے بھی لفظوں کا انتخاب کرتے ہیں اور ہندی کے کھلیان سے بھی دل پسند اور پُر معنی الفاظ چُن لیتے ہیں۔ فارسی میں اتنا ضرور ہے کہ کبھی کبھی پُورے پُورے فقرے اُردو کے گھر آ جاتے ہیں لیکن ثقیل الفاظ سے یک قلم سودا نے گریز کیا ہے۔ ہندی کے لئے یہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ کچھ لفظ ایسے بھی ملتے ہیں جو آج اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ لیکن اس کو کسی طرح سودا کی نظرِ انتخاب کی خرابی پر محمول نہیں کر سکتے۔ اس وجہ سے

کہ وہ اپنے زمانے کے مروّج الفاظ کو کام میں لاتے ہیں خواہ اس زمانے والوں کے مزاج کے موافق ہوں یا نہ ہوں۔ اُس زمانے میں یہ الفاظ عام تھے جس کا ثبوت اُن کے ہم عصروں یا پیش روؤں کے کلام کو دیکھ کر بآسانی مل سکتا ہے۔ جن الفاظ کا ہم نے ذکر کیا ہے اُن کی چند مثالیں پیش ہیں۔ مثلاً :۔

گھٹیالے (زخمی) ناؤں (نام) تیں (تو) کتر بیونت (قطع و برید) وغیرہ۔

سوؔدا نے اُردو میں کچھ ایسے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جو اُنہی کے لئے مخصوص ہیں لیکن اگر وہ کام میں آتے رہتے تو زبان کی وسعت میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا۔ مثلاً پارسال سے اسم صفت پارسالی۔ غیر شاعر کے بجائے ناشاعر اسی طرح ناحساب ناگرفتار وغیرہ۔

اُس عہد کے سلسلے میں جس میں سوؔدا تھے یہ بھی بتا دینا غیر مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ خاص باتیں جو اس زمانہ میں متروک ہیں" نے" علامتِ فاعلی محذوف ہو جاتی تھی اور بجائے "میں نے پایا" "کہ" میں پایا" کافی سمجھا جاتا تھا۔

غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ سودا کے زمانے میں فعل کی بھی جمع رواتھی۔ اسی وجہ سے سودا کے کلام میں اکثر حسب ذیل الفاظ بھی ملتے ہیں مثلاً

پڑیاں۔ دیکھیاں۔ پھلیاں وغیرہ۔

تشبیہ و استعارہ | تشبیہ اور استعارے سے شعر میں جو جان پڑ جاتی ہے وہ محتاج بیان نہیں لیکن اُن کا اثر زیادہ بھی ہوتا ہے جب دیکھی ہوئی چیزوں یا ہستیوں سے تشبیہ دی جائے۔ جس چیز کو نظروں نے دیکھا نہ ہوگا اُس کی تشبیہ سے دل بھی خاطر خواہ لذت یاب نہ ہو سکیگا مثلاً اگر ہندوستان کے رہنے والے سے یہ کہا جائے کہ انگلستان کی فلاں عمارت اہرامِ مصری کا جواب ہے تو اُس پر وہ اثر نہ ہوگا جو قاہرہ کی مسجد سے دہلی کی جامع مسجد یا آگرہ کی موتی مسجد کی تشبیہ سے ہوگا۔ سوؔدا نے اس کا کافی خیال رکھا ہے۔ جہاں تک ہو سکا ہے عام فہم اور ہندوستان کی چیزوں سے تشبیہ اور استعارے پیدا کئے ہیں یا اُن چیزوں کو لیا ہے جو باوجود ایرانی اور عربی ہونے کے بھی ہندوستانیوں کے دلوں پر اس طریقے سے اثر کرتی ہیں گویا وہ ہندوستان کی پیداوار ہیں۔ بہت کم تشبیہیں اور استعارے ایسے ہیں جو نامانوس یا اجنبی ہوں۔

تشبیہ کے انتخاب اور صرف سے شاعر کی جدتِ طبعی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر نئی تشبیہیں کوئی پیدا کرتا ہے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُس کی طبیعت میں لذات اور جدت کا مادہ کافی ہے اس کے بعد وہ درجہ ہوتا ہے کہ خواہ تشبیہات میں بذات خود جدت نہ ہو لیکن اس رنگ سے اُن کو پیش کیا جائے کہ اُن کا پُرانا پن جاتا رہے اور کم و بیش دل و دماغ کو وہی تازگی اور لذت نصیب ہو جو بالکل نئی تشبیہوں سے ملتی ہے۔ قدرت کی ایک مثال سوؔدا کے یہاں سے ملاحظہ ہو۔

ماٹی ہزار رنگ کی اس چاک سے بنی　　　دُنیا تمام گردشِ افلاک سے بنی

چاک اور آسمان میں جو وجہ شبہ ہے اُس کا لُطف بیان سے باہر ہے۔

معشوق کو قاتل اور سفاک سب نے کہا ہے لیکن سراپا اجل سے تشبیہ دینا اور شعر کو بے لطف نہ ہونے دینا سودا کا ہی کام تھا مثلاً:

قاتلِ خلق جو ہے تیغ و سناں ہے تو ہے　　　تو تو ہتیار نہ باندھے پھرے ہے پر شکلِ اجل

معشوق کی زلف کو سانپ سے تشبیہ دینا ایک عام بات ہے لیکن جس خوبی سے سودا نے اس پامال تشبیہ کو نباہا ہے وہ قابلِ داد ہے۔

خیالِ زلف کو تیرے نکالے دو دل نہ کیوں دل سے　　　یہ کالا ہے کہ جب تونبی سے نکلا بس نہ کیونکر ہو

ایہام سودا نے جو کچھ اُردو زبان پر اپنی زباں دانی اور علمی قابلیت سے احسان کیا ہے اُن کا ذکر بھی آئندہ کیا جائے گا لیکن اس وقت اتنا ضرور سمجھ لیجیے کہ اُن کی نظریں اس قدر دوربین تھیں کہ اُردو کو خراب ہوتے ہوئے بہت پہلے سے دیکھ لیا تھا اسی وجہ سے گو ایہام گوئی اُن سے بہت پہلے سے اُردو زبان میں رائج ہو چکی تھی لیکن اُنہوں نے صرف کم کرنے کی کوشش کی بلکہ اُردو کے باغ کو اس [illegible] جھاڑی سے صاف رکھنے کی ہر وقت کوشش کرتے رہے چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی　　　منکرِ سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

[illegible] ہو سکا سودا نے صدائے احتجاج بلند کی لیکن متاخرین نے اپنی بے راہ روی سے ایہام کو اس قدر مرغوب رکھا [illegible] اس جھاڑی میں ایسا پھنسا کہ تقریباً تیس برس تک کوئی ترقی نہ ہو سکی بلکہ بقول آزاد مرحوم کے بول [illegible] رہ گئے۔

[illegible] ایک اور بات بتا دینے کے قابل ہے کہ دُنیا سمجھتی ہے کہ غزل گوئی میں میر کا جواب سودا نہیں ہو سکتا لیکن سودا میں [illegible] خوبی ہے جو غزل کے میدان میں میر کو نصیب نہیں یعنی اُن کا کلام شروع سے آخر تک ایک رنگ [illegible] میر کا کلام بقول شخصے "پستش غایت پست و بلندش غایت بلند است" کا مصداق ہے لیکن سودا کے یہاں [illegible] سرے سے مفقود ہے۔

محمد نور الہدیٰ

مسدس

بیادگار یومِ حالی

یہ بلند پایہ مسدس حضرتِ احسن مارہروی نے یوم حالی (منعقدۂ اورنگ آباد دکن) کی تقریب پر علی گڑھ سے بطور پیغام بھیجا تھا اور اسی وقت از راہ کرم ہمیں "ہمایوں" میں اشاعت کی غرض سے عنایت فرمایا تھا۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء کی چھبیسویں اور ستائیسویں کو خواجہ حالی رحمۃ اللہ علیہ کے وطن پانی پت میں اعلیٰحضرت نواب بھوپال کے زیرِ صدارت شاعر مرحوم کی صد سالہ سالگرہ کا جشن منعقد ہو رہا ہے۔ "ہمایوں" کو اس مبارک قومی تقریب میں شامل کرنے کی غرض سے ہم اس موقع پر اس یادگار مسدس کی اشاعت کا فخر حاصل کرتے ہیں۔

زندگی طامعِ اشیائے خور و نوش نہیں — زندگی تابعِ نیرویٔ برودوش نہیں
زندگی خاک ہے وہ، جس میں کوئی جوش نہیں — زندگی خواب ہے، زندوں کو اگر ہوش نہیں
زندگی نام نہیں عیش کئے جانے کا
"زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا"

ہے حیاتِ ابدی اُس کو جہاں میں حاصل — متصف ذات ہو جس کی بہ صفاتِ کامل
زندہ جب تک رہے عالم کو بنائے قابل — اور مر جائے تو دُنیا رہے اُس کی قائل
زندگی یوں ہے تو ہے موت کا رونا بیکار
موت ایسی ہو تو سو زندگیاں اُس پہ نثار

جسمِ خاکی کے لئے دشمنِ جانی ہے اجل — پاک روحوں کو نہ اندیشہ ہے کوئی نہ خلل
فطرتِ حق کا اٹل ہے یہی دستورِ عمل — اس عمل میں کبھی ہوگا نہ ہوئی رد و بدل

فرقتِ مادہ و روح میں کیوں غم کوئی کھائے
نہ مٹے اسم صفت اذاتِ مسمّٰی مٹ جائے

زندہ وہ قوم ہے دُنیا میں جو ہے مُردہ پرست ــــ ہے وہ آغوشِ بقا میں جو کہے نیست کو ہست
یاد ہو اے دلِ غافل جو تجھے عہدِ الست ــــ حال و مستقبل و ماضی کو بہم کر پیوست

نہ ہوں ناکام اگر مدِ نظر کام رہے
ہم جو مٹتے ہیں تو ہٹ جائیں مگر نام رہے

اے عظیم العظما! اے فلکِ مجد و عُلا ــــ اے شریف الشرفا! اے شرفِ اہلِ صفا
اے حکیم الحکما! نبض شناسِ دُنیا ــــ اے معین الشعرا! حالیِ شمس العلما

عصرِ موجودہ میں جتنی سُخن آرائی ہے
تیرے فیضانِ ادب کی وہ مسیحائی ہے

شعرا جن کو فلاطوں نے بتایا بیکار ــــ جن کا دُنیا کے نکموں میں رہا حصر و شمار
جن کے اقبال میں تھی شانِ زوال و ادبار ــــ جن کی قسمت سے مٹایا گیا اعزاز و وقار

رہنمائی نے تری اُن کو دکھائی وہ راہ
جس سے ہاتھ آگئی کھوئی ہوئی سب عزت و جاہ

تُو نے غفلت زدہ افراد کو ہشیار کیا ــــ تُو نے سوئی ہوئی تقدیر کو بیدار کیا
تُو نے راہِ کج و ناصاف کو ہموار کیا ــــ مختصر یہ ہے کہ بے کار کو باکار کیا

قوم پر، ملک پر، الطاف ہیں یکساں تیرے
بھول سکتے نہیں تاحشر ہم احساں تیرے

تیرے اقوال نصیحت ہیں زمانے کے لئے ــــ تیرے ارشاد ہدایت ہیں زمانے کے لئے

تیرے افکار بصیرت کے زمانے کے لئے　　تیرے اشعار صداقت ہیں زمانے کے لئے

توڑ کر شاعریِ کاذبہ کی سدِ سدید

تو نے ڈالی ادبِ صدق کی بنیادِ جدید

تیرے احساس نمایاں ، ترے جذباتِ عمیق　　تیرے الفاظ بہت سہل ، معانی ہیں دقیق

حق بجانب ہے ترے نقد و نظر کی تحقیق　　ہیں مخالف بھی موافق ترے حسبِ توفیق

وجہِ تنظیم ہوئی موعظت و پند تری

فکرِ آزاد طبیعت بھی ہے پابند تری

ہے ترے بامِ ادب کا بہت اونچا پایا　　پستیِ شعر کو تا اوجِ فلک پہنچایا

نہ رہا کہنہ و فرسودہ کوئی سرمایا　　شاعری نے تری دنیا کی پلٹ دی کایا

ہو گئے ختم وہ مضمون و خیال و جذبات

جن میں نقصاں کے سوا تھی نہ کوئی کام کی بات

تیرے اوصاف نہیں شعر و سخن تک محدود　　وجہِ صد فخر ہے دنیا میں ترا ایک وجود

علم ہوگا نہ زمانے سے جہاں تک مفقود　　کارنامے ترے عالم میں رہیں گے موجود

جوہرِ فرد ہے تو ! کچھ تجھے معلوم بھی ہے

ملت و قوم کا خادم بھی ہے مخدوم بھی ہے

مصلح و ناقد و شاعر ہے تری ذاتِ شریف　　خواجۂ قوم و ملل ، مجتہدِ فنِ لطیف

بہتر اوصاف کی ہو سکتی ہے جتنی تعریف　　تجھ میں موجود تھے سب تا بحدِ توصیف

دوسروں کے لئے ہوتے تھے جو اقوال و مقال

پہلے خود ان پہ عمل کر کے دکھاتا تھا مثال

تیرے ہر قول کی تاثیر کا ہے بھید یہی ـــ کہ نہیں تیری صدائیں صفتِ طبل تہی
تُو نے ایسی کوئی بات اپنی زباں سے نہ کہی ـــ فکر اپنے لئے خود جس کے عمل کی نہ رہی

کوئی تقدیمِ عبث کی نہ مقدم بن کر
جب ہُوا پیش تو تمثیلِ مجسّم بن کر

سو برس ہو گئے اِمسال ولادت کو تری ـــ مگر اکثر نہیں بھُولے ابھی صُورت کو تری
دیکھتے ہیں جو تصانیف و صحافت کو تری ـــ دل کی آنکھوں سے لگاتے ہیں وہ عظمت کو تری

یادگار آج ہیں جتنے بھی ترے شہ کارے
فلکِ علم و ادب کے ہیں چمکتے تارے

مشرقستانِ ادب سے جو اُٹھی تیری صدا ـــ گُونج اُس کی ہوئی چاروں طرف اعجاز نُما
غفلتِ خواب میں بھی جس نے سُنا چونک اُٹھا ـــ مرحبا داعیٔ حق، واہ ترا کیا کہنا

جس کو منظور ہو شاعر سے پیمبر ہونا
مثلِ حالی اُسے لازم ہے سُخنور ہونا

یومِ حالی کو صداقت سے منانے والو! ـــ ہو مبارک تمہیں، بنیادِ عقیدت ڈالو
قدرِ اسلاف کرو عزتِ رفتہ پالو ـــ یعنی اخلاف کو سانچوں میں انہیں کے ڈھالو

ہے علی گڑھ کا یہ پیغام سنو اہلِ دکن
تُم سے چھُوٹے نہ کبھی بکہ حالی کا چلن

پیغام بر
احسن مارہروی
اُردو ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نپولین اعظم کا بچپن

بحیرۂ روم کے ایک مختصر جزیرے کارسیکا میں ایک قصبہ اجیشو واقع ہے۔ نپولین کا باپ چارلس بونا پارٹ وہاں وکالت کیا کرتا تھا۔ وہ ایک وجیہہ، خوش شکل اور روشن خیال انسان تھا۔ اُس نے ایک خوبصورت اور عالی دماغ خاتون لیٹیشیا سے شادی کی۔ وہ ایک ممتاز خاندان کا فرد تھا۔ مگر انقلاب زمانہ کے باعث اُس کی گزر اوقات اپنے ہاتھ کی کمائی پر تھی۔ خاندان کی خوشحالی کا زمانہ گزر چکا تھا۔ گرچونکہ وہ ایک کامیاب وکیل تھا، اُمورِ عامہ میں بڑی دلچسپی لیا کرتا تھا۔ اور چونکہ ایک عالیشان گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے لوگ اُسے بڑی عزت و توقیر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

ابتدا میں جزیرہ کارسیکا اٹلی کے ماتحت تھا۔ زبان اور تہذیب دونوں کی ایک ہی تھیں۔ مگر جن ایام کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ان ایام میں فرانس کی ایک فوج کارسیکا پر حملہ آور ہوئی۔ کارسیکا کے محبِ وطن افراد نے اپنی مادرِ وطن کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے سرفروشوں کی ایک جماعت تیار کی۔ جیسا کہ بلند نظرت قائد تھا۔ چارلس بونا پارٹ نے بھی خدمتِ وطن کی خاطر قلم کو چھوڑ کر تلوار سنبھالی اور لیٹیشیا بھی حاملہ ہونے کے باوجود اپنے خاوند کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر جنگوں میں شامل ہوئی اور بڑی فراخ حوصلگی اور خندہ پیشانی سے جنگ کے مصائب کو برداشت کرتی رہی۔ مگر سرفروشوں کی یہ مختصر جماعت فرانس کی کثیر التعداد فوج کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ نہ کر سکی۔ اسے ہر جنگ میں پسپا ہونا پڑا۔ اور مجاہدین ادھر اُدھر پریشان حال پھرنے لگے۔

لیٹیشیا گرفتاری کے خوف سے اپنے گھر میں آ چھپی۔ ۱۵ر اگست سنہ ۱۷۶۹ء کی صبح کو اُسے گرجا سے عین عبادت کے دوران میں گھر واپس آنا پڑا۔ آ کر ایک صوفے پر دراز ہو گئی۔ صوفے پر ایک چادر بچھی تھی جس پر الیڈ[1] کی جنگوں اور جانبازوں کی تصاویر نقش کی گئی تھیں۔ اولوالعزمی، سرفروشی اور حقیقت شناسی کے اس شاندار ماحول میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام نپولین بونا پارٹ رکھا گیا اور جس کے نام سے کچھ عرصے کے بعد تمام یورپ میں ایک گونج پیدا ہو گئی اور جس نے تمام یورپ میں نعرۂ لمن الملک الیوم بلند کیا۔

بچے کے لئے کارسیکا کی ایک خوش وضع، خوش شکل اور فہیم دایہ مقرر کی گئی۔ ماں اپنی نگرانی میں اُس کی خوراک اور اُس کے آرام کے انتظامات کرایا کرتی تھی۔ جُوں جُوں نپولین بڑا ہوتا گیا اُس کی ماں نے آہستہ آہستہ اُس کی تربیت شروع کر دی۔ اُس کی

---

[1] یونان کے ایک فقیدالمثال شاعر ہومر کی تصنیف ہے۔ اس میں ٹرائے کے محاصرہ کے حالات اور بہادروں کی شجاعت کے کارنامے نظم کئے گئے ہیں۔

بصیرت نے اُس پر الم نشرح کر دیا کہ اس بچّے کو غیر معمولی قوائے ذہنی عطا کئے گئے ہیں۔ اس لئے اس نے اس کی تربیت پر خاص توجہ صرف کی۔ اُس نے نپولین کے سامنے بلند مقاصد پیش کئے۔ اس کے دماغ میں اعلےٰ خیالات کی پرورش کی۔ اس کی ہر نازیبا حرکت پر مناسب سزا دی۔ اور کسی قسم کی تنگ خیالی اور بے راہ روی کو اُس کے نزدیک نہ پھٹکنے دیا۔ یہ اُسی حیران کُن تربیت کا نتیجہ تھا کہ جب نپولین اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانے لگا تو عام بچّوں کی طرح نہ اُس نے اپنے قیمتی وقت کا کوئی لمحہ ضائع کیا، نہ کھیل کود کی طرف توجہ دی، نہ کوئی اور بُری عادت اختیار کی اور نہ کبھی مشکلات ہی کو دیکھ کر گھبرایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نپولین فطرۃً عظیم الشان قابلیتوں کا مالک تھا۔ مگر یہ اُس کی ماں ہی تھی جس نے ابتدا ہی سے ان قابلیتوں کو راہ راست پر ڈال دیا۔

اپنی والدہ کی تربیت کے متعلق نپولین نے بعد میں کہا: "شوہر کی وفات کے بعد میری ماں کا نہ کوئی رہنما تھا اور نہ کوئی ہمدرد اس لئے اُسے تمام معاملات کی باگ اپنے ہاتھ میں لینی پڑی۔ لیکن یہ کام اُس کی برداشت سے زیادہ نہ تھا۔ اُس نے اِس دور اندیشی سے ہر بات کا انتظام کیا جس کی مثال اس کی ہم عصروں اور ہم جنسوں میں نایاب ہے۔ سبحان اللہ! کیسی بلند فطرت خاتون تھی! ہم اس کی مثال کہاں تلاش کریں؟ وہ بے مثال شفقت کے ساتھ ہماری حفاظت کیا کرتی تھی۔ ہر پست خیال اور ہر عاقبت نااندیشانہ محبت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اس کی ہر بات میں بلند خیالی تھی۔ جھوٹ سے اُسے نفرت تھی۔ اور کوئی معمولی سی نافرمانی بھی برداشت نہ کرسکتی تھی۔ ہمارے کسی قصور پر چشم پوشی نہیں کی جاتی تھی۔ عزیزوں کی وفات، تنہائی یا افلاس اُس پر کوئی اثر نہ کرتی تھی۔ اُس نے یہ تمام مصائب بڑی مستقل مزاجی سے برداشت کئے اور تمام کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا۔ وہ مرد کی سی قوّت رکھتی تھی اور عورت کی سی محبّت اور شرافت۔"

اپنی والدہ کی اس شاندار سیرت سے متاثر ہو کر نپولین اکثر کہا کرتا تھا۔ "کہ مستقبل میں بچے کی بھلی یا بُری سیرت کا انحصار اور صرف ماں پر ہُوا کرتا ہے"۔ "اور فرانس کو اپنی فلاح و بہبود کے لئے اچھی ماؤں سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں"۔ نپولین کے نزدیک علامہ اقبال کے نظریہ کے مطابق ماں

سیرت اقوام را صورت گر است

اُس عالی نژاد خاتون کی سیرت کو ایک واقعہ بڑی خوبی سے واضح کرتا ہے۔ ابھی نپولین کو شہنشاہ بنے تھوڑا ہی عرصہ ہُوا تھا کہ اُس کی ماں اُس سے ملاقات کرنے گئی۔ اُس نے ذرا بے پروائی سے ہنستے ہوئے اپنا ہاتھ ماں کی طرف چومنے کے لئے بڑھایا لیکن اُس کی ماں نے بڑے استقلال سے اپنا ہاتھ نپولین کی طرف بڑھا دیا اور کہا "نہیں۔ یہ تمہارا فرض ہے کہ تم اُس ہاتھ کو چومو جس نے تمہیں زندگی بخشی"۔ ——— کس قدر خود دار اور مستقل مزاج عورت تھی! یہی وجہ تھی کہ تمام

بچے اُس کے تابع فرمان تھے اور اُس کی عظمت کے قائل تھے۔

نپولین ابھی بچہ ہی تھا کہ اُس کی عظمت و ذہانت کے آثار لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے۔ اُس کا باپ اُسے دوسرے تمام بچوں سے زیادہ عزیز جانتا تھا۔ نپولین اُس کی گود میں بیٹھ جاتا۔ اور کارسیکا کے محبانِ وطن کے جاں فروشانہ کارنامے بڑی دلچسپی سے سُنتا۔ ماں اُسے اُن پُر مصائب ایام کی زہرہ گداز داستان بالتفصیل سناتی اور بتاتی کہ کس تحمل اور عزمِ راسخ سے اہلِ کارسیکا نے تمام تکالیف کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ وہ کہنیاں ٹیکے، اپنے گالوں کو دونوں ہاتھوں کا سہارا دے کر ہمہ تن گوش ہوجاتا اور اپنی ماں کی ولولہ انگیز گفتگو سُنتا۔ اور پردے ہی پردے میں ایک جنگجویانہ رُوح کی پرورش کرتا رہا۔ اُس کے ایک چچا نے بسترِ مرگ پر کہا کہ "گو جوزف سب بھائیوں سے بڑا ہے مگر نپولین خاندان کا سردار ہے"۔ بالخصوص کارسیکا کا فرانسیسی گورنر کاؤنٹ ماربوف اُس بچے کا بڑا مداح تھا اور کہا کرتا تھا کہ "اگر حالات نے مساعدت کی تو نپولین کو دُنیا میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہوکر رہے گی"۔

ابھی اسے پیدا ہوئے چند ہی سال گزرے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اُمورِ خانہ داری کی تمام ذمہ داری اس کی ماں کے کندھوں پر آپڑی۔ وہ اپنے یتیم بچوں کو ہمراہ لے کر ایک گاؤں میں چلی گئی۔ وہاں اِن کا ایک اپنا مکان تھا۔ اس مکان کے اردگرد کا نظارہ بڑا رُوح پرور تھا۔ بچے تمام دن باغ میں کھیلتے رہتے۔ کبھی وہ اُڑتی ہوئی رنگ برنگ کی تیتریوں کے پیچھے بھاگتے اور انہیں پکڑتے۔ کبھی درختوں میں آنکھ مچولی کھیلتے۔ اور کبھی کیچڑ میں ننگے پاؤں بھاگ کر اپنے کپڑے لت پت کرلیتے۔ اور ماں انہیں ملامت کرتی۔ اُن کی اس معمولی حالت کو دیکھ کر کسی کے دل میں بھی یہ خیال پیدا نہ ہوتا ہوگا کہ مستقبل قریب میں یہ یتیم اور بیکس بچے یورپ کے عدیم النظیر حکمران بنیں گے اور تین چار قرنوں کی تاریخ صرف انہی کے عظیم الشان کارناموں سے پُر ہوگی۔

ابھی اُس کی عمر پانچ ہی سال کی تھی کہ وہ ایک مقامی سکول میں داخل کر دیا گیا۔ لباس کے متعلق بالکل بے پروائی کا اظہار کرتا۔ بٹن کھلے ہوتے۔ جرابیں ایڑی تک ہوتیں اور بوسیدہ، تسمے عموماً کھلے رہتے۔ دوسرے طلبہ اُس پر آوازے کستے۔ مگر وہ مغرورانہ استغنا سے کام لیتا۔ سکول کی ایک ہم عمر لڑکی گیا کومینٹیا کے حسن نے اُسے مسحور کر لیا۔ یہ نپولین کی پہلی محبت تھی۔ لڑکی بھی اُس کی بےحد والہ و شیدا تھی۔ دونوں کی محبت بچپن کی سادگی کی آئینہ دار تھی۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر سکول آتے جاتے۔ بڑی عمر کے لڑکے اُن کے گرد ہوجاتے اور مذاق کرتے۔ نپولین ہاتھ میں سنگریزے اور لکڑیاں اُٹھا لیتا اور نتائج سے بالکل بے پروا ہوکر بڑے جوش سے حملہ آور ہوتا۔ اس پر لڑکے راہِ فرار اختیار کر جاتے۔ اور پھر نپولین اپنی محبوبہ کا ہاتھ فاتحانہ انداز سے پکڑتا اور گنگناتا ہوا چلا جاتا۔ اُس کی اس حالت کو دیکھ کر ایک لڑکے نے ایک سادہ سا شعر موزوں کیا جس کا مطلب یہ ہے "نپولین جس کی جرابیں آدھی پھٹی ہوتی ہیں گیا کومینٹیا سے محبت کرتا ہے"۔ لڑکے جونہی اُسے دیکھ پاتے یہ شعر پڑھنا شروع کر دیتے اور وہ

شفقت سے لال پیلا ہوجاتا۔

جوں جوں نپولین کی عمر بڑھتی گئی اُس نے اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ کھیل کود میں حصہ لینا ترک کر دیا۔ وہ سنجیدہ متین اور خاموش بنتا گیا۔ وہ ہر معاملہ میں بڑی دُور اندیشی کا اظہار کرتا اور کبھی کسی سے بے تکلف نہ ہوتا۔ اسی لئے بھائی بہن اُس سے اتنے مانوس نہ تھے اور اُس کے مقابلہ میں اُس کا بڑا بھائی جوزف زیادہ محبوب تھا۔ نپولین کی یہ عادت بن گئی کہ ہر شام کتاب ہاتھ میں لیتا اور قریبی پہاڑیوں کے ایک غار میں چلا جاتا۔ سامنے کھُلا سمندر رہوتا اور بسیط فضائے آسمان۔ خبر نہیں ان لامتناہی وسعتوں کو دیکھ کر اُس کے خیالات نے کس قدر وسعت اختیار کی اور کون کون سے بلند ارادوں نے اُس کے دل ودماغ میں ہیجان پیدا کیا۔ وہ غار اب بھی متبرک خیال کیا جاتا ہے۔ زائر لوگ وہاں جاتے ہیں اور وہ غار نپولین (Napoleoni di Grotto) کے نام سے مشہور ہے۔

نپولین کی رُوح آزاد تھی اور خیالات بلند۔ اس حقیقت سے آشنا ہو کر وہ اپنی ذات پر نازاں تھا اور اپنے آپ کو عوام الناس سے بالاتر خیال کیا کرتا تھا۔ اس لئے جب ہم عمر لڑکے اور دوسرے لوگ اُس سے عام افراد جیسا سلوک روا رکھتے تو اُس کے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا۔ وہ فطرتاً خاموش اور سنجیدہ مزاج تھا۔ وہ اس متانت سے مختصر مگر پُرزور اور پُرمغز گفتگو کرتا کہ معمر لوگ بھی حیران رہ جاتے۔ اُسے کھیل کود اور سوسائٹی سے نفرت تھی۔ اُس کے دل سے فرحت وانبساط کے جذبات تقریباً مفقود تھے۔ اور اُن کے بجائے اُس کے چہرے پر کچھ کچھ مایوسی نمایاں تھی۔ یہ مایوسی ظاہر کرتی تھی کہ نپولین بے فکری کے بجائے عمر رسیدہ زمانہ شناس انسانوں کے گہرے سوچ بچار میں لگا رہتا ہے۔ وہ ہر وقت مطالعہ میں منہمک رہتا۔ کبھی پر ظلم روا نہ رکھتا اور کمزوروں سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا کرتا۔

اُس کی اس سیرت سے متاثر ہو کر کارسیکا کے فرانسیسی گورنر کاؤنٹ ماربوف نے سفارش کر کے اُسے برین واقع فرانس کے فوجی سکول میں داخل کرا دیا۔ اُس وقت نپولین کی عمر دس سال تھی۔

اب تک نپولین اپنے گھر میں رہا تھا۔ اُسے بالعموم اُن لوگوں سے واسطہ پڑا تھا جو اُس کے اعزہ واقارب میں سے تھے۔ اس لئے اس ماحول میں اس کی مخالفت نہ ہوئی۔ تمام بچے اُس کی عادات سے متاثر ہو کر اُسے بالاتر شخصیت سمجھتے اور اُس سے مرعوب رہتے تھے۔ بڑی عمر کے لوگ اُس کی ذہانت وفطنت کو دیکھ کر اُس کی عزت کرتے تھے۔ پرستاروں کے اس حلقہ میں وہ شانِ بے نیازی سے رہتا تھا۔ اُسے توقع تھی کہ برین سکول میں بھی اُس کی قابلیت کے معتقد اور مداح موجود ہونگے اور وہ عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ مگر وہاں تو حالات ہی دگرگوں تھے۔ اُمراء کے مغرور بچے اُسے غریب اور اجنبی خیال کر کے حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اب تک نپولین کے نزدیک مابہ الامتیاز صرف قابلیت ہی تھی۔

اُس کا اعتقاد تھا کہ ایک انسان جتنا قابل ہو اُسے دنیا میں اتنا ہی ممتاز اور معتقد رہونا چاہئے۔ لیکن اب یہ دیکھ کر اُس کے جذبات کو سخت صدمہ ہُوا کہ لوگوں کے نزدیک اُس شخص کی زیادہ قدر و منزلت ہے جو دولتمند ہے۔ اور ایک غریب خواہ کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو اُن کے سامنے ذلیل و خوار ہے۔ دوسرے لڑکے عیش و عشرت میں مشغول تھے۔ دن رات رنگ رلیوں میں گزارتے مگر وہ سخت عسرت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ نپولین کا ایک غریب خاندان سے تعلق رکھنا اُن کے لئے سخت قابلِ نفریں تھا۔ اُس کا لباس اور اُس کا نسب واحبہ اُن کے لئے سامانِ تفنن بن گیا۔ وہ فرانسیسی زبان سے بھی ناواقف تھا۔ یہ امر اُس کے لئے اور تکلیف دہ ثابت ہُوا۔

ماحول کی اس ظلم آفرینی کو دیکھ کر وہ نامعلوم طور پر جمہوریت نواز بنتا گیا۔ اس کے دل پر طبقۂ امرا کی تنگ خیالی، بے دردی اور سنگدلی کا بہت بڑا اثر ہُوا اور اسی بُرے اثر کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انقلاب فرانس کے دنوں میں اس نے انقلابیوں کی پُرزور اور علانیہ حمایت کی۔

برین سکول میں ہر طالب علم کو ایک قطعۂ زمین حسب منشا کاشت کرنے کے لئے دے دیا جاتا تھا۔ نپولین نے اپنے قطعہ میں ایک خوبصورت باغ لگایا۔ اور اُس کے وسط میں ایک سادہ سا مگر دلکش حجرہ تعمیر کیا۔ یہ حجرہ اُس کے کارسیکا کے غار کا قائم مقام بنا۔ اور اسے اُس نے اپنے مطالعہ کے لئے مخصوص کر دیا۔ غور و فکر اور مطالعہ کے لئے دوسرے عیش پسند اور آوارہ مزاج طلبہ سے بچ کر وہ اس کمرہ میں آجاتا اور تنہائی میں والٹیر، روسو اور ہومر کی ہنگامہ خیز تصانیف کا مطالعہ کرتا۔ وہ ہر اس دن کو ضائع شدہ شمار کرتا جس دن وہ اپنے علم میں کوئی قابلِ قدر اضافہ پیدا نہ کر لیتا۔ طبع انسانی کی متنوع خصوصیات، بنی نوع انسان کی بہبود کے ذرائع، قوموں کے تنزل اور ترقی کے اسباب، حکومتوں کا عروج و زوال وغیرہ اہم مسائل اس کے لئے خاص طور پر جاذبِ نظر تھے۔ وہ ان تمام مسائل کے متعلق غور کیا کرتا تھا۔ ہندسہ، تاریخ اور جغرافیہ میں اُس کی قابلیت مسلمہ تھی لیکن ادب سے وہ متنفر تھا اور کہا کرتا تھا کہ ان سے ماخوذ معلومات ہمیں درجۂ یقین تک نہیں پہنچاتیں۔ فرانسیسی زبان میں اُس نے قلیل عرصے میں حیران کُن قابلیت پیدا کر لی۔ اُس نے ایک خط میں اپنی والدہ کو لکھا کہ "ہومر بغل میں لے کر اور تلوار ہاتھ میں پکڑ کر میں دُنیا میں اپنا راستہ آپ بنا لوں گا"۔ یہ خط ظاہر کرتا ہے کہ اُس کو اپنی ذات پر بڑا اعتماد تھا۔ اور اُس کے مزاج میں علم و عمل کا حیران کُن امتزاج پایا جاتا تھا۔ اُس کی متانت، شرافت، محنت اور قابلیت کو دیکھ کر اُستاد بہت جلد اُس کے گرویدہ ہو گئے۔

اُس کے اعلےٰ اخلاق، عزم بلند، اور وسیع معلومات سے آخر کار سکول کے امیرزادے اور دیگر طلبہ بھی مرعوب ہو گئے۔ برین کے سکول کا ایک واقعہ جب کہ نپولین کو سکول میں داخل ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے اور اس کی عمر پندرہ سال تھی تاہم یہ حقیقت بخوبی منکشف کرتا ہے کہ تمام طلبہ بلا استثنائے احدے اُس کی فوقیت کے قائل تھے اور اُس کے اطاعت گزار بن چکے تھے۔

اُس موسم میں برف باری بڑے زور شور سے ہوئی۔ اس قدر کہ تمام رستے مسدود ہو گئے اور میدانوں میں برف کی گہری تہ پیدا ہو گئی۔ سکول کے طلبہ کو کھیلنے کا موقع نہ ملتا تھا اور وہ سخت تنگ تھے۔ نپولین نے تجویز پیش کی کہ برف کا قلعہ تعمیر کر کے مصنوعی جنگ شروع کی جائے۔ تمام طلبہ کمربستہ ہو گئے۔ نپولین نے فنِ تعمیر کا خاصہ مطالعہ کر رکھا تھا۔ اُس کے زیرِ ہدایت تعمیر شروع ہو گئی۔ لڑکوں نے بڑی فرمانبرداری اور مستعدی سے ہر حکم کی تعمیل کی۔ جب قلعہ پایۂ تکمیل کو پہنچا تو اس قدر عظیم الشان تھا کہ شہر کے لوگ جوق در جوق اس کے دیکھنے کے لئے آئے۔ جنگ کے لئے نپولین نے تمام طلبہ کو دو فوجوں میں تقسیم کر کے ہر فوج کا ایک ایک جنرل مقرر کر دیا۔ دونوں افواج کی کمانڈ اُس نے اپنے ذمہ لی۔ لڑائی سے پہلے اُس نے ایسی ولولہ انگیز تقریر کی کہ تمام کے چہرے جوش اور آنے والی جنگ کی خوشی سے تمتما اُٹھے۔ اب ایک فوج محصور ہو گئی اور دوسری محاصرہ کرنے والی۔ وہ کبھی غیرت دلانے والے الفاظ میں محاصرین کی ہمت افزائی کرتا اور کبھی محصورین کے پاس جا کر اُنہیں مدافعت کے لئے ہر ممکن قربانی کرنے پر آمادہ کرتا۔ جنگ بڑی دلچسپ رہی۔

قاعدہ تھا کہ ہر صوبجاتی فوجی سکول اپنے تین قابل ترین لڑکے جن کی عمر پندرہ سال یا اس سے زیادہ ہو ہر سال پیرس کے مرکزی فوجی سکول میں بھیجے۔ جونہی نپولین کی عمر پندرہ سال کی ہوئی وہ اس مرکزی سکول میں بھیج دیا گیا۔ یہ اُس کی غیر معمولی قابلیت اور جوانمردی کا بہترین ثبوت تھا۔ وزیرِ حرب نے اس داخلے کے موقع پر نپولین کے متعلق مندرجۂ ذیل دلچسپ رپورٹ درج کی:۔

"موسیو ابونا پارٹ۔ تاریخ پیدائش ۱۵ اگست ۱۷۶۹ء۔ قد پانچ فٹ چھ انچ جسم مضبوط اور صحت بہت اچھی۔ نرم مزاج دیانتدار اور احسان شناس ہے۔ طرزِ عمل قابلِ تقلید ہے۔ علومِ ہندسہ میں ممتاز رہا ہے۔ تاریخ اور جغرافیہ کو خوب سمجھتا ہے۔ نمائشی علوم اور لاطینی کی طرف اتنی توجہ نہیں۔ قابل جہاز ران بنے گا۔"

یہ مختصر مگر جامع اندراجات نپولین کی اُس وقت کی حالت کا آئینہ ہیں۔ ساتھ ہی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انسان مستقبل کے تاریک پردوں میں سے کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ نپولین ایک عام جہاز ران نہ بنا۔ بلکہ اُس نے خود غرضی ہوس پرستی اور ظلم و تعدی کے طوفانی سمندر میں ملک و ملت اور بنی نوعِ انسان کی کشتی بانی کی۔

نپولین جب پیرس کے فوجی کالج میں پہنچا۔ تو اُسے ایک عجیب عبرت خیز سماں دکھائی دیا۔ کالج کے طلبہ جنہیں جنگ کی صعوبتوں کے لئے تیار کیا جا رہا تھا بڑی آرام پسندی اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُمرا کے وہ نازپروردہ بچے اپنے ہاتھ سے کام کرنا ہتک خیال کرتے تھے۔ ملازمین اُن کی ہر خدمت بجا لانے پر مامور تھے۔ اُن کے گھوڑوں کی خبرگیری کرتے تھے۔ اُن کے ہتھیار صاف کرتے تھے۔ اُن کے بوٹوں پر پالش کیا کرتے تھے۔ الغرض اُن کے ادنٰے سے ادنٰے اور بڑے سے بڑے تمام کام اپنی نوکروں کے ذریعہ سے انجام پذیر ہوا کرتے تھے اور امیرزادے خود یا تو زندگی کے لُطف اُٹھانے میں

مصروف رہتے یا نرم و نازک بستروں پر محوِ استراحت رہتے تھے۔ ان حالات کو دیکھ کر نپولین کا دور اندیش دماغ سخت متردد ہوا۔ وہ نہ چاہتا تھا کہ ایک سپاہی کی زندگی نفاست اور نزاکت کی آئینہ دار ہو۔ اب وہ برین سکول کا ناتجربہ کار اور اس لئے کمزور دل طالب علم نہ تھا کہ اس ناپسندیدہ صورتِ حالات کو دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتا رہتا۔ عمر، علم اور کامیابی نے اُسے بڑا دلیر اور اولوالعزم بنا دیا تھا۔ اُس نے کالج کے پرنسپل کو ایک درخواست[1] لکھی جس میں پُر زور الفاظ میں اُن تمام اصولوں کا ذکر کیا جن کو مدِنظر رکھ کر ایک سپاہی کی تربیت کرنی چاہئے۔ اُس نے پرنسپل کو ترغیب دی کہ اس کالج میں انہی اصولوں پر عمل درآمد ہونا چاہئے۔ اس درخواست کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ اُلٹا باقی طلبہ اس سے بدظن ہو گئے۔ مگر اس تحریر نے یہ امر منکشف کر دیا کہ پندرہ سال کی عمر میں جب ہر ایک لڑکا آرام اور آزادی کا خواہاں ہوتا ہے اور بیکاری کی زندگی بسر کرنا ضروری سمجھتا ہے نپولین بڑا دُور بین مستقل مزاج اور مشقت پسند تھا۔ شاید کسی آواز نے اُس کے کانوں میں یہ کہہ دیا تھا کہ مستقبل میں تمہیں عظیم الشان کام سرانجام دینے پڑیں گے اور اُن کے لئے مناسب تیاری لازم ہے۔

فارغ التحصیل ہونے پر نپولین کی عملی زندگی اس قدر مصروفیت کی تھی کہ اُسے مطالعہ کے لئے کوئی وقت نہ ملتا تھا لیکن پھر بھی وہ مذہبی، سیاسی، انتظامی اور دیگر معاملات میں حیرت انگیز وسعتِ معلومات کا اظہار کیا کرتا تھا۔ یہ ہمہ گیر واقفیت اُس نے کہاں سے حاصل کی؟ یقیناً برین اور پیرس کے تعلیمی اداروں سے۔ اُس کی غیر محدود معلومات ہی اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت ہیں کہ ایام طالب العلمی میں اس نے بڑے انہماک سے محنت کی۔ پیرس کالج میں ایک دفعہ[2] علم ہندسہ کا ایک لاینحل مسئلہ پیش آگیا۔ وہ ایک کمرے میں چلا گیا اور دروازے کو قفل لگا لئے۔ لگاتار بہتّر گھنٹوں تک دماغ سوزی کرتا رہا۔ خورونوش اور نیند کو بھلا بیٹھا اور اس مسئلہ کو حل کرنے کے بعد ہی باہر نکلا۔ یہ واقعہ اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ وہ کسی مشکل کے پیش آنے پر اپنی تمام تر توجہات اس کے حل کرنے پر مرکوز کر دیتا تھا۔ ایک جرنیل کی حیثیت سے کسی جنگ کے پیش آنے پر بھی وہ ہمیشہ اسی طرح کیا کرتا تھا۔ جب تک وہ جنگ کے متعلق تمام ضروری سامان مہیا نہ کر لیتا اور جب تک میدانِ جنگ کا نقشہ اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے روشن نہ ہو جاتا وہ آرام نہ کرتا۔ ایک دفعہ انتظامی قوانین کا مسودہ تیار کرتے وقت اس نے متعدد مرتبہ[3] تھکا ڈالے مگر خود ذرہ بھر تکان محسوس نہ کی۔

پیرس کے کالج میں بھی نپولین نے تاریخ، علومِ ہندسہ، جغرافیہ اور فلسفہ کا بڑی بالغ نظری سے مطالعہ کیا۔ دُنیا بھر کے بہترین مصنفوں کی بہترین تصنیفات نے اُس کے دماغ کی نشو ونما کی۔ اس کا حافظہ بڑا تیز تھا۔ وہ ہر قسم کے نظریوں کو یاد رکھ

---

[1] تاریخ نپولین مصنفہ لاکارٹ صفحہ ۵ و تاریخ نپولین مصنفہ ایبٹ صفحہ ۹۔

[2] ایبٹ صفحہ ۹

[3] لاکارٹ صفحہ ۱۶۹

کر اُن پر ضرورتِ زمانہ اور مفادِ عامہ کے مطابق بڑی اچھی طرح بحث کر سکتا تھا۔ وہ علم اور اُس کے متعلقات کی طرف اس طرح مائل تھا جس طرح ایک پودا روشنی کی طرف جھکتا ہے۔ اس کے علم میں جس قدر اضافہ ہوتا تھا اُسی قدر شوق میں افزونی ہوتی تھی۔

اس وسیع مطالعہ نے اُس کے دماغ میں فلسفیانہ غور و فکر کا مادہ بدرجہ اتم پیدا کر دیا۔ اُس کی گفتگو بڑی پُر زور اور معنی خیز ہو گئی۔ اُس کی تحریر جدتِ ترکیبات، معنی آفرینی، اثر انگیزی اور جوشِ بیان کا بہترین نمونہ ہوتی تھی۔ ایک دفعہ اُس کے ایک اُستاد نے کہا۔ کہ "نپولین کی تحریرات مجھے آتش فشاں پہاڑ کی شعلہ آفرینی کی یاد دلاتی ہیں"[1] جرنیل بننے پر اُس نے وقتاً فوقتاً اپنی فوج کے نام جو اعلانات جاری کئے وہ اُس کی قوتِ تحریر کی برق افگنی کا نہ مٹنے والا ثبوت ہیں۔ لکھتے وقت اُس کے دماغ میں خیالات اس شدت کے ساتھ متلاطم ہوتے تھے کہ قلم اُن کو انتہائی عجلت کے باوجود بمشکل معرضِ تحریر میں لا سکتا تھا۔ اور پھر تحریر اس قدر بدخط ہوتی تھی کہ قدیم مصری رسم الخط کا دھوکا ہونے لگتا۔ اسی لئے اُس کا خوشخطی کا اُستاد ہمیشہ اُس سے شاکی رہتا تھا۔ اُن دنوں کا نپولین صحرا کی اُس پرسکون شام کی طرح تھا جو اپنے پہلو میں ایک عالمگیر طوفان لئے بیٹھی ہو۔

اس کے غیر معمولی اوصاف کو دیکھ کر تمام اُستاد اُس کی قدر کرتے تھے اور اکثر اپنے ہاں بُلایا کرتے تھے۔ بالخصوص تاریخ کا پروفیسر تو اُس کا والہ و شیدا تھا اور اُس کے خیالات سے خوب لذت اندوز ہوا کرتا تھا۔ ایک بڑا با اثر اور فاضل پادری جس کا نام رینل تھا، نپولین کا بڑا مداح تھا۔ اُسے اکثر اپنے ہاں ضیافتوں پر مدعو کرتا اور اُس کا پیرس کے مقتدر علماء سے تعارف کراتا وہ اس نوجوان کی پختہ کاری کو دیکھ کر ششدر رہ جاتے۔

انہی دنوں میں اُسے ایک بار اپنے ہم جماعتوں کے ہمراہ کسی خوشی کی تقریب پر مارسیلز جانا پڑا[2]۔ وہاں تمام لڑکے ہنس کھیل رہے تھے اور اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ محوِ رقص تھے۔ یہ دُور غور و فکر میں منہمک تھا۔ کسی نے طعنہ مارا کہ "تمہارے دل میں جنسِ لطیف کا کوئی احترام نہیں"۔ وہ بولا "آدمی کی تعمیر کھیل کود اور رقص سے نہیں ہوتی" بلند فطرت نپولین چاہتا تھا کہ سوسائٹی کو ارتقائی منازل طے کرا کے تکمیل کے بامِ اعلےٰ پر پہنچا دے۔ بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے اُس نے بڑا وسیع لائحہ عمل مرتب کر رکھا تھا۔ وہ صرف خلقِ خدا کی خدمت کر کے دُنیا میں شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پیرس کا کالج چھوڑنے پر جب وہ سترہ سال کا تھا اُس نے رینل مذکور کے اس سوال[3] کے جواب میں کہ "وہ کون سے ادارے ہیں اور کون سے اصول ہیں جن کو استعمال میں لانے سے انسانیتِ کبریٰ انتہائی مسرت حاصل کر سکتی ہے" ایک مضمون ملک بھر کے اُدباء اور فضلاء کے مقابلے میں لکھا۔ اُس کا مضمون اوّل رہا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ زمانۂ تعلیم ہی میں ایسے مسائل پر دقتِ نظر اور وسیع الخیالی سے غور کیا کرتا تھا۔ وہ عام لوگوں

---

[1] ایبٹ صفحہ ۱۰ [2] ایبٹ صفحہ ۹

[3] لاکارٹ صفحہ ۷ ، ایبٹ صفحہ ۱۱ –

نہ اس لیئے مجرا سمجھتا تھا کہ وہ اپنا وقتِ عزیز فضول کاموں میں ضائع کرتے ہیں اور ان کے سامنے کوئی بلند مقصدِ حیات نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ صرف اسی محدود حلقے میں بے تکلف ہوتا تھا جو کسی حد تک اس کا ہم خیال تھا۔ تاہم عوام کے دلوں پر اس کی قدر و منزلت کا نقش ثبت ہو چکا تھا۔

ان دنوں فرانس میں انقلاب کی آگ سلگ رہی تھی اور جیسا کہ قاعدہ ہے، دُنیا کے انقلابات محض فوری حادثات نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ عرصہ دراز کی بے اطمینانی اور ذہنی کشمکش کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ محکوم مدتِ مدید تک حاکموں کی غفلت شعاریاں اور خود غرضیاں ملاحظہ کرتے رہتے ہیں۔ رعایا کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ اُن کے حکمران یونان کے عشرت پسند دیوتاؤں کی طرح اپنے عیش و عشرت کیلئے انہیں ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ اس قسم کے احساسات بڑے عرصے تک دلوں میں پرورش پاتے رہتے ہیں۔ اور آخر کار ایک طوفانِ عظیم بن کر ملک میں وہ قیامت برپا کرتے ہیں کہ انسان اس کے تصور سے بھی کانپ اُٹھتا ہے۔ بادشاہوں اور اُمراء کو تختۂ دار پر لٹکانا، عہدِ ماضی کے تمام بھلے یا بُرے اداروں کا نیست و نابود کرنا، کشت و خون اور لوٹ مار میں منہمک ہونا اور عالیشان محلات کو نذرِ آتش کرنا انقلابیوں کے ادنےٰ مشاغل بن جاتے ہیں۔ اُن دنوں یورپ کی زمانہ کا رجحان یقینی طور پر اسی قسم کے ہولناک انقلاب کی طرف تھا۔ نپولین اگرچہ عوام الناس کی تکالیف اور خواہشات سے دلی ہمدردی رکھتا تھا مگر وہ انقلاب کی زہرہ گداز تفصیلات سے بڑا خائف تھا اور جہاں وہ ایک طرف حکمران خاندان کی استعمار پرستی کا قلع قمع کرنا چاہتا تھا وہاں اُس کو یہ بھی فکر رہتا تھا کہ کہیں یہ انقلاب ننگِ انسانیت شکل اختیار نہ کر جائے۔ اپنے ان خیالات کا اظہار وہ اکثر اپنی تحریرات میں اور اپنے دوستوں کے سامنے علانیہ کیا کرتا تھا۔ اس کا یہ رویہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ بچپن ہی سے حریت، اخوت اور مساوات کا علمبردار تھا اور ان کی جائز حدود سے بخوبی آگاہ تھا۔

جب اس کی عمر سولہ سال ایک ماہ تھی اس کا فوجی ملازمت کے لئے امتحان ہوا۔ جیسی کہ توقع کی جا سکتی ہے ہر مضمون میں اس کے نتائج بڑے شاندار رہے۔ تاریخ کے پروفیسر نے اُس کے دستخطوں کے بالمقابل لکھا[1] "پیدائش اور کردار ہر لحاظ سے یہ کارسیکا میں سے ہے۔ اگر قسمت نے یاوری کی تو یہ نوجوان اپنے آپ کو دُنیا میں ممتاز بنائے گا" اس امتحان کے اختتام پر نپولین توپخانے میں دوم درجے کا لفٹیننٹ مقرر کر دیا گیا۔ وہ آغازِ عمر میں اس معزز عہدے پر سرفراز ہو کر بڑا نازاں ہوا۔

اس تقرر کے وقت نپولین بڑا دُبلا پتلا اور نحیف الجثہ تھا۔ شبانہ روز دماغی محنت نے اس کی جسمانی نشوونما روک دی تھی یہاں تک کہ دن کا کافی حصہ ایک جگہ بیٹھے رہنے کی وجہ سے اُس کی ٹانگیں اُس کے بالائی دھڑ سے چھوٹی رہ گئیں۔ چنانچہ شہنشاہ بننے پر وہ اس تناسب کو پورا کرنے کے لئے بڑے اونچے فوجی بوٹ پہنا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے ایک بار ایک خاتون

---

[1] ایبٹ صفحہ ۱۰۔

نے اُسے اس حالت میں دیکھ کر بلی بوٹوں ہیں [illegible] کی پھبتی اُڑائی تھی اور اسی غیر متناسب نشو ونما کی بنا پر اکثر انگریز مصنفین کہتے ہیں کہ وہ عدالتی جاہ وجلال نہ رکھتا تھا لیکن اُس کا چہرہ اس کمی کو پورا کر دیتا تھا۔ اُس کے چہرہ کے خد وخال نہایت دلآویز تھے۔ اُس کی سب سے بڑی خوبی اُس کی آنکھوں کی چمک تھی جو نظر کو خیرہ کر دیتی تھی۔ اُس کی تمام زندگی میں صرف ایک شخص کو اس سے آنکھ ملا کر دیکھنے کی جرأت ہوئی اور نپولین نے اس کی اس دلیری سے متاثر ہو کر اُسے جرنیل کا ممتاز عہدہ عطا کیا۔ کہتے ہیں کہ نپولین کے عظمت وجلال کا صحیح اندازہ صرف اُس وقت ہو سکتا تھا جب وہ گھوڑے پر سوار ہوتا تھا۔ کیونکہ اُس وقت اُس کا جسمانی نقص آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔

تاریخ عالم میں اپنے کمالات کی بدولت نپولین بادشاہوں کی صف میں ایک فقید المثال شخص ہے لیکن ہم نے اُس کے بچپن کے حالات کا مطالعہ کر کے دیکھ لیا ہے کہ اس کی یہ کامیابی محض اتفاقی نہ تھی۔ محض مخصوص حالات کی بدولت وہ ترقی کی انتہائی بلندیوں پر نہ پہنچا۔ اور نہ وہ اپنی عظمت کے لئے دُنیا کے کسی مقتدر انسان کا مرہونِ منت ہی بنا بلکہ یہ سب کچھ اُس کے بچپنے کی مسلسل محنت اور قوت بازو کا ناگزیر نتیجہ تھا۔ نپولین جس زمانے میں ہوتا اور جن حالات میں ہوتا وہ ایک نامور ہستی بنتا۔ لاریب قدرت نے اُسے غیر معمولی ذہنی استعداد عطا فرمائی تھی لیکن اُس استعداد میں جو اضافہ اُس کی فرض شناسی مستعدی اور ان تھک کوششوں نے کیا وہ ہر زمانہ کے لوگوں کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ ہے اور آئندہ نسلیں اُس کے کارہائے نمایاں کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہیں گی۔

اس مضمون کے خاتمہ پر اگر علامہ اقبال کا یہ شعر لکھ دیا جائے تو کس قدر موزوں رہے گا ؎

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

عبدالغنی بی۔ اے

زندگی میں صرف حقائق درکار ہیں۔ (ڈکنز)

مجھے حفاظت کے لئے سوائے نیکیوں کی ڈھال کے اور کوئی ہتھیار درکار نہیں۔ یہی وُہ ہتھیار ہے جس کے ساتھ میں خطرے سے صحیح گذر جاتا ہوں۔ ہاں یہی ہتھیار میرے لئے محافظ فرشتہ ہے۔ (لانگ فیلو)

طاہر قریشی

لے لاکارٹ صفحہ ۱۶۹۔

فرانس ـــ پیرس!

فرانس! اس لفظ میں کچھ شیرینی ہے! جنہوں نے پیرس کا شہر دیکھا ہے جو پیرس میں چند دنوں بھی ٹھہرے ہیں انہیں اس کے بتانے اور یقین دلانے کی ضرورت نہیں اُن کے دل اس کے گواہ ہیں۔ پیرس کو فرانسیسی زبان میں لکھتے تو پیرس ہیں لیکن پڑھتے یا پُکارتے ہیں پری یا پاری، پیاری کے لگ بھگ اور اس شہر میں اس کے مناظر میں اس کے مظاہر میں کچھ اس قدر نسائیت ہے کہ اسے بجائے پیارا کے پیاری ہی کہنے کو جی چاہتا ہے۔ یوں تو یہ دُنیا کا چوتھا، پانچواں سب سے بڑا شہر ہے اور اس لئے لازماً عظیم الشان ہے لیکن اس عظمت کے ساتھ نہیں اس عظمت سے بڑھ کر اس عظمت پر چھائی ہوئی اک خاص نوع کی نزاکت ہے جو پیرس کے ساتھ مخصوص ہے۔ پیرس ہے یہ نزاکت، پیرس ہے خوبصورتی رعنائی دلربائی، راگ رنگ شعر صفائی تناسب آرٹ یہ سب کچھ ہے پیرس اور اس پر مستزاد وہ سب کچھ بھی جو محض دیکھنے اور محسوس کرنے اور جاننے سے تعلق رکھتا ہے! ——— لفظ فرانس کا کہا تھا لیکن گفتگو پیرس پر شروع ہوگئی! یہ کیا یہ کیسے؟ اس لئے کہ پیرس محض فرانس کا دار السلطنت نہیں بلکہ وہ ہے فرانس کا دل فرانس کا دماغ بلکہ خود فرانس۔ فرانس جو سارے کا سارا سمٹ کر پیرس بن گیا ہے اور پیرس محض اپنے فرانس ہی کا دل نہیں بلکہ وہ ہے سارے یورپ بلکہ ساری دنیائے حاضر کا زندہ و تابندہ دھڑکتا ہوا دل! دل! ہاں اہلِ دل اُسے خوب سمجھتے بُوجھتے ہیں، دماغ کا ٹھکانا لندن یا برلن یا نیویارک ہُوا کرے لیکن دل تو پیرس ہی کی دلکشی کا والہ و شیدا ہے! دلدادہ، دل شاد، دل شکستہ، دلگیر غرض ہر قسم کے دل پھینک لوگوں کا ماویٰ و ملجا یہی دل والوں کا قبلہ و کعبہ ہے!

لیکن متمدن دُنیا کا یہ دل، محض یار لوگوں کی طرح کا کمزور سا پھسپھسا ڈھلمل یقین دل نہیں کہ آئے دن ضعف کا شکار ہوتا رہے بلکہ وہ ہے مضبوط منہمک زندہ خوبصورت رنگیں مسرور شادکام!

صدیوں یہ پیرس اور یہ فرانس یورپ کا، اُس کی شائستگی کا، اُس کے علم و ادب کا، اُس کے اوضاع و اطوار کا، اُس کے فیشن کا مرکز بنے رہے ہیں۔ انگریز یورپ کے تاجر تھے فرانسیسی اُس کے معلم ادیب اور ہر معنی میں ادب آموز تھے۔ فرانسیسی زبان یورپ کے ملک ملک میں شائستگی اور سیاسی مفاہمت کی زبان تھی اور اب تک ہے۔ جو شخص یورپ کے ملک ملک میں سفر کرنا چاہتا ہے اُس کی قوموں سے رابطہ پیدا کرنا چاہے اُس کے تمدن سے فیض یاب ہونا چاہے اُس کے عیش و عشرت اُس کے نظم و سیاست سے آگاہ ہونا چاہے اُسے فرانسیسی زبان سے اور اُس کے علم و ادب سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کرنا لازم ہے!

فرانس اور پیرس کا نام سُن کر راقم کے دل میں بھی سینکڑوں خیالات اُٹھتے ہیں اور ہزاروں مناظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں : نپولین اور اُس کے کارنامے، ژان دارک اور اُس کی معجز نمائیاں، لوئی بادشاہوں کا تجمل و احتشام، مولئیر، راسین، وکٹر ہیوگو، الگزانڈر ڈیوما (بدقسمتی سے ہم میں سے اکثر ان کے نقلی بھدے ناموں سے آشنا ہیں اور اصلی ناموں سے نابلد) ان کی ادبی جولانیاں، پھر فرانس کے دیہات کے دلفریب نظارے، ہرے بھرے صاف ستھرے زرخیز کھیت، اچھوٹے چھوٹے دریا، ننھی ننھی آبجوئیں، اُس کے جنوبی نیلگوں ساحل کی رنگینیاں اور سب سے بڑھ کر اُس کے مقلب القلوب دل، پیرس کی سڑکیں بازار چوک عجائب خانے تصویر گاہیں مجسمے چمن نما گزرگاہیں جنت نما باغ، وہ "شاں زلی زے" وہ "بوا دبولون" وہ "لوور" وہ طولری باغ" اور سب کی رُوح و رواں وہ خود "پاری" وہ جانِ عالم وہ مشہور و معروف پیرس — نہ وقت ہے نہ جگہ کہ ان میں سے کسی ایک کا بھی جی بھر کا ذکر کیا جائے بس یہ سمجھ لو کہ تمدن جب اپنی متانت سے تنگ آجاتا ہے تو معاً فرانس کا رُخ کرتا ہے اور سیدھا جا کر پیرس کا دامن پکڑ لیتا ہے !

غلام

تمام زنجیریں توڑ کر، غلام کو اُنھوں نے آزاد کر دیا . . . . . .
لیکن وہ اتنا ہی غلام رہا جتنا پہلے تھا۔

غلامانہ ذہنیت کے صدقے میں وہ ویسے کا ویسا ہی پابندِ سلاسل تھا،
سُستی اور کاہلی کی وہی بیڑیاں اس کے پاؤں میں پڑی تھیں،
خوف اور وہم پرستی کی زنجیروں میں وہ ویسا ہی جکڑا ہُوا تھا
اور اسی طرح جہالت، بدگمانی اور وحشی پن کی زنجیروں میں گرفتار
اس کی غلامی زنجیروں میں نہ تھی
بلکہ اپنی ہی ذات میں تھی

آزاد تو صرف آزاد لوگ کئے جا سکتے ہیں،
اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہوتی
کیونکہ آزاد آدمی خود اپنے آپ کو آزاد کر لیتے ہیں ۔
(جیمز آپنہائیم)

ملک محمد اسلم خان ایم اے (کیمبرج)
بیرسٹرایٹ لاء۔ لاہور

ساقی

مے و مینا سے ہے آرائشِ ایماں ساقی
لا غنیمت ہے مجھے یہ سروساماں ساقی

جامِ گلرنگ بڑھا میری طرف بہرِ خدا
تا کہ میں دیکھ سکوں پرتوِ جاناں ساقی

تو کرے دردِ غمِ زیست کا اے کاش علاج
ہے یہ وہ درد کہ جس کا نہیں درماں ساقی

ہو سکے تجھ سے تو رندوں کو مہیّا کردے
ایک ساعت کے لئے عیش کا ساماں ساقی

طاعت و کفر کی فرسودہ روایات کو چھوڑ
جام دے جام یہ ہے بزمِ حریفاں ساقی

تجھ سا دُنیا میں کہاں سروِ سمن بُو ہوگا
تیری خوبی پہ فدا سنبل و ریحاں ساقی

جام بھر دے کہ گھٹا چھائی ہے کہساروں پر
چھیڑ بربط کہ یہ ہے موسمِ باراں ساقی

پھر معطّر ہے شمیمِ گُل تر سے ہر سانس
رشکِ فردوس ہے پھر صحنِ گلستاں ساقی

سچ ہے یہ مجھ کو رہا کرتی ہے اِک بُت کی تلاش
تیری اس نکتہ شناسی کے میں قرباں ساقی

تیرے رُخسار کے مصحف نے مسلماں کیا
چشمِ روشن ہے تری مشعلِ ایماں ساقی

آسماں پر ہے تری بندہ نوازی سے دماغ
لوٹ آیا ہے پھر اب وقتِ سلیماں ساقی

کون ہو سکتا ہے رندوں کے سوا تجھ سے دوچار
رشکِ خورشید ہے تیرا رُخِ تاباں ساقی

کردیا دل پہ تری چشمِ غزالی نے فسوں
لے گئی ہوش تری جنبشِ مژگاں ساقی

چاند پر جیسے مچلتی ہوئی ساون کی گھٹا
تیرے رُخ پر ہے یونہی زلفِ پریشاں ساقی

جو گلی کوچوں میں مشہور ہے مے نوش جلال
تیرے میخانے میں ہے آج غزل خواں ساقی

جلال

لفظ "نیوز" (تازہ خبریں) چار حروف .E. W. S .N سے مرکب ہے جو بالترتیب نارتھ (شمال) ایسٹ (مشرق) ویسٹ (مغرب) ساؤتھ (جنوب) کی علامات ہیں۔ گویا چاروں اطراف عالم لفظ "نیوز" کے مفہوم میں شامل ہیں۔ مطلب یہ کہ دُنیا کے تمام ملکوں کی ہر قسم کی تازہ بتازہ خبروں کے مجموعے کو اخبار کہتے ہیں۔ اور ان خبروں کو بطریقِ احسن ترتیب دینا اور ان پر بے لاگ تنقید کرنا فنِ اخبار نویسی کا موضوع ہے جس کی بدولت کاغذ کے ایک ٹکڑے کو دُنیا میں وہ عزت، وقعت، طاقت اور رُعب حاصل ہے جو کسی اور چیز کو نصیب نہیں۔

اخبارات کے ایجاد و اجرا کی مختصر تاریخ

چینی کہتے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں سب سے پہلا اخبار ہم نے نکالا تھا اور ہمیں اخبارات کے موجد ہیں۔ لیکن اُن کا یہ دعوےٰ یقینی طور پر پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکا۔ زمانۂ حال کی تحقیقات سے پایا جاتا ہے کہ سب سے پہلا اخبار موسومہ "ایکٹا ڈمنا" کا اجرا شہر روما (اٹلی) میں مسیح سے چند صدیوں پہلے ہوا تھا۔ اس کے بعد اہل جرمنی نے پندرھویں صدی عیسوی میں ایک اخبار نکالا۔ فرانس کا پہلا اخبار "دا فرانس" نامی ۱۶۳۱ء میں شائع ہوا۔ انگلستان میں سب سے پہلا اخبار "ویکلی نیوز" ۱۶۲۲ء میں جاری ہوا جو ۱۷۸۵ء میں "یونیورسل رجسٹر" کے نام سے موسوم ہوا اور اب ۱۷۸۸ء سے "ٹائمز" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ دُنیا میں کسی اخبار کو "ٹائمز" جیسی قدر نصیب نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس کا ۱۷۸۵ء سے ۱۹۲۹ء تک کا فائل جو ایک فرم کی ملکیت تھا چھ سو پونڈ میں ۱۸۰۰ء تک کی جلدوں میں سے چند دفتر "ٹائمز" نے خرید کر اپنا فائل مکمل کیا اور باقی جلدیں "رائل سٹیٹسٹیکل انسٹی ٹیوٹ" ۱۸۰۰ء کے بعد کے فائل کی جو اسکو کی "مارکس انجل انسٹی ٹیوٹ" نے خریدا تھا بہت مانگ تھی۔ چنانچہ ایک موقع پر وارسا متحدہ امریکا سے بذریعہ تار طلب کیا گیا۔ یکم اگست ۱۸۲۸ء سے ۳۰ جون ۱۹۱۱ء تک کا فائل ۱۹۱۲ء میں خریدا تھا۔ روس میں پہلا اخبار ۱۷۰۳ء میں جاری ہوا اور پیٹر اعظم شہنشاہ روس نے اس اخبار کے اس کے پروف کی کاپیاں تک خود درست کیں۔ اس اخبار کے دو سال کے پرچے اس وقت تک محفوظ ہیں۔ امریکا میں پہلا اخبار ۱۷۰۴ء میں "نیوز لیٹر" کے نام سے جاری ہوا۔ اس سے پہلے ... سے واقف نہ تھے۔ ہندوستان میں سب سے پہلا اخبار مولانا آزاد کے والد مولانا محمد باقر نے ۱۸۳۶ء میں

فنِ اخبار نویسی کا درجہ

... ایک ایسا شریف اور معزز فن ہے جس سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق رکھنا بڑے بڑے بادشاہ اور مدبر باعثِ فخر

سمجھتے رہے ہیں۔ چنانچہ روس میں پہلا اخبار بادشاہ وقت کے زیر ادارت نکلا تھا۔ اور کارل مارکس۔ بنجمن فرینکلن۔ لینن۔ ٹراٹسکی۔ ایڈیسن۔ میلڈسٹا۔ لائڈ جارج۔ مسولینی۔ ہٹلر وغیرہ تمام بڑے بڑے آدمیوں نے اپنی معاشری و سیاسی زندگی کی ابتدا اخبار نویسی سے کی۔ ہندوستان میں مہاتما تلک۔ مولانا محمد علی اور مہاتما گاندھی وغیرہ نے بھی اخبار نویسی سے ہی دُنیا پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھایا۔

اخبار کو آج وہ طاقت حاصل ہے جس سے دنیا کا کوئی فرد خواہ وہ شاعر ہو یا ادیب، ڈاکٹر ہو یا طبیب، بیرسٹر ہو یا وکیل۔ تاجر ہو یا مدبر، مذہبی رہنما ہو یا سیاسی، اداکار ہو یا مُقرر منحرف نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے حلقۂ اقتدار سے باہر قدم رکھ کر اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ قوموں کی زندگی اور موت کا سوال اخباروں کی موافقت اور مخالفت پر منحصر ہے۔ دوست سلطنتوں کو دشمن بنا دینا۔ اور دشمن سلطنتوں کو دوست بنا لینا اخبارات کا ایک ادنےٰ کرشمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے آدمی اخبار اور اخبار نویسوں کو ہوّا سمجھتے رہے ہیں۔ چنانچہ

ولیم سٹیڈ نے کہا تھا کہ اخبار نویس کی صورت دیکھ کر شیطانوں کا باوا ابلیس بھی کانپ جاتا ہے۔

پُرتگال کا بادشاہ نوبل اخبارات ہی کو اپنی معزولی کا باعث سمجھتا تھا۔

جمہوریہ وینز ویلا (امریکا) کے صدر میٹرو کا قول ہے کہ میں جہنم کے عذاب سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا اخبار نویس کے قلم سے ڈرتا ہوں۔

نپولین بوناپارٹ جو یہ کہا کرتا تھا کہ اگر آسمان ہمارے سروں پر لوٹ پڑے تو ہم اپنی سنگینوں سے اسے پرے ہٹا دینگے اخبارات سے کم خائف نہ تھا۔

ملکہ سپین نے اخبار نویسوں کو زہریلے جانوروں سے تعبیر کیا ہے۔

سلطان عبد الحمید نے معزول ہونے کے بعد کہا تھا کہ اگر میں اپنے ملک میں پھر اقتدار حاصل کر سکوں تو سب سے پہلے اخبار نویسوں کو قید خانہ میں بند کروں۔

ایک مشہور سائنس دان اور ماہرِ نفسیات اخبارات کو روز افزوں جرائم کا باعث قرار دیتا ہے۔

روسو کی پیشین گوئی ہے کہ یورپ کے سلاطین نے جس قدر قرون ماضیہ میں پریس کو ترقی دی تھی اس کے خطرناک نتائج کے خوف سے وہ آئندہ چلکر اُتنے ہی اسکے مٹانے میں کوشاں ہونگے۔

سلطان احمد نے پریس کے خطرات کو محسوس کرتے ہوئے اپنے قائم کردہ مطبع کا تمام سامان کنوئیں میں ڈلوا دیا تھا تاکہ پریس کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔

نیٹشے کا قول ہے کہ اچھے آدمیوں کو عوام کے اخلاق کی غیر مشروط حفاظت کرنی چاہئے۔ ہمیں ایسے تمدن پر اعتماد نہیں

کرنا چاہیئے جو اخبار خوانی اور اخبار نویسی کو جائز قرار دے۔

سوامی رام تیرتھ کا مقولہ ہے کہ مبارک ہیں وہ لوگ جو اخبارات کا مطالعہ نہیں کرتے۔

مہاتما گاندھی نے بھی جنوبی ہند کے دَورے میں کہا تھا کہ مجھے جرنلزم سے بچاؤ۔

آج پریس کی طاقت سے کسی کو انکار نہیں۔ ایسی حالت میں جب کہ دُنیا کے ہر کام میں اخباروں کا ہاتھ ہے۔ اخبار نویسوں کو بھی ذرا ذمہ داری اور فرض شناسی سے کام لینا چاہیئے۔ ملک اور قوم کی اجتماعی اور انفرادی امیدیں انہی لوگوں سے وابستہ ہیں بعض اوقات ان کی غلطیاں اور لغزشیں سارے ملک اور قوم کی غلطیاں اور لغزشیں بن جاتی ہیں۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ آج کل لوگوں نے اخبار نویسی کو ایک کھلونا سمجھ رکھا ہے اور جو چاہتا ہے اس سے کھیلنے لگتا ہے۔ آج محض اسی قماش کے چند نا اہل اخبار نویسوں کی بدولت تمام ہندوستانی بلکہ انگریزی پریس بھی گٹر پریس (G. P.) کے نام سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ مختصر یہ کہ اخبار نویسوں کو چاہیئے کہ وہ واقعات کو نہایت تحقیق و تدقیق کے بعد اخبارات میں جگہ دیں اور اپنی ناقدانہ تحریروں میں حق گوئی کو اصل مقصد ٹھہرائیں نیز سیاسی پراپیگنڈوں کے پہلو بہ پہلو اخلاقی مضامین پر بھی زور دیں کہ سیاست سے بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ عمدگیٔ اخلاق ہی مقصود ہے دَورِ حاضر میں جب کہ ملک کے اندر بہ یک وقت متعدد تحریکیں جاری ہیں جن میں سے بیشتر عورتوں کی آزادی اور تعلیم پر زور دے رہی ہیں۔ ہمارے اخبار نویسوں کو جنسی معاملات سے تعلق رکھنے والے اشتہارات میں اخلاق کو خاص طور پر مدِّنظر رکھنا چاہیئے۔ مضمون کا یہ پہلو ایسا ہے جس میں طویل ہو جانے کی بہت گنجائش ہے۔ لیکن ہم ناظرین کے قیمتی وقت اور مصلحتوں کا احترام کرتے ہوئے یہ سب کچھ انہیں کے تخیل کے لئے چھوڑتے ہیں اور اخبار نویسوں کی رہنمائی کے لئے اٹلی کے میلڈسٹا نامی اخبار نویس کی مثال پیش کرتے ہوئے مضمون کو ختم کرتے ہیں جس نے اپنے پُر اثر اور زور دار مضامین سے اہلِ اٹلی کو اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے شراب نوشی ترک کر دی۔ یہی نہیں بلکہ آپس کے لڑائی جھگڑوں سے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔

پرسرام

مجھے یقین ہے کہ نیکی چیتھڑوں اور میلے کچیلے کپڑوں میں اسی طرح چمکتی ہے جس طرح اُودے رنگ کے نفیس اور دلکش کپڑوں میں۔ (چارلز ڈکنز)

عقیدت مند آنکھ ہر عیب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ (عبداللہ بن معاویہ)

طاہر قریشی

فریاد

(خدائے عشق کے حضور میں)

رحم! بس اے خدائے عشق
حسن ہے مبتلائے عشق

آخرِ شب کی خامشی — ہوتی ہے جب سکوں طراز
اٹھتی ہے درد و کرب سے — ایک صدائے غم نواز
نالۂ قلبِ شعلہ ریز — نوحۂ شمع جاں گداز

اس کی شکست میں چھپا
دیکھ رہا ہے دل مرا

—— ایک نگارِ ناز کو
جانِ بہارِ ناز کو

ضبطِ غمِ نہاں بھی ہے
شکوۂ بےزباں بھی ہے

حسنِ جہاں فروز ہو — نازکشِ ادائے عشق

اُس پہ بھی یہ جفائے عشق؟
رحم! بس اے خدائے عشق!

نغمے ہوں دم بخود جہاں — پردۂ سوز و ساز میں!
نکہتِ گل، ادب شناس — جس کی فضائے ناز میں!
شمع کے مُنہ کو چُپ لگے — جس کے حریمِ راز میں!

ہاں وہی مظہرِ جمال
ہاں وہی جنّتِ خیال
یوں ہو ستم کشِ ملال؟

لب پہ نشاطِ خامشی — دل میں ہوائے ہائے عشق!

کیا ہے یہی سزائے عشق؟
کیا ہوئی وہ وفائے عشق؟ — حُسن کو یوں ستائے عشق!

رحم —— بس اے خدائے عشق!

روش صدیقی

علوی اور سفلی محبّت

(ڈراما[1])

دو آدمی سڑک کے درمیان ٹہلتے ہوئے جا رہے ہیں۔ یہ مضافاتی علاقہ بالکل سنسان ہے۔ مرغزاروں اور درختوں کی چوٹیوں پر نفیس کہر پیچ وخم کھاتی ہوئی بیرتی نظر آتی ہے۔ دُور شہر میں بازار کے چراغوں کی دھندلی دھندلی قطاریں دکھائی دے رہی ہیں جن کی مدھم لَو لمحہ بہ لمحہ تاریک ہوتے ہوئے اُفق کے پس منظر کے مقابل زرد معلوم ہوتی ہے۔ شہر کے اندر گاڑیوں کی آمد ورفت کی دھیمی دھیمی آواز اِس جگہ یوں سُنائی دے رہی ہے جیسے بھاری غالیچوں پر قدموں کی چاپ۔

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ (عقلِ کُل کا بھروپ بھر کر استادانہ انداز میں) عورت کی محبت یا روحانی ہوتی ہے یا نفسانی۔ کوئی عورت دونوں صفات کا مجموعہ نہیں ہوسکتی۔ ٹیٹشین کا نظریہ بالکل درست ہے۔

دُبلا پتلا آدمی۔ ٹیٹشین نے اس کے متعلق کیا کہا ہے؟

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ اُس نے ایک خوبصورت تصویر بنا کر اُس کا نام "آسمانی اور ارضی محبت" رکھا۔ اس تصویر میں اس نے دو عورتیں دکھائیں جن میں سے ایک پاکیزہ اور خاموش روحانیت کی مُورت تھی اور دوسری نفسانیت اور ہوس کاری کا مجسمہ یہی حال حقیقی زندگی میں ہے۔

[یہ کہہ کر وہ اطمینان سے سگار کا ایک لمبا کش لگاتا ہے۔ گویا اُس نے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل کر دیا ہے۔]

دُبلا پتلا آدمی۔ تمہارا یہ خیال ہے؟

---

[1] اسی مصنّف کا ایک ڈراما "کچھ شوہروں کے متعلق" اکتوبر کے "ہمایوں" میں شائع ہوچکا ہے۔ افسوس ہے کہ راقم کی فروگذاشت سے اس کے نیچے ترجمہ کا حوالہ درج نہ ہُوا۔

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ خیال کیا، میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔ مجھی کو لو، میں ایک معمولی آدمی ہوں۔ میرے آباء واجداد کاشتکار تھے، اس لئے میں رُوحانی عورت کے مقابلے میں گوشت پوست کی عورت کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں مثالی محبت کی خوبی کو سمجھ سکتا ہوں۔ دو روحوں کے ملاپ میں واقعی شاعرانہ بلند خیالی ہے لیکن جونہی میرے لب کسی عورت کے گرم لبوں کو چھُوتے ہیں، میرے دماغ سے اس قسم کے تمام متوہمانہ خیالات فقرّو ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت میں سوچنا چھوڑ کر محسوس کرنے لگتا ہوں۔

دُبلا پتلا آدمی۔ تمہیں یہ سب کچھ عورتوں ہی نے سکھایا ہے۔

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ کس طرح؟

دُبلا پتلا آدمی۔ مرد کو جو کچھ عورت بنا دے وہی بن جاتا ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں ——— ڈرو مت، میں تجسّس نہیں کرتا ——— مگر میرا خیال ہے تمہاری محبوبہ نفس پرست ہے۔ اب میری مثال لو۔ جس عورت سے مجھے محبت ہے ——— گھبراؤ مت۔ میں سرِ بزم نہیں ——— میرا مطلب یہ ہے کہ اُس کی حالت اِس کے بالکل برعکس ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کیوں؛ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ دُبلی پتلی ہے۔ لیکن اُسی نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ دو روحوں میں باہمی کشش اور سچی رُوحانی دوستی کی صلاحیت ہی ایسے تعلقات کے جواز کی دلیل ہو سکتی ہے جو بہ صورتِ دیگر قابلِ اعتراض سمجھے جاتے ہیں۔

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ مگر صرف دُبلی پتلی عورتوں کے نزدیک!

[وہ پھر دھوئیں کا ایک مرغولہ ہوا میں چھوڑتا ہے۔ اس شانِ استغنا سے گویا دوبارہ اُس نے اس مسئلہ کا قطعی حل پیش کر دیا ہے اور اس دفعہ علم الابدان کے نقطۂ نظر سے]

دُبلا پتلا آدمی۔ اُس کی محبت میں ملاطفت اور حیا ہے۔ ہماری ہم آغوشیاں ہماری محبت سے الگ ایک چیز ہیں اور ہمارے بوسے دھندلے اور خوابناک دریائی وقفے۔ شاید تم یہ سُن کر ہنسو مگر یہ ہے بالکل درست کہ جب ہم اپنی شدید سے شدید جذباتی ملاقاتوں کے بعد بھی جُدا ہوتے ہیں تو ہم بہن بھائی کی طرح سکون، پاکیزگی اور دلجمعی کی حالت میں جُدا ہوتے ہیں۔

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ عورتیں کس قدر مختلف ہوتی ہیں۔ جب میں اپنی محبوبہ سے جُدا ہوتا ہوں تو میں خالصتہً ایک ایسا نر ہوتا ہوں جو اپنی مادہ سے علیحدہ کر لیا گیا ہو اور وہ مطلقاً ایک مادہ ہوتی ہے جس کے لب میرے بوسوں کی آگ سے ملتہب ہوتے ہیں اور اُس کے دل میں محبت، حسد اور نفرت کا ہیجان برپا ہوتا ہے۔ اُس کی محبت وہ بھڑکتی ہوئی پیاس ہے جو کبھی بجھ نہیں سکتی۔

(سگار کا ایک اور کش لگاتا ہے۔)

دُبلا پتلا آدمی۔ اگر میں اپنی محبوبہ کا ذکر اس طرح کروں تو وہ مجھے کبھی معاف نہ کرے۔

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ اور میری محبوبہ اگر محبت کے متعلق تمہارے یہ خیالات سن پائے تو تمہیں ایسا آڑے ہاتھوں لے کہ عمر بھر یاد کیا کرو۔ میں نے بھی ابتدا میں روحانی اوٹ پٹانگ طریقے سے کام لینا چاہا تھا ——— تم جانتے ہی ہو ابتدا میں آدمی ذرا جھجکتا ہے ——— مگر وہ میری اول جلول باتوں کو خاطر میں بھی نہ لائی۔ بوسوں پر بوسے، باہم آغوشیاں، گرمجوشی اور ناآسودگی، وہ تو فقط ایسی باتیں جانتی تھی۔

دُبلا پتلا آدمی۔ عجیب بات ہے۔

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ قطعاً نہیں۔

دُبلا پتلا آدمی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں محبت کی دو قطعاً متخالف حدود پر کھڑے ہیں۔ تم نفسانیت کی حد پر اور میں روحانیت کی حد پر۔ تمہاری عورت فربہ اور سُرخ ہے اور میری دُبلی پتلی اور سفید۔

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ میں اُسے فربہ تو نہیں کہہ سکتا۔

دُبلا پتلا آدمی۔ اور میری بھی کچھ ایسی دُبلی پتلی تو نہیں۔

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ میری نہ تو فربہ ہے اور نہ لاغر۔ اسے دیکھ کر گداز اور گدرائے ہوئے جسم کا خیال آتا ہے۔

دُبلا پتلا آدمی۔ میری بھی متوسط ڈیل ڈول کی ہے لیکن اُس کی انگلیٹ کچھ ایسی ہے کہ دیکھ کر چھریرے پن کا گمان ہوتا ہے میں اسے سفید بھی نہیں کہہ سکتا۔ اُس کا رنگ سُرخی مائل زرد ہے۔

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ میرا خیال ہے میری محبوبہ کا رنگ گہرا سُرخ ہے۔

دبلا پتلا آدمی۔ اگر یہ دونوں ایک جگہ جمع ہوں تو عجیب دلچسپ اتفاق ہو۔ خدا جانے اِس قسم کی دو قطعاً مختلف طبائع گفتگو کے کس مشترک موضوع پر جمع ہو سکیں۔ میں نے سُنا ہے فرانس میں کبھی کبھی دو دوست اپنی اپنی محبوبہ کے ساتھ چار آدمیوں کی چھوٹی سی ضیافت میں ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کبھی ہم چاروں بھی یوں ہی کہیں جمع ہوں۔

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ یہ مشکل ہے۔ ممکن ہے وہ ایک دوسری کو جانتی ہوں۔

دُبلا پتلا آدمی۔ ہاں یہ ایک دُور اندیشانہ خیال ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ باہم شناسا ہوں گی۔

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ممکن ہے اُن کا آپس میں گہرا بہناپا ہو۔

دُبلا پتلا آدمی۔ (لجاکر) میں کہتا ہوں ———

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ (دوسرے کی تجویز کو قیافے سے سمجھ کر) ہاں ہاں!

دُبلا پتلا آدمی۔ بھئی دیکھو تم مجھے اپنی محبوبہ کا نام بتا دو اور میں تمہیں اپنی کا نام بتا دیتا ہوں۔

[بہت دیر تک دونوں چُپ چاپ چلتے رہتے ہیں۔ یہ تجویز تو دونوں کو پسند ہے لیکن دونوں اس سوچ میں پڑ گئے ہیں کہ کہیں دوسرا میری رضامندی کو گاؤدی پن پر تو محمول نہ کرے گا۔ آخر گٹھیلے بدن والا آدمی دفعتہً رُک کر اپنا ہاتھ دوسرے کی طرف بڑھاتا ہے اور وہ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ دونوں مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور گرمجوشی سے ایک دوسرے کے ہاتھ کو بہت دیر تک پکڑے رہتے ہیں۔]

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ (تقریباً سرگوشیوں میں) مسز جیروم زالو۔

دُبلا پتلا آدمی۔ (متوحش نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ کر) کیا؟

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ بس اب تمہاری باری ہے۔

دُبلا پتلا آدمی۔ کون؟ تم نے اُس کا کیا نام لیا ہے؟

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ مسز جیروم زالو۔

دُبلا پتلا آدمی۔ آہ!

[اپنا متشنج ہاتھ اُس کے بازو پر ڈالتا ہے]

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ کیوں، کیا بات ہے؟

دُبلا پتلا آدمی۔ ارے وہی تو میری بھی ہے۔

[دونوں کے لبوں پر ایک دہشت ناک مُہرِ سکوت لگ جاتی ہے]

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ شنبہ۔ سہ شنبہ۔ اور پنجشنبہ۔

دُبلا پتلا آدمی۔ دوشنبہ۔ چہار شنبہ اور جمعہ۔

(دوبارہ خاموشی)

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ اور یک شنبہ؟

دُبلا پتلا آدمی۔ (ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے) کون کہے؟

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ (ترشی سے) یہ ہے وہ روحانیت کا مجسمہ جس کی تم پرستش کرتے ہو۔

دُبلا پتلا آدمی۔ (متاسفانہ انداز میں) ہاں میری روح کی ہیلی، میری دوشیزہ ادا، شرمیلی۔

گٹھیلے بدن والا آدمی۔ اور میری جنسی رفیقہ، میری گرمجوش، احذیلی۔

دُبلا پتلا آدمی ۔ جی چاہتا ہے روؤں۔
گٹھیلے بدن والا آدمی ۔ تم اس لئے رونا چاہتے ہو کہ تم اُس سے روحانی محبت کرتے تھے۔ لیکن میں ہنسنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ وہی کچھ ہے جو اُس نے مجھے سکھایا تھا۔

[جس کا رونے کو جی چاہتا تھا وہ تلخی سے ہنستا ہے اور جو ہنسنا چاہتا تھا اُس کی پیشانی پر غم کی دردناک سیاہی چھا جاتی ہے]

دُبلا پتلا آدمی ۔ اب کیا کرنا چاہئے۔
گٹھیلے بدن والا آدمی ۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ تم روحانی لوگ ان باتوں سے کس طرح متاثر ہوتے ہو لیکن اتنا میں جانتا ہوں کہ ہم عام فانی آدمی اپنی محبت میں کسی کے اشتراک کے وہم وگمان کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ میرا طریقِ کار بالکل سیدھا سادھا ہے۔ میں نے اُس سے بھر پایا۔
دُبلا پتلا آدمی ۔ اور ہم روحانی لوگ...... ہم.... میں اب کبھی اُس کی صُورت تک دیکھنا نہیں چاہتا۔

[دونوں مصافحہ کرتے ہیں]

گٹھیلے بدن والا آدمی ۔ لیکن.... مجھے ایک خیال آیا ہے۔
دُبلا پتلا آدمی ۔ کیا؟
گٹھیلے بدن والا آدمی ۔ یہ بہت اچھا خیال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلے عمر بھر مجھے کبھی ایسی اچھی بات نہیں سُوجھی۔ سُنو، اُس نے اپنی ایک ذات سے دو الگ الگ عورتیں بنا رکھی ہیں۔ اس میں اپج ہے اور ہمیں اس کی داد دینی چاہئے۔
دُبلا پتلا آدمی ۔ داد دینی چاہئے؟
گٹھیلے بدن والا آدمی ۔ یقیناً۔ شرفا کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ جس طرح وہ اپنے آپ کو پیش کرے ہم تسلیم کرلیں۔ اگر وہ دو عورتیں ہے تو ہمارا کیا حق ہے کہ ہم اسے ایک سمجھیں؟
دُبلا پتلا آدمی ۔ لیکن ———
گٹھیلے بدن والا آدمی ۔ لیکن ویکن نہیں۔ بات روزِ روشن کی طرح صاف ہے۔ ہم نے آج کی گفتگو آپس میں کبھی نہیں کی ہر بات اسی طرح ہے جس طرح پہلے تھی۔ سمجھے؟
دُبلا پتلا آدمی ۔ (دُبدھا میں) ہاں۔
گٹھیلے بدن والا آدمی ۔ تو بات طے ہوئی۔ ہم اب آپس میں کبھی اُس کا ذکر نہ کریں گے۔ نہ اُسے کبھی ان باتوں کا علم ہونے

دیں گے۔ میں بدستور اُس کا جوشیلا عاشق ہوں اور تم حسبِ سابق اُس کے روحانی فدائی۔ یوں ہم آئندہ ہمیشہ ہنسی خوشی زندگی گزاریں گے۔ خدا حافظ!

دُبلا پتلا آدمی۔ خدا حافظ۔

[دونوں بے ڈھنگے طور پر دفعتہً الگ ہو جاتے ہیں۔ ایک سیدھے ہاتھ کو جاتا ہے اور دوسرا اُلٹے ہاتھ کو۔ لیکن دونوں میں سے ہر ایک یہی سوچ رہا ہے کہ کسی طرح دوسرے کے پاؤں اُکھاڑ کر اس عورت کی محبت کا بلاشرکتِ غیرے حق دار بن جائے۔ دونوں کے غرور کو صدمہ پہنچ چکا ہے اور دونوں جھلّائے ہوئے ہیں۔ دوسرے دن جب یہ اُس عورت سے ملیں گے تو اپنے اپنے وقت پر سامنے آتے ہی ضرور اُس پر برس پڑیں گے اور وہ دونوں کو ٹکا سا جواب دے دے گی کہ جاؤ اپنی راہ لو اور خود عاشقوں کا ایک نیا جوڑا تلاش کرے گی کہ بجز اس کے چارۂ کار بھی کیا ہے؟]

مولنار

مترجمہ حامد علی خاں

نواہائے راز

بے روح تھی یہ خاک، تمہیں جانِ جہاں ہو — تخئیل ہو، یا خواب ہو، یا وہم و گماں ہو

آسودہ ہو، سمٹے ہوئے قطروں کی رگوں میں — پھیلے ہوئے دریا میں کراں تا بہ کراں ہو

ہے ربط تو دونوں میں مگر چشم و نظر کا — تم ہو مری آنکھوں میں مگر مجھ سے نہاں ہو

یا رب یہ حجاباتِ سراپردۂ اسرار — اور ایک سراسیمہ بہر سُو نگراں ہو

جاری نہ ہو اے کشمکشِ ضبط غضب ہے — وہ اشک جو اک عمر سے پلکوں میں نہاں ہو

تکوینِ دو عالم کا سبب ذات تمہاری — سرتاجِ جہاں ہو، شرفِ کون و مکاں ہو

ہمراہ ہو تم کاش کبھی ختم نہ ہو راہ — صد حیف اگر طے سفرِ ہر دو جہاں ہو

اس قالبِ بے مایہ کی تم رُوح ہو لیکن — افسوس کہ جو رُوح ہو بے نام و نشاں ہو

اے طبعِ رواں! نورِ گُلِ شب کو سحر کر

اے خونِ جگر! آنکھ میں آ، لعل فشاں ہو

حامد علی خاں

محبّت

دربارِ خداوندی میں خلق کا اژدہام تھا۔ ایوانِ الٰہی ایک مسلسل بھنبھناہٹ سے گونج رہا تھا۔ سامنے ایک زرتار مخملیں فرش پر قوسِ قزح جیسی ہفت رنگ کرسی خدائے قدوس کی منتظر تھی۔ کرسی کے دونوں جانب دو گورے چٹے فرشتے سنجاب و سمور میں لپٹے ایک اطالوی بُت کے مانند بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ نقیب نے خدا کے آنے کی صدا دی، خاموشی گہری خاموشی تمام مجمع پر چھا گئی۔ ایوان کے در و دیوار لرز گئے۔ معاً ایک بجلی سی چمکی اور چمک کر کڑکی۔ حاضرین پر غشی سی طاری ہو گئی ـــــ خدائے عزّ و جل اپنی کرسی پر جلوہ افروز تھا۔

دھیمے دھیمے سروں میں دُور سے حوروں کے گانے کی آواز آ رہی تھی اور اُن کی پازیب کی نقرئی کھنکھناہٹ بیہوشوں کو آہستہ آہستہ ہوش میں لا رہی تھی۔

لوگ حیرت سے آنکھیں پھاڑے کُرسی کی طرف تک رہے تھے لیکن وہاں نہ خدا تھا نہ کرسی نہ فرشتے ـــــ صرف نور کا دریا موجیں مار رہا تھا۔ لوگ گھبرا گئے۔

خدا کی آواز نُور میں سے آئی "آج میرے الطاف و اکرام کا دن ہے مانگو جو کچھ مانگتے ہو"۔

لوگوں کے خوف زدہ دلوں میں تقویت پیدا ہوئی۔ لبوں میں حرکت کرنے کی طاقت عود کر آئی۔

"خدایا مجھے اس قدر دولت دے کہ گنجِ قارون کا نام مٹ جائے"۔

"اور مجھے حسنِ یوسف دے جو چاند کو شرماوے"۔

"اور مجھے عمرِ نوح عطا کر"۔

"اے خدا! مجھے تندرستی دے"۔

"مجھے علم چاہئے"۔

"مجھے عقل دے"۔

"مجھے اپنی عبادت کی توفیق دے" (کسی خوشامدی نے کہا)

سب کی دُعائیں قبول کر لی گئیں۔ ہر کہ و مہ شادان و فرحاں نظر آ رہا تھا۔ آپس میں باتیں ہونے لگیں۔ ایوانِ خداوندی

پھر بھنبھناہٹ سے گونجنے لگا۔

"کسی اور کو کچھ مانگنا ہے؟"

لوگوں نے یک زبان ہوکر کہا "نہیں اے خدا! کچھ نہیں"

خدا مسکرایا اور مسکرا کر بولا۔

"او کم بیں انسان جو کچھ تو نے مانگا میں نے قبول کر لیا مگر جانتا ہے ان تمام اوصاف کی آڑ میں کتنی خوفناک تصویریں پنہاں ہیں؟"

مجمع جواب دینے سے قاصر تھا۔

"سن! دولت کی خیرہ کن چمک اور سامعہ نواز جھنکار میں مزدور کا خون اور کسان کی فلک شگاف آہیں پنہاں ہیں —— حسن کے عقب میں غرور اور نخوت منہ چھپائے بیٹھی ہے —— عمر دراز کی آڑ میں معصیت کا سانپ پھنکار مار رہا ہے —— تندرستی کے پس پشت جبر و تشدد کا دیو مونچھوں پر تاؤ دے رہا ہے —— علم خودی کی شراب پیئے جاہلیت سے ناک کٹا رہا ہے —— عقل خود مجھ سے برسر پیکار ہے اور عبادت کے جامۂ اطہر میں تعصب کا بچھو پل رہا ہے ——" (لوگ منہ کھولے حیرت سے نور کی طرف دیکھ رہے تھے —— ان کے خوابوں کی تعبیر کس قدر بھیانک نکلی) "لیکن میں تجھے ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ دونگا جو نہ صرف انسان کی واحد ملکیت ہوگی بلکہ درندے، پرندے اور چرندے بھی اس کی چاشنی سے شاد کام ہوں گے —— اچھا اپنی آنکھیں بند کرلو اب میں جاتا ہوں۔ میرے چلے جانے کے بعد میری ہفت رنگ کرسی کے سر پر وہ نعمت جلی حروف میں لکھی نظر آئیگی"

لوگوں نے اپنی اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

خدا بادِ بہار کے مانند چلا گیا اور اس کے ساتھ نور بھی رخصت ہوا —— حوریں گلفام اور رگداز جسموں والی نوخیز حوریں سفید بادل جیسے باریک لباس پہنے، سر پر موتیوں کا نازک و رنگین تاج رکھے، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خدا کی کرسی کے چاروں طرف محوِ رقص و سرود تھیں —— ناچتی ہوئی گاتی ہوئی حوروں کے درمیان سے کبھی کبھی کرسی چند لمحوں کے لئے نظر آجاتی تھی جس کے سر پر خونیں حروف میں لکھا تھا —— 'محبت'

انسان کے دل میں پہلی بار محبت کی کسک پیدا ہوئی۔ کس قدر لذت تھی اس کسک میں کہ وہ ہر شئے کو بھلا بیٹھا ——

شریف عالم بھاگلپوری

فکرِ اقتصاد اور نظریۂ اشتراک

فکرِ اقتصاد بھی اتنا قدیم ہے جتنا انسانی تمدن ۔ وسائلِ رفعِ احتیاج اور مسائلِ اقتصادی کی رفتار مساوی و متوازی ہے لیکن سلطانی مصالح اور آئینِ جہاں بانی نے شکمِ انسانی کو صدیوں تک خالی رکھا تاکہ چشمِ انساں "نورِ معرفت" کا نظارہ کر سکے ۔

"اندرون از طعام خالی دار　　　تا دراں نورِ معرفت بینی"

خالی از طعام اندرون "بغاوت" کا مسکن بنا ۔ اس نے ہندی، یونانی، رومی، اسلامی، مسیحی متکلمین اور اشتراکی معاشئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ۔ ہر مفکر نے اپنے ماحول کے مطابق ابنِ آدم کی نگاہوں کو نورِ معرفت سے ہٹا کر "نورِ نان" پر مرکوز کرنے کی سعی کی ۔ بعض نے نان و معرفت کو متحد ثابت کیا اور بعض نے انہیں ضدین بتایا ۔ کوتلیا شاستر سے مارکس کے سرمایہ تک سینکڑوں افراد نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا ۔

ہندوستان ——— کوتلیا شاستر کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندی آریا فراہمیٔ دولت، سود خواری اور تجارت کو بہترین معاشری امور خیال کرتے تھے ۔ اس کتاب سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ زراعت کا پیشہ سب سے زیادہ معزز خیال کیا جاتا تھا زاں بعد تجارت ۔ ملازمت بدترین ذریعۂ معاش تھا ۔

"اتم کھیتی　مدھم بیپار　　　نکھت چاکری بھیک دوار"

(بہترین ذریعۂ معاش کاشتکاری ہے ۔ زاں بعد تجارت ۔ ملازمت دستِ انسان میں کاسۂ گدائی ہے)

زمانۂ مابعد میں گوتم نے ترکِ دُنیا اور رہبانیت کا درس دیا ۔ گوتم کی تعلیمات ہندوؤں کے زر دارانہ اور سود خورانہ نظامِ معاشرت کا مذہبی ردِ عمل تھیں ۔ آج لینن کی بالشویت یورپ کی ہوسِ استعمار کا اقتصادی ردِ عمل ہے ۔

یونان ——— فکرِ اقتصاد کے طالب العلم کو یونان میں تھیوسی ڈائیڈز، فلاطوں، ارسطو اور زینوفون دکھائی دیتے ہیں ۔ ان کے ہاں اقتصاد امورِ خانہ داری کی ایک شاخ تھی ۔ ان کے نزدیک غلامی کا ادارہ نہایت اہم اور ضروری تھا ۔ ذاتی ملکیت کے بھی یہ لوگ قائل تھے ۔ سود کے مخالف تھے اور دولت کو بانجھ خیال کرتے ۔ ان کے نزدیک اقتصاد اخلاقیات اور سیاسیات کے ماتحت تھا ۔ یہ مفکر ہمیں بتاتے ہیں کہ فراہمیٔ زر انسان کا ثانوی مقصد ہے نہ کہ اوّلیں ۔

فلاطوں حیاتِ صالح کی جستجو میں نکلتا ہے ۔ "ریاست" میں وہ ایک نظری مملکت کا خاکا پیش کرتا ہے جو اس کے نزدیک

حیاتِ اجتماعیہ کی بہترین شکل ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ افلاطون بھی اس مملکت میں عوام و خواص کی غیر فطری تفریق روا رکھتا ہوا تجویز کرتا ہے کہ عوام کے لئے دولت پیدا کرنا ملکیت شخصی، خاندانی نظام اور دولت جمع کرنا جائز ہے لیکن خواص کے لئے دولت پیدا کرنا اور نہ جمع کرنا نہ ملکیت شخصی اور نہ خاندان۔ ارسطو کے نزدیک اقتصاد ذریعہ ہے مقصد نہیں۔ وہ دو قسم کے معاشی اعمال پیش کرتا ہے فطری اور غیر فطری، فطری اعمال کا مقصد جائز احتیاجات کا رفع کرنا اور غیر فطری معاشی اعمال کا مقصد محض دولت جمع کرنا ہے۔

اسلام ——— یونانیوں کے بعد مسلمانوں نے اقتصاد پر قلم اٹھایا۔ لیکن انہوں نے اقتصاد کو اخلاقیات اور اسلامیات پر کبھی ترجیح نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کسی نظری مملکت کے تصور میں اوراق سیاہ نہیں کئے عقل و اقتصاد کا تصادم ان کے ہاں مفقود ہے۔ ابن خلدون کے ہاں نظری بحثوں کا پتہ چلتا ہے۔ مسلم معاشئین میں "الدمشقی، شہاب الدین احمد، فخر الدین محمد بن عمر الرازی، ابن سینا، ابن مسکویہ، ناصر الدین طوسی، محمد بن عبد الرحمٰن، غزالی اور محمود الاملی" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اگرچہ ان کا نظریۂ اقتصاد دینی تشکیلات کی الجھنوں سے رہائی حاصل نہ کر سکا۔[1]

مسیحیت ——— مسیحیت نے اپنے عہدِ طفولیت میں اس امر کا اعلان تو کر دیا کہ سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزر جانا ممکن ہے لیکن امیر کا خداوند کی بادشاہت میں داخل ہونا ناممکن ہے لیکن مسیحی لوگ اس دنیا میں "خدا کی بادشاہت" قائم نہ کر سکے۔ جب مسیحیت نے ہوش سنبھالا تو اسے شہنشاہیت استوار کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ تاہم مسیحی متکلمین نے اقتصادی نظریئے پیش کئے۔

"ان متکلمین کے نزدیک قانونِ الٰہی کے مطابق جماعتی نظام کلیسائی نظام ہے جسے انفرادیت کے مقابلہ میں اجتماعیت کا نظام سمجھنا چاہئے۔ شروع شروع میں مختلف پیشے ذاتِ الٰہی سے مختلف فاصلہ پر مانے جاتے تھے کوئی قریب کوئی بعید گویا اس کلیسائی جماعت کی شکل اہرام کی سی تھی۔ لوتھر نے آ کر اس میں یہ تغیر کیا کہ سب پیشوں، سب طبقوں کو ذاتِ الٰہی سے یکساں قریب منوالیا۔ اور نظامِ جماعت کی شکل کرہ کی سی مانی جانے لگی۔

میکلن نے معیشتِ صحیحہ کا جو نقشہ بنایا تھا اس کی بنیاد ملکیت شخصی پر ضرور رکھی لیکن اس انفرادی حقِ ملکیت کے ساتھ خیرات کا فریضہ توام تھا اور کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک صحیح معیشت کا تقاضا یہ تھا کہ اگر قبضہ کے اعتبار سے املاک شخصی ہوں تو استعمال کے لحاظ سے اجتماعی۔ شخصی املاک کا تصور دراصل ایک امانت کا تھا جسے مفادِ اجتماعی کی رعایت سے صرف کرنا ضروری تھا۔"[2]

سولھویں صدی کے اواخر میں مسیحی دنیا کا مطمحِ نظر مذہب کی جگہ سیاست اور "خدا کی بادشاہت" کے بجائے اقتصادی شہنشاہیت تھا۔

---

[1] معاشیات ۔ از ڈاکٹر ذاکر حسین۔

[2] معاشیات ۔ از ڈاکٹر ذاکر حسین

فرانس ـــــــ کالبرٹ کے نظریوں نے فرانس میں ہوا کا رُخ بدل دیا۔ اس کے نزدیک ریاست کے لئے ضروری ہے کہ وہ زرومال کے انبار اکٹھے کرے اور اس کے حصُول کے لئے ریاست کو چاہئے کہ وہ اپنی محکوم آبادی پر خوب ظلم کرے۔ درآمد بند کرنے کے بعد برآمد کی تمام راہیں اپنے تاجروں کے لئے کھول دے۔ آبادی بڑھانے کے تمام ذرائع استعمال کرے۔ ان مقاصد کے حصُول کے لئے ریاست کو کلی اختیارات ہیں۔ تاریخ اقتصاد کا یہ فکر کالبرٹ کے نام سے مشہور ہے۔

طبیعئین ـــــــ کالبرٹ کی تباہ کاریوں کو دیکھتے ہوئے فرانس میں معاشیئین کی ایک نئی جماعت اُٹھی۔ یہ جماعت تجارت کے مقابلے میں زراعت کی زیادہ قائل تھیں۔ اس کے نزدیک زرعی پیداوار سے فائدہ اُٹھانا فطری ہے اور تجارت سے فائدہ اُٹھانا غیر فطری۔ تجارت میں یہ 'آزاد تجارت' کے حامی تھے۔ یہ جماعت کسانوں کی حامی تھی۔ اس جماعت کے معاشیئین 'طبیعئین' کہلاتے ہیں۔

انگلستان ـــــــ انگریزی مقتصد آدم سمتھ نے طبیعئین کے نظریوں کی تائید وحمایت کرتے ہوئے 'آزاد تجارت' پر زور دیا۔ اس کی کتاب "دولتِ اقوام" مشرق ومغرب میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ اُنیسویں صدی کے بیشتر معاشیئین نے آدم سمتھ کا تتبع کیا۔

کلاسکی درس ـــــــ بنتھم، مال تھس، ری کارڈو اور مل ایسے معاشیئین کا تعلق کلاسکی درس سے ہے۔ ان کے نزدیک اقتصادی قوانین ابدی اور عالمگیر ہیں۔ ان کے نزدیک ترقی زراعت کا خیال باطل ہے۔ یاد رہے کہ ری کارڈو ایک بہت بڑا ساہوکار تھا۔

اشتراکیت ـــــــ کلاسکی درس کے معاشیئین کی تباہ کاریوں کا ردِ عمل اشتراکیت کی صُورت میں رُونما ہُوا۔ لاریب اشتراکی نظریہ بہت قدیم ہے لیکن اس زمانہ میں اسے فنی حیثیت دی گئی۔ جدید اشتراکیت کی ابتدا روسو کی کتاب "میثاق ملی"[۱] اور گاڈون کی تصنیف "استفسار" سے ہوتی ہے۔ زاں بعد کابٹ، سینٹ سائمن اور فوریر نے اقتصاد کی سیاسی چیرہ دستیوں کے خلاف آواز اُٹھائی۔ انگلستان میں رابرٹ اوون، فرانس میں لوئی بلینک اور جرمنی میں راڈبرٹس نے ان کے نظریوں کی تائید کی۔ آخر کار کارل مارکس نے اشتراکیت کو فنی حیثیت میں اس طرح پیش کیا کہ مشرق ومغرب کے مزدوروں کو حکومتیں اُلٹ دینے کا درس دیا۔ سب سے زیادہ زرپرست قوم میں سرمایہ داری کا سب سے بڑا دشمن مارکس پیدا ہُوا۔ اس کی شہرہ آفاق تصنیف "سرمایہ" ہے۔

باری ـــــــ

---

[۱] میں اپنی کتاب "انقلاب فرانس" میں "روسو اور میثاق ملی" کے عنوان سے ایک باب لکھ چکا ہوں۔ (باری)

سوہنی اور مہینوال کے خطوط

اردو زبان کے بلند پایہ علمی و ادبی رسائل میں انگریزی۔ فرانسیسی۔ جرمن اور روسی زبانوں کے تراجم اکثر شائع ہوتے ہیں۔ مگر عموماً ہماری ہندوستانی زبانوں اور خصوصاً ہماری پنجابی زبان کے تراجم کی طرف بالکل توجہ مبذول نہیں کی جاتی۔ ہم آج پنجابی زبان کی ایک مشہور نظم سوہنی مہینوال کے ایک حصے کا ترجمہ اہلِ نظر حضرات کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ مہینوال کو سوہنی کے والد نے اپنی بھینس چرانے پر مقرر کیا تھا۔ اور جب سوہنی اور مہینوال کی محبت کا راز فاش ہو گیا تو اس نے مہینوال کو اپنے گھر سے نکال دیا۔

اس کے کچھ عرصے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو یہ خط لکھے۔ (دجوری)

سوہنی کی راز دار سہیلی مہینوال کے پاس جاتی ہے

۱

سوہنی کی وہی خاص سہیلی
مہینوال کی خیریت دریافت کرنے کے لئے
آئی
اور اس نے کہا۔
مجھے کوئی پیغام دو
یا خط ہی لکھ دو

۲

خط بھی۔
نصف ملاقات ہوتا ہے
دور سے ملنے ملانے کا
یہی ایک طریقہ ہے۔
خدائے تعالےٰ نے دوسری دفعہ
تم کو
مصیبت میں گرفتار کیا ہے
مگر جو کچھ تمہاری قسمت میں لکھا ہے
اس کو کون ٹال سکتا ہے۔؟

۳

اس نے قلم دوات اور کاغذ لیا
بڑے جوش کے ساتھ
اپنی محبوبہ کی طرف خط لکھا
خدا کا فضل شامل حال تھا

مہینوال کا خط سوہنی کی طرف

۱

اس خدا کی حمد
اور رسول کی تعریف
جس کی صفتوں کی کوئی انتہا
اور شمار ہی نہیں۔
مہینوال نے سوہنی کی طرف
طعنے لکھے۔ کہ
اے حسینہ!
تیرا کچھ بھی اعتبار نہیں۔

۲

اری او بیوی!
خاوند کی پیاری!
تو نے سچا وعدہ نہ کیا
تجھے لاکھوں اور کروڑوں ہی بار
میری طرف سے مبارک باد۔
تجھے خوشی اور عیش سے
فرصت ہی نہ ملے۔

۳

اپنے خاوند سے
تیری محبت ایسی ہے
جیسی
کسی کبھی
اور میاں بیوی کی نہ ہو گی
بھلا ہُوا
تیری آرزو بر آئی
تجھ جیسا عیش پسند
اور کوئی نہ ہو گا۔

۴

تُو اس قدر خوش ہے
کہ مجھے خطرہ ہے۔
کہ کہیں
تُو خوشی سے مر ہی نہ جائے
اور اپنے خاوند کا گھر
مفت ہی میں ویران نہ کر دے
سُسرال میں
ایسی کسی اور کی عزت نہیں کی جاتی
جیسی تیری کی جاتی ہے۔

۵

تُو ڈولی میں بیٹھتے وقت
ذرا بھی نہ ہچکچائی
اور میرا خیال کر کے
تجھے ذرا بھی شرم نہ آئی۔
تُو سُسرال جا کر

منہ زور سی ہو گئی
اور میں
جیسا ذلیل ہُوا ہوں
کوئی بھی نہ ہُوا ہو گا۔

۶

حسن و خوبصورتی
ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں۔
اے حسینہ!
زیادہ بناؤ سنگار نہ کر
ہم نے تو تجھ کو
ایک نظر دیکھا
اور ایک ہی نگاہ کے بدلے
تُو نے
ہمارا ایمان خرید لیا۔
عاشق کبھی
دکھاوے کی تجارت نہیں کرتے۔

۷

خدا کرے
وہ مر جائے
جو میرے سوا کوئی دوسرا
تیرے ساتھ رہے
کس طرح ہو سکتا ہے
کہ اس حالت میں
خدا کا قہر اس پر نازل نہ ہو۔
میرا رقیب
اور تیرے وصل کا آبِ حیات
اس کو ملے؛
خدا کرے اُس پر
میری اتنی آہیں پڑیں
جن کی انتہا نہ ہو۔

۸

میرے لاکھ بار وفا یاد کرنے کی
مجھے داد ملے گی
بس مجھے اور کسی سے
کوئی عداوت تو ہے نہیں
جھوٹوں کے گلے میں
طوق اور زنجیر پہنا کر
اُن کو سزا ملے گی۔
جھوٹوں کو
اس دربار میں
کوئی نہیں پوچھے گا۔

۹

میدان سے بھاگ جانا
مرد کا کام نہیں
اور
عشق کا کھیل

کوئی گڑیوں کا کھیل نہیں ہے۔
جو تُو نے
مجھ سے
جھوٹے وعدے کئے
مجھے گھر سے نکال کر
پھر میری خبر تک نہ لی

۱۰

سچے خدا نے کیا خوب کہا ہے۔
واقعی تجھ جیسا کوئی مکار نہیں
اب بھی میری پیاری!
ذرا عقل سے کام لے
اور جو وعدے
تو نے کئے تھے
اُن کو
نہ بُھلا

۱۱

میں نے پتنگے کی طرح
جان
تجھ پر قربان کر دی
میں نے تجھ سے کوئی
قرض کا سودا تو نہیں کیا؛
تجھے چاہئے یہ تھا
کہ جو کہا تھا اس کو پُورا کرتی
مگر تُو نے
خود ہی مجھ کو
اپنے ہاتھوں سے ڈبو دیا
مجھے کنارے تک بھی نہ پہنچایا۔

۱۲

تجھ کو چاہئے تھا
کہ
میرے چاک کئے ہوئے سینے کو
جلد ہی رفو کر دیتی
زخم کو اسی حالت میں۔
چھوڑ کر بھاگ جانا
اچھا نہیں ہوتا
مجھے مصیبت میں پھنسا کر
تم خود بھاگ گئیں۔
بھلا کوئی مجھ جیسا بھی
بدقسمت ہو گا؛

۱۳

چند ہی دن بعد
حُسن جاتا رہتا ہے
تم اس جھوٹے حُسن پر
نہ اتراؤ
نہ خوشی ہمیشہ رہتی ہے۔
اور نہ خوبصورتی ہی

ہمیشہ ساتھ دیتی ہے

۱۴

ہمیشہ اطمینان نہیں
ہمیشہ عیش و عشرت نہیں
ہمیشہ باغوں میں بلبلیں نہیں چہکتیں
اور نہ
ہمیشہ بہار ہی کا موسم رہتا ہے۔
غلطی سے
تجھ سے
میں نے
رشتۂ محبت جوڑا۔
بھلا مجھے کیا خبر تھی۔
کہ تو غم خواری نہ کرے گی

۱۵

اگر تو نے
اپنے دل سے مجھے نکال نہیں دیا
تو آئندہ بھی
رشتۂ محبت قائم رکھنا
میں نے تیرے لئے
صرف بھینسیں ہی نہیں چرائیں
کیا میں نے
اپنے ماں باپ
اور دوست آشناؤں کو بھی
نہیں چھوڑ دیا ــــ ؟

۱۶

میں تیرے لئے
وطن سے نکل کر
پردیس میں ذلیل ہُوا ہوں
مجھ بدقسمت کے لئے
اب کوئی جگہ رہنے کی نہیں
مجھے مصیبتوں نے گھیر رکھا ہے
میں کس طرف کو جاؤں۔ ؟
میرا وطن بھی تو میرے نزدیک نہیں ہے

۱۷

واہ پیاری!
تُو نے مجھ سے
اچھا سلوک کیا
دوست تلوار کھینچ کر مارا نہیں کرتے
مجھے تجھ سے بھلائی کی اُمید تھی۔
مگر
تو نے مجھ پر۔
انتہائی ظلم کیا
اب سچی باتیں سننے کے لئے
مجھے کچھ اور کہنے کا موقع نہ دے

سوہنی کی سہیلی کا مہینوال کا خط سوہنی کے پاس لے جانا

۱

اس نے خط پر
مہینوال کی مہر لگوالی
اور خط لے کر
سوہنی کی طرف گئی
اور
ساس کی نظر بچا کر
محبوب کا خط
محبوبہ کے ہاتھ میں
دے دیا

۲

دوستو! خط کیا تھا
عید کا چاند تھا
بار بار
وہ اپنی جان قربان کرتی تھی
جوں جوں
سوہنی خط کی تہیں کھولتی
اس کے دل میں
اپنے محبوب کی طرف سے
جو گرہ پڑ گئی تھی
وہ کھلتی جاتی تھی

۳

وہ خط پڑھتی
خط کو بوسے دیتی
سینے سے لگاتی
روتی
اور یہ کہتے ہوئے
خط کے ہر اس حصہ کو چومتی
جو ابھی بوسہ دیئے بغیر رہ گیا تھا
کہ یہ
میرے ہمیشہ رسنے والے
زخموں کا مرہم ہے

۴

سوہنی نے دیکھا
خط پر
خون کے قطرے پڑے ہوئے ہیں
یہ دیکھ کر
سوہنی کو غش آگیا
ابھی پہلا ہی زخم اچھا نہ ہوا تھا
کہ پیارے نے
ایک اور کاری زخم لگا دیا

۵

میں پہلے ہی زخمی تھی
پیارے کے طعنوں نے
جو تیز تلوار کی دھار سے بھی
زیادہ تیز تھے
مجھے نیم جان کر دیا
پیارے کے طعنے
ایسے چبھنے والے
اور خون کرنے والے تھے
کہ اُن کا ہر وار
جگر کو چیرتا ہوا چلا گیا

۶

جب کسی قدر
اس کے حواس درست ہوئے
اس نے قلم دوات طلب کی
اور اسے قفل! اس نے
اپنے پیارے کے نام
اس طرح خط لکھا۔

سوہنی کی طرف سے مہینوال کے خط کا جواب

۱

خدا و رسول کی تعریف کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۲

جب میرا پیارا
تم سے میرا حال دریافت کرے۔
تو تم میری طرف سے
کروڑ دفعہ سلام کے بعد اس سے کہنا
کہ
جانِ من!
جب میرے والدین نے تم کو
بھینس چرانے سے علیحدہ کر دیا تھا

۳

جان سے زیادہ پیارے!
میں اس وقت ہی جان گئی تھی کہ
مجھ پر مصیبت آنے والی ہے
اس وقت کا خیال کر کے
میں چیخ پکار کرتی تھی
کھانا پینا
میں نے چھوڑ دیا تھا
مگر جب تک مقرر وقت نہ آجائے
کون مر سکتا ہے۔ ؟

۴

اے میری جان!
میرا رونگٹا رونگٹا آواز دے رہا تھا
میں چلاتی رہی کہ
میں اکیلی رہ گئی ہوں۔

آخر انہوں نے میری
سگائی کی
شادی کردی
اور جبراً مجھے ڈولی میں ڈال دیا۔

۵

"گاناں" جو میری کلائی پر بندھا ہُوا تھا۔
میں نے توڑ کر
صحن میں پھینک دیا
اور خوبصورت کپڑے
جو مجھے پہنائے گئے تھے
میں نے مٹی میں لت پت کرکے
خراب کردیئے
اگر میں یہ جانتی
کہ یہ مجھے جکڑ دیں گے
میں زہر کھا کر مرجاتی۔

۶

مگر
اے میری جان سے زیادہ پیارے!
میری قسمت میں
تمہاری طرف سے
یہ شرمندگی لکھی تھی
سسرال جا کر میں نے
بالکل کسی سے بات تک نہ کی

میری ساس نے مجھ سے
بات کرنے کے لئے
ہزار جتن کئے۔

۷

اے میرے پیارے!
پھر
تیرے رقیب کو میرے پاس بھیجا
اور
وہ دست درازی کرنے لگا۔
مگر خدا تعالےٰ نے
مجھے ہمت دی

۸

اے میری جان! میرے ہاتھوں
جو اس کی درگت ہوئی
وہ ساری عمر یاد کرتا رہے گا
میں نے اس کو اس قدر مارا
کہ وہ حواس تک کھو بیٹھا
پھر میں نے ہاتھ اُٹھا کر کہا
کہ اے خدا!
مہینوال اور اس کی عزت کی
حفاظت کرنا

۹

میری جان سے زیادہ پیارے!

میری آواز عرش معلیٰ تک
جا پہنچی
اور میری دُعا جلد ہی قبول ہوگئی
کہ
خدا تعالےٰ کے فضل اور کرم سے
جلد ہی وہ مجھ سے علیحدہ ہوکر
اکیلا
سوگیا

۱۰

اے میری جان!
خدا کرے
وہ ہمیشہ ہی مجھ سے علیحدہ رہے
اور میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے۔
پیارے!
سسرال میں تو میرا سب سے جھگڑا ہے ہی
میرے والدین نے بھی
مجھے بھلا دیا ہے۔

۱۱

میرے پیارے!
میری آنکھوں میں عرصہ سے
نیند نہیں آئی
غضب کی لمبی راتیں ہیں
خدا جانتا ہے میں کس طرح گذارتی ہوں۔
میں بیٹھ کر۔
اے میرے مالک!
تجھ کو یاد کرتی ہوں۔
مجھے تجھی سے محبت ہے
اور
میں تجھی کو چاہتی ہوں

۱۲

میری جان سے زیادہ پیارے!
تیرے بغیر
اس چارپائی سے
مجھے اس طرح ڈر لگتا ہے
جیسے یہ مگرمچھ ہو
جو مجھے نگل جائے گا
اور بستر یوں معلوم ہوتا ہے
کہ کباب بنانے والی سیخ ہے
کہ میرا کباب بنا ڈالے گی۔

۱۳

پیارے!
میں تیرے فراق میں
بغیر بستر کے سوتی ہوں
یہ چارپائی کی رسیاں
مجھے اس طرح معلوم ہوتی ہیں
جس طرح میرے سینے پر

کوئی گھونسے چلا رہا ہو ــــــ
مجھے پل بھر بھی چین نصیب نہیں ہوتا۔
پائنتی مجھے اس طرح کاٹنے کو دوڑتی ہے
جیسے اژدہا ہو
جو کاٹنے کو دوڑ رہا ہے

۱۴

اے میرے مالک!
جو کچھ میرا حال ہے۔
میں نے سارا تم کو سنا دیا ہے
جلتی ہوئی آگ پر
تم نے تیل ڈال دیا ہے
بھڑک رہی تھی
تم نے
اس کو اور زیادہ
بھڑکا دیا ہے

۱۵

جان سے زیادہ پیارے!
تم نے یہ طعنے جو لکھے ہیں
یہ آگ کی طرح جلانے والے ہیں۔
انہوں نے میرا سینہ جلا دیا ہے
پیارے!
میں سچے دل سے کہتی ہوں
کہ 'خدا' ایک ہی ہے۔

۱۶

میری جان!
جب میرے پاس آؤ گے
تو تم کو یقین آجائے گا
اب پیارے!
یہ کہہ کر جلتی ہوئی آگ پر
اور تیل نہ ڈالو۔
یہ میری طاقت نہیں۔ کہ
میں جھوٹ کو جھوٹ کہہ دوں۔
پیارے!
جو کچھ میری قسمت میں لکھا ہے
میں اس کو کس طرح بدل سکتی ہوں

۱۷

پیارے!
میں اس قول کو نبھاؤں گی
مر جاؤں
اگر میں اس کو پورا کرنے میں
حیل و حجت کروں
میری جان!
اگر میں تم سے مُنہ موڑ لوں
خدا کرے مجھے اس کی سزا
دوزخ میں ملے۔

۱۸

میری جان!
خدا گواہ ہے
میرے محبوب تم ہی ہو
میرا اور کسی طرف دیکھنا بھی
درست نہیں۔
سارے زمانے میں
تمہارے بغیر
میرا اور کوئی بھی نہیں۔

۱۹

پیارے!
میں نے تو تم سے محبت کا رشتہ جوڑا ہے
پہلے دن سے ہی میں تو
تمہاری ہو گئی تھی۔
اے میرے مالک!
میں تمہاری ہو چکی ہوں۔
میری عزت اب تمہارے ہی ہاتھ میں ہے
میں تو دام کے بغیر
تمہارے پاس فروخت ہو چکی ہوں۔

۲۰

میری جان!
میں تو تمہاری لونڈیوں کی بھی لونڈی ہوں
یہ میں سچے دل سے کہہ رہی ہوں۔
وہ خدا ہی
مجھے تمہارے ایمان اور امان کے ساتھ رکھے۔
دوسروں پر یہ راز
ظاہر نہ ہونے دینا۔

۲۱

میری جان سے زیادہ پیارے!
تمہارا ملنا
میرے لئے آب حیات کی طرح ہے۔
مجھ پیاسی کو
کبھی یہ آب حیات پلا کر
ہمیشہ کے لئے زندہ کر دو
کسی بھی بہانے سے
اے میرے پیارے!
میرے پاس آجاؤ
کسی طرح بھی
مجھے اپنی صورت دکھا جاؤ

۲۲

اے میری جان!
تم کچھ ایسا بھیس بدل کر آنا
کہ کوئی دشمن پہچان نہ سکے
پیارے!
میں بیمار ہوں۔
ناچار ہوں

بے بس ہوں
میری دوا صرف یہ ہے
کہ
میں تمہیں دیکھ لوں

۲۳

پیارے!
خدا کے واسطے
تم مجھ سے آکر مل جاؤ
میں مردہ ہوں
تم آکر
مجھے زندہ کر دو
جب تم میرے پاس آؤ گے

پھر میں تم سے
کوئی اور بھی مشورہ کروں گی

۲۴

اے دوست!
پھر وہ سوہنی کا خط۔
محبوب کی طرف لے کر
جلد ہی چلی گئی
اور
اے حضرتِ فضلؔ!
پھر محبوبہ کا خط
اس نے محبوب کو پہنچا دیا

(فضل شاہ)

مترجمہ

احمد دجوری

خوشگوار حالات میں پیدا ہو کر غم انگیز خیالات کا سنہرا تاج سر پر پہننے سے یہ بہتر ہے کہ ہم غربت میں پیدا ہو کر اپنے اندر اطمینان بخش دل کی پرورش کریں۔ (شیکسپئر)

کسی مصیبت زدہ آدمی کی مخلصانہ امداد یہ نہیں کہ ہم خود اس کا بوجھ ہلکا کریں۔ بلکہ اس کی صحیح امداد یہ ہے کہ ہم اس کی طاقت کو اس کے ہاتھوں کارفرما کریں تاکہ اس میں بوجھ کو برداشت کرنے کا مادہ پیدا ہو جائے۔ (فلپس بروکس)

عاقل کے ساتھ مختصر سی پُرمعنی گفتگو، کتابوں کے سالہا سال کے مطالعہ سے کہیں زیادہ مفید ہے۔ (لانگ فیلو)

طاہر قریشی

بحری تحفظات یا بحری جنگ؟[۵]

محاربۂ عظمیٰ کو ختم ہوئے چار سال ہو چکے تھے۔ اس کی ہولناکیاں اور تباہ کاریاں ہر متنفس کے دل پر اپنے گہرے اثرات جمائے
ئے تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ بین الاقوامی تعلقات اس درجہ کشیدہ و ناخوشگوار نہ تھے جیسے آج کل ہیں۔ انہیں وجوہ کی بنا پر ۱۹۲۲ء
ں بہ مقام واشنگٹن دو معاہدات عمل میں آئے جنہیں چار دولی معاہدہ اور نو دولی معاہدہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اول الذکر معاہدہ
یکہ، برطانیہ، جاپان اور فرانس کے مابین عمل میں آیا جس کے رو سے یہ طے پایا کہ معاہدہ کرنے والی اقوام زمانہ مستقبل میں ان حقوق
ضرور لحاظ رکھیں جو بحر اطلانتک کی حد تک ان کے لئے معین کئے گئے ہیں۔ آخر الذکر معاہدہ اطالیہ، پرتگال، بلجیم، ریاست ہائے
ں، امریکہ، جاپان، برطانیہ اور چین کے مابین عمل میں آیا جس کا اہم مقصد مشرق بعید میں امن عامہ کا تحفظ تھا اور بالخصوص ملک چین
ے حقوق کی صیانت و حفاظت۔

اس کے بعد سے حالات میں تغیر و تبدل ہوتا رہا۔ رفتار زمانہ نے جاپان کو مجبور کیا کہ تین صوبجات نیز علاقہ جیہول پر قابض
ا دیا۔ چین کے بقایا حقوق کی جانب بھی اس کی حریصانہ نگاہیں اٹھنے لگیں۔ اس طرح جاپان نو دولی معاہدہ کی خلاف ورزی کا مرتکب
ا جس کا اہم مقصد چین کی آزادی کا کامل تحفظ تھا۔ ازاں بعد ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو بحری کانفرنس منعقدہ لندن میں جاپانیوں نے
ری مساوات کا مطالبہ پیش کر دیا۔ جب یہ قبول نہ کیا گیا تو اس نے گزشتہ ماہ دسمبر میں معاہدۂ واشنگٹن کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔
ب سوال یہ ہے کہ کیا جاپان کا مطالبۂ مساوات بحری واجبی تھا؟ اور کیا حالات حاضرہ کے تحت معاہدۂ واشنگٹن کا مقرر کردہ تناسب
۵ : ۳ : ۳ اس کے لئے کافی نہیں؟ یورپ کے ارباب سیاست حسب ذیل وجوہ کی بنا پر اول الذکر سوال کا جواب نفی میں اور آخر الذکر
وال کا جواب اثبات میں دیا کرتے ہیں۔

بزمانۂ جنگ جاپان کو اس قدر بحری خطرہ لاحق نہ ہوگا جتنا امریکا یا برطانیہ کو ہوا کرتا ہے۔ اگر بفرض محال جاپان کو بحری خطرہ
ہی تو صرف ایک سمندر کی حد تک اسے تحفظ کرنا ہوگا لیکن اس کے برعکس برطانیہ اور امریکا کے لئے ایک سے زائد اطراف کا تحفظ ضروری ہوگا
ر بالخصوص برطانیہ کو چار سمندروں کی طرف سے حفاظت ضروری ہوگی۔ یہاں ایک اور امر قابل غور ہے کہ امریکا و برطانیہ از منہ موجودہ
ں دو مقتدر بحری قوتیں سمجھی جاتی ہیں لیکن بُعد مسافت کی وجہ سے ہر دو دول جاپان پر حملہ آور ہونے سے قاصر ہیں، جیسا کہ گزشتہ

[۵] یہ مضمون اس سال کے آغاز میں اشاعت کیلئے موصول ہوا۔ اب سیاسی حالات کے تغیر کو پیش نظر رکھکر اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ "ہمایوں"

نصف صدی سے ہوتا آیا ہے۔ علاوہ ازیں جزائر فلپائن کی آزادی بڑی حد تک حملہ کے خطرہ کو رفع کر دیتی ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیا جائے کہ کوئی ملک حملہ کی جسارت کرے تو اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوگی اولاً تو اس لئے کہ جاپان کثیر تعداد میں جزائر سے گھرا ہوا ہے جو بڑی حد تک تحفظات کے طور پر کام آیا کرتے ہیں ثانیاً یہ کہ جاپان کی بحری فوج اس قدر کثیر ہے کہ دشمن کو بہر صورت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ علاوہ بریں جاپان کی قومی آمدنی اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ معاہدۂ واشنگٹن کے مقرر کردہ تناسب سے زیادہ مطالبہ کیا جائے۔ امریکا کے بہ نسبت اس کی آمدنی ½ ۶ گنا کم متصور کی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی اس نے ۱۹۲۲ء کے بعد سے گیارہ سال کے عرصہ میں بحری تحفظات پر اس قدر خرچ کیا کہ امریکا اسی قدر رقم آٹھ سال میں صرف کرتا رہا اور پھر اس کا بحری تناسب امریکا سے ½۵ گن بڑھ گیا۔ ایک اطلاع سے معلوم ہوتا ہے کہ سال رواں کے لئے منظور شدہ میزانیہ کا ایک تہائی حصہ بحری دفاع کے لئے مختص کر دیا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ رقم پانچ سو ملین کو پہنچتی ہے۔

مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر جاپان کا مطالبۂ مساواتِ بحری مبنی بر انصاف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خود جاپان کے نمائندہ جنرل کیٹو نے واشنگٹن کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں اس امر پر زور دیا تھا کہ "جاپان کے لئے ہر حیثیت سے ۵ : ۵ : ۳ کا تناسب کافی و وافی ہے اور حالات اس امر کی اجازت نہیں دیں گے کہ زمانۂ مستقبل میں مزید بحری تحفظ کا مطالبہ کیا جائے"۔ اب یہاں دفعتہً یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ کیا اسباب ہیں جن کی بنا پر جاپان کو مطالبۂ مساواتِ بحری پیش کرنے کی ضرورت داعی ہوئی؛ پہلی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ جاپان چین کے چار شمالی صوبجات پر قابض ہو چکا ہے اس لئے اسے چین کی طرف سے اقدامِ جنگ کا خطرہ ہے۔ علاوہ بریں روس بھی اس پر خار کھائے بیٹھا ہے۔ اس لئے وہ مزید بحری تحفظات کا حامی ہے تاکہ بوقت ضرورت سہولت کے ساتھ ان دونوں ممالک کی مدافعت ہو سکے۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ سے اپنی تجارت کو بین الاقوامی طریقہ پر مستحکم اور ٹھوس بنیادوں پر قائم کر دینے کا طالب ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مشرقِ بعید میں اپنی مکمل آزادی کی برقراری بھی اس کے پیش نظر ہے۔ یہاں یہ امر بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ جاپان میں شہنشاہ میجی کے زیر حکومت فوج کو سیاسیات میں دخل در معقولات کی اجازت نہ تھی لیکن اب منچوریا پر قبضہ نے حالات کو بالکل برعکس بنا دیا ہے۔ اس وقت جاپانی حکومت پر فوجی اقتدار کا کافی تسلط ہے۔ جس کی وجہ سے بحری مساوات کے مطالبہ نے مزید تقویت حاصل کی۔ ایک تازہ بیان جاپان کا اس سلسلہ میں یہ بھی ہے کہ جب امریکہ اور برطانیہ نے اپنے بحری تحفظات میں اضافہ کرنا شروع کر دیا ہے تو کیوں نہ جاپان ان کی تقلید پر آمادہ ہو"۔ "سنڈے ڈسپیچ" کے نامہ نگار کے بیان کے مطابق امریکا فضائے بحر پر مکمل حکمرانی کا عزم بالجزم کر چکا ہے اور اس نے ایک عظیم الشان بیڑے کی تعمیر کا حکم دے دیا ہے جو کسی ملک سے کم درجہ پر نہ ہو۔ حال ہی میں تین مہیب پروازی کشتیاں تعمیر کی گئی ہیں اور چوبیس جنگی جہازوں کی تعمیر کا بھی اعلان کر دیا ہے۔ اس طرح وہ بحرالکاہل اور بحر اطلانتک کی موجوں پر کامل اقتدار کا طالب ہے۔ یہی حال برطانیہ

کا بھی ہے۔ مثال کے طور پر اس نے ایک اعلان کے ذریعہ سے اپنے جہازوں کا وزن ...، ٹن سے ... ۹ ٹن تک بڑھا دیا ہے۔
انہیں وجوہ کی بنا پر جاپان ۵ : ۵ : ۳ کا تناسب ہٹا کر مساوی درجہ کا خواہش مند ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ ۵ : ۵ : ۵ کا طالب ہے یا ۳ : ۳ : ۳ کا کیونکہ جاپان کے ساحل اور اس کی شہنشاہی کی ضروریات نہ امریکی جمہوری شہنشاہی سے کم ہیں اور نہ انگلستان کی مشروط شہنشاہی سے کسی حال میں دبی ہوئی۔ یہاں تک تو ہم نے اختصار کے ساتھ جاپان، امریکا اور برطانیہ کے بحری تحفظات کے متعلق بحث کی ہے۔ اسی سلسلہ میں فرانس اور اطالیہ کی رقابت بھی خاص طور سے قابلِ ذکر ہے جس کے مطالعہ سے قارئین پر یہ امر بالکل واضح ہو جائے گا کہ نہ صرف دولِ عظمیٰ بلکہ دولِ صغریٰ بھی اس بھنور میں پھنسی ہوئی ہیں۔

حقوق اور مفاد دونوں میں اطالیہ آج فرانس کا مخالف ہے وہ فرانس کے ساتھ اپنی بحری مساوات کے حق پر اصرار کر رہا ہے اسے اس کا قومی عُجب و غرور اس قسم کا مطالبہ کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ مسولینی نے اطالوی قوم سے اس کا وعدہ کر لیا ہے مگر جب ایک مرتبہ دعویٰ تسلیم کر لیا جائے گا تو یہ امر مشتبہ ہے کہ ملک اس سے بھی فائدہ اُٹھائے گا یا نہیں۔ اس لئے کہ اطالیہ میں فرانس کے برابر توسیعِ قوت کی مالی سکت نہیں ہے۔ غالباً مسولینی فرانس کو اطالیہ کی قوت تک اپنی قوت گھٹانے پر مجبور کرے گا۔ تخفیفِ اسلحہ کے ان پُراسرار مطالبوں کے پیچھے یہی مقصد پنہاں ہے لیکن فرانس اطالیہ کی مساوات کو خیال میں جگہ دینے سے بھی انکار کرتا ہے چونکہ وہ دُنیا کی دوسری سب سے بڑی شہنشاہیت ہے اس لئے قدرتاً اُس کی ضروریات اطالیہ سے کہیں بڑھی ہوئی ہیں۔ فرانس کو بھی اپنے بحرالکاہل مقبوضات کی حفاظت کرنی اور وہاں پولیس کا انتظام قائم رکھنا ہے۔ اطلانٹک اور بحرِ شمالی کے ساحلوں اور بحرِ متوسط کے علاقوں میں بھی اس کو یہی کام کرنا ہے۔ اطالیہ کے اہم مفاد بحرِ متوسط کے سوا اور کہیں نہیں ہیں۔ اگر فرانس اطالیہ کے مطالبہ مساواتِ بحری کو قبول کرلے تو وہ اپنے آپ کو اس رقبہ میں اپنی حفاظت کی طاقت سے محروم کرلے گا اس لئے کہ اطالیہ ہمیشہ اپنے عساکر کو وہاں جمع کر سکے گا اور فرانس کو اس کی افریقی نوآبادیوں سے محروم کر سکے گا جہاں اس کی زبردست عسکری قوت اور خام مادوں کے ذخائر موجود ہیں۔ واشنگٹن کانفرنس بابت ۱۹۲۲ء میں بھی اطالیہ اور فرانس بحری قوت کی نسبت باہم اختلاف رکھتے تھے اطالیہ کا مطالبہ تھا کہ فرانس کے ساتھ اس کو جہازوں کے وزن کی مساوات ملنی چاہیئے اور جہاں تک جنگی جہازوں کا تعلق تھا اس نے اپنا مقصد حاصل بھی کر لیا۔ لندن کی بحری کانفرنس منعقدہ ۱۹۲۳ء میں اس نے پھر اپنا دعویٰ پیش کیا مگر کسی دعوے پر غور کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ فرانس آمادہ نہ تھا کہ ہر قسم کے جہازوں میں اسے اپنے مساوی کرلے اور کسی ملک نے بھی معاہدہ پر دستخط نہ کئے۔ اس ناکامی سے بگڑ کر سینیر مسولینی نے اعلان کیا کہ فرانس جتنے جنگی جہاز اور جس قدر وزن کے بنائیگا وہ بھی برابر اتنے ہی بنائے گا۔ چونکہ دونوں ممالک اپنی مرضی کے مطابق جنگی جہاز تعمیر کرنے کے لئے آزاد تھے بشرطیکہ وہ بڑے سائز کے نہ ہوں اس لئے مقابلہ شروع ہو گیا۔ اطالوی میزانیہ کی کمی اور قومی آمدنی کے مستقل طور پر گھٹتے رہنے کے باوجود

بھی مسولینی نے وہی کیا جس کی اس نے دھمکی دی تھی۔ کروزروں کی تعمیر میں وہ بہت جلد فرانس سے آگے بڑھ گیا اور آخرالذکر کو جو فضیلت برباد کُن جہازوں اور تحت البحر کشتیوں کے اعتبار سے حاصل تھی وہ بھی بڑی حد تک گھٹ گئی۔ فرانس کے دس ہزار ٹنی کروزروں میں جہاز کے بالمقابل جہاز بن رہا تھا۔ یہ اسلحہ میں برابر ہیں مگر سرعت رفتار میں بڑھے ہوئے۔ فرانس کے اعلےٰ برباد کُن جہازوں کے مقابلہ کے لئے اطالیوں نے "بلیک پینڈ" نام کے کروزر بنائے ہیں جو اپنی جسامت کے باوجود تمام جہازوں میں سب سے زیادہ تیز جانے والے ہیں اور اس قابل ہیں کہ فرانس کے بڑے سے بڑے برباد کُن جہازوں کو جالیں اور کاٹ کر پھینک دیں۔ ان کے مقابلہ کے لئے فرانس نے ایک اور برباد کُن جہاز بنایا ہے جو ان سے بڑا ہے اور جس میں اس سے بہتر اسلحہ ہیں۔ فرانس کے ہر قسم کے جنگی جہاز جو آج سے تین چار سال قبل (۲۱۹) تھے اب (۲۶۶) ہو گئے ہیں لیکن اطالیہ کے اتنی ہی مدت میں (۲۶۰) سے بڑھ کر (۳۰۵) ہو گئے۔

ان ہر دو ممالک کی بحری رقابت کو تفصیل کے ساتھ اس لئے قلمبند کرنا پڑا تاکہ بحری تحفظات کی بابت ہر دو کے نقطۂ نگاہ سے پوری واقفیت ہو جائے۔ آج سے چند ماہ قبل فرانس کے وزیر خارجہ کا ایک اہم بیان اخبارات میں شائع ہوا تھا جس کے مطالعہ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ فرانس بھی رسماً نیز عملاً معاہدۂ واشنگٹن کی تنسیخ کر چکا ہے۔ یہ امر بخوبی ذہن نشین رہے کہ اختلافات کی خلیج جس قدر زیادہ وسیع ہوتی ہے اُس قدر مصالحت کی امیدیں بھی دُور ہوتی جا رہی ہیں۔ اگر فرانس جرمنی پر ناک بھوں چڑھائے ہوئے ہے تو اطالیہ فرانس پر خفگی کا اظہار کر رہا ہے اور برطانیہ ان سب سے عدم مصالحت کی بنا پر رُوٹھا ہُوا ہے۔ علاوہ بریں ایک اور امر قابلِ غور ہے کہ ہر ملک کا مطالبہ جداگانہ ہُوا کرتا ہے اور وہ اس چیز کا طالب ہوتا ہے جس کا اس کے پاس فقدان ہو اور اس شے کی عدم ضرورت پر دوسروں کو مجبور کرتا ہے جو اس کے پاس موجود ہے۔ اپنے اپنے حالات کے لحاظ سے اگر برطانیہ بٹالین بڑھانے کا حامی ہے اور آبدوز کشتیوں کی کمی کا طرفدار، تو فرانس اس کا قطعاً مخالف ہے۔ اگر امریکا جزائر کی عدم موجودگی کی وجہ سے بحری بندرگاہوں کے اضافہ پر زور دیتا ہے تو جاپان اس بنا پر اس تجویز کی مخالفت کرتا ہے کہ وہ کثیر تعداد میں جزائر سے گھرا ہُوا ہے۔

ان حالات کی روشنی میں اس امر کا فیصلہ مشکل نہیں کہ امسال منعقد ہونے والی بحری کانفرنس کامیاب ہو گی یا نہیں اور کیا متذکرہ بحری تحفظات اس امر کا اعلان کر رہے ہیں کہ وہ مستقبل قریب میں بحری جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے؟

عبدالقادر جیلانی

ایک جواں مرگ کا نوحہ

جاتی ہے میری جان سنبھالو کسی طرح
ساجد کو میرے پاس بُلا لو کسی طرح

میں چیختا ہوں اور یہ دیتا نہیں جواب
روٹھا ہوا اگر ہے منا لو کسی طرح

دُولہا بنا دیا اِسے نہلا دُھلا کے پھر
اِس بے زباں پہ خاک نہ ڈالو کسی طرح

تنہا اِسے اُٹھا کے کہاں لے چلے ہو تم
مجھ کو بھی اس کے ساتھ اُٹھا لو کسی طرح

فارغ ہوئے جو دفن سے اس کے تو کیا ہوا
سینہ میں جوشِ غم تو دبا لو کسی طرح

اقرار تھا کہ عابد و ساجد رہیں گے ایک
ارمان میرے دل کے نکالو کسی طرح

حُورانِ خلد مجھ کو دکھانا تھا سبز باغ
یہ نوجواں ہے اس کو سکھا لو کسی طرح

تُو جائے اور میں زندہ رہوں یہ گماں نہ تھا
اچھا بتا دے تُو ہی کہ تو میری جاں نہ تھا

محمد زین العابدین فرجاد کوتانوی

محفلِ ادب

ایک اُجڑی ہوئی صحبت کی یاد

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جب شاہجہان آباد پر انگریزی تسلط پوری طرح ہوگیا تو حکومت کا اثر محکوم پر پڑا تجدید تاریخ تھی مذہب آہستہ آہستہ کمزور ہونا شروع ہؤا اور ادب اسی رفتار سے معاشرت میں داخل ہوتا رہا جہاں آباد کی سرزمین وہ جگہ تھی جس کی خاک سے ایسے علما کا گروہ پیدا ہؤا جن کی زندگی علم وفضل کے ڈنکے بجا گئی اور جن کے کارناموں کے گیت آج بھی دنیا گا رہی ہے۔ ان کی موت زندگی سے بہتر تھی کہ ہر صبح کا آفتاب ان کی بوسیدہ قبروں کو بوسہ دیتا ہؤا طلوع ہوتا ہے اور روز روشن کی وداع سب سے پہلے ان کے مزاروں سے گلے ملتی ہے مگر اب وہ دَور فنا ہو رہا تھا۔

غدر کو پینتیس سال سے زیادہ ہوچکے قرآن وحدیث کی درسگاہیں کمزور ہو رہی ہیں ادب کے چرچے شروع ہوگئے گرمی کا موسم ہے اور ایک شام کا ذکر ہے۔

شمس العلما منشی ذکاءاللہ جو چیلوں کے کوچہ میں رہتے تھے روزانہ شام کو چھ بجے گھر سے نکلتے تھے اور ٹاؤن ہال آجاتے تھے (یہ کمپنی باغ میں تھا جہاں اب کمیٹی کا دفتر ہے) بتاشوں کی گلی سے مولوی نذیر احمد دریبہ سے ماسٹر پیارےلال اور اکبر رہٹ کے کنویں سے مولوی ضیاءالدین بھی آتے تھے۔ منشی ذکاءاللہ اگر جلدی نکل آتے تھے تو مولوی نذیر احمد کے ہاں پہنچ جاتے تھے چنانچہ جس شام کی یہ صحبت ہے اُس روز مولوی نذیر احمد صاحب کے مکان پر منشی ذکاءاللہ آگئے تھے میں کچھ رشتہ کی کچھ شاگردی کے تعلق کی وجہ سے زیادہ وقت مولوی نذیر احمد صاحب کی خدمت میں بسر کرتا تھا۔ یہ دونوں بزرگ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ محض اتفاق سے مولانا آزاد تشریف لے آئے۔ مولوی نذیر احمد صاحب ٹاؤن ہال پیدل جاتے تھے اور آٹھ نو بجے تک تشریف رکھتے تھے۔ ان کے پاس وکٹوریا گاڑی تھی کبھی کبھی ہوا خوری کو اس میں نکل جاتے تھے۔ آج مولانا آزاد کے آنے پر انہوں نے گاڑی کا حکم دیا اور تینوں صاحب باہر نکلے میں بھی ہمرکاب تھا سامنے کی سیٹ پر بیٹھنے میں کچھ دیر تکلف رہا آخر میں اور مولوی ذکاءاللہ سامنے اور مولوی نذیر احمد اور مولانا آزاد بڑی سیٹ پر بیٹھے۔ کھاری باؤلی میں مولانا حالی سے ملاقات ہوئی مولانا آزاد کے اصرار پر وہ بھی اندر تشریف لے آئے اور ہمارے برابر بیٹھ گئے۔ میں اس وقت نویں جماعت میں تھا اور مولانا حالی سے پڑھتا تھا۔ ہمارا زمانہ طالب علمی آج کے زمانہ سے مختلف تھا آج کے اُستاد برابر کے دوست ہیں۔ اس وقت ڈر کے مارے استاد کے سامنے آنکھ اُٹھانی بھی مشکل تھی میں سکڑ رہا تھا کئی دفعہ ارادہ کیا کہ آگے جاکر کوچوان کے پاس بیٹھ جاؤں لیکن اجازت نہ ملی۔

گفتگو شعر وشاعری پر ہونے لگی اور ذوق وغالب کا مقابلہ شروع ہوگیا۔ یہاں تک کہ ہم لاہوری دروازہ کے باہر پہنچے یہ مقام اس وقت گلزار بنا ہؤا ہے دو منزلہ سہ منزلہ عمارتیں ہیں گنجان آبادی ہے منڈی ہے دوکانیں ہیں اُس وقت جنگل بیابان تھا۔ جہاں ایک مسجد کے سوا جو شاید ابھی تک موجود ہے کچھ نہ تھا۔ ایک طرف کچھ لڑکے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ دوسری طرف کبڈی ہو رہی تھی اور سڑک کے برابر مداری تماشا کر رہا تھا۔

زندگی ان لوگوں میں بھی تھی مولانا آزاد کی تحریک مولوی نذیر احمد صاحب کی تائید اور منشی ذکاءاللہ صاحب کی خواہش پر گاڑی ٹھیرائی گئی اور مداری نے پوری طاقت سے اپنے کرتب دکھانے شروع کئے۔ مولوی نذیر احمد اور مولانا حالی میرے اُستاد تھے۔ مولانا آزاد اور منشی ذکاءاللہ واجب الاحترام بزرگ اس لئے میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں مجھے تعجب ضرور ہے کہ یہ مداری کے اس رنگ میں باوجود

اس علم وفضل کے کیونکر آ گئے کہ وہ سانپ اور نیولے کی کشتی دکھائے گا۔ مگر مداری کے راگ اور چیز ہے اور ان کی قابلیت دوسری چیز۔ یہ آخر وقت تک یہ ہی سمجھتے رہے کہ کشتی اب ہوئی۔ حالانکہ اُس کے پاس ایک نیولا اور ایک سانپ تھا۔ ظاہر ہے کہ دونوں میں سے ایک زخمی ہوتا۔ اگر مداری اس طرح روز کشتیاں دکھاتا تو اُس کو ایسا کیا مل جاتا کہ روز سانپ اور نیولے لاتا ایک چونی مولانا آزاد نے اور اسی طرح تینوں نے دو دو آنہ یا چار چار آنہ دیئے اور مداری سب پیسے خلتے میں کھ سیدھا ہولیا۔ ان سب نے کہا کہ کشتی دکھاؤ مگر وہ ہنس کر ٹالتا ہُوا یہ جا وہ جا۔

گاڑی میں کچھ دیر مداری کے متعلق بحث ہوتی رہی آخر مولوی نذیر احمد نے وہی غالب و ذوق کا مضمون شروع کر دیا۔ مولانا حالی کا واسطہ غالب سے تھا اور مولانا آزاد کا ذوق سے دونو بزرگ اپنے اپنے ثبوت پیش کر رہے اور منشی ذکاء اللہ اور مولوی نذیر احمد بحث کے مزے لوٹ رہے تھے مولانا آزاد نے فرمایا نثر ہو یا نظم اگر لطف زبان نہ ہو تو بیکار ہے۔ مولوی حالی کی رائے تھی کہ زبان کا لطف ہو تو سبحان اللہ مگر اصلی جوہر تخیل ہے اگر یہ نہیں تو محض زبان کو لیکر چاٹا کیجئے مجھے تعجب ہے کہ ان بزرگوں کی نظر کس قدر وسیع حافظہ کیسا پختہ اور ذہن کیسا رسا تھا۔ طرفین سے سینکڑوں شعر برسنے لگے۔ مولانا آزاد نے سینکڑوں شعر نواب مرزا شوق کے پڑھ ڈالے میر حسن اور مرزا شوق کا مقابلہ تھا فراق کی کیفیت میں مولانا آزاد نے شوق کا یہ شعر پڑھا۔

تلاطم میں شب بھر طبیعت رہی   نہ صورت رہی وہ نہ رنگت رہی

اس شعر کی چاروں نے داد دی مولانا حالی نے اسی کیفیت میں میر حسن کا یہ شعر فرمایا:۔

نہ ملنے کے دکھ اسکے سب ہیں سہے   مگر اپنے جی سے وہ جیتا رہے

اس کی صراحت مولانا نے کچھ ایسے الفاظ میں کی کہ وہ سب آبدیدہ ہو گئے میں اس وقت تو خاک نہ سمجھا مگر اب اس شعر کا لطف آتا ہے سبحان اللہ محبت کی اس سے زیادہ کیفیت کیا ہو گی " مگر اپنے جی سے وہ جیتا رہے "

اِسکے بعد پھر وہی غالب اور ذوق کے شعر کی گردان اور لطف زبان کی رٹ شروع ہوئی۔ ذوق کے اس شعر پر سب نے بیساختہ مرحبا کہا:۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے   سر بوقت ذبح اپنا اُس کے زیر پائے ہے

زبان کے اعتبار سے مولانا حالی نے غالب کے بہت سے شعر پڑھے مگر وہ بات پیدا نہ ہو سکی مگر اُنکے اس شعر کو سب نے پسند کیا اور نزاکتِ خیال کی داد دی:۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں   اُٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

یہ متبرک صورتیں جن پر ادب موتی نچھاور کر رہا تھا اور جو کوثر سے دُھلی ہوئی زبانیں لیکر پیدا ہوئے تھے میرے سامنے پیوند خاک ہوئی ہیں۔ جہان آباد کے ایسے ایسے تماشے میری آنکھ سے اوجھل ہوئے ہیں کہ دل اُن کی یاد سے تڑپ اُٹھتا ہے۔ مولوی نذیر احمد کی گرج جس نے آسمانِ اسلام کے اچھے اچھے بادلوں کو خاموش کر دیا تھا ختم ہو چکی۔ میدانِ تقریر کے اس شیر نے جس کی دھاڑ سے آسمان و زمین گونج اُٹھتے تھے میرے سامنے دُنیا سے مُنہ موڑا میں آخر وقت بالیں پر موجود تھا اور دیکھ رہا تھا کہ جس کی تقریر و تحریر جادو کر رہی تھی وہ موت کے جنگل میں پھنسا ہُوا دنیا سے رواں ہو رہا ہے۔

میں اس مشاعرہ میں موجود تھا جہاں مرنے والا داغ مولانا حالی پر چھا رہا تھا اور اس نے اپنے اس شعر سے مولانا کو رونکھا کر دیا تھا۔

تم بھی اے ناصح کسی پر جان دو   ہاتھ لا اُستاد کیوں کیسی کہی

میں نے اُسی رات کے آخری حصہ میں وہ سماں بھی دیکھ لیا کہ دلی پرست داغ جو مولانا سے حج مچا رہا تھا اس شعر پر ڈاڑھیں مارتا ہُوا انکے قدموں پر آ گرا۔

لے کے داغ آئے گا سینہ پہ بہت اے سیاح   دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

"عصمت"

راشد الخیری

مطبوعات

شکار } یہ نواب قطب یار جنگ مرحوم بی۔ اے علیگ کی قابلِ قدر تصنیف ہے جسے اُن کے فرزند رشید جناب سراج الدین احمد صاحب نے شائع کیا ہے شکار کے موضوع پر اُردو میں اب تک اتنی مبسوط جامع دلچسپ اور معلومات سے لبریز کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اس کتاب میں نہ صرف آلاتِ شکار کے متعلق نہایت مفید معلومات درج ہیں بلکہ پرندوں، بڑے جانوروں اور درندوں کے شکار کے طریقے ان کی خصوصیات مزاج، شکار کے بعض دلچسپ واقعات اور شکار کے فن کے متعلق سینکڑوں مفید معلومات اور ہدایات موجود ہیں۔ حجم بڑی تقطیع کے ۵۰۰ صفحات۔ قیمت دس روپے۔ پتہ:۔ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

سفرنامۂ شمیم } پنڈت شیو نرائن صاحب شمیم نہایت خوش مذاق بزرگ ہیں۔ اس کتاب میں موصوف نے اپنی سیاحت کے دلچسپ حالات بہت سلیس اور مؤثر انداز میں بیان کئے ہیں۔ کتاب حسبِ ذیل ابواب پر مشتمل ہے (ا) جنوبی ہندو لنکا (ب) انگلستان، فرانس، سوئٹزرلینڈ (ج) برما (د) ناگپور نالندہ، راج گڑھ (ر) بمبئی و گوالیار۔ حجم ۲۲۰ صفحات قیمت مجلد ۲ پتہ:۔ پنڈت شیو نرائن صاحب شمیم ایڈووکیٹ ہائیکورٹ لاہور۔

سرودِ زندگی } یہ حضرت اصغر کی غزلوں کا ایک چھوٹا سا خوبصورت اور نفیس مجموعہ ہے جو شاعر کی تصویر سے بھی مزین ہے۔ ابتدا میں حضرت مصنف کا دیباچہ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کا مقدمہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریظ درج ہے۔ حضرت اصغر کو اس قدر شہرت اور مقبولیت حاصل ہو چکی ہے کہ اب اُن کا لطیف اندازِ تغزل کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا۔ قیمت مجلد ۲ (نیلے رنگ کی خوبصورت جلد پر مصنف اور تصنیف کا نام سنہرے حروف میں درج ہے۔ پتہ:۔ حضرت اصغر ایڈیٹر "ہندوستانی" الہ آباد۔

مختصر تاریخ دکن (از ابتدا تا اینڈم) } یہ کتاب مسٹر ہارون خاں شروانی ایم۔ اے (آکسن) پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کی قابلِ قدر تالیف ہے جو اگرچہ نصاب سررشتہ تعلیماتِ دکن کو پیش نظر رکھ کر طلبہ کے فائدہ کے لئے لکھی گئی ہے لیکن پُر از معلومات ہونے کے باعث افادۂ عامہ کے لئے بھی استعمال ہو سکتی ہے۔ کتاب بہت جامع ہے اور تلاش و تحقیق سے لکھی گئی ہے قیمت مجلد ۲ غیر مجلد ۱۲ حضرت مؤلف سے طلب فرمائیے۔

ال۔بیّنات } اس کتاب میں مختلف عنوانات کے ماتحت قرآنی آیات اور ان کے تراجم درج کئے گئے ہیں۔ چند عنوان حسب ذیل ہیں:۔ مذہبیات، جسمانیات، معاشرت، معاشیات، اخلاقیات۔ اس قسم کے بڑے عنوانوں کے ماتحت ذیلی عنوان ہیں مثلاً معاشرت کے ماتحت والدین، اولاد، عورت، میاں بیوی، رضاعت وغیرہ کے عنوان۔ یہ کتاب نہ صرف آیات کے حوالوں کا ماخذ ہونے کی حیثیت سے مفید ہے بلکہ اس سے زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق اسلامی احکام بھی فوراً معلوم ہو سکتے ہیں۔ حجم ۳۲۹ صفحات، کاغذ کتابت طباعت اور جلد نفیس۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ۔ ال۔بیّنات۔ امراؤتی (برار)

افسانہ در افسانہ } یہ چیدہ افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جسے نیرنگستان' دہلی کے لائق ایڈیٹر مولانا عشرت رحمانی نے مرتب کیا افسانے سب طبعزاد ہیں اور افسانہ نگاروں میں حضرت مؤلف کے علاوہ علامہ کیفی دہلوی، علامہ راشد الخیری دہلوی، حضرت احسن مارہروی اور خواجہ حسن نظامی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کتاب بہت دلچسپ ہے۔ قیمت ۱۰ر۔ پتہ:۔ حضرت عشرت رحمانی مدیر نیرنگستان دہلی +

زیرِ ادارت

شبیر حسن خاں جوش

ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی

اطلاعنامہ بنام دائنان نسبت تعین تاریخ سماعت درخواست دیوالیہ (دفعہ ۱۹ ایکٹ ۵ سنہ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب سب جج صاحب بہادر اوّل بھڑائچ

نمبر مقدمہ ۳۹ سنہ ۱۹۳۵ء متفرقات معمولی دیوالیہ

بمقدمہ قرار دیئے جانے دیوالیہ مسمیان (۱) سنت رام (۲) رام لکھن } پسران گجادھر اقوام کہار ساکنان تحصیل تیرہ پرگنہ رکھ تحصیل وضلع بھڑائچ دیوالیہ سائلان

بنام (۱) جے جے رام ولد سرجو پرشاد ساکن تحصیل دھنونہی (۲) بشیشر مصر ولد پرکاش (۳) منشی رام ولد سورج مل ساکنان تحصیل تیرہ } اقوام برہمنان۔ پرگنہ وڈاکخانہ اکونہ تحصیل وضلع بھڑائچ مہاجنان فریق ثانی

درخواست دیوالیہ حسب دفعہ ۱۳ ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء

ہرگاہ مسمیان ۱۔ سنت رام ۲۔ رام لکھن سائلان نے عدالت ہذا میں بذریعہ عرضی مؤرخہ ۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۳۵ء درخواست کی ہے کہ وہ حسب منشا ایکٹ دیوالیہ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء دیوالیہ قرار دیئے جاویں اور تمہارا نام فہرست دائنان میں جو مدیونان مذکور نے داخل کی ہے پایا جاتا ہے لہذا تم کو اطلاع دی جاتی ہے کہ عدالت ہذا نے تاریخ ۲۹ (انتیس) نومبر سنہ ۱۹۳۵ء واسطے سماعت درخواست مذکور الصدر اور لینے بیان مدیونان کے مقرر کی ہے۔ اگر تم کچھ اس معاملہ میں پیروی کرنا چاہتے ہو تو اصالتاً یا بذریعہ وکیل جو حال مقدمہ سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو حاضر ہو۔

آج بتاریخ ۲۶ ستمبر سنہ ۱۹۳۵ء میرے دستخط و مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

(مہر عدالت)

سید عبد اللطیف پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس میو ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمالیں ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

قواعد

۱۔ "ھمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے ۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اُتریں درج کیے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے ۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱/ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے ۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کیے جاتے ۔

۶۔ ہُمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے ۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا ۔

۸۔ جواب طلب امور کے لیے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے ۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/ ۔

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجیے ۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھیے ۔

مینیجر رسالہ ہُمایوں
۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

Title and Picture Printed at the Halftone Press, Lahore.

[illegible]

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلت مآب آنربیل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرست مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۲۵ء

تصویر:۔ رات کی رانی

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے مع محصول — قیمت فی پرچہ ۹؍

بزمِ "ہمایوں"

جنوری ۱۹۳۶ء میں "ہمایوں" کی پندرہویں سالگرہ کے موقع پر حسبِ معمول "ہمایوں" کا ضخیم "سالگرہ نمبر" غیر معمولی اہتمام سے شائع ہوگا۔ جو حضرات اس نمبر کے لئے مضامین بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ از راہِ کرم جلد اس طرف متوجہ ہوں کیونکہ جب بعد از وقت آئے ہوئے مضامین کے لئے گنجائش باقی نہیں رہتی تو بعض حضرات کو شکایت پیدا ہوتی ہے۔

اورنگ آباد کے سہ ماہی ہمعصر "اردو" میں ایک صاحب نے "ناخدا" کے نام سے "ہمایوں" کے "روسی ادب نمبر" پر اظہارِ خیالات کرتے ہوئے بعض اعتراضات کئے تھے چونکہ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ایک قلیل الحجم ماہوار رسالہ کسی قوم کے ادب کی پُوری نمائندگی پر کسی طرح قادر نہیں ہوسکتا اور اس کا اعتراف ہم متعدد مرتبہ ان صفحات میں کر چکے ہیں اس لئے ہم نے "ہمایوں" میں "اردو" کی تنقیص آمیز لیکن مخلصانہ رائے کے بعض ایسے حصّوں کا تذکرہ خاص طور پر ضروری سمجھا جن میں فاضل نقاد نے عجیب و غریب تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا ہے۔

لیکن "ہمایوں" کے ایک فاضل مقالہ نگار جنہوں نے شاید "ناخدا" کی لفظی رعایت سے "امیر البحر" کا لقب اختیار کیا ہے اپنی حسبِ ذیل تصریحات کی اشاعت پر مصر ہیں:۔

"انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کے سہ ماہی رسالے "اردو" میں جناب "ناخدا" "ہمایوں" کے روسی ادب نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اس ادبی نمبر میں "بولشویک روس کا پس منظر" لینن خدا کے حضور میں، اور روسی تاریخ کے مشہور سنین کی اشاعت کا کیا موقع و محل تھا ——"

جناب "ناخدا" کی خدمت میں التماس ہے کہ کسی قوم کی ادبیات کا مطالعہ اس وقت تک بے سُود ہے جبتک کہ اس قوم کی پوری تاریخ مطالعہ کرنے والے کے سامنے نہ ہو چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ادبیات کی تاریخ لکھتے وقت مصنف اقوام کی معاشری اور سیاسی زندگی کا ذکر کرتے ہیں۔ رسالہ "اردو" کی اسی اشاعت میں ایک مضمون بعنوان "ادب اور زندگی" شائع ہوا ہے جس میں فاضل مضمون نگار اس نظریہ کی یوں تائید کرتے ہیں:۔

"کسی ادیب کی روح کو سمجھنے کیلئے اس فضا کو سمجھنا زیادہ ضروری ہے جس میں اس نے پرورش پائی، جبتک اس زمانہ کی زندگی نہ سمجھی جائے یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ ادیب نے یہی کیوں کیا اس کے خلاف کیوں نہیں کیا اسلئے کہ ادیب اپنے جذبات کی نہیں بلکہ اپنی فضا کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے اس کی زبان سے اجتماعی انسان بول رہا ہے"۔

میری ناچیز رائے میں اگر "ہمایوں" کے روسی ادب نمبر میں روس کی تمام سیاسی معاشری تاریخ کا خاکا بھی شائع ہوجاتا تو یہ امر قابلِ اعتراض نہ ہوتا۔ اُمید ہے کہ شائع ہونے والے فرانسیسی ادب نمبر میں فرانسیسی زندگی کے سیاسی معاشری پہلوؤں پر ضرور روشنی ڈالی جائے گی"۔ "امیر البحر"

جنابِ "ناخدا" کے تجاہلِ عارفانہ کے جواب میں حضرتِ "امیر البحر" کی یہ تحریر محض ربِ امتثالِ امر درج کر دی گئی ہے۔ ورنہ مولانا حالی برسوں پہلے اردو دان حضرات کیلئے اپنے مقدمۂ شعر و شاعری میں ان اُمور پر بہ وضاحت روشنی ڈال چکے ہیں۔

جہاں نما

اطالیہ اور حبشہ کا مناقشہ

اطالیہ اور حبشہ کی کشمکش جس نے کچھ مدت سے دُنیا کی توجہ جذب کر رکھی ہے روز بروز زیادہ اہم اور پیچیدہ صورت اختیار کر رہی ہے۔ انجمنِ اقوام کی مفاہمت کی تمام کوششیں اور صلح و امن کے تمام بین الاقوامی معاہدے اس گتھی کو سلجھانے سے قاصر معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی ایسی صورت نظر نہیں آتی کہ دونوں ملک صلح و امن سے باہمی اختلاف کو مٹا سکیں۔ جنگ روز بروز قریب تر نظر آ رہی ہے۔ یہ جنگ اگر چھڑ گئی اور گمان غالب ہے کہ ضرور چھڑے گی تو اس سے جمعیتِ اقوام کا بنیادی اصول اور اس کا مستقبل بُری طرح متاثر ہوگا۔ دولِ یورپ کے تمام مصالحانہ اقدامات مسولینی کی مبارزطلبی کے سامنے عاجز ہو چکے ہیں۔ وہ مشرقی افریقہ میں توسیع سلطنت کا کشور کشایانہ خواب دیکھ چکا ہے اور دُنیا جہان کی امن خواہانہ رائے عامہ کی طرف سے کان بند کر کے افواج کی توسیع، عسکری شاہراہوں کی تعمیر اور ہوائی طاقت کی شیرازہ بندی میں مصروف ہے۔

ہر شخص کے دل میں قدرۃً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ آویزش کے اسباب و علل کیا ہیں۔ ۹ر اکتوبر ۱۹۳۴ء تک دونوں ملکوں میں بظاہر کوئی وجہِ مخاصمت نہ تھی۔ اس وقت تک دونوں ملکوں میں صلح و آشتی اور رواداری کے معاہدے استوار ہو رہے تھے۔ اٹلی نے اعلان کیا تھا کہ وہ حبشہ پر کسی قسم کی دراز دستی کی نیت نہیں رکھتا۔ آخر صلح و سلام اور صدق و رفاقت کے یہ تمام پیمان دفعتہً ٹوٹ کیوں گئے۔ ان کی شکست کا موجب غالباً وہ دو حملے ہوئے جو یکے بعد دیگرے ۱۹ر نومبر ۱۹۳۴ء کو گانڈر پر (شمالی حبشہ) اور ۵ر دسمبر ۱۹۳۴ء کو حبشہ کی سرحد کے قریب اطالوی سمالی لینڈ پر ہوئے۔ پہلا حملہ اطالوی سفارت خانے پر ہوا تھا لیکن ۲۷ر نومبر ۱۹۳۴ء کو اس کے متعلق ایک پُر امن تصفیہ ہو گیا۔ دوسرا حملہ اطالوی سمالی لینڈ میں ولوال کے محافظ فوجی دستے پر ہوا۔ اطالیہ کی پیشقدمی کے متعلق حبشہ نے ۱۶ر دسمبر ۱۹۳۴ء کو جمعیت اقوام کے سامنے حسبِ ذیل الفاظ میں احتجاج کیا۔

"گذشتہ نومبر کی تئیسویں تاریخ کو ایک انگریزی اور حبشی جماعت حبشہ کے صوبۂ آگڈن میں مرغزاروں کی تفتیش کر رہی تھی کہ ولوال کے مقام پر ایک اطالوی فوجی دستہ اس کے کام میں مزاحم ہوا۔ (ولوال اپنے کنوؤں کی وجہ سے ایک اہم سرحدی مقام سمجھا جاتا ہے اور دونوں ممالک اس کی ملکیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ گذشتہ چند سال سے اٹلی اس علاقے میں اپنی فوجی طاقت بڑھا رہا ہے۔

ولوال، انندوب اور وردیر کے علاقے مستحکم کرلئے گئے ہیں۔ حبشہ والوں کا دعوے ہے کہ یہ تینوں سرحدی مقامات حبشہ کی حدود کے اندر ہیں) ۵ر دسمبر کو اطالوی فوج نے بلاوجہ اشتعال مفتش جماعت کے محافظ حبشی فوجی دستے پر ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے حملہ کردیا۔ حبشہ کی حکومت نے ۲۶ر دسمبر کو اس کے خلاف احتجاج کا خط لکھا۔ احتجاج کے باوجود تین دن کے بعد اطالوی فوجی طیاروں نے اسی علاقے کے دوشہروں اڈووا اور جرلوگوبی پر بم برسائے۔ ۲ر اگست ۱۹۲۸ء کے اطالوی اور حبشی معاہدہ کی دفعہ ۵ کے مطابق ۶ر دسمبر کے احتجاج اور ۹ر دسمبر کی درخواست تصفیہ کے جواب میں اطالوی سفیر نے اس احتجاج وغیرہ کی طرف سے کان بند کرکے ۱۱ر دسمبر کو ایک خط کے ذریعہ سے تاوان اور معذرت نامہ طلب کیا اور ۱۴ر دسمبر کو ایک اور خط میں لکھا کہ ہماری حکومت یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ کس طرح ایک ایسا حادثہ کسی ثالث کے سامنے تصفیہ کے لئے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اطالیہ کا نقطۂ نظر حبشہ کے نقطۂ نظر سے بالکل متضاد ہے۔ اس نے حبشہ پر اشتعال انگیز طرزِ عمل اختیار کرنے کا الزام لگایا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ

(ا) جنگ ولوال کے مقتولین ومجروحین کے نقصان کا معاوضہ ادا کیا جائے۔

(ب) حرار کا حبشی گورنر معافی نامہ پیش کرے۔

(ج) اطالوی جھنڈے کے سامنے اظہارِ اطاعت کیا جائے۔

(د) اس نقصان کے ذمہ داروں کو سزا دی جائے۔

یہی وہ دو تازہ ترین واقعات ہیں جو دونوں ملکوں کی باہمی آویزش کا بڑا اسبب سمجھے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے بعد بھی متواتر اور ایسے واقعات پیش آتے رہے اور حکومتِ حبشہ اطالوی سمالی لینڈ کے قریب اپنی سرحد پر اطالویوں کے تازہ حملوں کے خلاف بار بار جمعیت اقوام کے سامنے احتجاج پیش کرتی رہی۔ لیکن اس کے باوجود موجودہ آویزش کا سبب صرف یہی حملے نہیں ہوسکتے۔ ولوال کے قریب معمولی سی پیش قدمی اطالویوں کے دل میں جنگ کا ایسا عزمِ صمیم پیدا نہیں کرسکتی۔ ان تازہ حادثات نے محض ایسے متعدد اسباب کو از سرِ نو تقویت دے دی ہے جو اگرچہ بظاہر بھولے بسرے ہوچکے تھے لیکن اُن کے اثرات اب تک قائم تھے۔ چنانچہ موجودہ صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے لازم ہے کہ ہم حبشہ میں نوآبادیاں قائم کرنے کی غرض سے اٹلی کی اولیں پیشقدمی کو زیرِ نظر رکھیں۔ نوآبادیاں قائم کرنے کی ہوس جب کسی قوم کے دل میں ایک دفعہ جگہ پالیتی ہے تو پھر نکلنے کا نام نہیں لیتی۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء سے لے کر آج تک اطالوی دماغ سے نوآبادیاں قائم کرنے کا خیال نہیں نکلا۔ اٹلی کی فوجوں نے مشرقی افریقہ کی غیر مہماں نواز سرزمین پر نوآبادیوں کی تلاش میں پیش قدمی کرکے کئی دفعہ مُنہ کی کھائی ہے۔ اطالیہ کے سیاہ پوشوں کے سامنے سولینی کی تفاخر آمیز تقریروں کے باوجود اطالوی حکومت اُن متعدد شکستوں کو بھول نہیں سکتی جو اُسے حبشہ کی سیاہ فام فوجوں نے دیں۔ ایڈووا کی شکست کی یاد ہنوز اُن کے دلوں میں تازہ ہے خواہ اُس کی اہمیت کو کم کرنے

کے لئے کتنے ہی عذر کیوں نہ تراشے جائیں لیکن اطالیہ کے دل سے اس ذلت کی یاد نہیں نکل سکتی اور موجودہ جنگ کی تیاریوں کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اطالیہ کی پیشانی سے ذلت و رسوائی کا داغ دھوڈالا جائے چنانچہ جرار سے جرار لشکر جمع کئے جارہے ہیں ہوائی طاقت کا حشر انگیز سامان ہو رہا ہے اور سیاہ نسلوں کو خائف کرنے کے لئے عہد حاضر کے تمام جنگ جویانہ حربے استعمال کئے جارہے ہیں۔ اب ایک طرف تو اطالیہ کو اپنی ہوس استعمار اُکسا رہی ہے اور دوسری طرف ایڈووا کی شکست کی ذلت سامانی اس کی عسکری روح کو جنگ و پیکار پر اُبھار رہی ہے۔ اس کے ساتھ اگر تجارتی منڈیوں کی توسیع قدرتی وسائل پیداوار اور حبشہ کی کانوں سے مستفید ہونے کا شوق، نیز اری ٹریا کی اطالوی بندرگاہ سے لے کر حبشہ کے پار اطالوی سمالی لینڈ میں دوسری اطالوی بندرگاہ موگاڈیشو تک ایک جدید ترین شاہراہ بنانے کا خیال شامل کر لیا جائے تو اطالیہ کے جارحانہ اقدامات کی بہ آسانی توجیہہ ہو سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جنگ سے اطالیہ کو اپنے مفاد کے متعلق بڑی بڑی اُمیدیں ہیں اور وہ قیام امن کے متعلق کسی کی نہیں سُنتا اور نہ اُن معاہدوں کی شرائط کا کچھ لحاظ کرتا ہے جو نامساعد حالات میں حبشہ کے متعلق کئے گئے تھے۔

سینیر مسولینی نے اعلان کیا ہے کہ "یہ ایک فیصلہ کُن گھڑی ہے۔ اطالوی قوم کو ایک زبردست جدّوجہد کرنی پڑے گی۔ جس کے بعد دُنیا میں اس کا اقتدار بہت بڑھ جائے گا"۔ ایک اور موقع پر مسولینی نے کہا کہ "اگر یورپ اب دُنیا میں اپنے مستعمرانہ فرائض انجام دینے کے قابل نہیں رہا تو اس کی تباہی کی گھڑی قریب آپہنچی ہے"۔

یہ اعلانات اطالوی مختار مطلق کی دماغی کیفیت کے آئینہ دار ہیں۔ ظاہر ہے کہ جنگ ضرور ہو گی۔ ۶ر جولائی کو مسولینی نے اعلان کیا تھا کہ "ہم نے ایک ایسی جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے جس میں ہم بحیثیت ایک حکومت اور ایک قوم کے کبھی پیٹھ نہیں دکھائیں گے۔ ہم اس کا فیصلہ کر چکے ہیں اور یہ فیصلہ کسی طرح بدل نہیں سکتا"۔

اطالیہ کی حکمتِ عملی صاف ظاہر ہے۔ وہ کسی ایسے فیصلے پر اظہار رضامندی نہیں کر سکتا جو اُس کے مطالبات کو پورا نہ کرے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ مطالبات کتنے شدید، کتنے غیر قرینِ قیاس اور کتنے ناقابلِ قبول ہوں۔ اطالیہ نے اپنے اقل ترین مطالبات پیش کر دیئے ہیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

(ا) اطالیہ کی زاید آبادی کے لئے نو آبادیاں قائم کرنے کے لئے جگہ کا مطالبہ۔

(ب) شمالی اور شمال مشرقی حبشہ کی مُبیّنہ معدنی دولت سے آزادانہ استفادہ کا مطالبہ۔

(ج) حبشہ کی بیرونی حکمت عملی پر اختیارات اور یورپ میں شہنشاہ کے نمایندوں کے تقرر کا حق۔

(د) عدیس ابابا میں اطالوی افسروں کے تقرر کا اختیار جنہیں ملک کے نظم و نسق کے متعلق ہر طرح کا اقتدار حاصل ہوگا۔

جمعیت اقوام یا کوئی اور ثالث فریق شہنشاہ حبشہ کی آزادی میں دخل دیئے بغیر یا ملک پر اُس کے شاہانہ اختیارات کو تسلیم کرتے ہوئے حبشہ کو ان شرائط کے ماننے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جنگ کے سوا تصفیہ کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی اور نہ اطالیہ سے اس کی خفیف سی توقع بھی رکھی جاسکتی ہے کہ وہ جنگ کے ارادے سے باز رہے گا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حبشہ بھی جنگ کی خواہش سے قطعاً بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ ابھی تک کسی غیر جانبدار طاقت نے یہ موازنہ نہیں کیا کہ دونوں ملک کس حد تک اس افسوسناک کشمکش کے لئے جوابدہ ہیں اور یہ بات ابھی پوری طرح تحقیق نہیں ہوئی کہ اہلِ حبشہ خلافِ خواہش جنگ پر مجبور کئے جارہے ہیں۔ بایں ہمہ اگر اس دوران میں حبشہ کے طرزِ عمل کا بغور معائنہ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حبشہ بہر حال جمعیت اقوام اور غیر جانبدار ملکوں کی کوشش سے کسی پُر امن تصفیہ پر پہنچنے کو جنگ پر ترجیح دیگا۔ حبشہ جنگ سے اس لئے گریزاں نہیں کہ وہ عسکری جرأت و عزیمت یا دفاعی قوت سے محروم ہے۔ حبشہ میدانِ جنگ میں دس لاکھ کی جرار فوج لاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ۲۱؍ اگست ۱۹۳۰ء کے معاہدے کی رو سے وہ اپنے تحفظ کے لئے اسلحہ و بارود کے ذخائر کی درآمد پر اب تک مقتدر ہے۔ حبشہ جنگ سے محض اس لئے بچتا ہے کہ اُسکو اُس "دائمی دوستداری" کے معاہدے کا احترام ہے جو ۲؍ اگست ۱۹۲۸ء کو حبشہ اور اطالیہ کے مابین ہؤا۔ اس معاہدے کے مطابق دونوں سلطنتیں اس بات پر مجبور ہیں کہ اپنے بین الملکی نزاعات کو فیصلہ کے لئے کسی ثالث کے سامنے پیش کریں۔ اہلِ حبشہ کو اپنے اس موثق عہد نامے کے احترام کا بہت خیال ہے اور قبل اس کے کہ وہ جنگ کے میدان میں کود پڑیں وہ قیام امن کے تمام ذرائع استعمال کر لینا چاہتے ہیں چنانچہ ولوال کے واقعے کے بعد فوراً ہی حبشہ کے وزیر نے اطالوی حکومت کو ایک یادداشت بھیجی کہ مناقشے کے وجوہ اور سرحدوں کی تعیین کا مسئلہ فیصلے کے لئے ثالثوں کے سامنے پیش کر دیا جائے اس کے ساتھ ہی جمعیت اقوام کو ایک بیان لکھکر بھیجا گیا جس میں اطالوی اقدام کی شکایت کی گئی اور اسے بین الاقوامی میثاق کی دوسری دفعہ کے ماتحت روک دینے کی درخواست کی گئی تھی۔ میثاق کے اس حصے کا مفاد حسب ذیل ہے:۔

"کوئی جنگ یا جنگ کی دھمکی خواہ وہ جمعیت اقوام کے کسی رکن کو براہ راست متاثر کرتی ہو یا نہ کرتی ہو جمعیت کے نزدیک پوری توجہ کی مستحق ہوگی اور وہ بین الاقوامی امن کے قیام کے لئے مناسب اقدامات عمل میں لائے گی۔ جب کوئی ایسا موقع پیدا ہوگا جمعیت اقوام کا معتمدِ عمومی جمعیت کے کسی رکن کی درخواست پر کونسل کا اجلاس طلب کرلے گا۔"

حبشہ نے ایک دوسری درخواست ۳؍ جولائی کو ممالک متحدہ امریکہ کو بھیجی اور اُسے معاہدۂ کیلگ بریاں کا واسطہ دیکر قیام امن کی درخواست کی یہ معاہدہ جس پر اطالیہ، حبشہ اور امریکہ نے مل کر دستخط کئے تھے۔ جنگ کے آئندہ امکانات کو مٹانے کے لئے استوار ہؤا تھا۔

اس ضمن میں راس تفاری نجاشی حبشہ کے دو اعلانات خصوصیت کے ساتھ اہم ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ حبشہ قیام امن کے دل سے خواہشمند ہیں اور یہ قابلِ تعریف خواہش اب تک اُن کے دل میں موجود ہے۔ ۱۴؍ فروری کو شہنشاہ راس تفاری نے اٹلی کے ساتھ اپنے ملک کے نازک تعلقات کا تذکرہ حسب ذیل الفاظ میں کیا:۔

"میں نہ دبتا ہوں اور نہ ڈرتا ہوں لیکن اطالوی حکومت نے حفظِ ماتقدم کے طور پر جو عساکر جمع کر لئے ہیں اُن کے خیال سے مجھے بہت رنج ہوتا ہے کیونکہ یہ طرزِ عمل اعتماد کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے والا ہے اور اس کی موجودگی میں لوگوں کے دل سے شکوک و شبہات کا دُور ہونا ممکن نہیں۔ لیکن یہ اقدام میرے دل سے ثالثانہ تصفیہ کے حصُول کے عزمِ راسخ کو مٹا کسی طرح نہیں سکتا میں جہاں تک جلد ممکن ہو جنیوا کے اُس تازہ ترین معاہدے کو معرضِ عمل میں لانا چاہتا ہوں جس کا مقصد یہ ہے کہ حبشہ اور اٹلی دونوں مِل کر مابہ النزاع مسائل کے فیصلے کے لئے از سرِ نَو کوئی ثالثی تصفیہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

جنیوا میں یہ فیصلہ ہُوا تھا کہ سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان ایک غیر جانبدار علاقہ مشخّص کیا جائے، میں ایک ایسے فیصلے کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہوں جو جرلوگوبی اور ولوال کے درمیان ایک ایسا علاقہ قائم کر دے۔ اس علاقے کی تعیین کے وقت ہماری طرف سے یہ سوال قطعاً پیش نہ ہوگا کہ ولوال جسے ہم حبش کا علاقہ قرار دیتے ہیں اُس کو آخری فیصلہ کس کی ملکیت قرار دے گا۔

اسی خیال سے میں نے ولوال کے علاقے کو اپنی فوجوں سے خالی کر دیا ہے اور اب جرلوگوبی میں صرف تین سو سپاہی محض دیدبانی کی غرض سے باقی رکھے ہیں۔ میرے ان احکام کی لفظ بہ لفظ تعمیل کی گئی ہے۔ یہ اطلاع کہ میری فوجوں نے افدوب پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا ہے بالکل بے بنیاد ہے۔

جمعیت اقوام کی کونسل کی خواہش یہ تھی کہ دونوں قوموں کی بلاواسطہ گفت و شنید ثالثانہ فیصلہ کے حصُول کی خواہش پر منتج ہو میری اور میری حکومت کی خواہش بھی یہی ہے اور ہم کسی دباؤ یا دھمکی سے متاثر ہو کر کوئی اور طریقہ اختیار کرنے پر مجبور نہ ہونگے"

ایک اور اعلان میں بھی شہنشاہِ حبشہ نے جنگ کے امکانات کی روک تھام کے لئے جمعیتِ اقوام پر اظہارِ اعتماد کیا شہنشاہ نے کہا:۔

"پُرامن تصفیے کی ہر کوشش کے علی الرغم اٹلی پے بہ پے اپنی دونوں نو آبادیوں میں افواج اور اسلحہ کے ذخائر جمع کر رہا ہے جنگ کا امکان روز بروز خوفناک صورت اختیار کر رہا ہے لیکن اب بھی ہماری اُمید جمعیتِ اقوام اور بالخصوص برطانیہ اور فرانس سے وابستہ ہے"

شہنشاہ نے اس کے ساتھ ہی یہ الفاظ بھی کہے:۔

"اگر قیامِ امن کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں اور شیطانی طاقت غالب آ گئی تو حبشہ اپنے شہنشاہ کی قیادت میں اُٹھ کر ملک کے تحفظ کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک گرا دے گا"

اِن حالات کے پیشِ نظر جنگ رُکنے کا کوئی اِمکان نظر نہیں آتا اور اگر آخری وقت اٹلی نے کوئی ثالثانہ فیصلہ منظور کر لیا تو یہ واقعہ ایک معجزے سے کم نہ ہوگا۔

وؔلی کے متعلق بعض غلط فہمیاں اور اُن کا ازالہ

شمالی ہند اور دکن کا کون ایسا تذکرہ نویس ہے جس نے وؔلی اورنگ آبادی کے حالات اور شاعری پر کچھ روشنی نہ ڈالی ہو۔ یورپ کے محققین نے بھی وؔلی کے تذکرہ میں بہت زیادہ دلچسپی لی ہے مگر ان سب باتوں کے باوجود وؔلی کے متعلق اعتراضات اور شکوک بڑھتے ہی جاتے ہیں۔

وؔلی کو سب سے پہلے اردو شاعری میں چاسرِ اردو کی، اور ہملٹن کا درجہ دینے والا اور اسے بڑی آب و تاب سے روشناس خلق کرانے والا آزاد ہے۔ علامہ موصوف کے بعد تحقیق و تلاش کا دروازہ کھلا، سب سے پہلے دکن آگے بڑھا۔ اور اپنی معلومات اور تحقیق و تلاش کی بدولت وؔلی سے دو صدی پہلے کے شعرا کو ڈھونڈ نکالا۔ اس کے بعد لوگ ہر طرف سے دوڑے اور تحقیق و تلاش کی دُنیا میں ایک عجیب تحیر خیز ہنگامہ پیدا ہو گیا۔ محققین نے اپنی تحقیق و تلاش کی دُھن میں بجائے ایک فیصلہ کن بات بتانے کے لوگوں کو اور گمراہ کر دیا۔ اور آج صرف وؔلی کے نام کے متعلق ہم اس قدر اختلاف دیکھتے ہیں کہ دماغ پریشان ہو جاتا ہے۔

ایک[1] جماعت ہے جو وؔلی کا نام شمس الدین بتاتی ہے۔ دوسری[2] ہے جو اسے ولی اللہ کہتی ہے، بعض اسے ولی الدین کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اور بعض اس کا نام محمد ولی سمجھتے ہیں۔ جناب[3] نصیر الدین ہاشمی اس پر مصر ہیں کہ اسے ولی محمد کہا جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے "ہندستانی" کی یہ رائے مجھے بہت زیادہ قابلِ قبول معلوم ہوتی ہے کہ اسے شمس ولی سمجھا جائے کیونکہ اس میں تمام اختلافات بھی کسی حد تک دُور ہو جاتے ہیں۔ یہ "بہت[4] ممکن ہے کہ شمس الدین لقب ہو اور اس طرح پورا نام شمس الدین ولی محمد ہو۔ اور اسی کا مخفف شمس ولی ہو گیا ہو"۔ اس طرح ہاشمی صاحب کی رائے بھی صحیح ہو جاتی ہے اور ان کے اس دعویٰ سے کہ "چونکہ ابوالمعالی کے بیٹے محمد تقی نے ولی محمد نام بتایا ہے اسلئے یہ ضرور صحیح ہے، کسی کو اختلاف نہیں ہوتا۔

وؔلی کے وطن کے متعلق بھی بہت زیادہ اختلاف ہے۔ نواب علی ابراہیم خاں، یوسف علی، قیام الدین قیامؔ، اور نواب شیفتہ

---

[1] رسالہ ہندستانی جنوری ۱۹۳۳ء۔

[2] میر حسن دہلوی، مرزا علی لطف، اور عبدالغفور خان نساخ وغیرہ کے نزدیک ان کا نام وؔلی اللہ ہے۔

[3] رسالہ ہندستانی جنوری ۱۹۳۳ء صفحہ ۲۔

[4] رسالہ ہندستانی جنوری ۱۹۳۳ء صفحہ ۲۔

نے ولی کو دکن کا باشندہ لکھا ہے۔ میر حسن دہلوی، عبد الغفور خان نساخ اور مولینا آزاد نے ولی کا وطن گجرات بتایا ہے۔ مگر اس کا کوئی معقول ثبوت ان لوگوں کے پاس نہیں ہے۔ مؤلف چمنستانِ شعرا نے بڑے یقین کے ساتھ میر حسن وغیرہ کی تردید کی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"مردمان نسبت او بہ گجرات دادند غلط محض است"

کلیات ولی میں مولینا احسن صاحب مارہروی نے ولی کے وطن کے متعلق جو اختلاف ہے اس پر ایک عالمانہ اور متبحرانہ شان سے بحث کی ہے اور آخر میں محققانہ دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ولی گجرات کا باشندہ نہیں ہو سکتا بلکہ دکن ہی اس کا اصلی وطن تھا[1]۔ مولینا کی تحقیقات اس بارے میں بہت مدلل اور فیصلہ کن ہے اور یقیناً اس اختلاف کو مٹانے کیلئے کافی ہے۔

مؤلف "تذکرہ شعرائے دکن" نے بھی ولی کو اورنگ آبادی ہی ثابت کیا ہے اور خود ان کے لب ولہجہ سے اس کی سند بہم پہنچائی ہے۔ مجھے اس کا یہاں موقع نہیں کہ میں ان کا اعادہ کروں کیونکہ اس میں طوالت ہے۔ لیکن خود ولی کے تین اشعار جو اس کے دکنی ہونے پر شاہد ہیں مؤلف تذکرہ شعرائے دکن کے حوالہ سے نقل کرنے میں کوئی حرج نہیں دیکھتا۔ اشعار ہیں:۔

دکھ کی شمع سوں روشن ہے ہفت اقلیم کی مجلس ٭ ولی پروانگی کرتا تری ملکِ دکھن بہتر

ولی توران و ایران میں ہے مشہور ٭ اگرچہ شاعرِ ملکِ دکھن ہے

دکھنی زباں میں شعر سب لوگاں کہتے ہیں اے ولی ٭ لیکن نہیں بولا ہے کوئی یک شعر خوش شیریں نمط

ان شواہد کے باوجود کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ولی کو دکن کا باشندہ نہ تسلیم کیا جائے۔

ولی خاندان مشائخ قادریہ میں سے تھے۔ مؤلف "دکن میں اردو" نے ان کا سنِ ولادت ۱۰۸۰ ہجری بتایا ہے مگر کوئی حوالہ نہیں دیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد بیس برس کے سن میں تحصیل علم کے لئے بہ گجرات روانہ ہوئے۔ کچھ دنوں تک وہاں شیخ وجیہ الدین کی درگاہ میں رہ کر تحصیل علم کرتے رہے۔ وہیں اس خاندان کے ایک سجادہ نشین کے ہاتھ پر طریقۂ قادریہ شطاریہ میں بیعت کی۔ مؤلف "اردوئے قدیم" نے لچھمی نارائن شفیق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ولی گجرات سے سورت گئے اور وہاں سے حج کے لئے روانہ ہوئے۔ حج سے واپس آنے کے بعد احمد آباد میں ۱۱۴۳ھ میں فوت ہوئے۔ "مزار ولی گنبد" میں دریا خان کے گنبد کے قریب دفن کئے گئے۔

---

[1] دیکھو کلیاتِ ولی (مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد) صفحہ ۱۵ و صفحہ ۱۶۔

سن وفات کے متعلق تذکرہ نویسوں کا اختلاف ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں سن وفات ۱۱۰۱ھ لکھا ہے۔ مؤلف تذکرہ شعرائے دکن نے ۱۱۵۵ھ تحریر کیا ہے۔ مؤلف "اردوئے قدیم" کو اس پر یقین ہے کہ سن وفات ۱۱۵۵ھ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انہوں نے دیوان ولی کا ایک قلمی نسخہ دیکھا ہے جو ۵ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۲ھ میں بمقام احمد آباد مکتوب ہوا ہے، اور بقول ان کے اس کے خاتمہ پر "تمام شد دیوان ولی رحمتہ اللہ علیہ" تحریر ہے لیکن مؤلف موصوف اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتے۔ اور سن وفات کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں دیتے۔ اس کے لئے مجھے مؤلف "اردو شہ پارے" کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ وہ تحقیق و تلاش کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ولی کا سن وفات ۱۱۴۳ھ قرار دیا جائے۔ میرے خیال میں یہ تحقیق ان کی صحیح ہے اور کم از کم کسی دوسری قابل اعتماد تحقیقات تک اس کا ماننا ضروری ہے۔

ولی کے متعلق یہ تو سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے دہلی کا بھی سفر کیا تھا لیکن یہ سفر کس عہد میں پیش آیا تھا اس میں اختلاف ہے، علامہ آزاد، مصنف گل رعنا[1] اور مؤلف "تذکرہ شعرائے دکن"[2] اس کو عہد محمد شاہ کا واقعہ بتاتے ہیں۔ برخلاف اس کے میر حسن دہلوی، نواب علی ابراہیم خان، اور عبد الغفور خان نساخ وغیرہ اس پر متفق ہیں کہ ولی عالمگیر کے عہد میں دہلی آیا تھا۔ میر تقی کا ولی کے دہلی آنے کے بارہ میں یہ بیان ہے :۔

"(ولی) در شاہجہان آباد دہلی نیز آمدہ بود و بخدمت میاں گلشن رفت و از اشعار خود پارۂ خواند۔ میاں صاحب فرمودند، این ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ بکار ببر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت"!

مؤلف اردوئے قدیم کو علامہ آزاد اور مصنف گل رعنا وغیرہ سے سخت اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک ولی عالمگیر کے عہد میں دہلی آیا تھا۔ وہ اس بارہ میں اس حد تک مصر ہیں کہ اس نے اختلاف کے جوش میں مؤلف گل رعنا کی کسی دلیل کو قابل اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ لکھتے ہیں :۔

"مولینا آزاد اور مصنف گل رعنا اس کو (ولی کے دہلی آنے کو) عہد محمد شاہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں اس کی کوئی سند نہیں"[3]۔

میرے خیال میں مؤلف اردوئے قدیم کی یہ زیادتی ہے۔ حکیم عبد الحیٔ صاحب اپنے دعوے کے ثبوت میں بہت ہی قوی دلیل رکھتے ہیں۔ وہ خود ولی کا ایک شعر پیش کرتے ہیں جس سے ان کے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ مؤلف گل رعنا لکھتے ہیں :۔

"ولی محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں دہلی آئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں ان کا جی لگ گیا تھا۔ چنانچہ اپنی ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

---

[1] گل رعنا صفحہ ۹۸ [2] تذکرہ شعرائے دکن صفحہ ۱۱۳۱ [3] اردوئے قدیم صفحہ ۹۷

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین ⁂ جا کہو کوئی محمد شاہ سوں"

ان تمام اختلافات کو دُور کر دینے کے لئے ہمیں یورپ کے محققین کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد سارا اختلاف دُور ہو جاتا ہے۔ اور ہم بہت جلد ایک صحیح نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ بلوم ہارٹ ولی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"ولی دکھنی جن کا نام شاہ ولی اللہ تھا . . . . . ابوالمعالی کے ساتھ اورنگ زیب کے عہد میں دہلی گئے۔ یہاں سعداللہ گلشن سے ملاقات کی۔ پہلی مرتبہ فارسی کے بجائے ریختہ نظم لکھی۔ کچھ عرصہ بعد اپنے دیوان کے ساتھ وطن کو واپس ہوئے۔ اس کے بعد محمد شاہ کے عہد میں (۱۱۳۴ھ / ۱۷۲۲ء) پھر دہلی گئے جہاں ان کے اردو کلام کی بڑی تعریف ہوئی"۔

اس بیان سے ہمیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ ولی دو مرتبہ دہلی آئے تھے۔ ایک بار عالمگیر کے سامنے اور دوسری بار محمد شاہ کے عہد میں۔ اور اسی دوسرے سفر میں بقول مؤلف تذکرہ شعرائے دکن ولی کے دیوان کی بہت زیادہ قدر ہوئی اور دہلی کے ہر کوچہ و بازار میں ولی کی غزلوں کے چرچے ہونے لگے۔

ولی نے قدیم شعرائے دکن کی طرح مثنوی پر اپنا زیادہ وقت نہیں ضائع کیا۔ ان کی طبیعت زیادہ تر غزلوں کی طرف رجوع تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف میں مثنویاں صرف دو تین ہی پائی جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے غزلیات کا بہت زیادہ حصہ ہے۔ غزلوں کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن قصیدہ، ترجیع بند، مسدس، رباعی وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اور بہت زیادہ حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

مولینا آزاد، اور مصنف گل رعنا کا بیان ہے کہ ولی نے ایک رسالہ نورالمعرفت بھی لکھا ہے لیکن آج کل چونکہ وہ بالکل ناپید ہے اس لئے اس کے متعلق کوئی خاص رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔

جامع کلیات ولی حضرت احسن مارہروی نے ولی کی مثنویوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مثنوی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ "دہ مجلس" کا ابتدائی حصہ ہے۔ مؤلف تذکرہ شعرائے دکن اور حکیم عبدالحی صاحب کو بھی بالکل اسی طرح ایک جگہ دھوکا ہوا ہے ان لوگوں نے روضۃ الشہدا کو جو دراصل ولی ویلوری کی تصنیف ہے اور جس کو ترتیب کے لحاظ سے "دہ مجلس" بھی کہا جا سکتا ہے ولی اورنگ آبادی کی تصنیف بتایا ہے۔ کیا عجب کہ وہ "دہ مجلس" جس کو مولینا نے ولی اورنگ آبادی سے منسوب کیا ہے وہ دراصل ولی ویلوری کی روضۃ الشہدا ہی ہو۔ کیونکہ کلیات ولی میں جو "دہ مجلس" (ولی اورنگ آبادی) کے خاتمہ کا شعر نقل کیا گیا ہے وہ اس طرح ہے:۔

"ہؤا ہے ختم جب یو درد کا حال ⁂ گیارہ سو پر تھا اکتیسواں سال"

روضۃ الشہدا، (ولی ویلوری) کے خاتمہ کا شعر بھی قریب قریب بالکل اسی طرح ہے :- ؎

"کیا ہوں ختم جب یو درد کا حال ⁂ گیارہ سو اوپر تھا تیسواں سال"

بہت ممکن ہے کاتب کے معمولی سہو سے اتنا بڑا فرق پیدا ہو گیا ہو۔ ولی اورنگ آبادی کی "دہ مجلس" کے وجود میں مجھے اس لئے بھی بہت زیادہ شبہ ہے کہ ولی کے جتنے دیوان دیکھے گئے ہیں ان میں صرف دو ہی مثنویاں پائی گئی ہیں۔ اگر ایک مثنوی اس کے "دہ مجلس" کا ابتدائی حصّہ ہوتا تو یقیناً اس کے کسی دیوان میں ضرور اس کے آخر کا یا درمیانی حصّہ ملتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے، ہر دیوان میں اسی قدر حصّہ پایا جاتا ہے اور یہ تعجب خیز ہے۔ آخر دُنیا میں ہر جگہ اس کے ایک ہی دیوان سے تو لوگوں نے نقل نہیں کیا ہوگا۔ انڈیا آفس، برٹش میوزیم، کیمبرج یونیورسٹی کے تمام نسخوں میں اس کی مثنوی کا صرف اس قدر حصّہ پایا جاتا ہے۔ اور اس سے کم از کم یہ تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ولی نے اسی قدر اس مثنوی کے متعلق کہا تھا۔ اب یہ اختیار ہے کہ اسے جس نام سے چاہئے موسوم کیجئے۔

آخر میں ولی کے چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل کئے جاتے ہیں :- ؎

یہ تل تجھ مکھ کے کعبہ میں مجھے اسود حجر دستا ⁂ زنخداں میں ترے مجھ چاہِ زمزم کا اثر دستا

مت جا چمن میں لالہ بلبل پہ مت ستم کر ⁂ گرمی سوں تجھ نگہ کی گل گل گلاب ہوئیگا

مجھ کوں ہؤا ہے معلوم اے مست جام خونیں ⁂ تجھ انکھڑیاں کے دیکھے عالم خراب ہوئیگا

اے ولی غیر آستانۂ یار ⁂ جبہ سائی نہ کر خدا سوں ڈر

کہاں ہے آج یا رب جلوۂ مستانۂ ساقی ⁂ کہ دل سے تاب جی سے صبر سر سے ہوش لے جاوے

گر ہؤا ہے طالب آزادگی ⁂ بند مت ہو سبحہ و زنّار کا

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی ⁂ دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

مت تصوّر کرو مجھ دل کو کہ ہرجائی ہے ⁂ چمنِ حسن پریرو کا تماشائی ہے

اے ولی رہنے کو دنیا میں مقامِ عاشق ⁂ کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

کارِ عاشق تو راست بازی ہے ⁂ کج نکو کر سجن تو ابرو کوں

گیسوئے تابدار دلبر کا ⁂ دام ہے میرے دل کے آہو کوں

دلِ عُشّاق بند ہوتے ہیں ⁂ جب وہ کھولے اپس کے گیسو کوں

معین الدین دردائی

غزل

فرقت میں حالتِ دلِ ویراں نہ پوچھیے — تقدیر نے کیا ہے جو احساں نہ پوچھیے

جس دن ہوا تھا کوچ دیارِ حبیب سے — میں کس قدر تھا بے سروساماں نہ پوچھیے

بگڑے ہوئے نصیب کی آندھی کے سامنے — کیونکر چراغ تھا تہِ داماں نہ پوچھیے

یارانِ بزم، صبحِ وطن سی عزیز شئے — کیونکر بنی ہے شامِ غریباں نہ پوچھیے

سینے کو چھوڑ کر جو دھڑکتا ہو سانس میں — اُس دل سے حالِ جُنبشِ مژگاں نہ پوچھیے

جس نیم جاں مریض کی ہونٹوں پہ جان ہو — اُس سے حکایتِ لبِ جاناں نہ پوچھیے

مرگِ طویل نزع ہو جس شخص کی حیات — اُس سے رموزِ چشمۂ حیواں نہ پوچھیے

ڈر ہے عروسِ وقت کی نبضیں نہ چھوٹ جائیں — شرحِ درازیِ شبِ ہجراں نہ پوچھیے

ڈالا ہے لا کے جس نے یہاں اس عذاب میں — کیا اب بھی اُس خدا پہ ہے ایماں نہ پوچھیے

ہنگامۂ وداع میں دوشِ نگار پر — کیوں کھل پڑی تھی زلفِ پریشاں نہ پوچھیے

وقتِ فراق کاکلِ برہم کی چھاؤں میں — افسردگیِ چہرۂ تاباں نہ پوچھیے

اُس نازنیں کے جذبۂ بے اختیار سے — کیونکر حیا تھی دست و گریباں نہ پوچھیے

افشائے رازِ عشق و محبت کے خوف سے — اُن انکھڑیوں کا گریۂ پنہاں نہ پوچھیے

وقتِ سفر چھڑی تھی جو اک لمحہ پیشتر — وہ داستانِ دیدۂ جاناں نہ پوچھیے

آشفتگیِ روحِ زلیخا کا واسطہ — کیا شئے تھی آخری شبِ زنداں نہ پوچھیے

شرمندہ ہو نہ جائے کہیں رحمتِ خدا — اُس بُت کا التفاتِ فراواں نہ پوچھیے

اِس غم میں بھی ہے جس سے بقیدِ حیات جوش
اُس شوخ کا وہ عہد وہ پیماں نہ پوچھیے

جوش ملیح آبادی

ریڈیم

ریڈیم (Radium) ایک قسم کی دھات ہے۔ چونکہ یہ اپنے جسم سے خاص قسم کی شعاعیں خارج کرتی ہے اس لئے اس
م ریڈیم بمعنی مُشعِع یا لامع رکھا گیا۔ چنانچہ یہ نام اسم بامسمّٰے ہے۔ اس کا رنگ چاندی کے مانند سفید چمکدار ہوتا ہے۔
مادام کیوری (Madame Curie) نے اس دھات کے نمکوں[1] یعنی (Salts) کو معدنی یورینیئم آکسائیڈ
(Native Uranium Oxi) یا پچ بلنڈ (Pitch - Blende) سے ۱۸۹۸ء میں سب سے پہلے حاصل
بعد ازاں ۱۹۱۱ء میں ان نمکوں سے ریڈیم نکالا گیا۔

عام طور پر ریڈیم سلفیٹ (Radium-Sulphate)، ریڈیم کلورائیڈ (Radium Chloride) اور ریڈیم برومائیڈ
(Radium Bromi) جو ریڈیم کے نمک ہیں اور اسی کے مانند شعاعیں خارج کرتے ہیں ریڈیم کے بجائے سرجری یا
ی میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ اول الذکر پانی میں حل نہیں ہوتا۔ مؤخر الذکر نمک پانی میں حل ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی
یں ہیں پہلی وہ جس میں پانی کی آمیزش ہوتی ہے۔ اُسے ہائیڈریٹڈ (Hydrated) کہتے ہیں۔ دوسری وہ جس
پانی کی آمیزش نہیں ہوتی اُسے این ہائیڈرس (Anhydrous) کہتے ہیں۔ ان نمکوں میں ریڈیم کی مقدار حسب
ہوتی ہے:-

ریڈیم سلفیٹ	۲ر۷۰	فی صدی
این ہائیڈرس ریڈیم کلورائیڈ	۱ر۷۶	" "
ہائیڈریٹڈ ریڈیم کلورائیڈ	۹ر۶۷	" "
این ہائیڈرس ریڈیم برومائیڈ	۶ر۵۸	" "
ہائیڈریٹڈ ریڈیم برومائیڈ	۶ر۵۳	" "

ان نمکوں کے استعمال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پلاٹینم (Platinum) دھات میں ۱۰ فیصدی اریڈیم[2] (Iridium)

---

[1] دھات اور تیزاب کے مرکب کو نمک یا سالٹ کہتے ہیں۔ ایک ہی دھات کو اگر مختلف تیزابوں میں علیحدہ علیحدہ حل کیا جائے تو مختلف نمک حاصل ہونگے چنانچہ ریڈیم کلورائیڈ ریڈیم اور نمک طعام کے تیزاب کا مرکب ہے۔ ریڈیم سلفیٹ، ریڈیم اور گندھک کے تیزاب کا مرکب ہے علیٰ ہذا القیاس۔

[2] یہ بھی ایک دھات ہے۔

ملاکر (تاکہ اوّل الذکر زیادہ سخت اور پائدار ہو جائے) اُس کی مطلوبہ لمبائی اور موٹائی کی سوئیاں (needles) سلائیاں یا نلیاں تیار کر لی جاتی ہیں - یہ سوئیاں وغیرہ اندر سے خالی ہوتی ہیں اور اُن کی دیوار کی موٹائی تقریباً نصف ملی میٹر یا ایک انچ کے پچاسویں حصّہ کے برابر ہوتی ہے - ان کے اندر ریڈیم کا کوئی سا نمک خصوصاً ریڈیم سلفیٹ جو پانی میں حل نہیں ہوتا بھر دیا جاتا ہے پھر انہیں اچھی طرح جھال لگاکر بند کر دیا جاتا ہے اور سوئیوں کے ایک سرے پر ناکہ بنا دیا جاتا ہے۔ جس مقام پر ریڈیم کا اثر درکار ہوتا ہے وہاں مطلوبہ مقدارِ خوراک کی سوئیاں چبھوکر خاص طریقہ پر داخل کر دی جاتی ہیں - اور جب اُن کا نکالنا مقصود ہوتا ہے تو سوئیوں کے ڈوروں کو جو ناکے میں پڑے ہوئے ہوتے ہیں پکڑ کر باہر کھینچ لیا جاتا ہے - اس کے علاوہ اِن سوئیوں اور نلیوں کے مختلف مقامات پر لگانے کے مختلف طریقے ہیں جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں -

ریڈیم کا اثر دراصل اُس کی شعاعوں پر منحصر ہے۔ چنانچہ تین قسم کی شعاعیں (Rays) اُس میں سے خارج ہوتی ہیں پہلی قسم کی شعاعوں کو ایلفا ریز (a Rays) کہتے ہیں - اِن کی ولوسٹی (Velocity) یا رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ سے ۵۵۸ میل فی سیکنڈ تک ہے - اور طاقتِ نفوذ (Penetrating Power) بہت ہی کم ہے - یعنی یہ اس قدر کمزور ہیں کہ معمولی کاغذ کی موٹائی میں سے بھی بآسانی نہیں گزر سکتیں - اس سے صاف ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا سوئیوں کی دیوار کی موٹائی ان شعاعوں کو باہر نکلنے سے محفوظ رکھتی ہے - اور جسم پر ان کا کوئی اثر نہیں ہونے پاتا -

دوسری قسم کی شعاعوں کو بیٹا ریز (B Rays) کہتے ہیں - اِن کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ ہے - جو تقریباً معمولی روشنی کی شعاعوں کی رفتار کے برابر ہے - اِن کی طاقتِ نفوذ ایلفا ریز سے تقریباً سَو گُنا زیادہ ہے - یعنی یہ کسی دھات کی پتلی سطح کو بآسانی عبور کر سکتی ہیں - جسم پر اِن کا اثر بہت مہلک ہوتا ہے یعنی جو حصّۂ جسم ان کے زیرِ اثر ہو وہ گل سڑ کر مردہ ہو جاتا ہے - اس لئے ان شعاعوں کو باہر نکلنے سے محفوظ رکھنے کیلئے سوئیوں یا نلیوں کی موٹائی اس قدر رکھی جاتی ہے کہ یہ شعاعیں باہر نہ نکل سکیں اور جسم کو کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں -

تیسری قسم کی شعاعوں کو گاما ریز (Y Rays) کہتے ہیں - یہ شعاعیں ایکس ریز[1] (X Rays) اور اُلٹرا وائلیٹ ریز (Ultraviolet Rays) کے مشابہ ہیں - ان کی رفتار روشنی کی شعاعوں کی رفتار کے برابر ہے - لیکن ان کی لہر کی لمبائی[2] (Wave Length) ایکس ریز کی لہر کی لمبائی سے بہت کم ہے - اسی تناسب سے ان کی طاقتِ نفوذ ایکس ریز سے بہت زیادہ ہے - کیونکہ کسی شعاع کی لہر کی لمبائی جتنی کم ہو اُتنی ہی اُس کی طاقتِ نفوذ زیادہ ہوتی ہے - اِن شعاعوں کی اہم خاصیت

---

[1] یہ بھی ایک قسم کی شعاعیں ہیں ان کا ترجمہ عکس ریز کیا گیا ہے -

[2] ایک شعاع میں متعدد لہریں ہوتی ہیں اور ہر قسم کی شعاع کی لہر کی لمبائی مختلف ہوتی ہے -

یہ ہے کہ یہ جسم کے مُہلک پھوڑوں (Malignant Tumours) مثلاً سرطان یا (cancer) کینسر وغیرہ کو جلا کر خشک کر دیتی ہیں اور تندرست حصّۂ جسم پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ جتنی ان شعاعوں کی لہر کی لمبائی کم ہوگی اتنی ہی یہ زیادہ مؤثر ہوں گی۔ چنانچہ اگر سوئیوں کی دیوار کی موٹائی بجائے نصف ملی میٹر کے کچھ زیادہ ہو تو زیادہ لمبی لہر کی شعاعیں طاقتِ نفوذ کم رکھنے کے باعث ان سوئیوں کی موٹی دیوار کو عبور کرنے سے قاصر رہیں گی۔ برخلاف اس کے کم لمبی لہر والی شعاعیں طاقتِ نفوذ زیادہ رکھنے کے باعث موٹی دیوار کو آسانی سے عبور کر لیں گی اور سرطان وغیرہ کو بہت جلد خشک کر دیں گی۔

مذکورہ بالا ریڈیم کے مرکبات کی بجائے ایک قسم کی شعاعی گیس جسے ریڈن (Radon) کہتے ہیں استعمال کی جا سکتی ہے۔ یہ گیس پیا ہوا ریڈیم کے کسی حل ہونے والے نمک (ریڈیم کلورائیڈ یا ریڈیم برومائیڈ) کو ایسی ڈولیٹ ڈ واٹر (Acidulated water) (وہ پانی جس میں کچھ تیزاب ملا دیا گیا ہو) میں ملانے سے حاصل ہوتی ہے اسے جمع کر کے صاف کر لیا جاتا ہے اور پلاٹینم (Platinum) کی سُوئیوں یا نلیوں میں بھر کر حسبِ معمول استعمال کی جاتی ہے۔ یہ بھی اُسی قسم کی شعاعیں خارج کرتی ہے جو ریڈیم سے برآمد ہوتی ہیں۔ اس کے بنانے میں ریڈیم کی کافی مقدار صرف ہوتی ہے اور ریڈیم کا نمک اس گیس کو خارج کرنے کے بعد بیکار ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں گیس کی طاقت تھوڑے ہی عرصہ میں بہت کم ہو جاتی ہے۔ ریڈیم بھی وزن میں گھٹتا رہتا ہے لیکن بہت آہستہ۔ چنانچہ تقریباً ۱۶۹۰ سال بعد یہ اپنی موجودہ مقدار سے نصف حصّہ رہ جائے گا۔ اس کے برخلاف ریڈن گیس ریڈیم سے خارج ہونے کے چار روز بعد اپنی نصف طاقت زائل کر دیتی ہے۔ لہٰذا یہ زیادہ عرصہ تک یکساں قوت کے ساتھ استعمال نہیں کی جا سکتی۔ اور اس وجہ سے زیادہ کارآمد نہیں ہے۔

ریڈیم کے دریافت ہونے سے قبل سرطان یا کینسر (Cancer) وغیرہ کا علاج صرف عمل جراحی (Surgical-Operation) سے کیا جاتا تھا[1]۔ اس قسم کے پھوڑوں (Tumours) کو ایک وسیع تندرست حصّۂ جسم کے ساتھ جدا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ وہ دوبارہ نکل آتے ہیں اور علاج بیکار ثابت ہوتا ہے۔ اس عمل سے اموات کثرت سے واقع ہوتی ہیں لیکن شفایاب ہونے کے بعد عموماً مرض دوبارہ پیدا نہیں ہوتا۔

ریڈیم دریافت ہونے کے بعد یہ دقتیں کسی حد تک رفع ہو گئی ہیں۔ مثلاً آپریشن (Operation) وسیع کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ بلکہ صرف جس مقام پر پھوڑا ہو وہاں سوئیاں داخل کرنی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس طریقۂ علاج سے اموات

---

[1] اب بھی جہاں ریڈیم میسر نہیں ہے۔ اسی عمل سے علاج کیا جاتا ہے۔

کم واقع ہوتی ہیں ۔

اس امر کا فیصلہ کہ قدیم عمل جرّاحی یا جدید علاج ریڈیم دونوں میں سے کونسا علاج زیادہ کامیاب[1] ثابت ہوتا ہے ۔ فی الحال نہیں کہا جاسکتا ۔ کیونکہ ریڈیم سے ابھی اس قدر تجربات حاصل نہیں ہوئے جتنے کہ آپریشن سے ہو چکے ہیں ۔ جب ریڈیم کے استعمال کو بھی کافی زمانہ گذر جائے گا تو دونوں قسم کے علاجوں کا مقابلہ صحیح طور پر ہو سکے گا کہ کونسا علاج زیادہ کامیاب اور مؤثر ہے ۔

عتیق الرحمن احمد پانی

[1] کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ مرض دوبارہ پیدا نہ ہو اور اموات بکثرت نہ ہوں ۔

احساس

میں کبھی محرمِ اُلفت ہی نہ ہوتا اے کاش! تجھے ہونا تھا جو بیگانۂ اُلفت اے دوست!
کبھی آغازِ محبت ہی نہ ہوتا! — اے کاش! یہی ہونا تھا جو انجامِ محبت اے دوست!

ہر کلی گلکدۂ دہر میں کھِل سکتی ہے! دلِ پژمردۂ جذبات نہیں کھِل سکتا!
عشرتِ گمشدۂ خُلد تو مِل سکتی ہے!! اے محبت! ترا آغاز نہیں مِل سکتا!

ہے وہ دل معتکفِ غمکدۂ تنہائی جس کے آغوش میں تھی انجمن ناز کبھی
اب وہ ناشاد ہے افتادۂ غم پیمائی لغزشِ پا تھی، جسے عشرتِ پرواز کبھی

کوئی بھولے سے جو کر دیتا ہے ذکرِ اُلفت غیر ہو جاتی ہے حالت دلِ افسردہ کی
یاد بھی جس کو نہ ہو، خوابِ شمیم و نکہت ہائے کیا زیست ہے اس غنچۂ پژمردہ کی

نغمۂ عشق جو ہوتا ہے کبھی محرمِ گوش روح غم شدتِ احساس سے تھرّاتی ہے
دیکھا جاتا نہیں جذبات کا خالی آغوش آہ! حسرت کدۂ دل سے نکل آتی ہے

زیست اس طرح ہوئی جاتی ہے بیگانۂ شوق زندگی جیسے سزاوارِ محبت ہی نہ تھی

میں کہاں محرمِ اسرارِ صنمخانۂ شوق
میرے آئینۂ دل میں کوئی صُورت ہی نہ تھی

آنکھ ملتی نہیں شمعِ شبِ تنہائی سے!
یاد آجاتی ہے خاکسترِ پروانۂ دل
رنگ اُڑتا ہے جو تصویرِ شکیبائی سے!
اُبھر آتی ہے وہیں سُرخیٔ افسانۂ دل

ہم عناں نکہتِ گل کو جو کبھی پاتا ہوں
کھینچتی ہے کوئی زنجیر گلستاں کی طرف
خوابِ ماضی کے تصوّر سے لرز جاتا ہوں
ہاتھ رہ جاتا ہے اُٹھ اُٹھ کے گریباں کی طرف

وہی ہوگا شبِ مہتاب کا اندازِ جمال
مگر اب، آہ وہ جشنِ شبِ مہتاب کہاں؟
اب تو ویران ہے تاریک ہے ایوانِ خیال
کھو گئے آہ! وہ فردوس کا خواب کہاں

دَورِ بزمِ مہ و انجم تو وہی ہے شاید!
تجھے اے محفلِ جذبات کہاں سے لاؤں
سازِ احساس تو بیدار ابھی ہے شاید!
خوابِ پروردۂ نغمات کہاں سے لاؤں

توڑ کر سلسلۂ کشمکشِ حزن و ملال
چاہتا ہوں کہ حدِ غم سے گزر جاؤں میں
ہے ابھرنے ہی کو داغِ غمِ حرمانِ وصال
اب تقاضائے محبت ہے کہ مر جاؤں میں!

آہ! اے دوست جو یہ بھی تجھے منظور نہیں
تو مرے غم کو ہم آغوشِ مسرت کر دے
یہ بھی ممکن اگر اے صاحبِ مقدور نہیں
تو مجھے غافلِ احساسِ محبت کر دے

روش صدیقی

ایران اور فنِ تمثیل

یہ عجیب بات ہے کہ بعض چیزیں اپنے ایسے جانی دشمنوں کے طفیل معرضِ وجود میں آئیں جو اُن کو کبھی ایک آنکھ دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ اور طرفہ یہ کہ ان کا چراغِ ہستی گل کرنے کی جتنی تدبیریں کی گئیں وہ ان کے فروغ کا باعث بنیں۔ فنِ تمثیل کا شمار بھی ایسی چیزوں میں ہے جنہوں نے اپنے معاندین ہی کے زیرِ سایہ نشو ونما پائی۔ مذہب نے اس پر کیا کچھ جبر و تشدّد نہیں کیا۔ مذہبی پیشواؤں نے اس کو مٹانے کی کیا کیا صُورتیں نہیں اختیار کیں مگر فنِ تمثیل نے ہر ملک میں مذہبی بارگاہ ہی میں جنم لیا، اور مذہب کے مقدس ہاتھوں سے پرورش پا کر پھلا پھُولا۔ بلادِ اسلام بالخصوص ایران اور عرب نے اس طرف بھُول کر بھی توجہ نہ کی۔ لیکن آخر کار وہاں بھی فنِ تمثیل نے مذہب کی گود میں آنکھ کھولی اور وہی اس کا گہوارہ بنا۔ کربلائے معلّیٰ کا واقعہ اسلامی دُنیا میں غیر معمولی حیثیت رکھتا ہے۔ اس حادثۂ ہائلہ نے مسلمانوں کے دلوں میں ایک مستقل ہیجان پیدا کر دیا۔ غم و اندوہ کا طوفان برپا کر دیا۔ چنانچہ اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ماہ محرم کے پہلے عشرہ میں مجالسِ عزا منعقد ہوتی ہیں۔ جو کسی خاص اسلامی ملک کے ساتھ مخصوص نہیں۔ مسلمان کہیں مرثیہ خوانی کرتے ہیں، کہیں غریبوں کو کھانا کھلاتے ہیں، مسافروں، پیاسوں کو شربت پلاتے ہیں۔ ایران کے مسلمان اس کی بہترین یادگار رسمِ تعزیہ تصوّر کرتے ہیں اور اسی کو سعادتِ دارین سمجھتے ہیں۔ اس رسم کی ابتدا ۳۵۲ھ میں اس طرح ہوئی کہ معز الدولہ احمد بن بویہ نے حکم دیا کہ اوّل عشرۂ محرم میں بغداد کے تمام بازار بند رہیں۔ لوگ سیاہ لباس پہنیں اور حضرت سید الشہداء رضہ کا تعزیہ بنایا جائے۔ اگرچہ اس کی مخالفت ہوئی۔ مگر شاہی فرمان کی مخالفت کی تاب کون لا سکتا تھا؛ یہاں تک کہ شاہانِ ویالمہ (آلِ بویہ) کے دورانِ حکومت میں تعزیہ داری کی رسم عام ہو گئی۔ سولہویں صدی عیسوی میں سلاطینِ صفوی کے عہدِ حکومت میں اس کی کافی ترقی ہوئی، جس نے بتدریج اُنیسویں صدی عیسوی میں "مجالسِ تعزیہ" کی صُورت اختیار کی۔ یہ مجالس تعزیہ نثر اور نظم دونوں میں ہوتی تھیں۔ ایک شخص نہایت پُر درد، شیریں اور درد انگیز لہجہ میں پڑھتا تھا۔ نثر کو تحت اللفظ اور نظم کو ساز کے ساتھ گا کر ادا کرتے تھے۔ مجالسِ تعزیہ پڑھنے والوں کو روضہ خوان کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ شدہ شدہ شاہ طہماسپ اور شاہِ عباسِ اوّل نے شعراء کو حکم دیا کہ وہ سلاطین کی مداحی کے بجائے سید الشہداءؑ و ائمۂ عظام رضہ کے فضائل و مناقب نظم کیا کریں، چنانچہ مُلا محتشم کاشی نے ایک بے نظیر مرثیہ کہا، جس کو شہرتِ دوام کا خلعتِ فاخرہ نصیب ہُوا۔ اس طرح شعراء مرثیہ کہتے اور روضہ خوان پڑھ کر سُناتے۔ گویا اس طرح تمثیل انفرادی کی تکمیل ہوئی، یا

یوں سمجھئے کہ قریب قریب یوروپی ممالک کے مرلزلاگ کا چربہ تھا، جو مذہب نے اتارا۔ اس قسم کی نظمیں تو بہت سی ہیں مگر ملا حسین واعظ کی روضۃ الشہدار اور اسمٰعیل خان کی طوفان البکار، اور اسرارِ شہادت زیادہ مشہور رہیں۔

اب شعرار کی توجہ اس طرف منعطف ہوئی کہ کسی طرح ان منظوم مرثیوں کو زیادہ مؤثر بنایا جائے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہی مرثیے منظوم تمثیلوں کے قالب میں ڈھلنے لگے۔ اس قسم کی مرثیہ گوئی میں محتشم، وصال، بیدل، مقبل، مخلص، شفیعی، نسیم اور قاآنی زیادہ مشہور رہیں۔ قاآنی کے ایک مشہور مرثیہ کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو:-

بارد چہ؟ خون، کہ؟ دیدہ، چسان؟ روز و شب، چرا؟
کیا برساتا ہے؟ خون، کون؟ آنکھ، کب؟ رات دن، کیوں؟
از غم، کدام غم؟ غمِ سلطانِ اولیا،
غم کی وجہ سے، کس کا غم؟ سلطان اولیار کا غم . . . .
نامش چہ بُد؟ حسینؑ، نژادِ کہ؟ از علی رضؓ
ان کا اسم مبارک؟ حسینؑ کس کی اولاد؟ حضرت علی رضؓ کی
مامش کہ بود؟ فاطمہ، جدش کہ؟ مصطفٰےؐ
والدہ ماجدہ کون تھیں؟ حضرت فاطمہ رضؓ جد بزرگوار کون تھے؟ جناب محمد مصطفٰےؐ
چہ شد؟ شہید شد، بکجا؟ دشت ماریہ
کیا ہوا؟ شہید ہوئے، کہاں؟ دشتِ ماریہ میں
کے؟ عاشر محرم، پنہاں، نہ برملا،
کب؟ دس محرم کو، دھوکے سے، نہ کھلم کھلا،

ایک دوسرے منظوم مرثیے کا ایک جزو ملاحظہ ہو۔ حضرت مسلم بن عقیل رضؓ جامِ شہادت نوش فرماتے ہیں۔ اس کی خبر ایک عرب کوفہ سے لاتا ہے۔ عرب کہتا ہے:-

عرب۔ من کہ بینی بصد شور و نوا می آیم — ہدہد نزدِ سلیمان ز سبا می آیم
مجھ کو شور و غوغا کرتے ہوئے آتا دیکھتے ہو — میں ملکہ سبا کا ہدہد بنکر حضرت سلیمان کے پاس آتا ہوں
آیم از کوفہ و دارم خبر از مسلم زار — چون نسیم سحری روح فزا می آیم
کوفہ سے آرہا ہوں، اور مسلم حزیں کی خبر لایا ہوں — نسیم سحری کے مانند روح افزا بنکر آیا ہوں

در سرم شوق لقائے پسر فاطمہؓ است　　　کہ بدرو دلِ مجروح دوامی آیم

مجھے حضرت فاطمہؓ کے پسر کی زیارت کا شوق ہے　　　میں مجروح دل کے درد کی دوا بنکر آیا ہوں

حضرت عباسؓ۔ این درے راکہ بود خاک سرایش کافور　　　سرمۂ چشم فلک باشد و خدامش حور

جس محلسرا کے دروازے کی خاک کافور کے مثل ہے۔　　　اور وہ چشم فلک کے لئے سرمہ ہے اور اسکے خدام حور کے مانند ہیں

ہست این در بخدا قبلہ اربابِ وفا　　　دردمندانِ بلا را بود این دار شفا

بخدا یہ آستان اربابِ وفا کے لئے قبلہ کے مانند باعظمت ہے　　　اور دردمندانِ بلا کے لئے کوئی شفاخانہ ہے

عرب۔ سلامِ من بتو اے مقتدائے عالمیان　　　ز کوفہ می رسم اے پیشوائے اہلِ جناں

اے مقتدائے عالم! آپ پر سلامتی ہو　　　اور اے اہلِ جنت کے پیشوا! میں کوفہ سے آتا ہوں

خدائے را بکجا میروی تو اے سرور؟　　　بیاں نما تو بحق خدائے جنّ و بشر

اے سرور! آپ کہاں تشریف لے جارہے ہیں؟　　　بیان فرمائیے آپ کو جن و بشر کے خدا کی قسم

حضرتِ عباسؓ۔ سلامِ من بتو اے قاصد نکو منظر　　　روم بکوفہ من این دم بحالتِ مضطر

اے نیک دِل قاصد! تجھ پر بھی سلامتی ہو　　　میں اس پریشانی کے عالم میں کوفہ جا رہا ہوں

نوشتہ اند بمن نامہ ہائے اشتیاق؛　　　فلک کشیدہ عنانم بسوئے ملکِ عراق

مجھے اشتیاق نامے لکھے گئے ہیں ،　　　اور آسمان نے میری لگام ملکِ عراق کی طرف کھینچ دی ہے

بمن بگو تو ز مسلم ، اگر خبر داری　　　کسے بکوفہ باو کرد از وفا یاری

مجھے بتاؤ، اگر مسلم کی بابت کچھ جانتے ہو　　　کیا کوفہ میں کسی نے اس کی مدد کی

ابھی تک یہ تمثیل نما مرثیے بھی روضہ خوان یا قصہ خوان پڑھا کرتے تھے، لیکن تعزیہ داری میں انہماک رکھنے والے حضرات کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ان تمثیل نما مرثیوں کو پڑھتے وقت اگر اسی طرح ادا کیا جائے تو یقیناً حاضرین کے دلوں پر اس کا اثر بہت زیادہ ہوگا۔ اس لئے اس کو کھیلنے کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ چنانچہ اس کو اسٹیج کرنے کا انتظام اس طرح ہوتا ہے کہ کسی جگہ کشادہ میدان میں ایک وسیع مربع چبوترہ بنایا جاتا ہے جس کی لمبائی، چوڑائی تیس، چالیس فٹ تک ہوتی ہے اور بلندی پانچ یا چھ فٹ۔ اس کے چاروں طرف پانچ، چھ فٹ کشادہ رستہ چھوڑ دیتے ہیں تاکہ اداکار بآسانی آجاسکیں۔ نشستوں کا انتظام صرف یہ ہوتا ہے کہ رسیوں کی مدد سے جدا جدا طبقے بنائے جاتے ہیں اور ان میں تپائیاں، بنچ، کرسیاں وغیرہ لگاتے ہیں۔ پردوں کا مطلق ذکر نہیں۔ جب مجمع کافی ہوجاتا ہے تو ایک توپ داغتے ہیں۔ گویا تماشا شروع ہونے کا

ایک اعلان ہوتا ہے۔ پہلا منظر سقوں کی ایک جماعت کا ہوتا ہے، جو "یا دتشنہ لب کربلا" کے نعرے لگاتی داخل ہوتی ہے۔ تماشائی اس جانگداز منظر کو دیکھ کر آہ و بکا شروع کر دیتے ہیں۔ "ہائے حسین! وائے حسین!!" کی صداؤں سے فضائے آسمانی گونج اُٹھتی ہے۔ سینہ کوبی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد افراد مجالس تعزیہ آتے ہیں جن میں جناب سالتمآبؐ، ملائکہ، پنجتن پاکؑ اور دیگر اہل بیت رضہ ہوتے ہیں۔ حُرؑ، معاویہ، یزید اور شمر وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ عورتوں کا کام امرا اور اعیان کے امرد لڑکے کرتے ہیں، جو اس میں شرکت کرنا باعث برکت و ثواب خیال کرتے ہیں۔ شمر اور یزید بننے والوں کی بُری گت بنتی ہے۔ نہ صرف زبانی لعنت کے تیر برسائے جاتے ہیں بلکہ عملی طور پر کوڑے مارے جاتے ہیں۔ تھپڑوں سے کلّے سُرخ کر دیئے جاتے ہیں۔ پتھر برسائے جاتے ہیں۔ اس لئے ایسے اداکار زیادہ تر قیدی ہوتے ہیں۔ ایکٹروں کا لباس نہایت موزوں اور مناسب حال ہوتا ہے۔ سب اداکار ایک ساتھ آکر چبوترے پر کھڑے رہتے ہیں یا بیٹھ جاتے ہیں اور اپنی اپنی باری پر سوال و جواب کرتے ہیں۔ چبوترے کو سکو کہتے ہیں۔ بعض اوقات جب اداکار کوئی بات بھول جاتے ہیں تو وہ یا خود دیکھ لیتے ہیں یا اُستاد سکو بتا دیتا ہے جو ڈائرکٹر، پرامپٹر، اسٹیج مینیجر وغیرہ کے فرائض انجام دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ تمثیل انفرادی کی جگہ تمثیل مجلسی نے لی اور اس کی ایران میں وہی صورت ہے جو ہمارے صوبہ میں راس کی، بنگال میں رتھ یاترا کی، بمبئی میں ہری کیرتن کی۔

اس قسم کے منظوم تعزیے کتابی صُورت میں بہت کم پائے جاتے ہیں، البتہ ایک مجموعہ سرلوئی پیلی نے مرتب کیا ہے۔ صاحب موصوف خلیج فارس کے پولیٹیکل ریزیڈنٹ تھے، اپنے دوران قیام میں اُنہوں نے زبانی روایات کی بنا پر اس مجمُوعہ کو جس میں ۵۲ تعزیے شامل ہیں دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔ ۱۸۷۹ء میں اس کی اشاعت ہوئی۔ ایک منظر قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے درج کر رہا ہوں۔

(حضرت سید الشہدا رضہ کا جسم مبارک تیروں سے چھلنی ہو رہا ہے۔ دشت کربلا میں پڑے کرب و بےچینی کے عالم میں فرما رہے ہیں)

جناب امامؑ۔ آہ! تیروں اور خنجروں کے زخم کیسا تڑپا دینے والا درد پیدا کر رہے ہیں۔ اے خدا! قیامت کے دن میری خاطر میرے ہموطنوں پر رحم کرنا۔ اب وقت قریب آگیا، لیکن اکبر کے ہجر کی پھانس دل کو چھید رہی ہے۔ کاش میرے نانا مجھے اس حال میں دیکھتے۔

حضور پیغمبرؐ ظاہر ہوتے ہیں (پیارے حسین! تمہارا نانا، رسول اللہ تم کو دیکھنے آیا ہے۔ میں تمہارے نازک بدن کے کاری زخم دیکھنے آیا ہوں۔ عزیز من! آخر تم نے خود میری ہی اُمت کے سفاک ہاتھوں سے جام شہادت نوش کیا۔ یہی صلہ تھا۔ جس کی مجھے ان سے توقع تھی۔ پیارے بیٹے آنکھیں کھولو اور اپنے نانا کی طرف دیکھو، جو تمہارے سرہانے بال کھولے کھڑا ہے۔ اگر کوئی خواہش

ہے تو زبان پر لاؤ۔

ب امام ۔ پیارے نانا! زندگی سے دل بھر گیا۔ اب یہی خواہش ہے کہ اس عالم فانی سے کوچ کرکے عالم بقا میں پہنچوں اور اپنے عزیزوں کو گلے لگاؤں۔ میں اپنے محبوں، مخلصوں اور خصوصاً عزیز از جان علی اکبر سے ملنے کے لئے بیقرار ہوں۔

مور پیغمبرؐ ۔ اس بات کا رنج نہ کرنا کہ تمہارا بیٹا علی اکبر شہید ہوا کیونکہ یہ شہادت قیامت کے دن میری گناہگار اُمت کے آڑے آئے گی۔

ناظرین اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ الفاظ فدائیان اہلِ بیت کے جذبات میں کس بلا کا تلاطم پیدا کرسکتے ہیں۔ غم واندوہ کی دل کشی میں کیا کمال حاصل ہے۔ جذبات کا صحیح مرقع پیش کرنے میں کس درجہ دسترس حاصل ہے۔

ایران میں ایک مدت تک فن تمثیل نے اس سے زیادہ ترقی نہ کی۔ ۱۸۲۷ء میں فتح علی شاہ قاچار کے عہد حکومت میں عہدنامہ کی رو سے قفقاز کا صوبہ (جس میں شروان، گرجستان، گنجہ، قراجہ داغ، ایروان اور نخجوان شامل ہیں) روسیوں کے تصرف میں آگیا۔ اور طفلس اس کا صدر مقام قرار پایا۔ اس وقت ایم وارنسوف وہاں کے گورنر تھے۔ چنانچہ ان کی مساعی جمیلہ سے ۱۸۵۰ء میں ایک تھیٹر تیار ہوا جس کا ذکر شاہ ناصر الدین قاچار نے اپنے سفرنامہ میں اس طرح کیا ہے :۔

"شب را با جانشین خود نقدیم ۔ بہ تماشا خانہ ای تابستانی ۔ بنائے مختصر است سفید کارے یک چہل چراغ بر میز داشت کہ با گاز روشن بود ۔ تماشا خانہ از صاحب منصبان روس وغیرہ پُر بود ۔ ہمہ جہت دولیست نفر آدم می گیرد۔ موزیک خوب می زدند ۔ بعدہٗ پردہ بالا رفت ۔ چند اکت دادند ۔ بزبان روسی حرف می زدند ۔ خوب خواندند ۔ بازی ورقص وحکایات خود نشان دادند ۔ بسیار بامزہ وخندہ بود ۔ زنہا وجوانان روسی خوب وخوشگل بودند ۔ یک رقاصہ ای فرانسہ ہم بود ، بسیار خوشگل وخوب می رقصید ۔ دو سال است این جا آمدہ "۔

میں شب کو اپنے ولی عہد کے ساتھ تھیٹر گیا۔ اس کا نام تابستانی ہے۔ عمارت مختصر ہے جس میں اکتالیس برقی لمپ روشن تھے ۔ تمام ہال روس کے صاحب منصب اور عہدہ داروں سے بھرا تھا۔ گانا بہت عمدہ تھا۔ اس کے بعد پردہ اُٹھا۔ چند ایکٹ کھلائے۔ روسی زبان میں خوب بات چیت کرتے تھے۔ ناچ، گانا اور ایکٹنگ بہت خوب تھا، نہایت پُرلطف اور ظریفانہ۔ روسی جوانان اور حسین عورتیں خوب خوب تھیں۔ ایک رقاصہ فرانسیسی بھی تھی۔ نہایت خوبصورت اور حسین۔ خوب ناچتی تھی اور وہ دو سال سے یہاں آئی ہے"۔

اس تماشا گاہ میں روسی اور فرانسیسی ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ تماشائی جو قفقازی اور دوسرے صوبوں کے ایرانی بھی ہوتے تھے، ان کھیلوں سے بیحد محظوظ ہوتے۔ اس جلوے نے قفقازیوں کی آنکھوں کو خیرہ کردیا۔ ان کے دلوں سے باطل اوہام کا پردہ

ہٹ گیا، اور انھیں فنِ تمثیل کی حقیقت معلوم ہوئی۔ اب ان کو یہ خیال ہؤا کہ اس قسم کے ڈرامے اپنی زبان میں کیوں نہ لکھے جائیں۔ چنانچہ مرزا فتح علی اخوزادہ نے اپنی توجہ اس طرف منعطف کی اور در اصل ایران میں فنِ تمثیل کا بابائے آدم یہی ہے۔ مرزائے موصوف تاتاری نسل سے تھے۔ آبا و اجداد کا وطنِ مالوف قراجہ داغ ہے۔ چونکہ مرزا کے پدرِ بزرگوار دربند میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس لئے اُن کو اخوازادہ کا لقب مِلا۔ کارناموں کا آغاز فوجی ملازمت سے ہوتا ہے، چنانچہ روسی فوج میں کپتانی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ مرزا صاحب یورپی آداب و رسوم کے پرستار تھے۔ علوم متداولہ سے بخوبی بہرہ ور تھے۔ ان کا قلب قومی جذبات کا ایک بحرِ بیکراں تھا، قوم کا درد بےچین کر رہا تھا کہ اُن کی اولوالعزم طبیعت نے رزم سے بزم کی طرف توجہ کی اور اس میں وہ کارنامے کر دکھائے، جو قیامت تک باقی رہیں گے۔ ان کو تمثیل نگاری کا خیال دامنگیر ہؤا، اور آذری ترکی میں حسبِ ذیل ڈرامے لکھے:۔

نام ڈراما	تاریخ تصنیف	سنہ ترجمہ در فارسی
۱۔ ملا ابراہیم خلیل کیمیاگر	سنہ ۱۸۵۰ء	سنہ ۱۸۷۳ء
۲۔ موسیو ژردان	سنہ ۱۸۵۰ء	سنہ ۱۸۷۵ء
۳۔ خرس قولدر باسان	سنہ ۱۸۵۱ء	سنہ ۱۸۷۶ء
۴۔ وزیر خان لنکران	سنہ ۱۸۵۲ء	سنہ ۱۸۷۶ء
۵۔ قصہ یوسف شاہ سرّاج	سنہ ۱۸۵۵ء	سنہ ۱۸۷۷ء
۶۔ مرد خسیس	سنہ ۱۸۵۵ء	سنہ ۱۸۷۷ء
۷۔ وکلائے مرافعہ	سنہ ۱۸۵۵ء	سنہ ۱۸۷۷ء

سنہ ۱۸۵۹ء میں ان سب کا ایک مجموعہ "تمثیلات قابوداں" کے نام سے شائع کیا، اور جنرل برتانکی کے نام نامی پر معنون کیا۔ مرزائے موصوف نے "تمثیلات قابوداں" کا ایک نسخہ شاہزادہ جلال مرزا ابن شاہ فتح علی قاچار کی خدمت میں ارسال کیا۔ شاہزادہ ممدوح علوم مروجہ سے بہرہ ور ہونے کے علاوہ صاحبِ تصنیف بھی تھے۔ چنانچہ خود نوشتہ تاریخ ایران موسوم بہ "نامۂ خسروان" کا ایک نسخہ مرزا فتح علیخان کی خدمت میں روانہ کیا۔ مرزائے موصوف نے اپنی تمثیلات پر تحریر کر دیا تھا۔

"اگر کسے ترجمہ این تمثیلات بفارسی نماید موجب تشکر و امتنان خواہد شد۔"

شاہزادہ ممدوح تمثیلات کے مطالعہ سے بیحد محظوظ ہؤا۔ اور اپنے ایک مقرب دوست مرزا جعفر قراجہ داغی کو مطالعہ کرنے کے لئے دیا۔ مرزا موصوف نے اپنی اہلیہ کے انتقال کے بعد اپنی پوری توجہ ادبی خدمات انجام دینے پر صرف کردی۔ ایرانی ادبیات نیز نصابِ تعلیم کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس کی خامیوں کو دُور کرنے کا خیال دامنگیر ہؤا۔ چنانچہ اس کا عملی نتیجہ یہ ہؤا کہ مرزا جعفر نے

حسب تحریر کپتان موصوف وحسب ایمائے شاہزادہ ممدوح "تمثیلات" کا ترجمہ فارسی میں شروع کر دیا۔ اور سب سے پیشتر ملا ابراہیم خلیل کیمیاگر کا ترجمہ کیا، جو ۱۸۷۲ء میں شائع ہؤا۔ شاہزادہ جلال ترجمہ کر پڑھ کر بے حد خوش ہؤا اور انعام واکرام سے مترجم کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے تین سال بعد موسیو ژردان کا ترجمہ ہؤا۔ افسوس کہ اس کی طباعت کی نوبت نہ آئی تھی کہ شاہزادہ ممدوح کا انتقال ہو گیا۔ جس کے باعث مرزا جعفر کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی، مگر ہمت کرکے اس نے تمام ڈراموں کو فارسی کا جامہ پہنا دیا، اور سب کے سب طہران میں چھپ کر شائع ہو گئے۔ موسیو ژردان کا ایک جزو ملاحظہ ہو۔

مجلس سیم

شرف النسأ خانم۔ (تنہا ایستادہ) اوخ! شکر خدایا! دلم بحوزردہ آرام گرفت۔ خراب شود ولایتے کہ جادو وجادوگر در انجا نباشد۔ اگر درویشی کہ دایہ ام گفت نمی شد، بیشک موسیٰ ژوردان شہباز را می برد، روزگارم را سیاہ می کرد۔

(درین حال در باز می شود۔ شہباز بیگ می آید توسے)

شہباز بیگ۔ شرف النسا! دردت بجانم! دانستی زن عموم امروز چہ کرد؛ پیش روے موسیٰ ژردان پسر عموم داد زدہ مرا ہم تہدید می کرد۔

شرف النسا خانم۔ شہباز! از کارہائے خود ہیچ خبر نداری داد زدن زن عموت بنظرت غریب می آید؛

شہباز بیگ۔ شرف نسا، جان! دردت بجانم من خودم چہ کردہ ام؛

شرف النسأ خانم۔ (زود رفتہ، دست دراز کردہ از پشت کارگاہ چند پارچہ کاغذ نیم صفحہ آوردہ باز می کند) شہباز! این شکلہا را پس برائے من کہ آوردہ؛ نیاوردی؛ بگفتی صورت دختران وعروسان پاریس ست ببین! در پاریس چہ قدر دختران خوشگل ہست! اینہا در مجالس رو باز کردہ باپسران یکجا نشست وبرخاست می کنند۔

مترجم کی دلی تمنا تھی کہ انکو اسٹیج کیا جاسے، مگر ملک کی ناقدر دانی سے اس کی نوبت نہ آئی اور نہ کسی نے اس کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا۔ ان ترجموں کا اثر اتنا ضرور ہؤا کہ بعض علم دوست حضرات نے فن تمثیل کی طرف توجہ کی اور فرانسیسی ڈراموں کو فارسی قالب میں ڈھالنے لگے، چنانچہ مولیر (MOLIER) کے تین ڈراموں کا ترجمہ فارسی میں ہؤا جن میں سے صرف (Le Misanthrope) کا ترجمہ، جو "گزارش مردم گریز" کے نام سے قسطنطنیہ کے مطبع تصویر الافکار سے ۱۸۷۷ء میں شائع ہؤا، دستیاب ہے۔ باقی دو ڈرامے مفقود ہیں۔ اس تمثیل کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

مجلس دوم — منظر سوم

مونس۔ (بہ پیش فراش مے رود) چہ ہست فرمائش؛
فراش۔ بیا، بہ بینیم! دارم دو حرف باسرکار۔
مونس۔ تو آن دو حرف خودت را کنی بلند اظہار
فراش۔ رئیس دیوان آن را کہ بندہ ام فراش
مرا بدست بداد دست حکم حاضر باش
بتو . . . . . .

مونس۔ آرے . تو **فراش۔** بکہ ؟

مونس۔ برائے چہ کار ؟ بمن . . . . . .

فراش۔ بحرف مفت (امیدی) حضرت سرکار۔

زبان میں سجع کا التزام ظاہر ہے۔

اس کے بعد محمد طاہر نے الیگزنڈر ڈوما کے حسب ذیل ناولوں کا ترجمہ تمثیل کے قالب میں ڈھالا (۱) سہ تفنگچی (۲) کاؤنٹ آف مونٹی کرسٹو (۳) لارینی مارگیٹ (۴) لوئی چہاردہم (۵) لوئی پانزدہم۔ ذکاء الملک نے مولیئر کے چند ڈراموں کا ترجمہ کیا جن میں سے حسب ذیل مقبول ہوئے (۱) جولیس وزنس لیپٹن ہیٹراس (۲) کلبائے ہندی (۳) لاابنی۔ افسوس ہے کہ ان ڈراموں کی تلاش کرنے کے باوجود بھی مجھے ان میں سے کوئی ڈراما دستیاب نہ ہوا، اور نہ نمونہ پیش کیا جاتا۔ شاہزادہ عبد الحسین مرزا ابن مؤید الدولہ طہماسپ مرزا نے الیگزنڈر ڈوما کے ایک ناول کا ترجمہ، جو عربی زبان میں ہو چکا تھا، فارسی ڈرامے کی صورت میں پیش کیا۔ اس کا نام برج ہائل ہے۔ اب ہم یہاں ایک ایسے تمثیل نگار کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جس کی زندگی گوناگوں عجائبات کا مرقع ہے، اور وہ شاہزادہ مالکم خان ناظم الدولہ ہے۔ اس کا باپ آرمینیا کا نومسلم اصفہان میں آ کر آباد ہوا۔ ۱۸۳۳ء میں مالکم خان پیدا ہوا۔ تعلیم و تربیت کے حالات پردہ خفا میں ہیں۔ لوگ بیان کرتے ہیں کہ اوائل عمر میں شعبدہ بازی دکھا کر طہرانیوں کو خوش کیا کرتا تھا۔ مذہبی پیشواؤں اور ملاؤں کے غیظ و غضب کی حد نہ رہی اور اس کے لئے جلاوطنی کا فرمان صادر کرا دیا۔ اس کے چند سال بعد یہ پھر ایران آ گیا۔ اور یہاں فری میسن سوسائٹی قائم کی۔ اس سوسائٹی کے ممبروں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ مذہبی رہنماؤں نے اس کو پھر جلاوطن کرا دیا۔ آخر کار یہ ایران کی طرف سے لندن میں سفیر مقرر ہوا اور اپنے فرائض نہایت عمدگی سے انجام دیئے۔ شاہ ایران نے خوش ہو کر اس کو شاہزادہ کے خطاب سے سرفراز کیا۔ مختصر یہ کہ اس کی زندگی عجیب واقعات کا مرقع ہے۔ ہم ان سب کا ذکر چھوڑ کر صرف اس کی ڈرامائی خدمات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے متعدد ڈرامے لکھے مگر وہ اب دستیاب نہیں۔ حال میں اس کے تین ڈراموں کا ایک مجموعہ برلن سے شائع ہوا ہے، جو "تیاتر" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ڈرامے اور کومیڈیاں تبریز کے روزنامہ "اتحاد" میں شائع ہو چکی تھیں۔ ۱۳۲۶ھ میں اخبار مذکور کی ضبطی کے سلسلے میں ناپید ہو گئیں۔ اس مجموعہ میں حسب ذیل ڈرامے شامل ہیں (۱) سرگزشت اشرف خان (۲) طریقہ حکومت زمان خان (۳) حکایت کربلا رفتن شاہ قلی مرزا۔

یہ ڈرامے اصلاحی اور سوشل ہیں۔ ان کی زبان سلیس اور شستہ ہے۔ افراد تمثیل کے بجائے "اسمائے اعضائے مجلس" لکھا ہے جو دوسرے تمثیل نگاروں کی اصطلاح سے مختلف ہے۔

اس کے علاوہ شکسپیر کے انگریزی ڈراما ہنری چہارم کا ترجمہ، تیاتر ضحاک، نامہ نادری، رومان تاتر، نواب ہندی، جعفر خان از فرنگ آمدہ، آخرین یادگار نادر شاہ، یوسف شاہ سراج وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ فارسی تمثیلات زیادہ تر فرانسیسی، انگریزی، ترکی اور عربی زبانوں کے ڈراموں سے ترجمہ ہیں۔ طبعزاد بہت کم ہیں۔

(اظہر علی)

آہنگِ نو

غم سے مضطر ہوں مگر طبع جواں رکھتا ہوں
سو گلستاں تہِ دامانِ خزاں رکھتا ہوں

آتشِ عشق دہکتی ہے مرے سینے میں
آہ میں شعلۂ اُلفت کا دھواں رکھتا ہوں

میرا ہر اشک ہے تسنیم کی موجِ رنگیں
اپنے غم خانے میں جنت کا سماں رکھتا ہوں

کھیل ہی میرے لئے شادی و غم دنیا کا
دل میں پوشیدہ کلیدِ دو جہاں رکھتا ہوں

میری ہر بات ہے مستقبلِ ہستی کی نقیب
نئی تخئیل، نیا طرزِ بیاں رکھتا ہوں

ابتدا جس کی گماں ہے وہ یقیں ہے میرا
انتہا جس کی یقیں ہو وہ گماں رکھتا ہوں

زنگ آلود جہاں میاں میں خنجر ہیں ہنوز
میں وہاں تیغِ دوسر اپنی رواں رکھتا ہوں

کیوں نہ اب کہنہ روایات کا ٹوٹیگا خمار
نیا خم خانہ نیا پیرِ مغاں رکھتا ہوں

الغرض کہنہ فضاؤں میں ہے اک قصرِ جدید
جس کے گوشوں میں نیا کون و مکاں رکھتا ہوں

جلال

اجتماعِ ضدّین

بہت دنوں پہلے ہم جب مثنوی مولوی رومی میں یہ شعر ؎

آں یکے شیرے کہ آدم میخورد ✤ آں یکے شیرے کہ آدم میخورد

پڑھتے تھے تو ہم کو حیرت ہوتی تھی کہ صرف یائے مجہول اور یائے معروف نے معنی میں کیا سے کیا کیفیت پیدا کردی۔ ایک وہ شیر ہے جو آدم کو کھاتا ہے، ایک وہ شیر ہے (یعنی دودھ) جس کو آدم کھاتا ہے، اس مقدمے کے بعد اصل قصہ سنئیے کہ ہم ایک دفعہ بازار سے گوشت ترکاری آٹا دال خرید کر سائیکل پر لادے ہوئے چلے جارہے تھے کہ بیچ راستے میں پوٹلی کی گرہ کھل گئی، آٹا ادھر گرگیا اور دال اُدھر ———

بازار کا مقام، لوگوں کی چہل پہل، جان پہچان والوں کی کثرت، گرا ہوا آٹا دال نہ اٹھائے بنتی ہے نہ چھوڑتے بنتی ہے۔ غم کے کھاتے، اور خون کے گھونٹ پیتے کھڑے ہوئے تھے کہ یکایک ایک شعر زباں پر آگیا ؎

غم ہے کھانے کے لئے، خون ہے پینے کے لئے ✤ اس خورد و نوش پہ، ہم مرتے ہیں جینے کے لئے

شعر کی خوشی میں ہم سارا غم بھول گئے۔ اور اسی پُر لطف حالت میں مزے لے لے کر پڑھنے لگے ؎

غم ہے کھانے کے لئے، خون ہے پینے کے لئے ✤ اس خورو نوش پہ، ہم مرتے ہیں جینے کے لئے

اور اپنا یہ شعر ہم کو اس قدر پسند آیا کہ تحفتہً اپنے ہر مخلص کو ہم نے اس کی نقل بھیج دی، جن میں ایک ہمارے مخلص دوست مولوی سید یوسف علی صاحب سولیلین . . . . ہیں ان کو بھی ہم نے یہ شعر جلی قلم سے خوشخط لکھ کر بھیجا تھا، جس کے دوسرے ہی دن ہمارے دوست ہمارے گھر آپہنچے، اور شعر مرسلہ کی تعریف میں زمین آسماں کے قلابے ملا دیئے۔ اور کہنے لگے کہ آپ کا شعر جس قدر غم کی تصویر ہے، اسی قدر خوشی کی بھی تفسیر ہے،

ہم نے حیرت سے منہ کھول کر کہا، عزیز یوسف! تم کیا کہہ رہے ہو؟ بھلا اس شعر میں خوشی کی کونسی بات ہے؟ اور اس میں مسرّت کا کونسا پہلو ہے؟

ہمارے دوست نے کہا، ایک تو وہ عام معنی ہیں جو سب سمجھتے ہیں، کہ ہم کو کھانے کے لئے غم اور پینے کیلئے خون دیا جاتا ہے، اس پر بھی ہم جینے کے خواہشمند ہیں، اور زندگی پر جان دے رہے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دوسرے مسرت بخش معنی یہ ہیں کہ ہم غم کھانے اور خون پینے پر مرے جاتے ہیں اور کیوں نہ مریں؛ کیونکہ ایسے ہی کھانے پینے سے تو زندگی (حقیقی) حاصل ہوتی ہے۔ الحمدللہ رب العالمین۔

واہ میرے دوست یوسف واہ، تمہاری اعلیٰ دماغی اور حسن تخیل کی داد دیتا ہوں۔

بلا کسی تغیر کے، غم کے آئینے میں مسرت کی صورت دکھنا
بغیر کسی تکلیف و تکلّف کے، حلقۂ ماتم کو محفل سرور بنا دینا } تمہارا ہی کام ہے۔

"این کار از تو آید و یوسف چنین کند"

(سچ ہے)

جلتی ہوئی شاخ میں ثمر آتا ہے ✤ غم میں رُخِ مقصود نظر آتا ہے
ہے زخم جگر میں تیری ہنستی صورت ✤ ہر چوٹ کے ساتھ، تو اُبھر آتا ہے

(امجد حسین)

غالبؔ

(ایک جدید نقطۂ نظر سے)

ذیل کا مضمون جو ایک نئے انکشاف کے طور پر پیش کیا گیا ہے ان حضرات کی دلچسپی کا موجب ہوگا جن کا خیال ہے کہ انگریزی تعلیم سے قبل ہندوستان جہالت اور لاعلمی کا گہوارہ تھا۔ ورنہ غالب جیسے فاضل شخص کے اشعار میں طبیعیات یا فلکیات کے ابتدائی مسائل کی طرف بعض اشارات دیکھ کر حیرت کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ انگریزوں کے ورود سے قبل ہندوستان کے مسلمان شرفاء کے نصابِ تعلیم کا معیار ایسا پست نہ تھا جیسا عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ غالب کے اشعار میں اگر بعض طبیعیاتی اور فلکیاتی مسائل کی طرف اشارات ہیں تو یہ بالکل معمولی بات ہے کیونکہ جس تعلیم نے سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ وغیرہم جیسے فضلاء پیدا کئے وہ ایسی فرومایہ نہ تھی جیسی ہم سمجھے بیٹھے ہیں۔ انگریزی عہد کا ناقص طریقۂ تعلیم اپنے بر خود غلط ادعا کے باوجود اب تک ایک سید احمد، ایک حالی، ایک شبلی، ایک نذیر احمد ایک ذکاء اللہ پیدا نہیں کر سکا۔

اس مضمون میں غالب کے ایک شعر کے متعلق لکھا گیا ہے کہ افسوس یہ شعر جو مسئلہ استحالۂ عناصر ثابت کرنے کے لئے لکھا گیا تھا۔ یادگارِ غالب جیسی کتاب میں عاشقانہ اشعار کے زمرے میں درج کر دیا گیا۔ اگر غالب اپنے اشعار میں سائنس کے مسائل "ثابت" کیا کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اُسے ایک سائنس دان قرار دیتے ہیں لیکن جن بودے دلائل سے اس نے مسئلہ استحالۂ عناصر ثابت کیا ہے وہ اس کی "سائنسدانی" کے متعلق کوئی اچھا خیال پیدا نہیں ہونے دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ یادگارِ غالب میں یہ شعر اسی زمرے میں درج ہو سکتا تھا جس میں درج ہُوا۔ مسئلۂ استحالۂ عناصر ثابت کرنا نہ غالب کا مقصد تھا اور نہ شاعری کا مقصد ہونا چاہیئے۔ غالب نے تو کثرتِ گریہ کے باعث آنسوؤں کے سُوکھنے اور آہوں کے جاری ہو جانے پر ازراہِ حسرت (یا ازراہِ شوخی؟) اتنا کہا ہے کہ اب مجھے بھی انکار نہیں کہ پانی بخارات میں تبدیل ہو سکتا ہے کیونکہ میرے آنسو بھی آہوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

ہماری رائے میں غالب کو ایک بڑا "سائنسدان" ثابت کرنے کی کوشش میں فاضل مقالہ نگار نے بھی وہی غلطی کی ہے جو ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے غالب کو تمام قدیم و جدید علوم کا ماہر ثابت کرنے میں کی تھی۔ صاحبِ مضمون نے اس بات کی دلیل کہ غالب کا کلام سائنس وغیرہ کے مسائل کا حامل بھی ہے۔ یہ دی ہے کہ بقول بجنوری مرحوم کے دیوانِ غالب وید مقدس کی طرح ہندوستان کی الہامی کتاب ہے اور الہامی کتابیں تمام علوم پر محتوی ہوتی ہیں۔ یہ دونوں دعوے محلِ نظر ہیں۔ دیوانِ غالب الفاظ کے منطقی مفہوم میں الہامی کتاب نہیں بلکہ یہ محض بجنوری مرحوم کا ایک شاعرانہ فقرہ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی الہامی کتاب نہ تمام علوم کی حامل ہے اور نہ ہونی چاہیئے کیونکہ الہامی کتابوں کا کلام وہ نہیں جو انسائیکلو پیڈیا کا ہے۔ غالب کے

متعلق ڈاکٹر بجنوری مرحوم کا حد سے بڑھا ہوا جوش جس تحریر پر منتج ہوا افسوس کہ وہ اس لحاظ سے ایک سعی ناشکور ثابت ہوئی کہ اُس نے ڈاکٹر عبد اللطیف جیسے عناد پرور نقاد پیدا کئے۔ ہمارا خیال ہے کہ غالب کو ایک زبردست سائنس دان ثابت کرنا بھی ایسا ہی غیر ضروری اور غیر مفید ہے۔ وہ صرف ایک بڑا شاعر تھا اور اس کے اشعار میں سائنس کے بعض عام مسائل کی طرف جو اشارات ہیں اِن سے وہ سائنس کا کوئی زبردست محقق ثابت نہیں ہو سکتا۔ البتہ ان اشارات سے غالب کی شاعرانہ جولان گاہ کی وسعت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے اور اگر صحیح اصُول تنقید کو مدِّ نظر رکھ کر اس باب میں مزید تحقیق کے ساتھ کوئی مضمون لکھا جائے تو وہ دلچسپ ضرور ہوگا۔

حامد علی خاں

غالب کے انتقال کو کم وبیش ۵۰ برس کا عرصہ ہوا۔ لیکن اس قلیل مدت میں اُردو دان طبقہ نے جو دلچسپی اس کے کلام میں لی ہے اس کی مثال ہماری زبان کی تاریخ میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ اور آج وہی شاعر جو اپنے زمانہ میں شکایت کرتا تھا کہ ؎

ہمارے شعر ہیں اب صرف دِل لگی کے اسدؔ ✦ کھُلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

یا ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا ✦ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور جو سخت ترین نکتہ چینیوں اور رکیک ترین حملوں کا آماجگاہ رہ چکا تھا اُردو کا بہترین شاعر اور نثار تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لوگ اپنی طبیعت اور استعداد کے مطابق اس کے کلام کی خوبیوں اور لطافتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور اس پر سر دُھنتے ہیں۔ ملک میں غالب کے متعلق کافی لٹریچر جمع ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے، اور غالب پرستی کے ساتھ غالب فہمی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری اور ڈاکٹر عبد اللطیف کے نقطۂ نظر میں خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو مگر مقصود دونوں کا غالب فہمی ہے اور ہم کو ماننا پڑے گا کہ اگر ایک طرف اس کی خوبیوں کے سمجھنے میں ہم بجنوری کے مرہونِ منت ہیں تو دوسرے رُخ کو دیکھنے کے واسطے عبد اللطیف کے۔

غالب فہمی کی ابتدا، حالی کی یادگارِ غالب سے ہوتی ہے جس نے اپنے اُستاد کے کلام پر تنقید و تبصرہ کر کے اس کے کلام کی خوبیوں صنعتوں اور لطافتوں کو اُردو دان طبقہ کے سامنے پیش کیا۔ لیکن نوجوان اور مغرب پسند طبقہ کو غالب کی طرف مائل کرنے والا پہلا شخص بجنوری مرحوم تھا۔ جو حقیقی معنوں میں "محقق" کہلانے کا مستحق ہے۔ اس نے غالب کے کلام میں وہ باتیں تلاش کیں جنہوں نے آج شیکسپیئر کو انگلستان کا سرمایۂ ناز اور گوئٹے کو جرمنی کا درخشاں ستارہ بنا رکھا ہے۔ اس نے شاعر کے کلام کا تجزیہ کر کے بتایا کہ اس کے دیوان کو محض چند اشعار کا مجموعہ سمجھ لینا ظلم ہے، کیونکہ اُن کے پردے میں فلسفے اور علوم کے دریا بہائے گئے ہیں۔ چنانچہ خود کہتا ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ✦ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس نے غالب کے فلسفہ حیات و ممات اور فلسفۂ مذہب و الٰہیات وغیرہ پر ایک غائر نظر ڈال کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک مسلم الثبوت فلسفی تھا۔ مذہبی معاملات میں وحدت الوجود کا قائل تھا، دُنیا کو ہیولیٰ اور فانی سمجھتا اور انسانی ہستی کو موہوم سمجھتا تھا۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ٭ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

یا ؎ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ ٭ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

(۲)

لیکن غالبؔ کا کلام ایسا نہیں کہ اس میں محض فلسفہ ہی کی تلاش کی جائے کیونکہ بقول بجنوری مرحوم "ہندوستان کی الہامی کتابیں صرف دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوانِ غالب" اور الہامی کتابیں قرآن شریف کی طرح تمام علوم پر مشتمل ہوتی ہیں، خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید۔ لہذا غالب فہمی کے واسطے بھی ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی نظر کو صرف فلسفہ، مذہب یا تغزل و تخیل ہی تک محدود نہ رکھیں بلکہ وسیع النظری سے کام لے کر علوم و فنون کے اُن تمام دفینوں کو ڈھونڈ نکالیں جو اس کے کلام میں پوشیدہ اور مضمر ہیں۔ ذیل کا مضمون اسی جستجو کی ایک جھلک ہے اور اس میں کلام غالب کو سائنس کے نقطۂ نظر سے پرکھا گیا ہے۔

گو معدودے چند سہی لیکن غالبؔ کے کلام میں ایسے اکثر اشعار ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کو علوم طبیعیات، کیمیا اور خصوصاً علم الافلاک میں بہت کافی دسترس حاصل تھا۔ نہ صرف دسترس، بلکہ وہ اپنے زمانے کے جدید اکتشافاتِ سائنس سے بھی کماحقہٗ آگاہ تھا۔ آفتاب کے داغوں کی ماہیت[1] سے اس کو پوری واقفیت تھی، اس کو علم تھا کہ سُورج اپنے محور پر گردش کرتا ہے اور برخلاف چاند کے اس کے داغ ہمیشہ یکساں نظر نہیں آتے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

لوگوں کو ہے خورشید جہانتاب کا دھوکا ٭ ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

اس شعر کے مطالعہ سے آپ پر بخوبی روشن ہو جائے گا کہ داغوں کے متعلق غالبؔ کو کم از کم مندرجہ ذیل امور سے ضرور آگاہی تھی، اور یہ نہ صرف سائنس دانی کا بیّن ثبوت ہے بلکہ اس سے یہ بات بھی صاف طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور اس کو ہر قسم کے علوم و فنون سے دلچسپی تھی۔

---

[1] آفتاب کے داغوں کی نسبت روایات تو بہت قدیم زمانہ سے مشہور تھیں مگر کسی نے اُن کو دوربین کی مدد سے نہ دیکھا تھا اور اسی وجہ سے لوگ اُن کے وجود کے بھی قائل نہ تھے، چنانچہ جب پہلی مرتبہ شینز نے پاپائے روما سے اس کے متعلق گفتگو کی تو اس نے کہا کہ "میں نے ارسطو کی تصنیفات کا کئی مرتبہ شروع سے آخر تک مطالعہ کیا ہے مگر اس میں مجھکو اس قسم کی کوئی روایت نہیں ملی یقین مانو، اس میں یا تو تمہاری دوربین کا قصور ہے یا تمہاری آنکھوں کا" مگر گلیلیو کے زمانہ سے داغوں کی موجودگی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے۔ اس کے متعلق مختلف قسم کے تجربات اور مشاہدات عمل میں آ چکے ہیں اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ داغ نہ صرف موجود ہیں بلکہ برقی اثرات سے اُن میں عظیم الشان تغیّر و تبدّل بھی ہوتا رہتا ہے۔

(۱) سورج میں داغوں کی موجودگی (۲) اُن داغوں کا روزانہ تبدیل ہونا اور (۳) داغوں کی تبدیلی صرف گردش ہی کے باعث نہ ہونا بلکہ اندرونی اسباب سے بھی اُن کا ظہور پذیر ہونا۔ چنانچہ "فراغ نہاں" کا اشارا اسی طرف ہے۔

علم الافلاک کے متعلق اس نے ایک شعر اور لکھا ہے جس سے ہم کو بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ستاروں اور سیاروں کی ماہیت سے بھی پوری طرح آگاہ تھا۔ اس کو علم تھا کہ ستارے محض آسمان کے بیل بوٹے نہیں بلکہ اُن میں سے بعض ہمارے آفتاب سے دس گنا بڑے اور روشن ہیں اور بعض میں ہماری دُنیا کی طرح لوگ آباد ہیں۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ ❊ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

یعنی ستارے، دراصل سورج اور سیارے ہماری زمین کی طرح آباد ہیں لیکن بادی النظر میں چھوٹے چھوٹے گولے نظر آتے ہیں جو رات بھر ٹمٹماتے رہتے اور صبح کو غائب ہو جاتے ہیں۔

علم الافلاک سے قطع نظر جب ہم علم الطبعیات (Physics) کے دائرہ میں غالب کو مردِ میدان پاتے ہیں تو ہمارے تعجب و انبساط کی کوئی حد نہیں رہتی۔ کسی ایسے شاعر سے جس کا نشوونما دورِ انحطاط میں ہوا جس کو مغربی علوم و فنون کی ہوا تک نہ لگی ہو، اور جس کے پیش نظر اس مبحث کی کوئی جدید کتاب بھی نہ ہو، یہ توقع مطلق نہیں ہو سکتی کہ وہ سائنس کے باریک اور دقیق مسائل پر روشنی ڈالے گا۔ لیکن جب ہم اس کو تبخیر (Evaporation) اور تکثیف (Condensation) کے پیچیدہ عمل پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہم کو اس کی وسیع النظری، ذہن رسا اور ہمہ دانی کی داد دینی پڑتی ہے۔

مندرجہ ذیل شعر میں نہ صرف سائنس کے ایک اہم مسئلہ کو دُنیا کے سامنے پیش کیا گیا ہے، بلکہ ایک شاعرانہ مثال دے کر اس کو ثابت کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو مسئلہ استحالۂ عناصر پر محض وقوف ہی حاصل نہ تھا بلکہ وہ اس کو ایک مسلّمہ عمل تصور کرتا تھا ؎

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا ❊ باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا[1]

غالب کی بلند پروازی اور ہماری کوتاہ بینی دونوں نے مجتمع ہو کر غالب فہمی کو ایک امرِ دشوار بنا دیا ہے۔ دیوان غالب کی کسی شرح کو اُٹھا کر دیکھیے ہر شعر کی تشریح ایک ہی نقطۂ نظر سے کی گئی ہے، وہی عشق اور وہی محبت۔ اصل یہ ہے کہ اہل زمانہ ہر چیز کو اپنی ہی عینک سے دیکھتے ہیں اور جب عینک دُھندلی ہو جاتی ہے تو تمام چیزیں دُھندلی نظر آنے لگتی ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ یادگارِ غالب جیسی وقیع کتاب میں بھی اس شعر کو عاشقانہ اشعار کے زمرہ میں لکھا گیا ہے۔ اہل نظر کی اس کوتاہ بینی کو دیکھ کر افسوس بھی ہوتا ہے اور تعجب بھی لیکن پھر یہ کہہ کر خاموش ہو جانا پڑتا ہے کہ "جواہر ریزے کنکروں اور سنگریزوں ہی میں ملا کرتے ہیں اور کوئی خوش نصیب ہی ہوتا ہے جو اُن کو ڈھونڈ نکالتا ہے"۔

(احمد الدین احمد مارہروی)

[1] اس شعر میں مسئلہ استحالۂ عناصر کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ضعف کی وجہ سے اندرونی حرارت اور جوش کم ہو جاتا ہے۔ تبخیر کی کمی کے باعث یا ٹھنڈ پہنچنے سے ہمارے آنسو دوبارہ سرد ہو گئے۔ اور اس تکثیف کے بعد ہم کو معلوم ہوا کہ مسئلہ تبخیر بالکل درست ہے۔ کیونکہ اگر جوش دینے سے پانی بھاپ میں منتقل نہ ہو جایا کرتا تو سردی پہنچنے سے ہرگز دوبارہ پانی میں منتقل نہ ہوتا۔ گویا مسئلہ تکثیف نے مسئلہ تبخیر کو ثابت کر دیا۔

احسن الافکار

نہ چمن سے واسطہ ہے نہ غرض ہے آشیاں سے — ہوئی قید میں رہائی، غم و فکرِ دو جہاں سے

تجھے سجدہ کرنے والے بہت اُٹھ گئے جہاں سے — نہ مٹے نشانِ سجدہ ترے سنگِ آستاں سے

نہ ہم آئے خود عدم سے نہ چلے خود اس جہاں سے — وہی لائے تھے وہاں سے وُہی لے چلے یہاں سے

نہ رہی سکوں کی دولت، کہ بجبر چھین لی ہے — ترے تیرِ نیمکش نے مرے قلبِ نیمجاں سے

تری جب نگاہ اُٹھی تو وہ بے پناہ اُٹھی — کوئی دِل بچا نہ ظالم ترے تیرِ بے کماں سے

سرِ پُر غرور اُٹھا کر نہ چلو، خفیف ہو گے — جو اُٹھا ہے یوں زمیں سے وہ گرا ہے آسماں سے

تری خوش خرامیوں کے ترے نقشِ پا ہیں شاہد — کہ بیان کر رہے ہیں وہ دہانِ بے زباں سے

جو ملیں ہزار جانیں، تو اُنہیں وہ خاک جانیں، — جنہیں ہے نیاز حاصل ترے نازِ دلستاں سے

الگ اپنی حسرتوں سے دلِ نا اُمید یوں ہے — کہ بچھڑ گیا ہو جیسے کوئی اپنے کارواں سے

نہ جھُکا نہ جھک سکیگا، نہ دبا نہ دب سکے گا — ترے در کا رہنے والا کسی اور آستاں سے

وہ ہوس پرست دِل ہے وہ بہت ہی پست دل ہے — جو زبان پہ نہ لائے کوئی بات خوفِ جاں سے

پسِ در صدائے دلکش مجھے کیا سُنا رہے ہو — جو پڑا ہُوا ہے پردہ وہ اُٹھاؤ درمیاں سے

نہ سُنیں فغانِ عاشق، مجھے رحم آ رہا ہے — کہ ابھی نہیں ہیں واقف وہ نتیجۂ فغاں سے

مرا حالِ زار سُنتا کوئی کس طرح کہ احسن
نہ کہا گیا زباں سے نہ ادا ہُوا بیاں سے

احسن مارہروی

غزل

کھٹکنا دل کے اندر یا جگر کے پار ہو جانا
مگر غافل نہ مجھ سے اَے نگاہِ یار ہو جانا

یہاں دستور سَو سَو عُذر اِک اِک چینِ ابرو پر
وہاں معمول دن بھر میں خفا سَو بار ہو جانا

تصوّر کر کے اُن کے خواب میں آنیکا لیٹا ہوں
جو مَیں سو جاؤں اے طالع تو تُو بیدار ہو جانا

جہاں تُو نے مجھے یہ درد کی دولت عطا کی ہی
وہاں تُو ہی دوا بھی اے خیالِ یار ہو جانا

نظر کے تیر نے بھی کیا چلن قاتل سے سیکھا ہے
کوئی تڑپے کہ لوٹے اُس کو دِل کے پار ہو جانا

صدؔق جائسی

کچھ شوہروں کے متعلق

(ڈراما)

منظر۔ ایک مشہور ایکٹرس کے مکان میں ملاقات کا کمرہ۔ شام کے پانچ بجے کا وقت۔
ایک مضطرب نوجوان عورت دیر سے ایک مطلا کرسی کے ایک گوشے پر بیٹھی انتظار
کر رہی ہے۔ مشہور ایکٹریس اپنی خلوت گاہ سے برآمد ہوتی ہے۔

مشہور ایکٹریس۔ آپ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں؟

مضطرب نوجوان عورت۔ (گلوگیر آواز سے) جی ہاں!

مشہور ایکٹریس۔ کہئیے۔ میں کیا خدمت کر سکتی ہوں؟

مضطرب نوجوان عورت۔ (ملتجیانہ انداز میں اپنی دونوں باہیں پھیلا کر) میرا شوہر مجھے واپس دے دیجئے۔

مشہور ایکٹریس۔ (حیران ہو کر اُس کے چہرے پر ٹکٹکی باندھ دیتی ہے)

مضطرب نوجوان عورت۔ آپ شاید اس سوچ میں پڑ گئی ہیں کہ وہ ہے کون سا؛ میں آپ کو بتاتی ہوں۔ وہ گورا چٹا نوجوان ہے۔
زیادہ دراز قد نہیں اور عینک لگاتا ہے۔ وہ وکیل ہے۔ آپ کی کمپنی کے مینجر کا قانونی مشیر۔ نام کا پہلا جزو الفرڈ ہے۔

مشہور ایکٹریس۔ اچھا! اچھا! میں انہیں جانتی تو ہوں . . . . . سمجھ گئی۔

مضطرب نوجوان عورت۔ جی ہاں! آپ اُن کو خوب جانتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ میں آپ سے بھیک مانگتی ہوں۔ خدا کے
لئے میرا شوہر مجھے واپس دے دیجئے۔

[طویل خاموشی]

مشہور ایکٹریس۔ آپ میری اس خاموشی کو گھبراہٹ پر محمول نہ کیجئے۔ میں صرف اس لئے حیران ہوں کہ . . . . میں کس طرح آپ کو آپ
کا شوہر واپس دوں دراں حالیکہ وہ میرے پاس ہے ہی نہیں۔

مضطرب نوجوان عورت۔ لیکن آپ نے تو ابھی کہا تھا کہ میں انہیں جانتی ہوں۔

مشہور ایکٹریس۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں نے آپ کے شوہر کو آپ سے چھین لیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں انہیں جانتی

ہوں کمپنی سے میرے گزشتہ عہد نامے کا مسودہ انہوں نے لکھا تھا اور میرا خیال ہے شاید اس کے بعد بھی میں ان سے ایک یا دو دفعہ ملی ہوں۔ وہ خوش خلق سے ہیں نا؛ بھورے بھورے بال ..... ہاں آپ نے اور کیا کہا تھا۔ وہ عینک بھی لگاتے ہیں؛

مضطرب نوجوان عورت۔ جی ہاں!

مشہور ایکٹریس۔ مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی انہیں عینک لگائے ہوئے دیکھا ہو۔

مضطرب نوجوان عورت۔ عینک انہوں نے اتار دی ہوگی۔ وہ آپ کے سامنے بہتر سے بہتر وضع میں پیش ہونا چاہتے ہیں۔ انہیں آپ سے محبت ہے۔ میرے سامنے وہ کبھی عینک نہیں اُتارتے۔ میری موجودگی میں انہیں اس بات کی قطعاً پروا نہیں ہوتی کہ وہ کس حال میں ہیں۔ انہیں مجھ سے محبت نہیں..... میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ میرا شوہر مجھے واپس دے دیجئے۔

مشہور ایکٹریس۔ اگر آپ ایک سادہ لوح نوعمر لڑکی نہ ہوتیں تو میں آپ سے ناراض ہو جاتی۔ آپ کے دل میں یہ انوکھا خیال کس طرح پیدا ہؤا کہ میں نے آپ کا شوہر چھین لیا ہے؛

مضطرب نوجوان عورت۔ وہ ہمیشہ آپ کو پھول بھیجتے ہیں۔

مشہور ایکٹریس۔ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔

مضطرب نوجوان عورت۔ یہ حقیقت ہے۔

مشہور ایکٹریس۔ انہوں نے مجھے کبھی کوئی پھول نہیں بھیجا۔ کیا انہوں نے خود آپ سے کہا ہے کہ میں پھول بھیجتا ہوں؛

مضطرب نوجوان عورت۔ نہیں مجھے پھول والے کی دکان سے اس بات کا سُراغ ملا ہے۔ ہفتے میں تین دفعہ آپ کو پھول بھیجے جاتے ہیں اور اُن کی قیمت وہ خود ادا کرتے ہیں۔

مشہور ایکٹریس۔ یہ سراسر جھوٹ ہے۔

مضطرب نوجوان عورت۔ آپ کا یہ خیال ہے کہ میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؛

مشہور ایکٹریس۔ میرا یہ خیال ہے کہ کسی نے آپ سے جھوٹ کہا ہے۔

مضطرب نوجوان عورت۔ (ایک خط کی تلاش میں اپنے بٹوے کو ٹٹولتے ہوئے) اور اس خط کے متعلق کیا ارشاد ہے؛

مشہور ایکٹریس۔ خط؟

مضطرب نوجوان عورت۔ ہاں ہاں! ان کا خط۔ آپ کے نام! اور وہ کہتے تھے.....

مشہور ایکٹریس۔ ان کا خط! میرے نام؛ دکھائیے.....

مضطرب نوجوان عورت۔ نہیں میں خود آپ کو سناتی ہوں (خط کھولتی ہے اور غمگین آواز سے پڑھنے لگتی ہے) میری پیاری۔ میں

آج تھئیٹر میں نہ آسکوں گا۔ بہت ضروری کام ہے۔ ہزار بار معافی اور ہزار ہا بوسے۔ الفرڈ

مشہور ایکٹرلیس۔ واہ!

مضطرب نوجوان عورت۔ یہ مجھے اُن کی میز پر پڑا ہوا ملا۔ غالباً کسی کے ہاتھ بھیجنے کا ارادہ ہوگا لیکن پھر بھول گئے اور میں نے کھول لیا۔

[رونے لگتی ہے]

مشہور ایکٹرلیس۔ آپ روتی کیوں ہیں؟

مضطرب نوجوان عورت۔ (سسکتے ہوئے) خوب! آپ میرے شوہر کو مجھ سے چھین لیں اور میں نہ روؤں۔ آہ میں جانتی ہوں۔ آپ کے لئے یہ معمولی بات ہے اور بہت آسان۔ اگر ایک رات آپ ایک شہزادی کے لباس میں ملبوس ہوتی ہیں تو دوسری رات ایک یونانی دیبی کی طرح لباس سے آزاد ہو جاتی ہیں۔ آپ اپنے ابرو سیاہ کر لیتی ہیں اور پلکیں نوکیلی۔ آپ اپنے ہونٹوں پر سُرخی اور چہرے پر طرح طرح کے غازے لگاتی ہیں۔ آپ کے پاس خوبصورت بننے کے لئے قسم قسم کے اُبٹنے اور گلگونے ہیں اور نکتہ سنج اور عقلمند بننے کے لئے مصنفوں کے چلتے ہوئے فقرے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایک غریب سا وہ دل وکیل آپ کے دامِ اُلفت میں گرفتار ہو گیا ہے بھلا میں ان سیدھے سادھے کپڑوں اور اپنے ہی ہونٹوں اور اپنے ہی ابروؤں اور اپنے سیدھے سادھے طور طریق سے آپ کا کیا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ مجھے اٹھلا کر چلنا، ناز و ادا دکھانا اور مردوں کے دلوں کو فریفتہ کرنا نہیں آتا۔ مجھے شیکسپئر صاحب نے نفیس مکالمے لکھ کر نہیں دیئے۔ . . . . ممکن ہے کہ آپ مجھ سے بھی زیادہ سادہ لوح ہوں لیکن اس کا مجھے اقرار ہے کہ جب سوال مردوں کو فریفتہ کرنے کا ہو تو میرا آپ کا کوئی مقابلہ نہیں۔

مشہور ایکٹرلیس۔ یہ عجیب دلچسپ معاملہ ہے۔

مضطرب نوجوان عورت۔ کون سا؟

مشہور ایکٹرلیس۔ آپ کا

مضطرب نوجوان عورت۔ میرا؟ آپ کا مطلب کیا ہے؟

مشہور ایکٹرلیس۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مجھے نہ کبھی آپ کے شوہر نے کوئی پھول بھیجا ہے، نہ کوئی خط اور نہ کوئی اور چیز۔ اچھا یہ تو بتایئے کیا یہ درست نہیں کہ کچھ عرصے سے آپ دونوں میں ناچاقی سی رہی ہے؟

مضطرب نوجوان عورت۔ یقیناً ناچاقی رہی ہے؟

مشہور ایکٹرلیس۔ اور پہلے آپ دونوں کو ایک دوسرے سے بہت محبت تھی؟

مضطرب نوجوان عورت۔ جی ہاں! بہت محبت تھی۔

مشہور ایکٹرلیس ۔ اور اب کچھ عرصے سے سرد مہری پیدا ہوگئی ہے ۔
مضطرب نوجوان عورت ۔ جی ہاں ۔
مشہور ایکٹرلیس ۔ اب میں سمجھی ۔ پیاری بہن اگر آپ کو معلوم ہو کہ ہم ایکٹرسوں کو کتنی مرتبہ اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں تو آپ خود کہیں کہ یہ واقعہ خلافِ معمول نہیں ۔ ظاہر ہے کہ آپ کے شوہر نے یہ کھیل آپ کے جذبۂ رقابت کو برانگیختہ کرنے کے لئے کھیلا ہے تاکہ آپ دوبارہ اُن سے پہلے کی طرح دلچسپی لینا شروع کردیں ۔
مضطرب نوجوان عورت ۔ (حیرت و استعجاب کی تصویر بن کر) کیا سچ مچ آپ کا یہ خیال ہے کیا پہلے بھی کبھی آپ کو ایسا کوئی واقعہ پیش آچکا ہے؟
مشہور ایکٹرلیس ۔ جی ہاں ! بارہا ۔ ایسے واقعات ہر اُس ایکٹرلیس کو پیش آتے ہیں جو ذرا قبول صُورت اور کامیاب ہو ۔ یہ دُنیا کا ایک پُرانا آزمودہ نسخہ ہے اور ہم ایکٹرسوں کو اکثر حصولِ مقصد کا وسیلہ بننا پڑتا ہے ۔ شاید ہی کوئی مرد ہوگا جس کا تھیٹر سے کچھ تعلق ہو اور وہ ایک نہ ایک وقت یہ تدبیر اختیار کرنے کی ضرورت نہ سمجھے ۔ مصنفین ، ادبا ، منظر نگار ، ماہرینِ موسیقی ، یہاں تک کہ کمپنی کے مالک بھی کبھی نہ کبھی یہ تدبیر اختیار کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں ۔ انہیں اپنی بی بی یا محبوبہ کی کھوئی ہوئی اُلفت کی بازیافت کے لئے ہم میں سے کسی کے ساتھ محبت کا ایک جھوٹا افسانہ تراشنا پڑتا ہے ۔ بی بی فوراً اس افسانے کو درست تسلیم کرلیتی ہے ۔ ہم لوگوں کو یا تو اس واقعہ کی اطلاع ہی نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی تو ہم اس میں مضائقہ نہیں سمجھتے ۔ ہمیں کم از کم یہ اطمینان تو ہوتا ہے کہ ہم بہت سی ایسی شادیوں کو کامیاب بنانے کا ذریعہ بنے ہیں جن کا انجام بصورتِ دیگر طلاق کی عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانے پر ہوتا ۔
مضطرب نوجوان عورت ۔ لیکن میں . . . میں کس طرح یہ بات سمجھ سکتی تھی ؟
مشہور ایکٹرلیس ۔ (شفقت آمیز تبسم کے ساتھ) نہیں پیاری بہن آپ کو عذر پیش کرنے کی ضرورت نہیں ۔ بھلا آپ کس طرح سمجھ سکتی تھیں ؟ یہ بات ہی ایسی ہے کہ انسان یقین کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے ۔ عورتوں کو خیال ہوتا ہے کہ ہمارے شوہر ایسے ماحول میں رہتے ہیں جہاں ہر وقت ہوا و ہوس کی ترغیبات اُن کا محاصرہ کئے رہتی ہیں اور اس ماحول میں ایسی زہرہ جبینوں کی کثرت ہوتی ہے جو اخلاقی قوانین اور معاشری پابندیوں سے قطعاً آزاد ہوتی ہیں ۔ عورتوں کا خیال ہے کہ ایک ایکٹرلیس ایک ہزار عام عورتوں سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے آپ ہم سے ڈرتی اور نفرت کرتی ہیں . . . . اس حقیقت سے آپ کے شوہر جو ایک ہوشیار وکیل ہیں خوب واقف ہیں ۔ چنانچہ وہ آپ کے خوف و رشک کے جذبات سے فائدہ اُٹھا کر آپ کی وہ محبت جس سے آپ نے انہیں محروم کر رکھا ہے دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔ وہ میرے نام خط لکھ کر میز پر رکھ جاتے ہیں . . . . یقین کیجئے کوئی وکیل اتنا بیوقوف نہیں ہوتا کہ اس سے بلاقصد اس قسم کی غفلت سرزد ہو ۔ صبح وہ میرے لئے پھُولوں کی فرمائش بھیجتے ہوں گے اور غالباً دفتر پہنچتے ہی اسے منسوخ کردیتے ہونگے ۔ ہاں یہ تو کہئے اُن کے پاس میرے بالوں کی کوئی لٹ تو نہیں ؟

مضطرب نوجوان عورت۔ جی ہاں۔ ہے تو سہی۔ وہ اُسے اپنی میز کی دراز میں رکھتے ہیں۔ میں اسے اپنے ساتھ ہی لائی ہوں۔

مشہور ایکٹرلیس۔ بالوں کی چوری کے لئے لوگ ہمارے بال بنانے والوں کو رشوت دے دیتے ہیں بلکہ میں تو حیران ہوں کہ اب تک میرے سر پر کوئی بال باقی ہی کیوں ہے۔

مضطرب نوجوان عورت۔ (مسرت سے اچھل کر) اچھا تو اس طرح انہوں نے یہ بال حاصل کئے ؟

مشہور ایکٹرلیس۔ میرا تو یہی خیال ہے۔ ورنہ اس کی اور تو کوئی توجیہہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اچھا یہ تو کہئے وہ کچھ عشقیہ خطوط تو اِدھر اُدھر نہیں رکھ دیتے ؟

مضطرب نوجوان عورت۔ (خوف زدہ ہو کر) نہیں تو !

مشہور ایکٹرلیس۔ آپ ناحق پریشان کیوں ہوتی ہیں۔ میں نے انہیں کوئی خط نہیں لکھا۔

مضطرب نوجوان عورت۔ لیکن آپ نے کس خیال ———

مشہور ایکٹرلیس۔ بات یہ ہے کہ اگر وہ میرے پاس آتے اور کہتے "سارا میں کہتا ہوں تم میری خاطر ایک ذرا سا کام کرو گی۔ میری بیوی آج کل مجھ سے کچھ کشیدہ سی رہتی ہے۔ کیا تم مجھے ایک پُرشوق محبت نامہ لکھ کر نہ دے سکو گی جو میں گھر میں کہیں اِدھر اُدھر رکھ دوں تاکہ کسی طرح میری بیوی کے ہاتھوں میں پڑ جائے . . . " میں ضرور ان کی یہ درخواست قبول کر لیتی اور ایک ایسا خط لکھ کر دیتی کہ کم از کم دو ہفتے تک آپ کا تکیہ آنسوؤں سے تر رہتا۔ ایک دفعہ میں نے ایک ڈرامانگار کے لئے دس ایسے خط لکھے تھے لیکن وہ اس کے کام نہ آسکے کیونکہ اس کی بیوی ایسی بااصول عورت تھی کہ وہ سب کے سب خطوط پڑھے بغیر اس کے حوالے کر دیتی رہی۔

مضطرب نوجوان عورت۔ آپ کتنی عقلمند ہیں اور کتنی نیکدل۔

مشہور ایکٹرلیس۔ میں تھیئٹر کی کسی دوسری لڑکی سے نہ اچھی ہوں نہ بُری۔ یہ اور بات ہے کہ آپ ہمیں زہریلی ناگنوں سے بدتر سمجھتی ہیں۔

مضطرب نوجوان عورت۔ (پشیمان ہو کر) توبہ! میں بھی کیسی بیوقوف تھی۔

مشہور ایکٹرلیس۔ سچ تو یہ ہے کہ جب میں آپ کی اشک آلود آنکھیں اور مسرت سے تمتمایا ہوا چہرہ دیکھتی ہوں اور یہ محض اس انکشاف کے باعث کہ ایک گورے چٹے عینک والے مردوئے کو ابھی تک آپ سے محبت ہے تو آپ واقعی مجھے کسی قدر سادہ لوح معلوم ہوتی ہیں۔ پیاری بہن کوئی مرد اس قسم کی پرستش کا مستحق نہیں۔ مگر خیر یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ ہے نا ؟

مضطرب نوجوان عورت۔ جی ہاں!

تجلّیات

انجم و مہر و ماہ میں جلوہ دکھا رہا ہے کون!
جلوہ دکھا دکھا کے پھر خود کو چھپا رہا ہے کون!

دامنِ کوہسار میں کس کا سکوتِ دلنواز
بربطِ آبشار میں راگ سُنا رہا ہے کون!

بحر کے مدّ و جزر میں کس کے جلال کا خروش
جوئے رواں کے حُسن میں نغمے بہا رہا ہے کون!

بن کے جمالِ ماہتاب، بن کے شبابِ آفتاب
بن کے بہار در بہار دہر پہ چھا رہا ہے کون!

ماہِ دو ہفتہ کا جمال، وقفِ سکوں ہے کائنات
سینے میں بن کے اضطراب مجھکو ستا رہا ہے کون!

راز کبھی نہ کھُل سکا، آہ! کبھی نہ کھُل سکا،
کس میں سما رہا ہوں میں مجھ میں سما رہا ہے کون!

اثر صہبائی

دست بریدہ بھوت

اس بات کا سب کو علم ہے کہ مشہور ہندوستانی ڈاکٹر رستم خاں نے مجھے اپنا متبنّےٰ قرار دیا اور میں اُن کی وفات کے صرف ایک گھنٹے بعد غریب اور محنتی دوا فروش سے ایک متموّل انسان بن گیا۔ بعض حضرات صاحب موصوف کے اس فعل کو دیوانگی تصوّر کرتے ہیں کیونکہ مجھ ایسے دُور کے رشتہ دار کے علاوہ کئی ایسے افراد موجود تھے جو اُس دولت کے مالک بن سکتے تھے۔ مگر میں یقین دلا سکتا ہوں کہ یہ فعل کسی دیوانگی کا نتیجہ نہ تھا اور یہ بھی یقین دلا سکتا ہوں کہ مجھے ڈاکٹر صاحب سے اُن کی زندگی کے آخری ایام میں ملاقات کرنے کا موقع ملا، اور بعض ایسی وجوہ تھیں جن کی بنا پر اُنہوں نے مجھے اپنی دولت کا واحد مالک قرار دیا۔ اگر میں خود اپنے مُنہ سے اِن وجوہ کو بیان کروں تو شاید آپ اُسے اپنے مُنہ میاں مٹھو بننے کے مرادف خیال کریں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کے لئے جو خدمات انجام دیں وہ ہر شخص سے ممکن نہ تھیں۔ اور ان سے آپ کو آگاہ کرانا میرا فرض ہے کیونکہ شاید اس طرح ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے۔ میری باتوں پر یقین کرنا یا نہ کرنا آپ کی مرضی پر منحصر ہے:۔

سر رستم خاں۔ سی، بی، کے، سی، ایس، آئی اور خدا معلوم کیا کیا کچھ، ہندوستان میں اپنے زمانے کے بہترین جرّاح اور ڈاکٹر مانے گئے تھے وہ کلکتہ میں دیر تک سرکاری ملازم کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے، اور ینٹیل ہاسپٹل کی بنیاد بھی انہی کے ساعئ جمیلہ کی مرہونِ منت ہے۔

شب و روز کی متواتر محنت و مشقت کے بعد ایک ایسا دن آیا جب اُنہیں معلوم ہُوا کہ وہ اب اپنے کام اور طبّی تحقیق کو جاری نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ زندگی کے باقی ماندہ ایام کو آرام سے گذارنے کی خاطر اُنہوں نے کلکتے کو خیرباد کہی اور اپنے وطن مالوف بمبئی کو روانہ ہو گئے۔

بمبئی پہنچ کر انہوں نے اپنی سکونت کے لئے باندرے کے قریب ایک کشادہ کوٹھی خرید لی جہاں وہ اپنا بیشتر وقت مطالعہ میں صرف کرنے لگے۔

اپنے متموّل اور بے اولاد رشتے دار کی آمد کی خبر ہمارے کُنبہ بھر کے لئے ایک دلچسپ خبر تھی۔ اُن دعوت ناموں سے جو ڈاکٹر صاحب نے اپنے مختلف رشتے داروں کے نام بھیجے، ہم پر یہ بات روشن ہو گئی کہ اُن کے دل میں ہماری یاد ابھی تک باقی ہے۔

گو سب سے آخر مجھ کو طلب کیا گیا جس کا مجھے قدرتی طور پر رنج تھا مگر چونکہ ڈاکٹر صاحب کو رنجیدہ کرنا مقصود نہ تھا اور مجھے بھی اُن سے ملنے کا اشتیاق تھا میں اپنی بیوی سے اجازت لے کر اُن کی خدمت میں روانہ ہو گیا۔

گاڑی میں ایک گھنٹے کے سفر کے بعد میں اپنے چچا کے مکان پر پہنچ گیا۔ اُن کا خادم مجھے مطالعہ کے کمرے میں لے گیا جہاں وہ انگیٹھی کے قریب ایک صوفے پر بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔

کمرے میں کسی کی آہٹ پاکر وہ یکلخت چونک پڑے اور میرا گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا ——— اُن دو بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے جو مجھے دیکھ رہی تھیں یہی معلوم ہوتا تھا گویا وہ میرے سینے کے اندر داخل ہو کر میرا جائزہ لے رہی ہیں۔

اُن کے جسم سے جواب محض ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ کبھی زمانہ میں قوی الجثہ ہوں گے۔ اُن کی غیر معمولی مضطرب نگاہوں سے یہ پتہ چلتا تھا کہ اُن کی زندگی سے کوئی ایسا اہم واقعہ ضرور متعلق ہے جس نے اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے اور اُن کے جسم کو آہستہ آہستہ دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔

چچا کے استقبال کی گرمجوشی نے مجھے ایک گھنٹے کے عرصے کے اندر اندر ہی اُن سے بے تکلف کر دیا۔ کھانے میں اُن کی بیوی بھی ہمارے ساتھ شریک ہوئیں۔

اُن کی بیوی کی نگاہوں میں بھی اضطراب کی وہی لہر جھلکیاں لے رہی تھی ——— میں سخت متعجب تھا کہ وہ کونسا ایسا اہم واقعہ ہو سکتا ہے جس نے ان دونوں کو یکساں مضطرب کر رکھا ہے؛

باتوں باتوں میں مافوق الفطرت قصوں کا ذکر آ گیا۔ چونکہ مجھے ایسی باتوں سے نفسیات کا ایک طالب علم ہونے کی وجہ سے گہری دلچسپی تھی، میں نے اُن سے وہ واقعات بیان کئے جن میں مجھے اکثر اوقات مافوق الفطرت اشیاء سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ جب میں نے اُن سے یہ بیان کیا کہ ایسے محیّر العقول واقعات مجھے خوفزدہ کرنے کے بجائے ایک دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں تو وہ میری گفتگو کو بڑی توجہ سے سننے لگے۔

گفتگو کے دوران میں ڈاکٹر صاحب نے کئی بار اپنی بیوی کی طرف پُرمعنی نگاہوں سے دیکھا مگر میں اس کا صحیح مطلب سمجھنے سے قاصر رہا۔

جب ڈاکٹر صاحب کی بیوی اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں تو اُنھوں نے مجھے ایک سگرٹ پیش کرتے ہوئے کہا "مسٹر نیاز! اگو مجھے آپ سے بہت کم گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے مگر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی وہ شخص ہیں جس کی مجھے ایک عرصے سے تلاش تھی۔"

میں نے اپنے چچا کے یہ تعریفی الفاظ سن کر کہا "یہ آپ کا حُسنِ ظن ہے"!

"اگر میں یہ کہوں کہ آپ ایک قوی دل کے مالک ہیں تو اُس کو خوشامد سے تعبیر نہ کیجیئے گا۔ کیونکہ اس قسم کے تکلفات ایسے نازک موقع پر استعمال نہیں کیئے جا سکتے ـــــ ہاں! تو چونکہ آپ کو ایسی چیزوں سے لگاؤ ہے اور آپ اُن کا فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کیا کرتے ہیں۔ کیا میں یہ خیال کر سکتا ہوں کہ کوئی بھُوت یا آوارہ روح آپ کو خوفزدہ نہیں کر سکتی؟"

"میرا خیال تو یہی ہے جناب!"

"بلکہ وہ نظارہ آپ کے لئے دلچسپ ہوگا۔"

"بڑی حد تک۔"

اس پر اُنھوں نے ایک لمبی آہ بھری۔

"مسٹر نیاز! یقین کیجیئے گا، ایک وقت تھا جب میں بھی آپ کی طرح کسی چیز سے خائف نہ ہوتا تھا۔ قوی دل ہونے کے باعث میں کلکتہ بھر میں مشہور تھا ـــــ مگر اب میں وہ نہیں رہا۔ خدا کے لئے اس معاملے میں جرأت سے کام نہ لیجیئے، ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کو وہی کڑا امتحان دینا پڑے گا جس نے آج کل مجھے عاجز کر رکھا ہے ـــــ ایسا امتحان جس کا انجام پاگل خانہ یا قبر کی چار دیواری ہے!"

تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد وہ اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولے "چند سال سے ایک مہیب اور ناقابلِ تسلیم واقعے نے میری اور میری بیوی کی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے۔ گو وہ واقعہ ہر روز پیش آتا ہے لیکن اُس کا اعادہ ہماری تابِ برداشت میں اضافہ نہیں کر سکا۔ اگر آپ کو کوئی چیز خوفزدہ نہیں کر سکتی تو میں اس معاملے میں آپ کی رائے کو بہت قیمتی خیال کروں گا۔"

"میری ناچیز رائے ہر وقت آپ کے لئے حاضر ہے مگر مجھے معاملے کی نوعیت تو معلوم ہونی چاہیئے!" میرا اشتیاق حد سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔

"اس واقعہ کی تفصیلات سننے سے پیشتر کیا آپ میرے ساتھ دوسرے کمرے تک چلنے کی تکلیف گوارا فرما سکتے ہیں؟"

یہ کہتے ہوئے وہ مجھے دارالتجربہ میں لے گئے جو لاتعداد آلاتِ جراحی اور بے شمار بوتلوں سے بھرا پڑا تھا۔ ایک میز پر شیشے کے مرتبان جن میں مختلف قسم کے حیوانی اعضا محفوظ تھے ایک قطار میں سجے ہوئے تھے۔

"مرتبانوں کی قطار دیکھی آپ نے؟ ـــــ یہ اُس قیمتی مجموعے میں سے صرف چند ہیں جو خوش قسمتی سے میرے کلکتے کے مکان کی آتشزدگی کے بعد باقی بچ گئے تھے۔ یہ نقصان ہر طرح میرے لئے ناقابلِ تلافی ثابت ہوا ہے۔"

میں نے اُن مرتبانوں کی طرف دوبارہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے جمع کردہ اعضا کیڑے مکوڑے اور مختلف اقسام کی ہڈیاں جو مرتبانوں میں بڑی نفاست سے محفوظ رکھی تھیں، واقعی بیش قیمت ہیں۔

تھوڑی دیر کمرے میں ٹہلنے کے بعد ڈاکٹر صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے "میں بہت ممنون ہونگا اگر آپ آج کی رات اسی کمرے میں قیام فرمائیں ——— اور اگر آپ کسی وجہ سے ایسا نہیں کرسکتے تو بلا تامل مجھ سے کہہ دیجئے "

مجھے کیا عذر ہوسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً ہی کہا "اس کے بالکل برعکس! میں بالکل تیار ہوں "

"میرا کمرہ آپ کے دائیں طرف ہے، اگر آپ کو کسی وقت میری ضرورت محسوس ہو تو میں صرف ایک آواز پر حاضر ہوجاؤں گا"

میں نے اپنے چچا کو مطمئن کرتے ہوئے کہا "مجھے یقین ہے میں آپ کو ہرگز ایسی تکلیف نہ دوں گا "

"مگر یہ ناممکن ہے کہ مجھے نیند آجائے ——— میں بہت کم سوتا ہوں۔ اس لئے ضرورت کے وقت مجھے بلانے میں تامل نہ کیجئے گا"

یہ تاکید کرکے ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔ یہ کمرہ یعنی ڈاکٹر صاحب کا دارالتجربہ کسی طرح بھی سونے کے لئے موزوں نہ تھا۔ قسم قسم کی بوتلیں مرتبانوں کی قطار جن میں خدا معلوم کن کن حیوانوں کے اعضا رکھے تھے سپرٹ اور دیگر ادویہ کی تیز بو فضا کو بہت مکدر بنا رہی تھی۔ کھڑکی پر کوئی پردہ نہ تھا اس لئے چاند کی سیمیں کرنیں آزادانہ کمرے کی دیوار پر پڑ رہی تھیں۔

میں نے لیمپ کو گل کردیا۔ کیونکہ چاند کی روشنی کمرے کے لئے کافی تھی۔ اب کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا۔ میں نے شب خوابی کا لباس پہنا اور کسی حادثے کی توقع سے خالی الذہن ہوکر سوفے پر لیٹتے ہی سوگیا۔

کمرے میں کسی کی آہٹ سن کر میں بیدار ہؤا۔ مجھے سوتے ہوئے غالباً تین چار گھنٹے ہوگئے تھے کیونکہ چاند کی روشنی کا وہ دھبا جو دیوار پر تھا اب وہاں سے ہٹ کر میرے سوفے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس آہٹ کی جستجو میں کمرے کے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں مگر تاریکی کی وجہ سے مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ آہستہ آہستہ جب میری نظریں تاریکی کی عادی ہوگئیں۔ تو میرے بدن میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی جب میں نے کسی چیز کو کمرے میں حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ اس چیز کے چلنے سے ایک مدھم شور پیدا ہو رہا تھا جو فضا کو اور بھی بھیانک بنا رہا تھا ——— !وہ چیز ایک انسانی جسم تھا جو دروازے کی جانب سے کمرے میں دبے پاؤں چلا آرہا تھا۔

جب وہ سایہ نما انسان چاند کی روشنی کے درمیان آیا تو مجھے معلوم ہؤا کہ وہ ایک متوسط قد کا آدمی ہے جو سر سے پیر تک ایک سپید لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔

چاند کی روشنی میں اس کا چہرہ ایک مہیب منظر پیش کر رہا تھا۔

وہ ان مرتبانوں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھا جن میں مختلف قسم کے انسانی اعضا پڑے ہوئے تھے۔ وہاں پہنچ کر اس نے میری طرف نگاہیں اٹھائیں، تھوڑی دیر ٹھیرا اور ناامیدی سے اپنے ہاتھ اوپر کی طرف اٹھائے نظروں سے غائب ہوگیا ——— ہاتھ نہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بازو اوپر کی طرف اٹھائے کیونکہ اس حالت میں میں نے اس کے بائیں ہاتھ کو اپنی جگہ سے غائب پایا۔

چونکہ میں نے اُس نظارہ کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا اور اُس شخص میں کوئی ایسی چیز موجود نہ تھی جو خلاف فطرت ہو اس لئے پہلے پہل میں نے یہی خیال کیا کہ شاید وہ ڈاکٹر صاحب کا خادم ہوگا جو غلطی سے اُس کمرے میں چلا آیا ہے۔ مگر جب وہ یکایک میری نظروں سے غائب ہوگیا تو میں فوراً اپنی جگہ سے اُچھلا اور لیمپ جلا کر تمام کمرے کو چھان مارا۔ جب اس شخص کا کوئی پتہ نہ چلا تو قدرتی طور پر مجھے یہ یقین ہوگیا کہ اس شخص کی پُراسرار گمشدگی واقعی غیر فطری اور عقل انسانی کی حدود سے باہر ہے۔

میں نے شب کا باقی حصہ جاگتے ہوئے کاٹا لیکن اس قسم کا کوئی واقعہ پھر پیش نہ آیا۔

میں صبح جلد بیدار ہونے کا عادی ہوں لیکن مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب مجھ سے کہیں زیادہ سحر خیز تھے۔ کیونکہ وہ علی الصباح ہی صحن میں پورا لباس پہنے ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بھاگے ہوئے آئے اور کہنے لگے "ہاں! ہاں! بتایئے کیا آپ نے اُسے دیکھا؟"

"ایک ہاتھ والے انسان کو؟"

ڈاکٹر صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں اُسی کو"۔

"جی ہاں میں نے اُس شخص کو اچھی طرح دیکھا ہے" اور یہ کہنے کے بعد میں نے رات والا واقعہ من وعن بیان کردیا جب میں اپنی کہانی سُنا چکا تو وہ مجھے اپنے مطالعے کے کمرے میں لے گئے اور مجھے کرسی پیش کرتے ہوئے بولے:۔

"قبل اس کے کہ اس محیر العقول واقعے کی تفصیلات بیان کی جائیں مجھے اُمید ہے کہ آپ پر وہ وجوہ روشن ہوگئی ہونگی جو میرے ذہنی تلاطم اور جسمانی کمزوری کا باعث ہیں۔ ہر روز اس شخص کا یہی مشغلہ ہے ــــ دروازے کے قریب سے ظاہر ہوتا ہے میرے کاندھوں کو پکڑ کر زور سے ہلاتا ہے اور پھر مرتبانوں کی قطار کے پاس جا کر نظروں سے غائب ہوجاتا ہے"۔

میں نے حیران ہو کر کہا "لیکن آخر یہ چاہتا کیا ہے"؟

"اپنا کٹا ہوا ہاتھ"

"ہاتھ؟"

"ہاں! ہاں! اپنا ہاتھ ــــ واقعہ یوں ہے کہ کلکتہ میں میرے پاس ایک مریض آیا جس کا ہاتھ بُری طرح زخمی ہو رہا تھا۔ چونکہ اُس کا علاج ناممکنات میں سے تھا اور یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ زخم بڑھ کر دوسرے اعضاء کو بھی نقصان نہ پہنچائے۔ میں نے اُس سے کہا۔ دیکھو بھئی! بہتر یہی ہے کہ تم برضا و رغبت اپنا ہاتھ کٹوا ڈالو ــــ بہت سمجھانے بجھانے کے بعد وہ راضی ہوگیا۔

عمل جراحی کے بعد اُس نے مجھ سے میری فیس کے متعلق سوال کیا۔ بیچارہ بالکل فقیر سا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُس

سے مذاق کرتے ہوئے کہا کہ میری فیس تمہارا ہاتھ ہے جسے میں اپنے دار التجربہ کی ایک بوتل میں بند کر رکھوں گا۔ یہ سُن کر وہ بہت سٹپٹایا اور کہنے لگا۔ مذہب ہمیں بتاتا ہے کہ قیامت کو جسم دوبارہ زندہ کیا جائے گا اس لئے میرا کٹا ہُوا ہاتھ میرے پاس رہنا ضروری ہے۔ اس پر میں نے اُسے کٹا ہُوا ہاتھ دکھایا اور پوچھا کہ تم اُسے کس طرح حفاظت سے رکھ سکو گے۔ تمہارے پاس تو ایسی دوائیں ہی نہیں۔ چنانچہ بہت بحث مباحثے کے بعد وہ اپنا ہاتھ اس شرط پر میرے پاس چھوڑ گیا کہ میں اُسے انتہائی حفاظت سے رکھونگا ــــــ وہ شخص چلا گیا اور تھوڑے عرصے کے بعد ہی یہ معاملہ میرے ذہن سے اُتر گیا۔ اس شخص پر عمل جراحی کرنے کے چند ماہ بعد میرے مکان کو آگ لگ گئی جس میں اور بیش بہا چیزوں کے علاوہ وہ مرتبان بھی ضائع ہوگیا جس میں اُس کا ہاتھ محفوظ رکھا گیا تھا ــــــ پہلے پہل تو مجھے اس ہاتھ کے ضائع ہونے کا خیال بھی نہ آیا مگر ایک برس بعد میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ کسی نے مجھے زور سے جھنجھوڑا۔ میں بستر پر سے اُٹھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ وہی مریض ایک بڑا سا لبادہ پہنے میرے سرہانے کھڑا ہے اور میری طرف ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مرتبانوں کے پاس گیا اور اُن کو بغور دیکھ کر وہاں سے غائب ہوگیا ــــــ مسٹر نیاز! یہ ہے سارا قصہ۔ یہ وہی مریض ہے جو ہر شب اس مکان میں آتا ہے اور یہ وہی انسان نما بھوت ہے جس نے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔"

یہ تھی ڈاکٹر رُستم خان کی کہانی ــــــ بعض حضرات کے نزدیک یہ واقعہ ناقابلِ یقین اور غیر ممکن ہوگا مگر مجھے ڈاکٹر صاحب کے بیان کی صحت کے متعلق کوئی شک و شبہ نہ تھا ــــــ اب میں نے دن کا بیشتر حصہ صرف اسی غور و فکر میں صرف کر دیا کہ کوئی ایسی تدبیر سوچوں جس سے یہ بلا ٹل جائے۔ چنانچہ شام کے وقت ایک نتیجے پر پہنچ کر میں نے اپنے میزبانوں کو یہ کہہ کر حیرت میں ڈال دیا کہ میں دوسری گاڑی سے پونا جا رہا ہوں۔

"مسٹر نیاز! معلوم ہوتا ہے میں نے اس واقعے کو آپ سے بیان کرنے میں ایک سخت غلطی اور غیر میزبانانہ فعل کا ارتکاب کیا ہے ــــــ مجھے چاہیئے تھا کہ یہ سب بوجھ اپنے ہی کاندھوں پر رہنے دیتا۔"

"ڈاکٹر صاحب آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے ــــــ میرا گھر واپس جانا اسی واقعے سے تعلق رکھتا ہے۔ میں تو ابھی آپ سے اجازت طلب کرنے والا تھا کہ آج کی رات بھی مجھے اسی کمرے میں سونے دیا جائے ــــــ میں اس غیر معمولی ملاقاتی کو ایک بار اور دیکھنے کی خواہش رکھتا ہوں۔"

چنانچہ میں وہاں سے رخصت ہو کر سیدھا پونا کے بڑے اسپتال میں گیا۔ جہاں میرا ایک دوست ہوس سرجن کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی اُس سے کسی مُردے کا ہاتھ طلب کیا۔ چونکہ اُسے علم تھا کہ میں ہر وقت مختلف اقسام کے تجربوں میں مشغول رہتا ہوں اُس نے بغیر کچھ دریافت کئے مجھے ایک لاوارث مُردے کا ہاتھ کاٹ کر لا دیا جو میڈیکل سکول

کے لڑکوں کو عمل جراحی کی تعلیم دینے کی غرض سے اسپتال میں پڑا تھا۔

جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق تھا مجھے اس بات پر یقین تھا کہ وہ شخص اپنا ہاتھ واپس لینے کے لئے بیقرار ہے اور یہی بیقراری اُس کی روح کو آوارہ پھرا رہی ہے۔ اس لئے میں نے خیال کیا کہ شاید کبھی دوسرے شخص کا ہاتھ اُس کو مطمئن کر سکے ——— یہ محض ایک خیال تھا اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے خود اپنے اس خیال پر ہنسی آتی تھی کہ میں ایسی مہمل سعی کر رہا ہوں!

القصہ میں وہ ہاتھ لے کر ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچا اور انہیں اپنے مقصد سے بالکل آگاہ نہ کیا۔

جب میں سونے کے لئے اُس کمرے میں گیا تو میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اُس ہاتھ کو ایک مرتبان میں ڈال دیا ——— اب وہ ہاتھ قطار والے مرتبانوں میں سے ایک میں پڑا تھا۔ میں اپنی کوشش کا نتیجہ دیکھنے کے لئے اس قدر بے تاب تھا کہ بالکل نہ سو سکا۔ چنانچہ ایک سوفے پر بیٹھ کر میں نہایت بے چینی سے اُس شخص کی آمد کا انتظار کرنے لگا ——— وہ آیا، وہی بڑا سا لبادہ پہنے ہوئے پہلی شب کی طرح وہ میرے قریب پہنچ کر ٹھٹکا مگر پھر وہ مرتبانوں کی قطار کی طرف بڑھا۔ اُس کی نگاہیں اُس ہاتھ والے مرتبان کی طرف پڑیں۔ اُس نے مرتبان کو لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اُٹھایا اور اُٹھاتے ہی غصہ کی حالت میں اُسے زمین پر دے مارا ——— مرتبان کے گرتے ہی وہ غائب تھا۔

ابھی ایک منٹ بھی گذرنے نہ پایا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور پوچھا "خیر تو گزری ——— کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں صاحب! ——— نا اُمیدی کا سامنا ضرور کرنا پڑا ہے۔"

اب میں نے اُن کو اپنی کوشش اور اُس کے نتیجے کے متعلق سب کچھ سنا دیا۔ انہوں نے میری گفتگو کو نہایت غور سے سنا مگر سر ہلاتے ہوئے بولے "آپ کی کوشش پُر معنی ضرور تھی مگر میرا خیال ہے ہمیں اس معاملے کو سر دست یہیں چھوڑ دینا چاہئے مبادا کسی مہلک حادثے سے دوچار ہونا پڑے۔"

ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد صبح تک میں یہی سوچتا رہا کہ میری کوشش ناکام کیوں ثابت ہوئی؟ ——— بہت غور وفکر کے بعد میں نے زمین پر سے وہ ہاتھ اُٹھایا جو مرتبان کے شکستہ ٹکڑوں کے قریب پڑا ہوا تھا۔ ہاتھ اُٹھاتے ہی میرے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی ——— وہ ہاتھ دایاں تھا اور اُس شخص کا بایاں ہاتھ کٹا ہوا تھا۔

صبح کی پہلی گاڑی میں مَیں پھر اُسی اسپتال کو گیا اور اپنے دوست سے اُسی لاش کا بایاں ہاتھ کٹوا کر اپنے ساتھ لیتا آیا مگر اب یہ دشواری پیش آئی کہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اُس کمرے میں سونے کی اجازت دینے سے قطعی انکار کر دیا۔

میں نے بہت منت سماجت کی مگر بے سُود۔ چنانچہ میں نے اُس ہاتھ کو پہلی طرح ایک مرتبان میں بند کر کے میز پر

رکھ دیا اور آپ ایک دوسرے کمرے میں چلا آیا جو ڈاکٹر صاحب نے میرے سونے کے لئے تیار کرا رکھا تھا۔

بھلا مجھے نیند کس طرح آتی۔ میرا دل تو اُس تجربے کی طرف لگا ہُوا تھا۔ رات کے کوئی دو بجے ہونگے جب ڈاکٹر صاحب شب خوابی کا لباس پہنے بھاگتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ مجھے اُن کی غیر معمولی آمد پر اس قدر تعجب نہ تھا جس قدر اُن کا چہرہ دیکھنے پر ہُوا۔ وہ واقعی ایک جوان معلوم ہو رہے تھے۔ آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ اپنا ہاتھ ایک فاتحانہ انداز میں ہلا رہے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُنہوں نے چلّا کر کہا:۔

"ہم کامیاب ہو گئے ہیں ـــــ مسٹر نیاز میں کن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں"۔

"کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ وہ معاملہ ختم ہو گیا؟ ـــــ یعنی وہ شخص راضی ہو گیا؟"

"ہاں! ہاں! اب وہ کبھی نہ آئے گا ـــــ مسٹر نیاز! میں آپ کے اس احسانِ عظیم کا معاوضہ کسی طرح ادا نہیں کر سکتا۔ بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ ـــــ آپ نے نہ صرف مجھے اُس بلا سے نجات دلائی ہے بلکہ میری بیوی کی جان کو بھی بچا لیا ہے جو اس ہر روز کے حادثے کی وجہ سے اندر ہی اندر گھُلی جا رہی تھی ـــــ میں آج سے پہلے ہرگز یقین نہ کر سکتا تھا کہ کوئی انسان مجھے اس مصیبت سے نجات دلا سکے گا"۔

× ×

ڈاکٹر صاحب سے پوچھنے پر معلوم ہُوا کہ وہ شخص حسبِ معمول رات کو اپنے وقت پر اُن کے پاس آیا، اُن کو جھنجھوڑا اور اُس کے بعد اُس کمرے میں چلا گیا جہاں مرتبان پڑے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا۔ واپسی پر وہ غیر متوقع طور پر بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ وہ اُن کے بستر کے قریب آیا اور تین بار جھُک کر سلام کرنے کے بعد غائب ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ جب وہ سلام کرنے کے لئے تیسری بار جھُکا تو اُس کا بایاں ہاتھ اپنی جگہ پر موجود تھا۔

چنانچہ یہ ہے وہ خدمت جس سے خوش ہو کر ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنی جائداد کا واحد وارث قرار دیا۔

(ماخوذ از کانن ڈائل) ـــــ سعادت حسن

شباب

کھل رہا تھا دامنِ کہسار میں اک لالہ زار
خندہ زن جنت پہ تھی جس کی طرب ساماں بہار

ایک لڑکا جس کو سچ مچ چاند کا ٹکڑا کہیں
حسن و معصومی کا گویا بولتا پتلا کہیں

توڑتا تھا پھول شاخوں سے کبھی، کلیاں کبھی
دوڑتا تھا گاہ یہ کہتا کہ وہ تتلی اُڑی

میں نے پوچھا۔ اے گلِ خنداں! ترا ہے نام کیا
وہ تنک کر بول اُٹھا کیوں تجھ کو مجھ سے کام کیا؟

پھر اُچھلتا کودتا اٹکھیلیاں کرتا ہوا
وہ گلستاں زادہ جی پھولوں سے بہلانے لگا

ہو گیا مسحور میں اِس شوخیٔ معصوم سے
وہ فرشتہ تھا "لڑکپن" لوگ کہتے ہیں جسے

محوِ گل بازی "لڑکپن" گلشنِ فطرت میں تھا
میکدہ بردوش قبلے سے اُمنڈ آئی گھٹا

نشہ بن کر وہ گھٹا ساری فضا پر چھا گئی
اک جمائی لی "لڑکپن" نے کہ بس نیند آ گئی

خواب میں دیکھا، مکاں ہے خوبصورت مرمریں
نور سے جس پر لکھا ہے "قصرِ فردوسِ بریں"

صف بہ صف استادہ ہیں گل پوش خوبانِ چمن
منعقد ہونے کو ہے قدوسیوں کی انجمن

ناگہاں اک لاجوردی شامیانہ تن گیا
صحنِ گلشن حور و غلماں کا نشیمن بن گیا

اک طرف پیرِ مغاں پیمانہ آرائے سبیل
اک طرف مستانہ رو تسنیم۔ کوثر۔ سلسبیل

آسماں سے تخت اُترا لوٹتا اُڑتا ہوا،
جیسے کوئی مست آئے جھومتا مڑتا ہوا

باغ کے مرکز میں جب پہنچا۔ تو گویا جم گیا
مہ رُخوں کا نقرئی سیلِ تکلم تھم گیا

یوں وہ اورنگِ مرصع تھا تجلی بارِ حسن
ہر طرف حدِ نظر تک سج گیا دربارِ حسن

حسن۔ کیسا حسن۔ شاعر کے تخیل سے حسین
حسن۔ ایسا حسن۔ بس تعریف ہو سکتی نہیں

سامنے اُس کے ہوئے رقصاں بُتانِ سیم بر
لے کے ہاتھوں ہاتھ عزت سے بٹھایا تخت پر

تالیوں کی کیف خیز آواز سے گونجی فضا
اس نے مجمع کی طرف دیکھا تو ششدر رہ گیا

پھر اُسی حالت میں اپنے آپ پر ڈالی نگاہ
شکل میں تھا انقلاب دل فریب و بے پناہ

روکش صد مہرِ عالم تاب رُخ کی آب و تاب
بن گیا تھا وہ غرض اک پیکرِ حسن و شباب

اُس نے سوچا۔ میں ہوں شاہنشاہِ اقلیمِ جمال
مجھ سے اخذِ حسن کرتا ہے سخنور کا خیال

عاشقوں کی راحت و ایذا مری مٹھی میں ہے
مختصر یہ عشق کی دنیا مری مٹھی میں ہے

دفعتہً نغموں کا دریا موج زن ہونے لگا
ساز و برگِ اہتزازِ روح و تن ہونے لگا

رقص کے بادل سے مستی کی بھرن پڑنے لگی
مُنہ میں کف لا کر بطِ مے جام سے لڑنے لگی

مے ترنم کی دہانِ گوش سے جب پی چکے
خُم سے پھر ڈھلنے لگی یارانِ محفل کے لئے

مے نئی۔ ساقی نیا۔ مینا نیا۔ ساغر نیا
جس طرف اُٹھی نگہ۔ آیا نظر منظر نیا

بادۂ ظرف آزما ڈھلت گیا۔ ڈھلت گیا
دورِ جامِ کیف زا چلت گیا چلت گیا

ہوش آنے پر جو دیکھا، اور ہی نظّارہ تھا
وہ سماں گُم تھا جو حُسن و عشق کا گہوارہ تھا

کیا تھا اِک بستی ہوس رانوں کی اِک مے خانہ تھا
دُخترِ رز کی شمعِ رُخ کا ہر کوئی پروانہ تھا

نوجواں ہمدم ہوا رندانِ شاہد باز کا
اُس پہ جادو چل گیا اس دورِ عیش آغاز کا

میکدے میں جا کے پیتا گاہ وسکی، گاہ پھول
لڑکھڑاتا گاہ بازاروں میں۔ سر پر خاک دھول

لیلیٔ شب نے اِدھر چہرے پہ کاکل چھوڑ دی
اُس نے بن ٹھن کر اُدھر کوئے بتاں کی راہ لی

شغلِ صبح و شام کیف اندوزیٔ رقص و سرود
دلستانِ نازِ بُتاں، وعدہ آفریں آواز عُود

گاہ ناٹک، گاہ ناطق فلم سامانِ سرور
تھے تماشا گاہ گویا مسکنِ غلمان و حُور

گاہ روز و شب جوئے کا مشغلہ محبوب تھا
تاش۔ چوسر۔ گنجفہ۔ شطرنج گہ مرغوب تھا

گاہ وہ مینڈھے لڑاتا۔ گہ کبوتر۔ گہ پتنگ
دیکھتا گاہے بٹیروں۔ تیتروں۔ مرغوں کی جنگ

بحرِ بے پایانِ عصیاں میں غرض بہتا گیا
طعنِ احباب و اعزّہ بے حیا سہتا گیا

انقلاب آئے زمیں پر۔ اور بدلا آسماں
ہاں مگر بدلا نہ وہ رندِ بد آموزِ جہاں

نشۂ صہبا میں اِک شب چُور ہو کر سو گیا
صبح دم اُٹھا۔ تو دیکھا بو العجب یہ ماجرا

جوشِ مدّ ہم پڑ چکا تھا۔ جھُرّیاں چہرے پہ تھیں
جامۂ تن کی کہولت نے چُنی تھی آستیں

وہ بہشتِ ذوق نظّارے۔ نہ وہ مے خانہ تھا
دورِ عشرت یوں گیا گویا کبھی آیا نہ تھا

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا۔ جو سُنا افسانہ تھا"

ابو نعیم نشتر جالندھری

دیہاتی دُلہن

ہری ہر، ایک انتہائی قدامت پرست خاندان کا رُکن تھا، لیکن اس نے یکایک اس قدامت پرستی کا جُوا اپنے کندھے پر سے اتار پھینکا۔ اُس کی انقلاب پسندی میں انتقام کا ایک جذبہ پنہاں تھا۔ اس نے اپنی سب سے کم سن بیٹی للّی کو ——— جس کے نام ہی سے عیسائیت کا اظہار ہوتا ہے ——— ایک انگریزی مدرسہ میں شریک کر دیا تاکہ وہ موجودہ تہذیب و تمدن کے مطابق تعلیم حاصل کرے۔ لیکن اس کو کبھی اس امر کا خیال تک نہ ہوا تھا کہ اس کو اندو بھوشن جیسا ایک قدامت پرست خاندان کا لڑکا، داماد ملے گا۔ عین اس وقت جب کہ وہ فتحمندانہ انداز سے، اپنے خاندان کو مغربی سانچے میں ڈھالتا جا رہا تھا، اندو بھوشن اس کی راہ میں حائل ہو گیا اور اس کو روک لیا۔ ہری ہر نے دیکھا کہ لڑکا نہ صرف اس کا ہم قوم ہے، بلکہ خوبصورت، ذہین اور طبّاع ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک متموّل گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس خیال سے ہری ہر کو اپنی موجودہ روش کو خیرباد کہنی پڑی اور وہ پھر قدامت پرستی کی خوبیوں کا وعظ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اب وہ ہر شخص سے کہنے لگا "سنو، ہمارے آبا و اجداد، بیوقوف نہ تھے، ان کو ہم لوگوں سے زیادہ انسانی طبائع اور فطرت کا علم تھا، اس وجہ سے ہم کو اپنے طفلانہ اور احمقانہ خیالات کی وجہ سے ان کی مخالفت نہ کرنی چاہئے۔ چونکہ ایک عورت کو اپنی عمر سسرال ہی میں کاٹنا پڑتی ہے۔ اس لئے اس کو جلد ہی اس گھرانے میں داخل ہو کر سسرال کے عزیزوں اور رشتہ داروں کی معاشرت، آداب اور شائستگی سیکھ لینی چاہئے۔ اس لئے بچپن کی شادی ناگزیر ہے"۔

ہری ہر، اپنی ضعیفی کے زمانے میں ایک مصلح بن گیا تھا۔ اور اس لئے اس کا مکرر قدامت پرستی کی طرف عود کرنا، دشوار بات نہ تھی۔ لیکن اس کی اولاد ضرور اس امر سے ایک عجیب کشمکش میں پڑ گئی۔ اور للّی کو سب سے زیادہ دقت اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا اس نے ماں کی گود میں بیٹھ کر جدید تہذیب و معاشرت کے سبق پڑھے تھے، اور اب باپ کے کہنے پر ان باتوں کو فراموش کر دینا اس کے لئے بہت دشوار تھا۔ اس نے بہت عرصہ قبل سنا تھا کہ اس کی ہم عمر لڑکی کے لئے شادی کا نام تک لینا گناہ ہے۔ لیکن وہ اب غصہ کے ساتھ یہ بات بھی سُن رہی تھی کہ اُس کو اس سے بھی بڑا گناہ یعنی شادی کرنا پڑے گی۔ اُس نے اپنے بزرگوں سے سُنا تھا کہ اس کی جیسی ایک کم سن لڑکی کا، چھوٹے فراک، اور لمبے پائتابوں کے سوا اور کوئی لباس پہننا، سخت تکلیف دِہ بات ہے لیکن آج یہ دیکھ کر وہ کانپ اُٹھی کہ وہی بزرگ جدید انگریزی لباس کو چھین کر، اس کو سوائے ساڑھی کے اور کوئی کپڑا پہننے نہیں دیتے۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے بالوں کو گوندھ کر چوٹی کرنے کی سعی کی تھی، جس کو دیکھ کر اس کی بڑی بہن نے اس پر

خفگی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن آج وہی بڑی بہن اس کی چوٹی گوندھنے اور جوڑا باندھنے میں منہمک نظر آرہی تھی۔

پہلے یہ ہوتا تھا کہ اگر وہ کبھی اپنے بڑوں کی باتیں چھپ چھپا کر سُنتی ہوئی پکڑ لی جاتی تھی تو اس کو بہت بُرا بھلا کہا جاتا تھا لیکن آج وہی بزرگ اس کی موجودگی میں ہر قسم کے موضوع پر بے روک ٹوک باتیں کرتے تھے۔ ایک بار جب اس کی ماں نے اس کو انگریزی اور بنگالی مخلوط زبان میں باتیں کرنے پر گھُرکی دی تو مارے خوف کے اس کا جسم کانپنے لگا۔ حالانکہ اُسی ماں نے اب تک اس مخلوط طرزِ گفتگو کو ایک بہت بڑا کمال سمجھ رکھا تھا۔ یہ سُن کر اُس کا دم گھُٹنے سا لگا کہ اس خاندان کے تمام خیالات اور عقائد کُلّیۃً تبدیل ہو چکے ہیں اور اب اُس کو بھی انتہائی قدامت پرست ہندو عورتوں کی معاشرت اور انہیں کی سی تہذیب اختیار کرنی پڑے گی۔

شادی کا دن مقرر ہو گیا اور للّی کی سُسرال سے زیوروں کی ایک لمبی چوڑی فہرست آئی جس میں سارے زیور قدیم وضع اور ساخت کے درج تھے۔ لڑکی والوں کو اس کی تعمیل کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا حالانکہ اُن لوگوں کو بھی ایسے زیور پسند نہ تھے، اور للّی کو تو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ وہ اپنے اس نفرت اور ناپسندیدگی کے جذبہ کو چھپا بھی نہ سکتی تھی، گویا اس کو بیش قیمت زیوروں کی رشوت محض اس لئے دی گئی تھی کہ وہ ایک غیر موزوں اور ناخوشگوار شادی پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دے۔ جو زیور للّی کے لئے آئے تھے وہ بہت بدنما بھونڈے اور خوفناک معلوم ہوتے تھے۔ "تم لوگ کس قدر سنگدل اور خود غرض ہو!" للّی نے غصّہ اور غم کے لہجہ میں کہا۔ "تم لوگ اپنے لئے تو بہترین، خوبصورت زیور ہیملٹن کے یہاں سے منگواتے ہو اور میرے لئے ایک بیوقوف سُنار کی دُکان سے یہ سونے کے ڈلے اُٹھا کر لائے ہو۔ یہ بوڑھی عورتوں کو زیب دیں گے۔ میرے قابل نہیں ہیں۔ ان کو میرے سامنے سے اٹھا لے جاؤ۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے"۔

لیکن للّی کی کوئی نہ سُنتا تھا۔ اُس کو اُن احکام کی تعمیل کے لئے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور اُس کو شادی کے روز مجبوراً وہی سونے کے ڈلے پہننے پڑے جن سے اس کو دلی نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ اُس کو گھر کے اِن اچانک پیدا ہونے والے تغیّرات اور قدامت پرستی کی وجہ سے بہت تکلیف اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور تنہائی میں اُس نے اس پر بہت آنسو بہائے۔

شادی کی تقریب ختم ہو گئی۔ لیکن جو کچھ بخیر و خوبی ختم ہوتا ہے وہ سب کچھ اچھا ہی ہوتا ہے چنانچہ اس غم و کلفت کے سمندر کو پار کرنے کے بعد، اُسے جو شریکِ زندگی ملا، وہ اس کے لئے غیر معمولی مسرت اور محبت کا باعث ہُوا۔ وہ خوبصورت تھا، مہربان تھا اور محبت پرست تھا۔ گو اُس نے اپنے شوہر کو آج سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، لیکن صرف چند ہی گھنٹوں میں، اُس نے، اُس کو اپنے عزیز ترین شریکِ زندگی کی حیثیت سے، دل و جان سے قبول کر لیا۔ اور اس کے کان میں، اپنی زندگی کی المناک داستان ساری کی ساری بیان کر دی۔ تعجب کی بات ہے کہ وہ یہ سب سُن کر، اپنی ماں اور بہنوں کی طرح ہنسا نہیں۔ بلکہ حتےٰ الامکان للّی کو

تسلی اور دلاسا دینے کی کوشش کی۔ للی کو اپنے دل میں اس امر کا اعتراف کر لینا پڑا۔ کہ اس کا شوہر اس کی تمام گذشتہ پریشانیوں اور ناقدری کا معاوضہ ہے، جو اُسے قدرت سے ملا ہے، اور ایک ایسے نیک دل شوہر کے معاوضہ میں انگریزی مدرسہ، نئے لباس اور مغربی طرز معاشرت ترک کر دینا، کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

جب سب رسمیں ختم ہو گئیں تو دولہا دُلہن جانے کے لئے تیار ہوئے۔ للی کی ہمشیرو بی بھانے اس کو نئے لباس سے سنوارا کیونکہ دُلہن اور دولہا دونوں کی یہی مرضی تھی۔ آج للی ایک دلہن بنی ہوئی تھی ——— ایسی دُلہن نہیں جو کہ مٹی کا ایک مجسّمہ معلوم ہو اور جو سونے کے ڈلوں سے لدی ہو جن سے والد کی دولت اور سُسرال والوں کی بدذوقی کا اظہار ہو رہا ہو ——— بلکہ ایک ایسی دُلہن، جو تاروں میں چاند کی مانند حسین اور دلکش ہو۔

اس کو شادی کے تحفوں کے طور پر چند زیور ایسے ملے تھے جو درحقیقت بہت خوبصورت تھے اور اُس کے مذاق کے مطابق تھے۔ ان میں اور چیزوں کے علاوہ، ایک موتی کی مالا، ایک جوڑ موتی کے بُندے، اور ایک ہیرے کا بروچ بھی شامل تھا آج ان خوبصورت زیوروں سے اس کا جسم آراستہ تھا، وہ ایک بہت ہی قیمتی نیلگوں بادامی رنگ کی ساڑی زیب تن کئے ہوئے تھی، اس کے دونوں کناروں پر کارچوبی کام تھا۔ لباس پہننے کے بعد ہی وہ فوراً اپنی خواب گاہ کی طرف گئی تا کہ اندوبھوشن بھی اس کے حسن کا نظارہ کر سکے۔ اُس نے ابھی ایک خوفناک سُرخ بنارسی ساڑی اور سونے کے ڈلوں کو پہن کر اپنے شوہر کے سامنے جانے کے منظر کو فراموش نہ کیا تھا مگر اب وہ اس بات کو ثابت کرنے کی متمنی تھی کہ کپڑوں اور زیوروں کا وہ بہت اعلےٰ مذاق رکھتی ہے۔

اندوبھوشن اس کو دیکھ کر مسحور ہو گیا۔ "میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں"۔ اس نے جذبات سے بھرے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "تم کس قدر عجیب وغریب نظر آ رہی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی پنڈیتا کی بیٹی نے مجھ پر ترس کھا کر اپنا آبی محل میرے لئے وقف کر دیا ہے تاکہ میں اس کے انسانی حسن سے زیادہ برتر حسن کے نظارہ سے لطف اندوز ہو سکوں۔ تمہارے بُندے شبنم کے قطروں کی مانند جھلک رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے لباس نے اس کا سارا حسن لوٹ لیا ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے الفاظ نہیں ملتے"۔

شرم سے للی کے رُخسار سُرخ ہو گئے اور وہ پکڑے جانے کے خوف سے بھاگ گئی۔

جب وہ رخصت ہونے لگی تو ماں نے نصیحت کرتے ہوئے کہا "جب تم گاڑی سے اُترنا تو صندوق سے سب زیور نکال کر پہن لینا۔ ورنہ تمہارے رشتہ دار نکتہ چینی کریں گے اور طعنے دیں گے"۔ للی نے کوئی توجہ نہ کی۔

جب وہ ریل میں سوار ہو گئی تو تمام عورتیں رونے لگیں، لیکن للی ٹھیک طور پر نہ سمجھ سکی کہ کیا ہو رہا ہے۔ اُس کو ایک ہندو لڑکی کی بدقسمتی کی داستان نہ سنائی گئی تھی، اس لئے وہ ساکت رہی۔ اس کو اب بھی اس امر کا علم نہ تھا کہ یہ رونا ہے کاہے کے

لئے ؛ وہ اندوبھوشن کے ساتھ جا رہی تھی، —— ایک ایسے شخص کے ساتھ جس کی ہم جلیسی کو وہ تمام دوسروں کی ہم جلیسی پر ترجیح دیتی تھی۔

(۲)

جب تک للی ریل میں بیٹھی رہی وہ اندوبھوشن کے الفاظ اپنے دماغ میں بار بار دُہراتی رہی۔ ان الفاظ سے اس کے دل میں جو جذبات اور دماغ میں جو خیالات پیدا ہو رہے تھے وہ ان میں بالکل مستغرق ہوگئی۔ اندوبھوشن کا سلوک اور برتاؤ، اس کو اپنی گذشتہ عیسائیت پسند زندگی کو بُھلا دینے پر مجبور کر رہا تھا، اور وہ اس زندگی سے اس طرح الگ ہوگئی تھی، جیسے پتے سوکھ کر درخت کی شاخوں سے جھڑ جاتے ہیں۔ گذشتہ چند ایام نے گویا اس کی ساری زندگی کو محیط کر لیا تھا۔

گاڑی ہاوڑہ اسٹیشن سے روانہ ہوئی۔ راستہ میں متعدد کارخانے، چھوٹے بڑے تالاب، بیشمار باغات اور ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے کھیت نظر آئے۔ لیکن للی نے اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ آہستہ آہستہ خدا کی وسیع کائنات کے دلکش مناظر، انسان کی ساختہ تہذیب و تمدّن پر مسلط ہونے لگے۔ اور اب کارخانوں اور گھروں کی بجائے میدان اور گھنے جنگل نظر آنے لگے۔ للی نے ایسے دلکش منظر کبھی نہ دیکھے تھے۔ اس نے ابتک صرف کلکتہ میں ایک میدان دیکھا تھا جو چاروں طرف دکانوں اور ٹریم کی سڑکوں سے گھرا ہوا تھا۔ اور عدن باغ جو ایک ہی سب سے بڑا باغ ہے۔ اگر للی اس وقت اپنی معمولی حالت میں ہوتی تو کبھی ان قدرتی مناظر کی طرف سے آنکھیں نہ ہٹاتی۔ مگر چونکہ وہ اپنے خیالات میں بے انتہا کھوئی ہوئی تھی اس لئے ان پر نظر ڈالنے کا خیال تک اُسے نہ رہ گیا تھا۔

کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے اسٹیشن نظر آتے تھے۔ للی کو یہ بھی نہ یاد رہا کہ اُسے بھی ایک ایسے ہی کسی چھوٹے اسٹیشن پر اُترنا ہے آخر کار ضلع مدناپور کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی ٹھیری، اور اس کے تمام ہمراہی اُترنے کی فکر کرنے لگے۔ ایک شخص اس کے کمپارٹمنٹ کے دروازہ کی طرف بڑھا اور اُسے باہر کھینچنے کی کوشش کی۔ للی اپنی نشست سے اُٹھی اور نیچے اُترنے کے لئے بڑھی لیکن یہ دیکھ کر اُسے سکتہ سا ہوگیا کہ اُسے پلیٹ فارم پر پہنچنے کے لئے تقریباً تین فیٹ نیچے کودنا ہے۔ کیونکہ یہ اسٹیشن ہاوڑہ کی مانند نہ تھا جہاں صرف ایک ہی قدم نیچے رکھنے سے پلیٹ فارم پر پہنچ جاتے ہیں۔

کسی نے چلا کر کہا "تم کیا کر رہی ہو؟ گاڑی ایک منٹ میں چل دے گی۔ نیچے اُترو"۔ دونوں طرف سے لوگ گاڑی میں داخل ہو کر سامان اُٹھا اُٹھا کر نیچے پھینکنے لگے۔ خادمہ جو للی کے ساتھ آئی تھی اس کو گود میں لے کر نیچے اُترنے لگی۔ اس کی ساڑی کا ایک کونا سر سے ڈھلک کر پاؤں میں پھنس گیا اور وہ مع للی کے نیچے گر پڑی۔ ایسی مذموم اور بدنما حالت پر للی شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ کیا یہ اُس ہستی کا جس کو دیوتا کی دختر کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا، ایک مناسب و موزوں استقبال تھا؟ ہر وقت نیچے گرنے کے خوف سے للی

اس بوڑھی خادمہ کی سیاہ گردن کو اپنے خوشنما اور سیمیں بازوؤں سے مضبوط پکڑے ہوئے تھی۔

دُلہن کسی قدر لمبی تھی، خادمہ کی اس حرکت سے اس گردن میں درد پیدا ہو گیا تھا، وہ اس کی گود سے نیچے کود پڑنا چاہتی تھی، لیکن بوڑھی عورت للّی کو اور زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیتی تھی۔

گاڑی چھوٹنے کے بعد سب لوگ جمع ہوئے، اسباب گاڑیوں پر لادا۔ اور گھر کی طرف روانہ ہوئے، برات آنے کی خبر تمام گاؤں میں پہلے ہی سے پھیل گئی تھی، اس لئے گاؤں بھر کے لوگ، جن میں جوان بوڑھے، بچے سب شامل تھے، گاؤں کو جانے والی سڑک کی دونوں جانب قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے تھے، یہ موسم سرما تھا لیکن للّی نے دیکھا کہ اکثر آدمیوں کے پاس گرم کپڑے نہیں ہیں۔ ان میں بعض صرف ایک دھوتی پہنے ہوئے تھے اور اُسی کو جسم سے لپیٹے ہوئے تھے۔ اور بعض کے تن پر میلے اونی کوٹ اور چادریں بھی تھیں، مگر جوتا یا سلیپر کسی کے پاؤں میں نہ تھی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ للّی نے اب تک کبھی ایسے نیم عُریاں اور کم پوشش والے آدمی نہ دیکھے تھے۔

بوڑھی خادمہ نے للّی کی ساڑی کو، سامنے کی طرف ایک جھٹکے کے ساتھ کھینچ کر گھونگٹ نکالا جیسے کہ کوئی دُلہن بغیر گھونگٹ کے کہیں جا ہی نہیں سکتی۔ اس طرح اس کے کان کے خوبصورت بُندے بالکل چھپ گئے۔ چھوٹے بروچ (کانٹے) جن سے اس کی ساڑی سر پر بندھی ہوئی تھی، جھٹکے سے ڈھیلے ہو گئے اور نکل کر سڑک پر گر پڑے۔ للّی موٹے ریشم کی ساڑی میں سے کچھ نہ دیکھ سکتی تھی تاہم وہ سینکڑوں آنکھوں کے گھورنے کو خوبی محسوس کر رہی تھی، چند بہت شریر لڑکے دُلہن کے بالکل پاس پہنچ گئے۔ اور بلا کسی لحاظ کے اُسے گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ یکایک دو تین لڑکوں نے مِل کر تالی بجائی اور بولے "ذرا دیکھو تو کیسی عجیب بات ہے، یہ عورت ہے اور پھر بھی جوتا پہنے ہوئے ہے"۔ اس عجیب و غریب انکشاف پر لوگ قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ یہ سُن کر للّی چاہنے لگی کہ ان شریر لڑکوں کی گوشمالی کرے اور اُن کے گالوں پر طمانچے رسید کرے۔ لیکن وہ بے چاری کچھ نہ کر سکتی تھی کیونکہ وہ ابھی نئی دُلہن تھی۔ اُسے فوراً ہی یاد آ گیا کہ اس کی ماں نے چلتے وقت اُس کو انہیں باتوں کی طرف توجہ دلائی تھی کہ ایک "دیہاتی دلہن" کو جوتا ہرگز نہ پہننا چاہئے۔

للّی کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ ایک خاتون ننگے پاؤں سڑک پر چل سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں کو جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔

"اور پر ماتا۔ آپ کا اس سے کیا مطلب ہے؟ کیا میں پلیٹ فارم پر ننگے پاؤں چلوں؟"

بہت بحث مباحثہ کے بعد یہ طے پایا تھا کہ جب وہ گاؤں کے اسٹیشن کے پاس پہنچے۔ تو جوتا اُتار ڈالے۔ لیکن مسرت آفریں خیالات میں وہ ایسی محو ہو گئی تھی کہ جوتا اُتارنا ہی بھُول گئی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ غم و غصہ اور نفرت کی فراوانی سے للّی کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ اور جب اس کی پالکی روانہ ہوئی تو اُس نے جوتے اُتار کر بہت دُور سڑک پر پھینک دیئے۔

سُسرال کی تمام عورتیں دُلہن کے استقبال کو کھڑی تھیں۔ گاؤں کی اور بہت سی عورتیں بھی دُلہن کو دیکھنے کے لئے جمع

ہوگئی تھیں، جوان خواتین میں سے ایک خاتون جو اندو بھوشن کی رشتہ سے بھاوج ہوتی تھی، چند سال تک کلکتہ میں رہ چکی تھی، اور اس نے ایک مشن اسکول میں کچھ تعلیم بھی پائی تھی، چونکہ شہری اور قصباتی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق اُس کی رائے مستند سمجھی جاتی تھی، اس لئے وہ سب سے آگے کھڑی ہوئی۔

جب پالکی رکھ دی گئی تو للّی کی ساس آگے بڑھی اور دروازہ کھول کر دُلہن کو گود میں اُٹھایا اور اندر لے گئی۔ عورتوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ نیروپاما کی کرخت آواز سب سے زیادہ بلند ہوئی "تم دیہاتی لوگ جیسی کہانیاں چاہو گھڑ لو، تنکاری کی اماں کو آنے دو، دیکھو جو میں اس کا جھوٹا مُنہ گرم لوہے سے نہ داغ دوں! کہہ رہی تھی کہ دُلہن تو جُوتا پہنے ہوئے پولیس انسپکٹر کی طرح چل رہی تھی، —— ذرا دیکھو تو اس کے خوبصورت رنگے ہوئے پَیر کیسے اچھے معلوم ہو رہے ہیں!"

للّی نے خدا کا شکر ادا کیا۔ یہ اس کے حق میں بہت اچھا ہُوا کہ شریر لڑکوں نے اس کے جُوتوں کو دیکھ کر تالیاں بجائیں۔ ورنہ اُن کو اتار کر پھینک دینے کا اُسے خیال تک نہ آتا۔

جب دُلہن کو رنگی ہوئی لکڑی کی چوکی پر کھڑا کیا گیا۔ تو ہر ایک اپنی اپنی سمجھ کے مطابق رائے زنی کرنے لگا۔ اندو بھوشن کی چچی نے اپنی بڑی بھاری نتھ کو جنبش دیتے ہوئے کہا "بڑی اچھی بات ہے! کیا وہ دُلہن کو دو کپڑے نہ دے سکتے تھے"

دوسری چچی نے خوفزدہ ہوتے ہوئے اپنی ہتھیلی اپنے گال پر رکھتے ہوئے کہا "اے ہے یہ کیا ہے؛ میں نے تو کبھی ایسی منحوس چیز نہیں دیکھی۔ دلہن آخر سیاہ لباس کیوں پہنے ہوئے ہے؛"

نیروپاما نے آگے بڑھ کر حاضرات کو اپنے علم سے مرعوب کرتے ہوئے کہا "کیوں۔ کیا تم اس کو سیاہ کہو گی؛ یہ سیاہ تو نہیں ہے نیلی ہے۔ آج کل تو کلکتہ میں یہ دستور ہے کہ شادی کے لئے نیلے رنگ کا لباس بناتے ہیں"

خادمہ نے، جو للّی کے ساتھ آئی تھی، ان سب غلط بیانیوں کی اصلاح کرتے ہوئے کہا "لیکن دیوی جی یہ ان کی شادی کی ساڑی نہیں ہے۔ وہ تو صندوق میں بند ہے۔ یہ رخصتی کے واسطے منگوائی گئی تھی۔ اس لئے ان کی بہن نے ان کو یہی ساڑی پہنا دی"

"اے ہے کیسی عجیب بات ہے!" دو تین عورتوں نے ایک ساتھ کہا اور ہنسنے لگیں۔

"ابھی تین راتیں بھی نہیں گزریں!" ایک عورت معترضانہ انداز سے کہنے لگی —— اس اثنا میں دلہن کی ساس صاحبہ آگئیں اور انہوں نے سخت نفرت کے لہجہ میں کہا "ہاں تو وہ زیور کہاں ہیں جن کی میں نے فرمائش کی تھی! کیا یہی پیتل کے چند ٹکڑے جو اس لڑکی کے جسم پر ہیں؛"

اس بات سے نیروپاما بھی کچھ سٹ پٹا سی گئیں، لیکن ہمت کر کے آگے بڑھیں اور بولیں "لیکن چچی جان دُلہن کے سامنے ایسی باتوں سے کیا فائدہ؛ آپ یہ کیوں نہیں دیکھتیں کہ آپ کو کیسی خوبصورت بہو ملی ہے؛" وہ زیور بھی سب آپ کو دینگے۔

شاید جلدی میں تھے۔ کلکتہ میں کسی کو سب چیزیں اتنی جلدی نہیں مل جاتیں۔"

لیکن ضعیف خاتون کی ایسی باتوں سے تسکین نہ ہوسکتی تھی۔" مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔" اُس نے غصّہ سے جواب دیا۔" اس گاؤں میں بھی اگر تم چاہو، تو ہر قسم کا طلائی زیور مل سکتا ہے۔ کیا تمہارے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ کلکتہ میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں منشار کے مطابق جلد زیور نہیں مل سکتا ——— مجھے اس سے کیا اگر دُلہن خوبصورت ہے تو ——— اتم جی بھر کر اس کو دیکھ سکتی ہو، بلکہ اس کی پُوجا بھی کرسکتی ہو؟"

سردی کے موسم میں بھی تِلّی کو اپنی پیشانی سے پسینہ نکلتا ہُوا معلوم ہُوا۔ وہ ان وحشی اور خوفناک عورتوں سے بہت خوفزدہ ہو گئی تھی، ممکن تھا کہ اگر کسی بات سے اُن کی تسکین نہ ہوتی تو وہ اُسے مار بھی بیٹھتیں۔" وہ میرے صندوق میں ہیں۔" اس نے بہت مشکل سے زبان کھولی۔

"خدا کی پناہ! ——— ذرا سنو تو یہ نئی دُلہن بول بھی رہی ہے" بعض عورتوں نے کہا: "کیسی عجیب لڑکی ہے!"

تِلّی کی خادمہ نے سب سے زیادہ زور سے کہا:" دراصل یہ کلچگ ہے۔ بھلا کوئی نئی بیاہی دُلہن کے جسم سے زیور بھی اُتار کر رکھ لیتا ہے ——— یہ تو بڑے اندھیر کی بات ہے!"

جوان عورتیں دُلہن کی کنجیاں ڈھونڈنے لگیں تاکہ اس کے صندوقوں کو کھول کر سب چیزوں کو دیکھیں۔ پہلے کپڑوں کا صندوق کھولا گیا۔ اندو بھوشن کی بہن چھبی نے صندوق کا ڈھکنا اُٹھایا اور زور سے ہنس پڑی۔ ہر شخص دیکھنے کے لئے دوڑا۔" ذرا دیکھو تو" چھبی نے کہا:" تمام صندوق کتابوں سے بھرا ہُوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ دُلہن دفتر بھی جایا کرتی ہے"۔

"بس چُپ رہو"۔ نیرو پاما نے گھُرکتے ہوئے کہا:" تم لوگ محض بے وقوف ہو۔ دُلہن تم لوگوں کی طرح جاہلِ مطلق نہیں ہے، وہ لکھنا پڑھنا جانتی ہے اور اس کو شادی کے تحائف کے طور پر یقیناً بہت سی کتابیں ملی ہونگی۔"

"لیکن یہ انگریزی کتابیں ہیں"۔ چھبی نے جواب دیا۔

اندو بھوشن کا سب سے چھوٹا بھائی، نیبنی، جس کی عمر پانچ برس کی تھی اب تک دُلہن کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا اور تمام باتیں سُن رہا تھا جو اس وقت ہو رہی تھیں۔ جب چھبی کتابوں کے نیچے سے تِلّی کے زیوروں کا صندوقچہ نکالنے کی کوشش کر رہی تھی، تو نیبنی چپکے چپکے سے اُس کے پاس گیا اور اُس کے کان میں بولا:" آپا۔ یہ دُلہن عورت ہے یا میم صاحب؟" اس سے قبل کہ لڑکی کوئی جواب دیتی، نیبنی کا ایک دوست راجو بول اُٹھا:" میں نے ان سے کہا کہ یہ عورت ہے لیکن ان کو یقین ہی نہیں آتا۔ ورنہ وہ پھر گھونگٹ کیوں نکالتی۔ میم صاحب تو ہمیشہ ٹوپی پہنتی ہیں۔"

نیرو پاما نے سُن کر قہقہہ لگایا اور کہا:" نیبنی کیسا ناسمجھ ہے! ارے بیوقوف کیا میم صاحب عورت نہیں ہوتیں!" "تو دُلہن مرد ہے"

کی طرح ساڑی کیوں باندھے ہوئے ہے ؟" تینی نے پوچھا۔

نیروپاما یہ سُن کر ہنسنے لگیں چھبتی نے غصہ میں آکر ان لڑکوں کو وہاں سے بھگا دیا۔ گھر کی ایک خادمہ نیروپاما کو بہت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہی تھی "آپ اتنا کیوں ہنس رہی ہیں ؟" اس نے پوچھا "یہ لڑکے سچ کہہ رہے تھے۔ دلہن یقیناً مردوں کی طرح ساڑی پہنے ہوئے ہے۔ ہم نے صرف ناچنے والی لڑکیوں کو اس طرح ساڑی پہنے ہوئے دیکھا ہے"۔

ایک ادنیٰ درجہ کی عورت کچھ دُور کھڑی ہوئی سُن رہی تھی، وہ شہادت دینے کے لئے آگے بڑھی۔ "ماں صاحب" وہ بولی۔ "ہمارا مادھو کہہ رہا تھا کہ اس نے کلکتہ میں جوان عورتوں کو جُوتا پہنے اور مردوں کی طرح دفتروں کو جاتے دیکھا ہے۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ وہ صابون بھی استعمال کرتی ہیں؟"

"کیا یہ سچ ہے ؟" نیروپاما نے حقارت آمیز تعجب سے پوچھا۔

"ماں جی! میں قسم کھا کر کہتی ہوں بالکل سچ ہے" عورت نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

للّی ان تعجب خیز کلمات کو سُن رہی تھی۔ اور اپنے مسرت آفریں خیالات اور خوابوں کو بھولی جا رہی تھی۔ اُس کے دل میں حیرت وخوف کی کشمکش شروع ہوگئی تھی، اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ ایک مجرم ہے اور یہ سب لوگ جج ہیں۔ اگر وہ لوگ اس کے نئے رشتہ دار نہ ہوتے تو یقیناً وہ ان کی بے وقوفیوں اور جہالت پر قہقہہ لگاتی، لیکن اس وقت تو ہنسنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

وہ ان لوگوں کی مانند کس طرح بن سکتی تھی جن میں قسمت نے لا کر اس کو ڈال دیا تھا۔ وہ اپنی تمام تعلیم اور تہذیب و شائستگی کو ترک کر کے ان عورتوں کی مانند بیوقوف اور جاہل بن جاتی، اگر اس طرح اس کو سکون حاصل ہونے اور خوف سے نجات پانے کا یقین ہو سکتا۔

دن کسی نہ کسی طرح گزر گیا۔ رات کو جب وہ خلوت میں اندوبھوشن سے ملی، تو ان تمام پریشانیوں کے بادل اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی شکل میں برسنے لگے۔ اندوبھوشن نے للّی کے گریہ و اضطراب سے اندازہ لگا لیا کہ وہ یہاں ٹھہرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اس نے اس کو بہت دلاسا دیا۔ اور ہر طرح اس کے اضطراب اور پریشانی کو کم کرنے کی سعی کی "لیکن یہ بالکل بچپن کی باتیں ہیں میری پیاری!" اس نے کہا "وہ لوگ دیہاتی اور بالکل ناشائستہ ہیں۔ تمہیں ان باتوں کا اثر نہ لینا چاہیئے۔ چند روز کے بعد تم اس بات کی عادی ہو جاؤ گی کہ ان کو اپنے خیالات کے مطابق سکھا اور سمجھا سکو۔ بھلا اس کی کیا ضرورت ہے کہ تم یہاں سے چلی جاؤ"

للّی اپنے ساتھ میٹرک کی تمام کتابیں لائی تھی۔ کیونکہ وہ شادی سے پہلے امتحان کی تیاری کر رہی تھی، لیکن ایسے وحشی انسانوں میں رہ کر اُسے جرأت نہ ہوتی تھی کہ ان کتابوں کو صندوق سے نکالے۔ لیکن اندوبھوشن اس معاملہ میں بہت مستقل مزاج واقع ہُوا تھا اس نے کہا کہ للّی کو محنت کر کے میٹرک کے امتحان میں ضرور شریک ہونا چاہیئے۔ غریب للّی عجیب مخمصہ میں پڑ گئی تھی۔ جب کبھی وہ کتاب لے کر بیٹھتی تو کوئی نیا مہمان دُلہن کو دیکھنے کے لئے آپہنچتا۔ اور اُسے فوراً کتابیں چھُپا دینی پڑتیں، اور آنکھیں بند کر کے گھونگھٹ

نکال کر بیٹھ جانا پڑتا ۔ لیکن للی کی اس احتیاط کے باوجود لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ دُلہن حقیقت میں انگریزی لکھتی اور پڑھتی ہے اور تعجب خیز خبر دُور دور تک پھیل گئی ۔

جب تھوڑے دِن کے بعد للی اپنے میکے واپس آئی تو پہلے کی مانند ایک بیوقوف اسکول کی لڑکی نہ رہ گئی تھی جو دیہاتی معاشرت اور سماجی حالات سے واقف نہ ہو ۔ اس نے بہت کچھ نئے معلومات حاصل کر لئے تھے ۔ اب وہ پوری طرح اس امر سے واقف ہو گئی تھی کہ کسے دیکھنا چاہئے اور کسے نہ دیکھنا چاہئے ۔ اس کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ کس کس کا نام لے اور کس کا نہ لے ۔ اس نے اس امر سے بھی واقفیت حاصل کر لی تھی کہ جیٹھ اور شوہر کے بڑوں کے سامنے آنا ، یا اُن کو چھُونا سخت گُناہ ہے ، وہ اِن تمام باتوں کو حفظ کر کے کلکتہ واپس آئی ۔

اس کو ایک سال تک اپنے میکے میں رہ کر سسُرال واپس جانا تھا ۔ اندوبھوشن کی یہ خواہش تھی کہ للی اپنے تعلیمی مشاغل کو جاری رکھے ۔ اس کے باپ نے بھی رضامندی ظاہر کی ۔ اس لئے پھر للی نے جوتا پہنا ۔ کتابیں اُٹھائیں اور مدرسہ جانے لگی ۔

(۳)

للی کے مدرسہ میں تقسیم انعامات کا سالانہ جلسہ تھا ۔ للی کو بھی اس میں انعامات ملنے والے تھے ۔ حالانکہ اس کو امتحان میں ایسی کامیابی حاصل نہ ہوئی ، جس کی اسے توقع تھی ۔ لیکن اس نے ایک مختصر انگریزی ڈرامہ میں ، جو اس روز کیا جانے والا تھا ، ہیروئن کا پارٹ لیا تھا ۔ للی کا انگریزی تلفظ بہترین ہونے کی وجہ سے اُسی کو منتخب کیا گیا تھا ۔ چونکہ مہمانوں میں ممتاز لوگ بھی شامل تھے اس لئے اساتذہ نے بہت محنت کی تھی اور کئی ریہرسل ہو چکے تھے ۔

اُن لڑکیوں کو ، جنہوں نے گانوں وغیرہ میں پارٹ لیا تھا ، دوسری لڑکیوں کی بہ نسبت جلد بُلایا گیا تھا ۔ اس لئے للی بھی جانے کی تیاریاں کر رہی تھی ۔ وہ جانتی تھی کہ ایک لڑکی ، جس کا شوہر موجود تھا ماتھے پر سُرخ بندی لگائے بغیر کہیں نہ جاتی تھی ۔ لیکن آج للی کو اسٹیج پر برٹی ٹینیا کے لباس میں آنا تھا ، جو سمندر رول کی ملکہ تھی ، بھلا وہ آج مدنا پور کی ایک دیہاتی دُلہن کی مانند پیشانی پر سُرخ بندی لگا کر کیسے جا سکتی تھی ؛ یہ سوچ کر وہ عجیب کشمکش میں پڑ گئی ۔ اس نے اپنے بالوں کو خوب دھو کر صاف کیا تھا اور سُکھایا تھا ۔ اس وقت وہ اس کے شانوں پر سیاہ بادلوں کی مانند اُڑ رہے تھے ۔ اس کی ماں اس کو کچھ ناپسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھ رہی تھی ۔ " کیا میں تمہاری مانگ پر ایک سُرخ بندی لگا دُوں ؛ " اس نے پوچھا " کوئی اس پر دھیان نہ دے گا " ۔

" نہیں اماں جان نہیں ! " للی نے جواب دیا ۔ " اگر میرے اُستاد دیکھ لیں گے تو مجھ پر ہنسیں گے " ۔

گاڑی کھڑی ہوئی تھی ، اور للی اب نیچے اُترنے ہی والی تھی کہ اس کی بڑی بہن یہ کہتی ہوئی آ پہنچی " میم صاحب ذرا ایک منٹ کے لئے ٹھیر جاؤ ۔ تمہاری سسُرال سے بعض رشتہ دار آئے ہیں ۔ اب تم نیچے نہیں جا سکتیں " ۔

"لیکن مجھے جانا ضروری ہے"۔ للی نے مضطربانہ لہجہ میں کہا۔ "ورنہ سارا کام خراب ہوجائے گا"۔

"کیا واقعی تم کو جانا ضروری ہے؟" اس کی بہن نے کسی قدر برہمی سے کہا۔ "مگر جانتی بھی ہو کہ یہ لوگ کیا کہیں گے۔ جب ان کو معلوم ہوگا کہ ان کے گھر کی ایک بہو مدرسہ میں رقص کرنے گئی ہے۔ کیا تم سب کچھ بھول گئیں ؛ میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ ان کاموں میں حصہ نہ لو۔ لیکن تم نے سُنا ہی نہیں"۔

للی انتہائی مایوسانہ انداز سے فرش پر بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت یہ بھی نہ جاننا چاہتی تھی کہ کون لوگ آئے ہیں اس وقت اس کے دماغ میں اس کے ناراض اساتذہ اور مایوس سہیلیوں کی تصویریں رقص کر رہی تھیں، یقیناً اُس پر اس تقریب کو ناکام بنانے کا الزام ضرور لگا یا جائے گا۔ غریب للی اس خیال سے سوائے رونے کے اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔

جب وہ سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی رو رہی تھی تو گھر کے سب لوگ مہمانوں کی خاطر تواضع میں ہر طرف دوڑ رہے تھے، حتےٰ کہ للی کی ماں بھی مکھیاں اُڑانے کے لئے پنکھا لے کر کھڑی ہوگئی تھی، لیکن للی کا دل اس قدر افسردہ ہوگیا تھا کہ وہ ان مہمانوں کے متعلق کچھ پوچھنا ہی نہ چاہتی تھی۔ گو وہ اسی کے گھر کے مہمان تھے۔

تقریباً تین گھنٹہ کے بعد معزز مہمان چلے گئے۔ اس وقت تک مارے خوف کے للی کا بُرا حال ہو رہا تھا، اُستاد اس کو کیا کہے گا اس نے سوچا۔ اس نے کسی سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ کرایہ کی گاڑی پر مدرسہ روانہ ہوئی، کیونکہ گھر کی گاڑی میں مہمان جا چکے تھے۔

مدرسہ کی عمارت کے سامنے ایک بہت بڑا سُرخ شامیانہ لگایا گیا تھا۔ راستے جھنڈیوں سے آراستہ تھے اور سڑک موٹروں اور گاڑیوں سے معمور تھی۔ ہر طرف شور و غل مچا ہوا تھا۔ دو تین لڑکیاں اور دو خواتین روش پر کھڑی ہوئی سڑک پر مضطربانہ نگاہیں ڈال رہی تھیں۔ اور ان کو پاس سے گذرنے والی گاڑیوں اور بھیڑ کا ذرا بھی خیال نہ تھا، جب غریب للی ان کے سامنے گاڑی سے اُتری تو سب نے ہم آہنگ ہو کر پکارا "للی" وہ سب اس قدر ناراض تھیں کہ اور کچھ نہ کہا، لیکن اور زیادہ کہنے کا موقع بھی نہ تھا، وہ للی کو لے کر جلد جلد اندر کی طرف چلی گئیں۔

گورنر کی بیوی انعام تقسیم کرنے والی تھیں، ان کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے، پروگرام کے بعض اہم امور ختم ہوئے اور اب ڈراما شروع ہونے والا تھا جس میں للی نے پارٹ لیا تھا۔ پیانو نواز نے پیانو شروع کیا۔ چند لڑکیاں اسٹیج پر رقص کرتی ہوئی آئیں اور بیچ اسٹیج پر کھڑی ہوگئیں۔ پیانو کی آواز بلند ہونے لگی، اور ساتھ ہی ایک حسین اور دلکش پیکر نمودار ہوا۔ جس کے سر پر ایک سُنہری، چمکدار تاج رکھا ہوا تھا، لباس نیلگوں اور سمندر کی موجوں سے بہت مشابہ تھا، یہ بری ٹینیا سمندروں کی ملکہ تھی۔

حاضرین نے مسرت و تبسم کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ لیکن اس لڑکی کو کیا ہوگیا تھا؛ وہ خوف سے کانپ رہی تھی، جب اس نے حاضرین پر نظر ڈالی تو یکایک اس کے چہرہ کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ ایک چیخ مار کر اسٹیج پر سے غائب ہوگئی۔ کسی کو معلوم نہ ہوا کہ

وہ بیہوش ہوگئی یا محض پیچھے گر پڑی - ہر طرف سے افسوس کی صدائیں بلند ہونے لگیں مگر پالنہ نواز خاتون اس بات پر سخت برہم ہو رہی تھی۔ دو تین لڑکیوں نے دوڑ کر للی کو اُٹھانے کی سعی کی، لیکن وہ سیدھی اور ساکت پڑی رہی۔ اور اس کا چہرہ ہاتھوں سے بند تھا، اس کا اُستاد دوڑا ہوا آیا "للی فوراً اُٹھو" اس نے کسی قدر برہم ہو کر کہا "تم سارا کام خراب کردو گی"۔ لیکن للی نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی۔ بہت سے لوگ کھڑے ہو کر یہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگے کہ اسٹیج کے پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ عورتیں تو سب کی سب اس لڑکی کے اطراف جمع ہوگئیں۔ اس کو کیا ہوا؟ کیا وہ بیہوش ہوگئی؟ للی کی سہیلیاں بار بار پوچھنے لگیں "کیا ہوا پیاری للی"؟ کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟" لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

گورنر کی بیوی اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کرنا چاہتی تھی، اس نے للی کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ لیکن اسکول کے عہدہ داروں سے استدعا کی کہ بلا انتظار کے اب انعامات کی تقسیم شروع کردی جائے۔ حاضرین اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

گورنر کی بیوی نے انعامات تقسیم کئے اور حاضرین اس کے بعد آہستہ آہستہ رخصت ہوئے۔ مرد پہلے چلے گئے۔ پھر عورتیں مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو کر باتیں کرنے لگیں۔ بعض للی کے پاس پہنچ کر اس سے ہمدردی کا اظہار کرنے لگیں۔

"براہِ کرم مجھے گھر بھیج دیجئے" للی نے آخر کار کہا۔ یہ اس حادثہ کے بعد پہلے الفاظ تھے جو اس کی زبان سے نکلے۔ اور کچھ کہنے سے اس نے انکار کردیا۔ چنانچہ اس کو گھر بھیج دیا گیا۔ گھر پہنچتے ہی للی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "میں آج سے مدرسہ نہ جاؤنگی" اس نے روتے ہوئے کہا، گھر کے سب لوگ حیرت سے اُسے دیکھنے لگے۔

آخر کار اس نے اس حادثہ کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ حاضرین میں للی نے سب سے پہلے جس شخص کو دیکھا وہ اندوبھوشن کا ماموں رائے چرن رائے وظیفہ یاب اسکول انسپکٹر تھا۔ اور اس کی نظر للی پر پڑنا، للی کے لئے ایک گناہِ عظیم تھا۔ اس کے علاوہ اس کا بیٹا بھی، جو اندوبھوشن سے عمر میں بڑا تھا، اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا، خاندانی رسم کے لحاظ سے وہ بھی للی کو نہ دیکھ سکتا تھا۔

یہ دونوں وہ معزز مہمان تھے جو صبح کے وقت للی کے مکان پر آئے تھے، اس کے بعد للی کے مدرسہ چلے گئے تھے۔ اس روز سے للی پھر مدرسہ نہیں گئی۔

(شانتا دیوی)

محشر عابدی بی۔ اے

مصنف "محشرستان"

غزل

ہر چند کہ ظاہر و عیاں ہوں ۔۔۔ در اصل جہان سے نہاں ہوں
چیخ اُٹھوں نہیں ہے تاب یہ بھی ۔۔۔ میں دردِ نہاں سے ناتواں ہوں
بیٹھا ہوں تو نقشِ پا کی مانند ۔۔۔ اُٹھا ہوں تو گردِ کارواں ہوں
ساقی سے غرض نہ میکدے سے ۔۔۔ مَیں مستِ شرابِ عاشقاں ہوں
مسجد کی خبر نہ بتکدے کی ۔۔۔ مَیں بندۂ حُسنِ دلستاں ہوں
گرداب نہیں کہ جس سے نکلوں ۔۔۔ مَیں کشتۂ موجِ ناگہاں ہوں
منزل کا پتا نہ راستے کا ۔۔۔ اُٹھے ہیں جدھر قدم رواں ہوں
مَیں ماہِ سپہر کا ہوں سایہ ۔۔۔ مَیں پرتوِ مہرِ آسماں ہوں
بالیدۂ آبِ عشقِ خوباں ۔۔۔ گلدستۂ حُسنِ گلرخاں ہوں
ہستی ہے مری عجب معمّا ۔۔۔ اک خواب ہوں وہم ہوں گماں ہوں

ناشاد مکینِ کوئے الفت
کہتے ہیں غلط کہ لامکاں ہوں

رام پرشاد ناشاد

محفلِ ادب

پند نامہ شغلی دکھنی

اردو ادب کے بہت کچھ جواہر پارے انجمن ترقی اردو کی بدولت تباہی سے بچ گئے اور اکثر انمول موتی اب بھی ہماری توجہ کے محتاج ہیں، اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ پند نامہ ہے جس کے مصنف نے خود کو شغلی کہا ہے شغلی کے متعلق اُردو شعرا کے تمام تذکرے خاموش ہیں، دکھنی ادبیات کے ذخیرہ کے مطالعہ سے صرف چند اشعار ایسے ملتے ہیں جو شغلی کے بتائے جاتے ہیں، اس پند نامہ میں ۱۰۵ اشعار ہیں لہذا یہ شغلی کے کلام کا مستقل نمونہ کہا جا سکتا ہے، اِن ۱۰۵ اشعار میں سے صرف ۱۰۳ ملتے ہیں، شاید دو شعر ضائع ہو گئے۔

شغلی کے متعلق میں صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ وہ نصرتی کا ہمعصر تھا یا فوراً اُس کے بعد پیدا ہوا، کیونکہ یہ پند نامہ نصرتی کی مشہور مثنوی گلشنِ عشق کے ساتھ ہی شامل ہے، گلشنِ عشق کا یہ قلمی نسخہ (جس کے لئے میں نواب حبیب الرحمٰن صاحب شروانی (صدر یار جنگ بہادر) کا مشکور ہوں) ۱۰۶۸ھ میں تصنیف ہوا اور ۱۱۶۸ھ میں اس کی کتابت ہوئی۔ اس سے یہ امر یقینی ہے کہ یہ ۱۱۶۸ھ سے قبل کی تصنیف ہے لیکن صحیح تاریخ کا تعین یقین کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ کسی فارسی پند نامہ کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے۔

سو اس وجہ تھی فارسی میں کتاب　　سو شغلی دکھن سال ؛ کیتا شتاب

سبب کیا جو کوئی معنی فارسی　　نیاتا سو پاوے کیا آرسی

لیکن اس کے متعلق باوجود کوشش کے زیادہ معلومات نہ مِل سکیں۔ اس سلسلہ میں پنجاب کے اکثر کتب خانے دیکھے، رامپور کے کتب خانہ میں بھی معلوم کیا، کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، کتب خانہ دفتر دیوانی سرکار نظام میں بھی جستجو کی۔ ان مقامات میں آصفیہ سے تین غیر مطبوعہ قلمی تذکرے ملے ایک تذکرہ دفتر دیوانی سے ملا۔ کسی فرصت میں انشاءاللہ اُن پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائیگی، شغلی کے متعلق میری کوششیں جاری ہیں، اگر میں نہ کر سکا تو ممکن ہے کہ یہ سعادت کسی دوسرے کے حصّہ میں ہو۔

اِس سلسلہ میں ایک "ذات" کا شکریہ ضروری سمجھتا ہوں جس سے مجھے اپنے کام میں بہت کچھ مدد مِل جاتی ہے، یہ غائبانہ شکریہ میرا فرض تھا، اس سے زیادہ کی اجازت نہیں مِل سکی، بہرحال ؎

حساب دوستاں در دِل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پند نامہ

کہ یک دن محمد علیہ السلام　　لیے اصحاب بیٹھے مدینہ تمام

تہاں یک شخص آ نبی کوں سلام　　کیا ہور کہن لاگیا یوں کلام　　۱ اس جگہ ۲ کو ۳ اور ۴ کہنے لگا

جو میں آئیا ہوں تمن قدم کن　　کہ شہر بین تے نصیحت سکن　　۱ آیا ۲ تمہارے ۳ پاس ۴ سے ۵ سیکھنے

تمیں منج نصیحت کے دیو عقل　　تو تس پر حکم میں کروں کا عمل　　۱ تم ۲ مجھے ۳ یعنی تس حکم پر میں عمل کروں گا

سو یو بات سن کر نبی یوں کہے　　تیرا بول مقصود جہانلگ اچھے　　۱ جس قدر ۲ ہے

تو تب دیں ادا اصحاب کیتا سلام　　نبی سوں ہوا پھر کے یوں ہم کلام　　۱ کیا ۲ سے

جو میرا ارادہ ہے یوں دل منے　　جو طاعت کروں رب کی تل تل منے　　۱ میں ۲ تل تل منے گھڑی گھڑی ہمیشہ

جو کرتا اچھوں بندگی میں سدا　　کدھیں بھی نہ طاعت سوں ہووں جدا　　۱ رہوں ۲ کبھی وقت۔

کیا بات دو اصحاب اسدھات جب　　سو سن کر نبی یوں کہے بات تب　　۱ اس طرح

جو اول ہو کے پاک وضو توں ساز　　جماعت سوں پنج وقت کر توں نماز　　۱ تو

اگر تو امر رب کا سر پر لیا　　گویا کے شب و روز طاعت کیا　　۱ یہ

او اصحاب نے یو سنیا بات جب　　تجھے دوسرا کیا سوال اسدھات جب　　۱ ۲ دوسرا

جو میں ہوں بھلا اس خلق میں رہوں　　کریں سب قبول بات جو میں کہوں

سو یو بات سن کر نبی یوں کہے　　اگرچہ خدا ترس ہو توں رہے

تو ہووے گا خلق دوست تیرا تمام　　انوں میں پھرے گا تو ہو کر امام　　۱ سب

سو یو بات سنی تا چہ سیوم سوال　　کیا پھر و اصحاب یوں حال حال

کشادہ ہووے دل جو منجہ تنگ ہے　　ہووے موم سا دل جو منج سنگ ہے　　۱ ۲ میرا

سو اس وجہ او شخص کیتا بیان　　سو اس کے نبی نے کئے یوں نشان

جو کچھ بات سچ دل میں آوے اگر　　تو نا بھول رب کوں سدا یاد کر

تو تب جا تیرا دل ہوئے گا کشاد　　ہبے تس پر بہوت ہوئے گا شاد شاد

سو یو بات سن دیں و اصحاب نے　　کیا سوال پھر دیں محمد کنے کے پاس

صدق یا محمد علیہ السلام　　بڑا ہے جو مقصود میرا تمام

جو میرا ارادہ اہے یو اصل　　رہوں ہو حضوری خدا کی اگل　　۱ آگے

سو یو بات سن کر نبی نے شتاب　　دیئے سوال کا اسکوں یوں کر جواب

ہے سگتا حضوری توں ہونی اگر — تو قرآں تلاوت شب و روز کر
بہے یو سوال کیتا نبی کے سنگات[1] — کہ اے یا خدا کے رسول پاک ذات — ۱؎ ساتھ
میں ڈرتا ہوں رب سوں بہوت[2] کل آج — سو یو بات کا ہے کہو کیا علاج — ۲؎ بہت
نبی یوں کہے تب اسے بندۂ خدا — شب و روز کر یاد رب کوں سدا
ظاہر ہو۔ باطن خدا یاد کر — تو ہووے گا تب دوست مقبول تر
بچھے[3] یو سوال نبی کے کیتا اگل[1] — جو ہوؤں میں عاقل خلق سوں سگل[2] — ۱؎ آگے۔ سامنے ۲؎ سب۔ ۳؎ نیز۔
نبی یوں کہے یاد کر موت کوں — تو عاقل ہووے گا ہمہ خلق سوں
کیا سوال پھر یوں نبی کے اگل — جو پاؤں میں ایمان میرا سگل
سو یو بات سن کر نبی یوں کہن — لگے اس شخص کے نشاں یوں کرن
جو ہنس مکھ ہوے گا خلق سات جب — کرے گا سکل سوں میٹھی بات تب
تو تب تجکو ایمان ہووے گا تمام — کہ رحمت عطا ہووے گی صبح و شام
بہے یو سوال کیتا[1] میں آ گنہ[2] — ہوے دن بدن کم لگوں نیک راہ — ۱؎ کیا ۲؎ گناہ
نبی تب دیئے اس کوں یوں کر جواب — جو توبہ کیا کر سدا بے حساب
کیا سوال پھر یوں سوں اصحاب — جو مجکوں نہ ہووے قبر کا عذاب
سو اسکوں نبی جواب یوں کر دیتے — جو مسکیں غریباں فقیراں جتے[1] — ۱؎ جتنے۔ جس قدر۔
اہے سو اُنن پر تو ہو مہربان — نہ آزار دے اُن اُپر کر آسان — ۱؎ اُن
تو تجکوں اُنن[1] کی دعا سوں ثواب — ہوے گا نہوے ؛ قبر کا عذاب
کہیا او شخص پھر کے اے یا رسول — جو میری دعا ہوئے ہر دم قبول
دیئے جواب یوں خاتم الانبیاؑ — جو تجکوں اہے جیو[1] جنے[2] دیا — ۱؎ جان ۲؎ جس نے
سو اس پاس منگ[1] توں دعا مستجاب — ہوے گا ہر کام تیرا شتاب — ۱؎ مانگ
کیا سوال پھر کر او درحال دیں — جو ننگا رہوں تا قیامت کہ نئیں؟
جو سُن کر اُٹھے یوں محمد نے بول — جو توں موسنا کان[1] کو عیب کھول — ۱؎ نہیں
کسی کا یہاں سیل نا دھوے گا — قیامت کوں نا پھر ننگا ہوئے گا
کیا سوال پھر یوں نبی کے اگل — قیامت نہ ہو جائے مجھ پر سگل[1] — ۱؎ دشوار
سبب کیا جو ہوے گا برا او وقت — سو او وقت سب پر کھٹے[1] گا سخت — ۱؎ بیتے گا۔ گذرے گا
تو اس وقت پر میں عرش کے تلار[1] — رہوں چھاؤں تل[2] کچھ نہ دیکھوں ازار[3] — ۱؎ تلے، نیچے ۲؎ تلے ۳؎ آزار
سو یو نقل حبب او شخص نے کیا — سو تسکوں دیئے جواب یوں انبیاؑ

اگر کوئی دواپ میں کریں جنگ جدل — لڑنے تو صلح کر خدا کے بول

یوں کرتا رہے گا صلح تو سدا — تو تج عرش تل جاؤں دئیگا خدا

نبی کی زبانی سنیا بات یوں — بہے پھر سوال کیتا نبی سات یوں

جو اعمال نامہ سفید دھائے کر — رہے واڈنی ؛ ہات مج آئے کر ؎۱ داہنا سیدھا

نبی نے دیئے جواب اسدھات سوں — جو مادر پدر کوں خوشی راکھ توں

تو تب جا او اعمال نامہ نچھل — سیدی ہات پر آرہے گا سگل

کیا سوال پھر یوں وا اصحاب نے — نبی کے آن کے روبرو سامنے

جو دنیا لے ہووے میرا دل سرد — بہے تسپر ہمیشہ اچھوں پر درد ؎۱ رہوں

نبی نے دیئے جواب اسدہات سوں — سدا دیکھتا اچہ گورستاں توں

تو تب دل دنیا سوں سرد ہویگا — بہوت موم دل پر درد ہوئے گا

کیا سوال پھر کر جو محبکوں اتال — جو ہونا شفاعت تمہارا کمال ؎۱ حاصل ؎۲ تمہارا

دیئے جواب یوں کر نبی پاک ذات — کہے یوں و اصحاب کے سات بات

جو رانڈاں یتیماں، اسیراں، گدا — اہے سو انن پر رحم کر سوا

تو تب جا شفاعت تجھے ہوئے گا — اُنن کا درد دکھ اگر کھوئے گا

یو سنکر او اصحاب نے سوال یوں — کیا پھر نبی سات در حال ووں

جو آئے روز محشر کوں دیدار ہنیں؛ — خدا دیکھے کا اُمیدوار ہیں

سو سن کر نبی جواب یوں کر دیئے — نصیحت و اصحاب کوں یو کیئے

جو ہمسائیگاں پر کرم کی نظر — کیا کر توں احسان انن کے اپر

تو تب کئین قیامت کوں دیدار توں — دیکھے گا اگر ہے بڑا پکار توں

کیا سوال پھر یوں کہ اے پاک تن — کہ دونوں جہاں میں رہوں میں امن

دیئے جواب یوں کر نبی نے بیاں — جو مت بول، قید کر توں زباں

اگر بد زبان تلوں۔ کیسے نا کہے — تو ہر دو جہاں میں امن تے رہے

کیا سوال پھر یوں کہ اے یا رسول — جو توبہ پڑے رب کینے منج قبول ؎۱ میری (مجھ)

نبی نے دیئے جواب اسدھات سات — کئے یوں و اصحاب کے سات بات

جو توں اپنے نفس پر قہر کر — ہمیشہ خدائے تعالیٰ سوں ڈر

نیئن میں انجھو لیا کے روزار زار — تو توبہ قبول تج کرے گا غفار ؎۱ آنکھ ؎۲ آنسو ؎۳ لاکر

کیا سوال پھر یوں کہ اے پاک تن — جو ہوئے نہ مرنے میں منجہ جاں کندن

[illegible] اصحاب سوں — [illegible] ہو ایک عیب دار کوں

[illegible] میں لوں آن کر — تو تا ہوسے گی جان کندن سچ اپر

[illegible] اہو سکے یوں ہم کلام — جو میرا ہوسے دوست عالم تمام

[illegible] جواب پھر یوں نبی تاجدار — جو بد کام سوں توں ہو پرہیزگار

[illegible] بول توں جھوٹ نقصان ہے — عمل نیک کر کچھ کہ انسان ہے

[illegible] تجکیں خلق دوست ہوئیگا تمام — جواں میں رہے گا تو ہو نیک نام

[illegible] بات سن کر نبی کے اگل — کہن لاگیا یوں بیان کر سگل

[illegible] کوں دیکھے غضب سوں خدا — رکھے اپنے رحم میں رب سدا

[illegible] بات سن کر نبی یوں کہے — اگر غضب سوں رب کے ڈرتا رہے

[illegible] طاعت عبادت کیا کر سدا — تجھے غضب نا کچھ کرے گا خدا

[illegible] بات سن کر کیا وہیں سلام — نبی سوں ہوا پھر کے یوں ہم کلام

[illegible] میں آب کوثر کا پیتا رہوں — عمر ہو ابد لگ[1] میں جیتا رہوں

[illegible] کہے یوں محمد علیہ السلام — دے پیاسے کوں پانی بھوکے کوں طعام

[illegible] آب کوثر کا ہوسے گا عطا — عمر ہوجئے گا سدا بے خطا

[illegible] بعد از نبی نے دیئے یوں جواب — کہ واللہ اعلم بالصواب

[illegible] کوں محمد علیہ السلام — نصیحت کئے پند نامہ تمام

[illegible] پند نامہ سنے تو ثواب — ہے اتنا جو ہوئے نکوئی[1] عذاب

[illegible] کوئی دیکھے اسے بھر نظر — تو گویا نبی کوں او[2] دیکھا بشر

[illegible] کوئی اسکوں پڑھے گا تمام — کہ دوزخ کی ہے آنچ اسکوں حرام

[illegible] کوئی اس پر کرے گا عمل — سوا دہوئے گا خاص بندہ اصل

[illegible] اس وجہ تھی فارسی میں کتاب — سو شغلی دکھن سال کیتا شتاب

[illegible] کیا جو کوئی معنی فارسی — نپا تا سو پاوے کیا آرسی[1]

[illegible] یک سو پانچ بیستاں تمام — زصدق محمد علیہ السلام

---

۱ تلک ۔ تک

۱ نہ کوئی

۲ وہ

۱ صاف ۔ ظاہر

[illegible] بدایونی

"جامعہ"

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے

اصغر علی محمد علی عطرساز لکھنؤ

اعلیٰ طبقہ کی خواتین سر میں لگانے کیلئے اس کارخانہ کا تیار کردہ بانو ہیر آئل استعمال کرتی ہیں

طبقہ نسواں میں اس کارخانہ کا عطر سہاگ و عطر عروس نہایت مقبول ہے

یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیکنامی کے ساتھ جاری ہے

سید عبداللطیف پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے ۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے ۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱؍ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے ۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے ۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے ۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا ۔

۸۔ جواب طلب امُور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے ۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصُولڈاک) فی پرچہ ۸؍ ۔

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مُکمل پتا تحریر کیجئے ۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے ۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳ - لارنس روڈ - لاہور

Title and Picture Printed at the Halftone Press, Lahore.

ہمایوں
فرانسیسی ادب نمبر ستمبر ۱۹۳۵ء
ایڈیٹر
(السن) بیرسٹرایٹ لا
نٹ ایڈیٹر
حامد علی خاں بی۔اے
SHARIF
LAHORE

فہرست مضامین

"فرانسیسی ادب نمبر"

نمبر (۳)

"ہمایوں" بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۵ء

تصاویر:- (۱) والٹیئر (۲) روسو (۳) ڈوما (۴) شیتوبریاں (۵) وکٹر ہیوگو (۶) سٹینڈھل (۷) بالزک (۸) موپساں (۹) مولیئر

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے مع محصول ——— قیمت فرانسیسی ادب نمبر ۱ر

بزمِ ہمایوں

"فرانسیسی ادب نمبر" اُس سلسلے کی دوسری کڑی ہے جو اہلِ اُردو کو غیر زبانوں کے ادب سے روشناس کرنے کے لئے "روسی ادب نمبر" سے شروع کیا گیا تھا۔ یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں کہ ایک ماہوار رسالے کی قلیل ضخامت ایک زبان کی ادبیات کے ہر دور اور ہر مصنف کے کارناموں کا سرسری سا احاطہ بھی نہیں کرسکتی اس لئے "روسی ادب نمبر" کی طرح موجودہ نمبر کو بھی کسی طرح جامع و مانع نہیں کہا جاسکتا۔ موجودہ پرچے میں صرف چند اہم فرانسیسی ادبا و شعرا کی تحریر کے نمونے پیش کئے جاسکے ہیں لیکن بعض اور اہم اور خصوصاً ہم عصر ادبا و شعرا کے مضامین کا نمونہ پیش کرنے سے یہ پرچہ قاصر رہا ہے اور اس کے سوا موجودہ قلتِ حجم کے ہاتھوں چارہ بھی نہیں۔

بہرحال یہ سلسلہ دلچسپ ضرور ہے اور اہلِ الرائے حضرات نے اسے مفید سمجھا ہے۔

جن اصحاب نے ہماری درخواست پر موجودہ پرچے کے لئے مضامین اور افسانے لکھے ہم اُن کے بالعموم اور مسٹر سعادت حسن کے بالخصوص ممنون ہیں جنہوں نے اس پرچے کی ترتیب میں بہت دلچسپی لی اور اس کے لئے مضامین لکھنے اور فراہم کرنے میں ہمیں قابلِ قدر مدد دی۔

کسی دوسری جگہ حضرت جوش ملیح آبادی کا ایک اعلان شائع ہو رہا ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرکے بہت مسرت ہوئی ہے کہ صاحبِ موصوف نے دہلی سے ایک بلند پایہ ادبی رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ جوش اقبال کے بعد عہدِ حاضر کا سب سے بڑا ہندوستانی شاعر ہے۔ اس کی ہمہ گیر اور ہمہ رس نگاہ کوہ و کاہ اور ذرہ و خورشید کا یکساں احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اگر فلسفے اور عمل آموزی میں ہم اسے ایک طرف غالب و اقبال کے قریب دیکھتے ہیں تو دوسری طرف جزئیات کے مشاہدے اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کی اہمیت کے احساس سے بہرہ ور ہوتے ہیں ہم اسے نظیر اکبر آبادی کے سلسلۂ خیال کی ایک ارتقائی کڑی بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اتنے بڑے شاعر اور ادیب کا صحافت کی طرف متوجہ ہونا ملک کی خوش قسمتی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ اہلِ ملک حضرتِ جوش کی آواز کا کما حقہ خیر مقدم کریں گے۔

تصاویر

موجودہ نمبر جن فرانسیسی مشاہیر کی تصویروں سے مزین ہے ان میں سے اکثر کا تذکرہ اس پرچے کے مضامین میں موجود ہے

موپساں

وکٹر ہیوگو

بالزک

سٹینڈہل

روسو

والٹیر

شاتوبرنداں
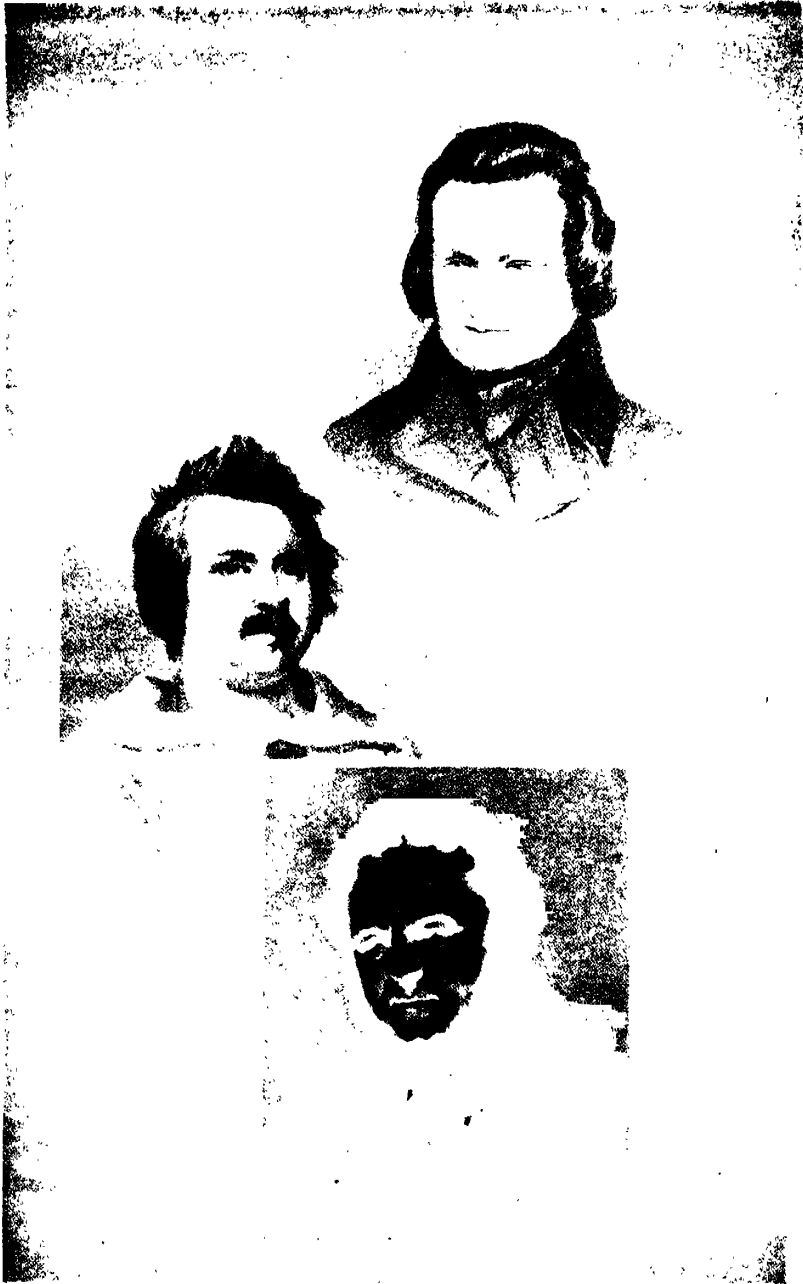
دوما

مولیر

لیکن یہاں یکجا تصاویر کا سرسری سا تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے:-

والٹیر (۱۶۹۴-۱۷۷۸ء) فرانکوئے ماری آروئے جو اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی فضلا میں ممتاز ترین شخصیت کا مالک تھا اِس نام سے مشہور ہے۔ آپ کی ذہنی استعداد اپنے تنوع اور وسعت کے لحاظ سے حیرت انگیز ہے۔ اس کے ڈراموں کی تعداد ہی پچاس ساٹھ کے لگ بھگ ہے جن میں سے بعض دنیا کے بہترین ڈراموں میں شامل ہونے کے قابل ہیں۔ اس کی شاعری قدرتِ زبان، قدرتِ فن اور بذلہ سنجی کے قابلِ قدر نمونے پیش کرتی ہے اور ناول نویسی میں تنقید نگاری کے اس اُستاد کے شاید دو ہی چار اور حریف ہوں۔

روسو - جین جیکوئیس روسو ۲۸ جون ۱۷۱۲ء کو جنیوا میں پیدا ہوا ۱۷۴۱ء میں وہ پیرس میں رہنے لگا۔ اس نے اپنی تحریروں میں مذہب اور ریاست کے نظام سے بغاوت کی جس کے باعث ۱۷۶۲ء میں اسے سوئٹزرلینڈ میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ ۱۷۷۰ء میں وہ دوبارہ پیرس آیا اور ۲ جولائی ۱۷۷۸ء کو مر گیا۔

الگزنڈر ڈوما (۱۸۰۲-۱۸۷۰ء) ۲۷ سال ہی کی عمر میں یہ ایک کامیاب ناول نویس کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔ ۱۸۴۴ء میں "تھری مسکیٹیرز" کی اشاعت کے بعد اس کی قابلیت کے جوہر پوری طرح کھل گئے۔ ۱۸۴۴ء سے ۱۸۵۰ء تک اس نے حیرت انگیز تعداد میں ناول لکھے اور اس کی تصنیفات کی طلب اتنی بڑھی کہ آخر اسے مددگاروں کی ایک جماعت رکھنی پڑی جن کی تحریروں کی اصلاح و ترمیم کر کے وہ طلب و رسد کا توازن قائم رکھتا۔

شیٹو بریاں (۱۷۶۸-۱۸۴۸ء) یہ سینٹ مالو میں پیدا ہوا۔ فرانسیسی افواج میں کچھ مدت تک کام کرنے کے بعد یہ پیرس آ گیا اور یہاں شاعر کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ ۱۷۹۱ء میں یہ امریکا چلا گیا اور لوئی ہشتم کے قتل تک وہیں رہا۔ اس موقع پر یہ فرانس واپس آیا اور ۱۷۹۲ء میں جمہوریت پسندوں کے خلاف لڑتا ہوا شدید طور پر زخمی ہوا۔ آخر اس نے انگلستان میں پناہ لی۔ نپولین کے تخت نشین ہونے پر وہ پیرس واپس آیا جہاں اس نے اپنی حیرت انگیز تصانیف کی اشاعت شروع کی۔

وکٹر ہیوگو - یہ ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوا۔ وکٹر ہیوگو فرانس کے اہم ترین شعرا میں سے ہے، یہ شاعری میں رومانی تحریک کا محرک ہوا، ناول نویسی کی طرف بھی اس نے توجہ کی اور اس فن میں بھی اس نے درجۂ امامت حاصل کیا۔ یہ اپنے عہد کے نظامِ معاشرت سے بیزار تھا۔ اس نے اپنی تحریروں میں غریبوں پر طبقۂ امرا کے مظالم بہت دردناک طریقے سے بیان کیے ہیں۔ "لامزرابلز" اس کا مشہور ترین ناول ہے جسے بعض نقاد دنیا کا بہترین ناول سمجھتے ہیں۔ ۱۸۸۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

سٹینڈھل (۱۷۸۳-۱۸۴۲ء) ماری ہنری بیلی اس نام سے مشہور ہے۔ یہ فرانسیسی ناول نویسوں میں پہلا شخص ہے جس نے رومانی تخیلات کا خاتمہ کر کے ناول کو حقیقت پسندی کی راہ پر ڈالا اور اپنے عہد کی حقیقی زندگی کے غیر جذباتی غیر مبالغہ آمیز اور مشرح مرقعے پیش کیے۔

بالزک (۱۷۹۹-۱۸۵۰ء) یہ فرانس کا مشہور ناول نویس اور افسانہ نگار ہے۔ اس کے ناول کثیر التعداد ہیں جن میں سے بعض تاریخی ہیں اور اکثر اپنے عہد کی زندگی کے مطالعہ و تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں حسنِ تفصیل و صفائی کے ساتھ اپنے عہد کی معاشرت کی تصویریں پیش کرتا ہے اس میں بہت کم مصنفین اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ انسانی جذبات کا تجزیہ کرنے میں بالزک کا ملکہ بے مثال ہے۔

موپساں (۱۸۵۰-۱۸۹۳ء) مشہور فرانسیسی افسانہ نگار ہے جس کے افسانے تجزیۂ نفس کے حیرت انگیز نمونے پیش کرتے ہیں، یہ انسانی نفسیات کا غیر جانبدار مصور تھا اور فن کاری کو نیکی یا بدی کی تبلیغ کا ذریعہ نہ بنانا چاہتا تھا۔ اس کے اکثر افسانے افراد پر معاشرہ اور قوانینِ قدرت کے ظلم کا مرقع دکھاتے ہیں۔

مولیئر (۱۶۲۲-۱۶۷۳ء) یہ کامیاب فرانسیسی ڈراما نگار مزاحیہ نگاری کا استاد ہے۔ اس کے ڈراموں میں جذباتی تجزیے اور انسانی کمزوریوں کے دلاویز مرقعے عدیم النظیر ہیں۔ اس کے متعدد ڈرامے اردو میں منتقل ہو چکے ہیں جن میں محمد عمر نور الٰہی صاحبان کے تراجم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مولیئر ڈراما نویس ہی نہیں ایک کامیاب ایکٹر بھی تھا۔

فرانسیسی ادب پر ایک سرسری نظر

"کسی زمانہ میں ایک ڈاکو رہتا تھا جو ڈاکا ڈالنے سے پہلے دُعائیں مانگ لیا کرتا۔ ایک دِن وہ گرفتار ہوگیا اور اس کے لئے پھانسی کی سزا تجویز کی گئی لیکن خدا کو اسے دار پر مارنا منظور نہ تھا اس لئے ایک ولی نے جو اس کی التجائیں سُن چکا تھا، آسمان سے اُتر کر اس کی جان بچالی "۔

فرانسیسی ادب کی ابجد اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے منظوم قصّے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گیت جو مبالغے اور توہمات سے پُر ہوتے اور ایک حد تک مؤثر بھی تھے فرانسیسی ادب کے پہلے کارنامے ہیں۔ ایک بازیگر کا بہت مشہور قصّہ ہے کہ " وہ اپنا پُرانا پیشہ چھوڑ کر خانقاہ میں داخل ہوگیا لیکن اسے مذہبی رسوم سے واقفیت نہ تھی اس لئے اس نے اپنے خیال کے مطابق حضرت مریم کے رنگیں مجسمہ کے سامنے اپنے کمالات دکھلانے شروع کئے۔ اس دلی عقیدت کا اجر اسے اسی طرح ملا کہ حضرت مریم کا مجسمہ حرکت میں آیا اور آپ نے اپنی نشست سے اُتر کر اپنے آنچل سے اس کی پیشانی کے قطرے پونچھے" وغیرہ وغیرہ۔ ان قصّوں سے فرانسیسیوں کی سادہ دلی کی شہادت ملتی ہے۔ فرانس ایک بت پرست ملک تھا اور اس نے آہستہ آہستہ مذہب کی طرف میلان دکھانا شروع کیا تھا۔ اس کے غریب باشندے جنگلوں میں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنا کر زندگی گذارا کرتے۔ مذہب ان کے لئے ایک بہت بڑا ہمدرد ثابت ہؤا۔ ان کی جہالت اور سادہ لوحی، انہیں جو کہا جاتا اس پر اعتماد کرنے کے لئے مجبور کرتی۔ ان کے لئے زندگی کا بس یہی واحد مصرف تھا کہ اسے اس طرح گذارا جائے کہ آخرت میں اس محنت اور خوف کا کافی صلہ ملے۔

مائیں بچوں کو قصّے سنایا کرتیں کہ کوئی راہبہ خلوت کی زندگی سے عاجز آ کر بھاگ نکلی۔ ایک مُدت تک بُری زندگی گذارتی رہی۔ آخر اسے اپنے گناہ کا خیال آیا اور وہ اس کے تلافی کے لئے پھر خانقاہ میں داخل ہوگئی۔ لیکن وہاں اس دوران میں حضرت مریمؑ اس کے بھیس میں اس کے فرائض انجام دیتی رہی تھیں اور وہ پھر وہاں اس طرح داخل ہوئی کہ اس کی گذشتہ زندگی کا حال کوئی جان بھی نہ سکا۔

بالوں کو اس قصّہ میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آتی کہ ایک بہادر سپاہی کو کسی گناہ کی سزا کے سلسلہ میں ایک راہب کی ٹوکری میں پانی بھر لانے کا حکم ہؤا۔ وہ سال بھر تک پانی بھرتا رہا۔ آخر ایک دن اس کی آنکھوں سے ندامت کے سچے آنسو گرے اور ٹوکری یکایک پانی سے لبریز ہوگئی۔ اس قسم کی نظمیں اور گیت فرانسیسی ادب کی طفولیت کے وقت بہت عام تھے۔ اس کے بعد

ایک دوسرا دور شروع ہُوا۔ اور شاعری نے بہادروں کی مدح اور تعریف کی طرف مُنہ نہ موڑا۔ مسلمان، اسپین سے بڑھتے ہوئے فرانس کی طرف چلے آرہے تھے۔ فرانسیسی آنے والے حملے کے ڈر سے قبل از وقت مرے جارہے تھے۔ شارلمین مدافعت کے لئے اُٹھتا ہے اور سارا ملک اس کی تعریف سے گونج اُٹھتا ہے۔ بچے اس کی تعریف میں سڑکوں اور کھیتوں میں گاتے پھرتے تھے۔ یہ نظمیں بہت دلچسپ ہیں اور ان میں سب سے زیادہ مشہور رولینڈ کی ایک نظم ہے۔

گیارھویں صدی:۔ ان ساری نظموں میں خرق عادت واقعات کی بھرمار ہے۔ معجزے، معجزے نہیں باقی رہے کیونکہ وہ ہر قدم پر ظہور پذیر ہوتے ہیں اور سیدھے سادے فرانسیسی اپنے گذشتہ بہادروں کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ سب کچھ صحیح ماننے پر مجبور معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کی نظموں نے اُن میں ایک تازہ روح پھُونک دی۔ سپاہی یہ سمجھنے لگا کہ فرشتے اس کے پہلو بہ پہلو لڑتے ہیں اور خدائی فوج اُن کی مدد کے لئے تیار رہتی ہے۔

رفتہ رفتہ لوگ پُرانے قصّوں اور گیتوں سے تنگ آنے لگے۔ ان کی جگہ یونانی اور رومی بہادروں کے قصّوں نے لی۔ یہاں بھی عجائبات کی وہی فراوانی تھی۔ خواہ وہ سیزر کی داستان ہو یا سکندر کی خواہ ہکٹر کا قصہ ہو یا اینیز کا۔ معنی یہی کہتا ہے کہ وہ ایک ایسی بستی کے مکین تھے جہاں کوئی واقعہ بغیر جادو یا معجزہ کے رُونما ہوتا ہی نہیں۔ بہادری دکھانے کو ہیرو کو سمندر سے گزار دیتے ہیں، آگ پر دَوڑا دیتے ہیں، لیکن وہ کچھ ایسی دھات کا بنا ہوتا ہے کہ نہ گُھلتا ہے نہ پگھلتا ہے۔ فرانسیسی ادب اب تک جن اور پری کے قصّوں تک محدود تھا۔

ملک اب صلح اور امن کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ سالہا سال کی خوں ریزی اور جنگ سے لوگ عاجز آگئے تھے اس وقت چرچ کے پاس سب سے بڑی طاقت تھی۔ اس نے ادب کو ترقی دی اور ملک میں امن پھیلانے کی کوشش کی۔ قصیدہ گوئی سے لوگ اب غزل کی طرف مائل ہوئے۔ خیالات میں حسن و محبت کی جھلک پیدا ہونے لگی۔ غزلیں لکھی جاتیں کہ رقص و سرود کے لئے موزوں ہو سکیں۔ عید کے دن کسی خاص جگہ لوگ جمع ہوتے۔ سارا دِن عیش و نشاط میں گزرتا۔ خوب ناچتے گاتے۔

بارھویں صدی:۔ اب "مزاح" نے فرانسیسی ادب میں دخل دینا شروع کیا۔ بارھویں صدی میں رینارڈ کے قصّوں سے سارا ملک لطف اُٹھا رہا تھا۔ ایسوپ کے قصّے بہت عام پسند ہو گئے۔ دُنیا بھر کے جانور، پرندے اور مچھلیاں ادب میں گھسیٹ لائی گئیں۔ مذاق ہی مذاق میں اصلاحی پہلو بھی دکھا دیا جاتا۔ ابتداً مذہب نے اس ذوق کو ایک حد معینہ کے اندر ہی قائم رکھنا چاہا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مذہبی لوگ بھی عوام کے قہقہوں اور تبسم میں لطف لینے لگے۔

اِن چیزوں کو عام کرنے والا بازاری گانے والوں کا وہ طبقہ تھا جو اپنی الگ الگ جماعت قائم کر کے ملک میں پھرا کرتا اور امرا کے دربار میں کمال دکھا کر اپنی روزی کماتا۔ لیکن یہ جماعت بہت جلد نفرت کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی اور اس کام کے لئے

تعلیم یافتہ طبقے نے درباروں میں رسائی حاصل کرنی شروع کی۔ فرانسیسی ادب کی ترقی کا یہ پہلا زینہ تھا۔

تیرھویں صدی:۔ تیرھویں صدی کا شاہکار "داستان گل" نامی نظم کی شکل میں پیش ہوا۔ جس میں محبت کو ایک مقدس اور حسین چیز کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ پہلی نظم ہے جس میں بندش، زبان اور خیالات کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اسی عہد میں "تاریخ سینٹ لوئی" لکھی گئی جس میں ایک فرانسیسی بادشاہ کا جو چھ برس تک "مذہبی جنگ" میں لڑا کیا تھا تذکرہ ہے۔ اس میں صحیح واقعات کو قلمبند کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور مصنف بڑی حد تک کامیاب بھی رہا ہے۔

چودھویں صدی:۔ اس کے بعد فرانسیسی ادب کا تاریخی کارنامہ (Froissart) کی تاریخ کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ دربار کے واقعات، سوسائٹی کی حالت بہت سطحی طریقہ پر ظاہر کی گئی ہے۔ پھر بھی یہ چودھویں صدی کے تاریخی واقعات کے لئے ایک مفید کتاب ہے۔

پندرھویں صدی:۔ اس صدی میں ایک بڑی شخصیت نے صفحہ ہستی پر قدم رکھا Philippe de comines کو جو "دورِ متوسط کا آخری اور موجودہ دَور کا پہلا مؤرخ" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ایک عجیب زندگی سے واسطہ پڑا۔ بچپن میں یتیم ہوا۔ نہایت ہی مختصر تعلیم پائی۔ قسمت نے بہادر چارلس کے دربار تک رسائی کرادی۔ لیکن اسے چھوڑ کر لوئی یازدہم سے آملا۔ یہ اس کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوا۔ چارلس نہایت ہی جھگڑالو قسم کا آدمی تھا اور اس کے برعکس لوئی ایک عقلمند اور ہوشیار ریاست دان تھا۔ لوئی کی موت کے بعد ہی اسے اس غداری کا صلہ مل گیا۔ چارلس کے طرفداروں نے اسے آٹھ مہینہ تک لوہے کے پنجرے میں مقید رکھا اور اس کے بعد دو برس تک اسے قید خانہ کی روٹیاں توڑنی پڑیں لیکن یہ بھی اس کے لئے مفید ہی ثابت ہوا۔ اس نے قید خانہ میں اپنی مشہور عالم "یادداشت" لکھی جو آج بھی مؤرخوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دیتی ہے۔ یہ ماضی کے رومان اور توہمات سے بالکل جدا سچے واقعات پر مبنی تصنیف ہے۔ انسانی زندگی کے صحیح مناظر اور تاریخ کے سچے واقعات بلا کم و کاست لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسی دَور میں ایک دوسرا شخص بھی ادبی مشغولیتوں میں غرق تھا۔ دُنیا اسے Froncois Villon کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس نے نہایت ہی قابل اعتراض زندگی گزاری ہے لیکن اس نے فرانسیسی ادب کو ایک ایسا عمدہ ذخیرہ دیا ہے جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اس کی زبان جدت سے معمور نظر آتی ہے۔ اور اس کے گیت صحیح واقعات بیان کرتے ہیں۔ اس کے خیالات انسانی جذبات کے صحیح ترین ترجمان ہیں۔ ویلوں کے ادبی ذخیرہ میں کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی لیکن صداقت جو اس کے کلام کی جان ہے اسے تاابد زندہ رکھے گی۔

پندرھویں صدی کے آخر میں ایک ان سے بھی بڑی ہستی ظہور پذیر ہوئی۔ F. Rabelais کے والدین غریب تھے۔ اس نے ایک دہاتی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی اور پندرہ برس تک راہبانہ زندگی بسر کی۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک ایسا شخص

جو اتنی مدت تک قعرِ گمنامی میں رہا ہو یک بیک میدانِ عمل میں آتا ہے اور ایک ابدی شہرت چھوڑ جاتا ہے۔ اس نے اپنی راہبانہ زندگی ہی میں اپنے ادبی ذوق کو ترقی دینی شروع کی۔ اسے ہر قسم کے علم سے ذوق تھا۔ لیکن اس کی خاص دلچسپی کی چیزیں طب، ریاضی اور جوتش تھیں لیکن چرچ اس کے اس ذوق میں حارج ہو رہا تھا مجبوراً اسے مذہب کو خیرباد کہنی پڑی۔

Rabelais نہایت ہی نیک اور بے ضرر انسان تھا۔ اسے پہلے مذہب سے بہت دلچسپی تھی۔ لیکن آخر میں آکر وہ چرچ کا بہت بڑا دشمن ہو گیا۔ اس کے قصے اب بہت زیادہ دلچسپی سے نہیں پڑھے جاتے۔ اس کا مذاق نہایت ہی بازاری ہے لیکن یہ الزام اس کے سر عاید نہیں ہوتا کیونکہ وہ مجبور تھا۔ اسے اس وقت ویسی ہی فضا ملی تھی۔ وہ کہتا ہے زندگی ہنس کر گزارو۔

سولھویں صدی:۔ سولھویں صدی آتی ہے اور John Calvin صفحۂ ہستی پر نمودار ہوتا ہے۔ ریبلائے اور کالون کی تعلیمات میں بہت فرق ہے۔ اول الذکر کہتا ہے کہ خدا رحیم و کریم ہے لیکن مؤخر الذکر کہتا ہے کہ خدا جبار اور قہار ہے۔ وہ اپنے کسی غلام کو دائمی سرفرازی کی نعمت عطا فرماتا ہے اور بعض ابدی لعنت کا طوق گلے میں لٹکائے پھرتے ہیں۔ ریبلائے کا فلسفہ گہری نظر سے عاری ہے۔ اس کے برعکس کالون آج تک ایک نئے خیال کا موجد سمجھا جاتا ہے۔

ان مذہبی مباحثوں کے درمیان Rousard کی عاشقانہ غزلیں دکھائی دیتی ہیں۔ شاعر اپنے محبت کے نغموں سے عوام کا دل ایک دوسرے موضوع کی طرف کھینچتا ہے۔ وہ اپنا ایک اسکول قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس دور کے اکثر شعراء اسی رنگ میں لکھنے لگے۔ اس کے مضمون میں عمدہ تشبیہوں اور پُرلطف استعاروں کی بھرمار ہے۔

فرانسیسی سقراط :۔

اسی ادبی کشمکش میں ملک کے ایک غریب خطہ میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں ایک شخص پیدا ہوا۔ ۱۵۳۳ء کی ایک طوفانی رات تھی کہ Montaigne عالمِ وجود میں آیا۔ باپ، لابوئیؔ نامی دوست اور مطالعہ ـــــ تین چیزوں کی مجنونانہ محبت خدا نے اسے ودیعت کی تھی۔ اس نے نہایت خاموش اور پُرلطف زندگی گزاری اور اپنا سارا مطالعہ انسانی فطرت کو سمجھنے میں صرف کر دیا۔ "ہم لوگ حقیقتہً کیا جانتے ہیں؟" اس کا تکیہ کلام تھا۔ اس کے مضامین بس اس ایک سوال کے جواب سے پُر نظر آتے ہیں۔ وہ ہر جگہ یہی جواب دیتا ہے ـــــ "بہت ہی مختصر"۔ ملک اسے فرانسیسی سقراط کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اس کی نظمیں اور مضامین خاموش زندگی کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ شہرت سے گھبراتا ہے۔ زندگی میں وہ صرف مصائب کو دیکھتا ہے لیکن کہیں کہیں خوشی کی چاشنی بھی دکھائی دیتی ہے۔

سترھویں صدی:۔ اب سترھویں صدی آتی ہے۔ فرانس کا دماغ انسانی زندگی کی ماہیت جاننے کے لئے بیتاب نظر آتا ہے اور وہ کسی فیصلہ کا بے چینی سے منتظر ہے۔ پوری صدی اسی فیصلہ کے لئے غلطاں و پیچاں نظر آتی ہے۔ یہ صدی فرانسیسی ادب کا زریں عہد ہے۔ اس کشمکش میں Pascal اور Descartes کی شخصیتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان کے پہلو بہ پہلو

Madam de- , Moliere , Racine , Corneille , Didrot , Montesquien
Sevigne -- , Boileau , La Rochefoucauld اور La Bruyere نظر آتے ہیں لیکن فرانسیسی ادب کا یہ زمانہ آزادی کی جد وجہد میں صرف ہو گیا۔ شاعروں اور ادیبوں کے شاہکار لوگوں کو ان کی غلامانہ ذہنیت سے ہوشیار کرنے کے لئے وقف تھے۔ ڈیکارٹے ایک فلسفی اور سائنسدان تھا۔ وہ شہید ہونے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا تھا۔ اس نے کبھی چرچ اور مذہب کا ساتھ نہیں چھوڑا لیکن اس نے آزادیٔ خیال کی کھیتی لگائی جو چرچ کے لئے سخت مہلک ثابت ہوئی پاسکل کو ایک ایسے عام عقیدہ کی تلاش تھی جس کے نور سے وہ اپنی رُوح کو منور کر سکتا۔ وہ بھی ایک سائنس دان تھا۔ چرچ کا مخالف تھا لیکن خدا کے وجود کا زبردست حامی تھا۔ اس کی سب سے مشہور تصنیف "خیالات" ہے۔ انداز بیان اس قدر نفیس اور خیالات اس قدر پاکیزہ ہیں کہ آج بھی وہ دلچسپی سے پڑھی جا سکتی ہے۔ فرانسیسی ادب میں کم آدمی اس کی طرح دلچسپ ہونگے ۱۶۶۳ء میں پیدا ہوا۔ باپ کا بہت ہی پیارا تھا۔ غریب باپ نے لائق فرزند کی تعلیم میں سب کچھ لٹا دیا۔ وہ بارہ برس کے سن میں ایک زبردست ریاضی دان تھا اور سولہ برس کے سن میں مذہب کے جزئیات سے واقف۔ پہلے ایک مدت تک ملحدوں کی فوج کا سردار بنا رہا اور خدا کے وجود کا منکر رہا۔ چالیس برس کے سن میں انتقال کیا۔ موت کے بعد ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ "اس کا دماغ غیر معمولی طور پر بڑا تھا"۔ وہ دنیا میں کوئی خوبی نہیں پاتا۔ کہتا ہے کہ دُنیا مصائب اور ناپاکیوں سے پُر ہے۔ وہ صرف "اسباب اور یقین" کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ کہتا ہے کہ "اعتقاد اور اُمید" کے بغیر ہماری رُوح کو سکون نہیں مِل سکتا۔

مولیر کا درجہ فرانسیسی ادب میں ناقابلِ بیان ہے۔ صرف فرانس ہی نہیں بلکہ دُنیا اس کی تصانیف کی مرہونِ منت نظر آتی ہے۔ سر والٹر اسکاٹ اسے "مزاحیہ نویسوں کا شہزادہ" کہا کرتا تھا۔ ۱۶۲۲ء میں ایک معمار کے گھر میں پیدا ہوا۔ باپ کو شاہی دربار سے تعلق تھا لیکن بیٹے نے بجائے بادشاہ کے پاس جانے کے تھیٹر میں نوکری کر لی اور پارٹ کرنے لگا۔ ایکٹر کی حیثیت سے اسے شہر بشہر سفر کرنا پڑتا۔ یہ بات اس کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ اسی نے اسے انسانی فطرت کا ماہر بنا دیا۔ اکاون برس کے سن میں اس کا انتقال ہوا۔

سترھویں صدی کے آخر میں ان قہقہوں اور تبسم کے درمیان دو شخص پیدا ہوئے۔ انسائیکلوپیڈیا کا مصنف Pierre Bayle اور مشہور مبلغ Bossuet جس کا اعتقاد تھا کہ چرچ انسانی روح کا ابدی مالک اور شاہِ فرانس، ملک کے سیاہ سفید کا تنہا ذمہ دار ہے۔ وہ پروٹسٹنٹ خیالات کا سخت مخالف تھا۔ اس کے خیال میں اگر ملک پر بادشاہ اور انسانی روح پر چرچ اچھی طرح قابض ہوں تو ملک میں کسی قسم کی بدعنوانی نہیں پھیل سکتی۔ اس کی اُن ہنگامہ خیز تقریروں اور تحریروں کے درمیان ایک شخص ایک گوشہ میں بیٹھا ایک ایسا کام کر رہا تھا جس کا احسان فرانس کبھی بھول نہیں سکتا۔ یہ بیل کی ذات تھی جو اپنا "تاریخ کا لُغت" مرتب کر رہا تھا۔

اٹھارھویں صدی:۔ یہ فرانسیسی تاریخ کا سب سے ہنگامہ خیز زمانہ ہے۔ والٹیر نے رومن چرچ پر لعنت بھیجی اور عوام کو تعلیم دی کہ کہ اسے جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکو۔ وہ مذہب اور روح کا قائل ضرور تھا لیکن چرچ کو ایسی طاقت سمجھتا تھا جو تاریکی کو پسند کرتی ہے اور نور سے نفرت کرتی ہے۔ اسے اپنے ظلم کی چکی میں بُرے بھلے کی تمیز کرنی بھی نہیں آتی۔

روسو نے تعلیم دی کہ ماضی بہترین دور تھا۔ تہذیب نام ہے غلامی کا اور سادہ انسان ہی آزاد اور مطمئن زندگی گذار سکتا ہے۔ ان دو دماغوں سے انقلاب فرانس کی روح کو غذا مل رہی تھی۔ والٹیر مذاق میں بے مثل ہے۔ یہ ایک بجلی کی طرح ہے جو تاریکی کے پردہ کو چاک کر دیتی ہے پرانی چیزوں کو مسمار کر دیتی ہے۔ لیکن مسافر اس سے راستہ نہیں پا سکتا اور اس کی روشنی میں پڑھ نہیں سکتا۔

روسو سیدھے سادے الفاظ میں گہرے مطالب چھپاتا ہے۔ سطحی نظر دوڑانے والے اس کے معنی کو جلد نہیں پا سکتے۔ قدرت نے والٹیر اور روسو کی شکل میں انقلاب فرانس کے دو زبردست نقیب پیدا کئے تھے۔

تمام علوم و فنون اس دور میں دربار شاہی کی ملکیت تھے۔ عوام سے انہیں ذرا بھی تعلق نہ تھا۔ مذہب ایک ایسی طاقت کا نام تھا جو صرف سیاسی ضروریات میں کام آتی۔ عوام کی تکالیف اور ذلتوں کی حد ہو چکی تھی۔ اس حالت میں بغاوت کی آگ بھڑکی اور دفعتہً سارے ملک میں پھیل گئی۔ اس چکی میں بدوں کے ساتھ اکثر نیک بھی پس گئے۔

اس آتش زدگی میں ایک قابل ذکر ہستی نظر پڑتی ہے۔ یہ Beaumarchais ہے جو ایک گھڑی ساز کا لڑکا تھا۔ اس نے تھیئٹر کو انقلاب کی ترقی کے لئے آلۂ کار بنایا۔ اس کے ڈرامے عموماً یہ دکھایا کرتے کہ فرانسیسی کیسی بُری اور غلامانہ زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اپنی یادداشت میں لکھتا ہے "میں ایک شہری ہوں یعنی ایک بالکل نئی چیز ——— فرانس کیلئے بالکل ہی ان دیکھی بات۔ میں ایک شہری ہوں ——— یعنی وہ جو تمہیں دو صدی پہلے سے ہونا چاہئے تھا اور جو تم آج سے بیس برس بعد ہو سکو تو ہو سکو" یہ ۱۷۷۴ء میں لکھا گیا تھا اور یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔

فرانس میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو نئے فلسفہ اور سائنس سے نفرت کرتا اور صرف پرانے علم و فن ہی کو زندہ رکھنا پسند کرتا تھا۔ ایسے لوگوں کیلئے روسو کے ایک دوست Bernardin نے ایک کتاب Paul and Virginia لکھی۔ یہ ایک مکمل قصہ ہے جو رومان سے بہت ہی بھدے طریقہ سے بھر گیا ہے۔ اس وقت اس کے مصنف کی بڑی قدر تھی اور ممکن تھا کہ فرانسیسی ادب اس کی پیروی کر کے ہمیشہ ہی کیلئے نیست و نابود ہو جاتا لیکن سیاسی طوفان کتاب اور اس کے مصنف دونوں کو بہا لے گیا۔

۱۷۹۲ء میں اس سیاسی طوفان کے درمیان ادب صرف ایک بار سر اٹھا سکا R. de Lisle نے اپنی مشہور نظم La Marseillaise لکھی جو باغیوں کا ترانۂ جنگ بن گئی لیکن انقلاب نے ادب کو طوفانی فرانس سے مار بھگایا۔ کتب خانے درباروں کے ساتھ رخصت ہو گئے اس عہد کی کوئی چیز بھی اس وقت دکھائی نہیں دیتی بجز Joubert کی تصنیف کے جو اس کی موت کے بعد چھپی اور جس میں اس نے ایٹیر

کے خیالات کی تردید کی ہے۔ اس طوفانی فضا میں The Genius of Christianity لکھی گئی جس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ادب بغیر مذہب کے زندہ نہیں رہ سکتا۔

یہ پہلی آواز تھی جس نے فرانس کو اس حماقت سے آگاہ کرنا چاہا کہ اطمینان صرف دولت میں ہے۔ یہ کوئی بڑا پیام نہ تھا لیکن اس وقت اس کا سب نے ساتھ دیا حتیٰ کہ فرانس کے عظیم الشان مصنف وکٹر ہیوگو نے بھی اس کی تائید کی۔

انیسویں صدی:۔ اس صدی کے اوائل کا سب سے بڑا فلسفی Auguste Comte سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تصانیف میں جدید اور پرزور خیالات فراوانی سے پائے جاتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے ـــــ انسانی دماغ پرورش پاتا رہا اور اس نے علت و معلول کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ دنیا کے عجائبات پر دماغ سوزی کی۔ آخر اس فیصلہ پر آیا کہ وہ اس معمے کو کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ سمجھ کر اس نے اپنی اس ترقی میں زندگی گزار دینا مناسب سمجھا "

لیکن یہ ایک ایسی غذا تھی جو انسانی روح کی عرصہ تک پرورش نہیں کر سکتی۔ ایک انقلاب بہت جلد رونما ہوا۔ Victor Hugo اور Lamenais نے رومن چرچ کو اس حد تک رواداری برتنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی کہ ہر شخص اپنے ضمیر کے مطابق خدا کی پرستش کر سکے۔ اس تعلیم سے رومانی شاعروں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی جو عیسائیت اور شخصی حکومت کی ہمدرد تھی۔ Gautier اس جماعت کا سردار کہا جا سکتا ہے۔ شاعری کے رباب پر اس نے چمکتے ہوئے الفاظ سے نغمہ سرائی کی۔ اس نے کوئی خاص بات نہیں کہی لیکن اس دور کے نوجوان اسے ادب کا دیوتا سمجھتے تھے۔

ان دھیمے سروں کے درمیان Beranger کے تیز نغمہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس کی شاعری الفاظ کے شان و شکوہ سے بے نیاز ہے۔ اس نے عوام کی زبان کو اپنے خیالات کا ترجمان بنانا مناسب سمجھا۔ فرانس کو اس کا نغمہ بہت پسند آیا لیکن غریب شاعر بہت جلد غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا۔ اپنی عظمت کے خیال سے گمراہ ہو کر اس کا کلام سحر خیز بن کر رہ گیا۔ اس کی جگہ لینے کیلئے فرانس کا عظیم الشان ادیب وکٹر ہیوگو پیدا ہوا۔ انقلاب کے چشمہ میں غسل صحت کر کے فرانسیسی ادب اپنے پورے نکھار کے ساتھ پھر جلوہ ریز ہوا۔ ترجمہ اس کے اصلی حسن کو پیش کرنے سے قاصر ہے اس محب وطن محب قوم شاعر نے ایک ایسا غیر فانی نغمہ چھیڑا جو رہتی دنیا تک گایا جائے گا۔ ہیوگو نے فرانسیسی ادب کو ایک تازہ روح بخشی ہے۔

اس وقت فرانسیسی ادب کے سیمیں تخت کے گرد ادیبوں کا ایک عظیم الشان دربار لگا تھا۔ یعنی اول (۱) George Sand ـــ دیہاتی زندگی کی مایہ ناز مصور (۲) De Balzac ـــ انسانی مزاج کے دو ہزار کردار کا صانع (۳) Prosper Merimee (۴) ہر دو Dumas (۵) Guy de Maupassant (۶) Flaubert (۷) Daudet (۸) Thierry اور Guizot ـــ مؤرخ (۹) Renan مذہبی لٹریچر کا حامی (۱۰) Saint Beuve ـــ مشہور نقاد ـــــ کی صورتیں دکھائی دیتی ہیں لیکن باقی تمام صفیں بھی ادیبوں سے پٹی پڑی ہیں ہیوگو کے بعد یورپ میں فرانسیسی ادب کی دھاک بندھ گئی۔ اس کی بہترین مثال اناطول فرانس کی شکل میں مل سکتی ہے۔

فرانسیسی ادب پر ابتدا سے انتہا تک نظر دوڑائیے۔ آرنلڈ کا جملہ کتنا زبردست اور صحیح ہے:۔

Versed in all arts, in none supreme

فرانسیسی ادب میں سب کچھ ہے لیکن ہم نہ وہاں شکسپیئر پاتے ہیں نہ ملٹن۔ نہ دانتے کی صورت نظر آتی ہے نہ گوئٹے کی!!!

شمسی گڈ

آخری سبق

اُردو داں حضرات بعض تراجم کی وجہ سے وکٹر ہیوگو، اناطول فرانس اور گائی دا ماپساں سے ایک حد تک ناآشنا نہیں ہیں لیکن ان تین فرانسیسی مصنفین کے علاوہ وہ کسی اور فرانسیسی ادیب کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں اور اس امر کی ضرورت ہے کہ اُردو داں حضرات کو تراجم کے ذریعہ سے فرانسیسی مصنفین کے قابلِ قدر خیالات سے آگاہ کیا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ مدیر ہمایوں کو اس ضرورت کا احساس ہوا اور انہوں نے روسی ادب کی طرح فرانسیسی ادب کے متعلق بھی ایک خاص نمبر نکالنے کا قصد کر لیا اُمید تو ہے کہ دیگر جرائد نیز مقتدر مصنفین مدیر ہمایوں کی تقلید کریں گے اور رفتہ رفتہ اُردو داں حضرات فرانسیسی مصنفین کے افکار بلند سے کما حقہ واقف ہو جائیں گے۔ جہاں تک مختصر افسانوں کا تعلق ہے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس میدان میں فرانسیسی ادیب گوئے سبقت لے گئے ہیں اور مختصر افسانہ نویس کے لئے فرانسیسی ادب کا مطالعہ لابدی ہے۔ پندرھویں صدی میں فرانسیسی مصنفین نے باقاعدہ مختصر افسانہ نویسی کی ابتدا کی اور اُنیسویں اور بیسویں صدی میں بالزاک ڈوڈے اور گائی دا ماپساں وغیرہ واجب التعظیم فرانسیسی ادیبوں نے اس فن کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ گائی دا ماپساں کی سحر طرازی کا اندازہ بعض ناظرینِ ہمایوں کو سید امتیاز علی صاحب تاج کی قابلِ قدر کتاب "ہیبت ناک افسانے" سے ہو گیا ہو گا لیکن بالزاک اور ڈوڈے کا نام بہت کم اردو داں حضرات نے سنا ہو گا۔ بالزاک ناول نویسی کا بادشاہ تھا لیکن اس کے مختصر افسانے عجیب و غریب رومانیت کے باوجود ڈوڈے کے سیدھے سادھے افسانوں کے مقابلہ میں نہیں لائے جا سکتے۔ الفانسے ڈوڈے (سنہ ۱۸۴۰ء تا سنہ ۱۸۹۷ء) تو پیدا ہی ہوا تھا مختصر افسانہ نویس بننے کے لئے۔ ڈوڈے کا کوئی افسانہ پڑھیئے آپ کو یہ نہیں معلوم ہو گا کہ اس میں کہیں بھی آورد ہے۔ پڑھیئے گا تو دل میں کہیئے گا کہ اس سے کہیں بہتر افسانہ ہم خود لکھ سکتے ہیں لیکن لکھنے بیٹھیئے گا تو اس کا تتبع مشکل نہیں محال نظر آئے گا اور یہی سہل ممتنع کی تعریف ہے۔ ڈوڈے کی زندگی میں ایک ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا جس سے اس کا وطن پرست دل تڑپ گیا اور اس نے اس دبی ہوئی چوٹ کو اپنے کئی افسانوں میں بالاعلان بیان کیا۔ یہ ناخوشگوار واقعہ اہل جرمنی کا فرانس کے بعض حصص پر قابض ہو جانا تھا۔ ڈوڈے نے مختلف عنوانوں سے متعدد افسانوں میں اس قبضے کے خلاف احتجاج کیا ہے لیکن ان سب افسانوں میں کامیاب ترین افسانہ وہ ہے جس میں ڈوڈے نے ایک معصوم بچے کی کیفیاتِ قلب کو بیان کیا ہے اور اسی افسانے کا ترجمہ ناظرینِ ہمایوں کی نذر کیا جاتا ہے۔

طالب صفوی

(۱)

اسکول جانے میں بہت دیر ہو گئی تھی اور رہ رہ کے یہ خیال آتا تھا کہ بچا آج خیریت نہیں ہے میسیو ہامیل نے کہہ دیا تھا

کر قواعد خوب یاد کر کے لانا اور یہاں قواعد کا ایک حرف بھی یاد نہیں تھا اس پر اتنی دیر ہوگئی! بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں سورج خوب چمک رہا تھا پن چکی کے پیچھے والے میدان میں جرمن سپاہی پریڈ کر رہے تھے یہ سب چیزیں قواعد ایسے خشک مضمون سے کہیں زیادہ دل فریب تھیں بلکہ سچ کیوں نہ کہوں میرا ارادہ بھی ہُوا تھا کہ اول پٹنا آخر پٹنا دیر تو ہو ہی گئی ہے ان سب چیزوں سے اچھی طرح لطف اُٹھانے کے بعد ہی کیوں نہ اسکول جاؤں؛ لیکن پھر خیریت اسی میں نظر آئی کہ سیدھا اسکول ہی کا رُخ کروں اور میں نے میسیو ہامیل کے عتاب سے بچنے کی دُعا مانگ کر طرارے بھرنا شروع کر دیئے۔ ٹاؤن ہال پر دم لینے کے لئے ذرا کی ذرا رُکا تو اس کے اندر مجمع غفیر نظر آیا دل نے کہا چلو یہ تماشا بھی دیکھتے چلو پھر خیال آیا کہ اس منحوس ٹاؤن ہال میں رکھا ہی کیا ہے؛ ہم نے تو دو برس سے یہی دیکھا کہ سب بُری بُری خبریں اسی ٹاؤن ہال سے شائع ہوئیں۔ کبھی یہ پرچہ لگا کہ فرانسیسی ہار گئے کبھی یہ خبر ملی کہ جرمن ہمارے قصبے میں داخل ہونے کو ہیں پھر ایسی خبروں سننے سے فائدہ ہی کیا؛ اسکول جانے کے لئے دوڑنا شروع کیا تو واشٹر نے زور سے آواز دی کہ بھاگتے کیوں ہو ابھی تو بہت وقت باقی ہے میں سمجھا کہ مذاق کر رہا ہے اور میں نے اور بھی تیز بھاگنا شروع کر دیا۔ اسکول کے باغ میں پہنچا تو عالم ہی بدلا ہُوا پایا۔ معمولاً ہمارے اسکول کے شوروغل کی آواز گلی سے سنائی دیتی تھی اور ڈیسکوں کے کھلنے اور بند ہونے لڑکوں کے پڑھنے اور میسیو ہامیل کی آہنی چھڑی کے کھٹاکوں سے ایک حشر بپا رہتا تھا مگر آج تو کچھ اس غضب کا سناٹا تھا کہ معلوم ہوتا تھا اسکول کئی دن کی چھٹی کے لئے بند ہوگیا ہے۔ دبے پیر کھڑکی کے پاس جا کر دیکھا تو سب لڑکوں کو موجود پایا بس جان سن سے نکل گئی اور یقین ہوگیا کہ آج خیریت نہیں ہے خیر ڈرتا لرزتا ہانپتا کانپتا اسکول میں داخل ہُوا۔ خیال کیا یقین کامل تھا کہ میسیو ہامیل برس پڑیں گے مگر اُنہوں نے نہایت شفقت سے کہا "جاؤ فرانز اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ ہمیں تمہارا انتظار تھا" بنچ کو پھاند کر اپنی جگہ بیٹھا تو جان میں جان آئی اور اطمینان سے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ میسیو ہامیل پر نگاہ پڑی تو ان کو اسی شاندار لباس میں ملبوس پایا جو وہ افسرانِ بالا کے معائنے کے دن پہنتے تھے۔ لڑکوں کو دیکھا تو نہ وہ شوخی تھی نہ وہ مسکراہٹ۔ سب کے سب خاموش سر جھکائے بیٹھے تھے۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب میں نے قصبے کے معززین کو اسکول کے ہال کے آخری حصہ میں گردن جھکائے بیٹھے دیکھا۔ ہمارے قصبے کے سابق میئر بھی بیٹھے تھے معزول شدہ فرانسیسی پوسٹ ماسٹر بھی موجود تھے اور ضعیف العمر ہوسر بھی کوئی کتاب کھولے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

(۲)

میں اس غیر معمولی خاموشی کا سبب اپنے پاس والے لڑکے سے پوچھنے ہی کو تھا کہ میسیو ہامیل نے کُرسی کے پاس جا کر نہایت حزیں مگر صاف آواز میں کہنا شروع کیا "بچو! میں آج تمہیں آخری مرتبہ سبق پڑھانے آیا ہوں۔ برلن سے حکم آگیا ہے کہ

لساس اور لورین کے تمام سکولوں میں صرف جرمن زبان پڑھائی جائے کل سے نیا ماسٹر نئی زبان میں تعلیم دے گا۔ بچو! یہ فرانسیسی کا آخری سبق ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم اسے توجہ سے سنو" معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے دل پر گھونسہ مار دیا۔ میں زیرِ لب بڑبڑانے لگا 'بدمعاش! یہی ان کم بختوں نے ٹاؤن ہال میں حکم دیا ہوگا جبھی تو وہاں اتنا مجمع تھا" میسیو ہامیل باری باری سے لڑکوں کا آموختہ سن رہے تھے اور میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ قواعد مجھے کبھی یاد نہیں ہوئی لیکن اس کے قبل یاد نہ ہونے کا افسوس نہیں ہوتا تھا ہاں پٹنے کا خوف ہوتا تھا مگر آج خوف کی جگہ دل پر افسوس اور شرمندگی کا قبضہ تھا۔ کبھی خیال آتا تھا کہ اگر سچ مچ فرانسیسی کا یہ آخری سبق ہے تو غضب ہے کیونکہ مجھ کم بخت کو تو ابھی اچھی طرح فرانسیسی لکھنا بھی نہیں آیا ہے۔ کبھی افسوس ہوتا تھا کہ میں نے اپنا وقت پڑھنے کے بجائے چڑیوں کے گھونسلے برباد کرنے میں کیوں ضائع کیا؛ وہی کتابیں جن کا اسکول تک لانا بوجھ معلوم ہوتا تھا اب اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز معلوم ہو رہی تھیں اور کتابوں کا کیا ذکر میسیو ہامیل کی سخت گیری کے باوجود ان کی جدائی بھی شاق تھی۔ اب سمجھ میں آیا کہ میسیو ہامیل نے اتنا شاندار لباس کیوں پہنا اور سب قصبے والے اداس کیوں بیٹھے ہوئے ہیں شاید ان کو بھی اچھی طرح فرانسیسی نہ پڑھنے کا صدمہ ہے! میں انہیں خیالات میں منہمک تھا کہ میسیو ہامیل نے میرا نام لے کر پکارا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ کوئی میرے سب کھلونے لے لے مگر مجھ میں یہ قوت پیدا کر دے کہ میں اس وقت اپنا آموختہ فر فر سنا دوں مگر بھلا کہیں آرزو سے تقدیر پھر سکتی ہے؟ کھڑا ہوا تو ایک سوال کا جواب بھی نہ دے سکا۔ میسیو ہامیل نے میری نیچی نگاہوں سے میرے دل کا اندازہ لگا کر کہا " فرانز! تم خود شرمندہ ہو اس لئے میں تم کو کوئی سزا نہیں دوں گا۔ دیکھا بیٹا اسی دن کو سمجھاتے تھے کہ اپنی زبان سیکھنے میں غفلت نہ کرو! اب تم لوگ کہو گے بھی کہ ہم فرانسیسی ہیں تو فرانسیسیوں کو یقین نہ آئے گا وہ اپنے دل میں کہیں گے کہ یہ کیسے فرانسیسی ہیں جو نہ فرانسیسی پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔ بیٹا یہ نہ سمجھنا کہ میں صرف تم بچوں پر الزام عائد کرتا ہوں۔ قصور ہم سب کا ہے۔ تم لوگوں نے پڑھنے سے جی چرایا تمہارے والدین نے تنبیہ نہیں کی اور میں نے دل لگا کر پڑھایا نہیں"۔ اس کے بعد میسیو ہامیل نے ایک طولانی تقریر میں ہمیں سمجھانا شروع کیا کہ فرانسیسی ہماری قومی زبان ہے اور اگر ہم نے اسے فراموش نہ کیا تو جرمنوں کی قید میں رہنے کے باوجود گویا قیدخانے کی کنجی ہمارے پاس رہے گی۔ تقریر ختم ہوئی تو میسیو ہامیل نے قواعد پڑھانا شروع کی میں کیا کہوں کہ اس دن قواعد کتنی سہل معلوم ہو رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ نہ انہوں نے اس روز سے زیادہ واضح کسی دن سمجھایا تھا اور نہ ہم لوگوں نے اس سے زیادہ توجہ سے کبھی سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سب کچھ چند گھنٹوں میں گھول کر پلا دینا چاہتے ہیں۔ قواعد کا سبق ختم ہوا تو انہوں نے ہم سب کو ایک ایک نئی کاپی دی جس کے سرورق پر بخط جلی فرانس السّاس فرانس السّاس کچھ اس طرح لکھا ہوا تھا کہ ان کاپیوں پر قومی جھنڈے کا گمان ہوتا تھا۔ اسکول پر سکوت طاری تھا ہر شخص خاموش بیٹھا ہوا تھا اور قلم چلنے کی آواز کے علاوہ کوئی اور آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہم لوگ خوش خطی کی مشق کر رہے تھے کہ اتنے میں کچھ تتلیاں

اندر آ گئیں لیکن ایک دفعہ نظر اُٹھا کر دیکھنے کے بعد چھوٹے سے چھوٹے بچے نے بھی دوبارہ ان پر نظر نہ ڈالی۔ میں جان توڑ کوشش کر رہا تھا کہ حروف خوبصورت بنیں اور جب کبھی انگلیوں کو سیدھا کرنے کے لئے ذرا کی ذرا دم لے کر میسیو ہامیل کے چہرے پر نظر ڈالتا تھا تو وہ بھی بے انتہا متاثر نظر آتے تھے۔ ان کا چہرہ اُداس تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسکول کی ہر ہر چیز کو اس یاس انگیز نظر سے دیکھ رہے ہیں گویا اب انہیں ان چیزوں کے دوبارہ دیکھنے کی امید نہیں ہے۔ اوپر کے کمرے میں میسیو ہامیل کی بہن ان کا اسباب ٹھیک کر رہی تھیں کیونکہ جرمنوں نے حکم دے دیا تھا کہ وہ دونوں بہن بھائی ہمارے قصبے سے چلے جائیں اور جب کبھی کسی ٹرنک کے رکھنے کی بھاری آواز آتی تھی تو میسیو ہامیل چونک پڑتے تھے۔ خوش خطی کی مشق ختم ہوئی تو چھوٹے چھوٹے بچوں نے الف بے سنانا شروع کی اور انہیں کے ساتھ ضعیف العمر ہوسر بھی عینک لگا کر کتاب کھول کر ہجے کرنے لگے۔ ہوسر کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ ان کے پڑھنے پر ہنسنے کو بھی دل چاہتا تھا اور رونے کو بھی۔ ہجے الف۔ بے ختم نہیں کرنے پائے تھے کہ گھڑی نے ٹن ٹن بارہ بجا دیئے۔ عین اسی وقت جرمنوں نے ہمارے اسکول کے نیچے بینڈ بجانا شروع کر دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کان کے پردے پھٹ جائیں گے اور ان کے ساتھ ساتھ دل بھی۔ میسیو ہامیل کے چہرے پر دفعتہً زردی چھا گئی۔ لڑکھڑاتے ہوئے کرسی پر سے اُٹھے اور ہم لوگوں کو مخاطب کر کے کہنے لگے "معزز دوستو! اور عزیز بچو! میں ـــــ میں ـــــ" معلوم ہوتا تھا کہ ان کے گلے میں کوئی چیز اٹک گئی ہے۔ ہم لوگوں کی آنکھ بچا کر رومال سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور بلیک بورڈ پر بہت بڑے بڑے حرفوں میں لکھ دیا "زندہ باد فرانس" لکھنے کے بعد میسیو ہامیل اسی تختے سے لگ کر کھڑے ہو گئے اور سر جھکا کر ہاتھ کے اشارے سے کہنے لگے "جاؤ اسکول بند ہو گیا"!

طالب صفوی

اے میری محبت، اے میری پرستش، اے اُن دو نفوس کی روشنی جو ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اے اُن دونوں کی ضیا جو ایک دوسرے میں سما جاتے ہیں، اے اُن دو نگاہوں کی تنویر جو ایک دوسرے میں تحلیل ہو رہی ہیں، تو میرے پاس آئے گی؟ کیا تو نہ آئے گی؟ اے میری مسرت! وہ تنہائیوں میں ساتھ مل کر چلنا! وہ مسرور و منور دن! بعض اوقات میں نے خواب میں معلوم کیا ہے کہ کبھی کبھی چند ساعتیں فرشتوں کی زندگی سے جدا ہو کر یہاں زمین پر کچھ لوگوں کی قسمتوں میں نفوذ کر کے بسر ہوتی ہیں۔

وکٹر ہیوگو

انیسویں صدی کے مشہور فرانسیسی انشا پرداز

اُنیسویں صدی کے آغاز میں فرانسیسی ادب کی بیداری رومانی تحریک سے شروع ہوتی ہے جس کے ساتھ وکٹر ہیوگو اور الگزینڈر ڈوما ایسے باکمال انشا پردازوں کے نام وابستہ ہیں۔ اُن ستاروں میں سے جو ہیوگو کے ہم عصر تھے قابل نقاد چارلس آگسٹن سیں بیو بہت شہرت رکھتا ہے۔

چارلس آگسٹن سیں بیو

سیں بیو ۱۸۰۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۶۹ء میں وفات پا گیا۔ اُس نے اپنی ادبی زندگی ایک شاعر اور ناول نویس کی حیثیت سے شروع کی مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد اُسے معلوم ہو گیا کہ وہ ناول نویس کے بجائے ایک کامیاب نقاد ہے۔

سیں بیو پہلا ادبی نقاد تھا جس نے صحیح تنقید کے لئے عمیق مطالعے اور وسعت علم کو ضروری قرار دیا اور اس طرح تمام مروجہ اصولوں کو مسترد کر دیا۔ لارڈ مارلے کہتا ہے کہ فرانسیسی زبان سیکھنا صرف اُسی صورت میں سُودمند ہو سکتا ہے کہ یہ زبان سیکھنے کے بعد سیں بیو کی تنقیدوں کا مطالعہ کیا جائے۔

سیں بیو کے دلچسپ ترین مضامین (Monday Talks) میں ملتے ہیں جو کتابی صُورت میں شائع ہونے سے پہلے اخباروں میں آرٹیکل کی صُورت طبع ہوا کرتے تھے۔ سیں بیو زیادہ تر صرف فرانسیسی انشا پردازوں کے افکار پر نقد و تبصرہ کیا کرتا تھا۔ اس نے کلاسیکل لٹریچر اور انگریزی ادیبوں کی کتابوں پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔

سیں بیو نے ایک دفعہ کہا تھا "یہ میری خواہش رہی ہے کہ میں تنقید کے حُسن میں ایک نیا اضافہ کر سکوں اور اس کے ساتھ ہی اس میں حقیقت کا عنصر بھی زیادہ سے زیادہ داخل کر سکوں"۔

اپنی زندگی میں سیں بیو کو ایک دفعہ ایک خشک مزاج ایڈیٹر سے واسطہ پڑا۔ بہت جھگڑوں کے بعد آخر ڈوئل تک

سلہ - یہ تحریک جرمنی سے شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ فرانس تک پہنچ گئی۔ جرمنی کے نوجوان شاعروں اور ادیبوں نے یونانی اور لاطینی اصول و قواعد سے جنکی تقلید پر اہل فرانس مٹے ہوئے تھے، انکار کر دیا اور ادب کو اپنے دماغ کی مدد سے تیار کرنا شروع کیا۔ اس تحریک کی داستان بہت طویل ہے قصہ مختصر بیلو نے جو ڈراما کیلئے یونانی اتحادِ ثلاثہ کی قید لگائی تھی اور جس پر والٹیر نے اپنا سارا زورِ قلم خرچ کیا اس تحریک کی بدولت اُٹھ گئی اور یہ قاعدہ بھی کہ ٹریجیڈی کے ہیرو اور ہیروئن بادشاہ ملکہ اور شہزادیاں ہونی چاہییں حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا اور اس امر پر زور ڈالا کہ پوشاکیں اس زمانے کے مطابق ہونی چاہئیں جس سے کردار تعلق رکھتے ہیں۔

نوبت آگئی۔ چنانچہ دونوں میں ڈوئل ہوئی۔ اس نقاد کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہاتھ میں چھاتا۔ اس کی وجہ اُس نے یہ بیان کی کہ "مجھے مرجانا قبول ہے، مگر میں اس بارش میں بھیگنا نہیں چاہتا۔"

جارج سیں :-

ایمنڈائن لیوسلی اروما دیوپن، فرانس کی مشہور ادیبہ جس کا قلمی نام جارج سیں ہے ۱۸۰۴ء میں پیدا ہوئی اور ۱۸۷۶ء میں فات پاگئی۔ اُس کا نام میوسٹ اور چوپن کے ساتھ عاشقانہ تعلق کی وجہ سے مشہور ہے۔ اُس نے ایک سَو کے قریب کتابیں لکھی ہیں۔

جارج سیں نے اپنی تصانیف میں بہت سے نئے الفاظ اختراع کئے ہیں جو اُس کے بعد بہت سے مصنفوں نے اپنی تحریروں میں استعمال کئے ہیں۔ وہ ایک طویل عرصے تک گسطاؤ فلابرٹ کے ساتھ خط وکتابت کرتی رہی۔ ان خطوط سے اُس کی ادبی لیاقت واضح طور پر نمایاں ہے۔

اُس کی تحریر نہایت شگفتہ اور سلیس ہے۔ اُس کی پہلی کتاب بہت مشہور ہے جس میں اس نے اپنی اور چوپن کی داستانِ محبت بیان کی ہے۔

پراسپر میریمی :-

'کارمن' نامی ایک مشہور رومان کا مصنف پراسپر میریمی ۱۸۰۳ء میں پیدا ہُوا اور ۱۸۷۰ء میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اُس کا نام صرف اسی ایک رومان کا مصنف ہونے کی وجہ سے مشہور ہے جس کو بعد ازاں تمثیلی شکل میں سٹیج پر کھیلا گیا ہے۔

میریمی نے مختصر افسانے اور چند ناول بھی لکھے ہیں مگر انہیں ادب میں بلند مرتبہ حاصل نہیں ہے۔

ہانری دی بالزک :-

بالزک ۱۷۹۹ء میں پیدا ہُوا اور ۱۸۵۰ء میں اس جہان سے رُخصت ہوگیا گو وہ اپنے آپ کو اُس زمانے کی رومانیت سے علیحدہ تصور کیا کرتا تھا مگر یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ اُس کی تحریر میں رومانی تحریک کا اثر بڑی حد تک موجود ہے۔

۱۸۴۲ء میں بالزک نے (Human Comedy) لکھنے کی ایک سکیم تیار کی۔ اُس کا ارادہ یہ تھا جیسا کہ وہ خود بیان کرتا ہے: "میں انسانی ناولوں کی ایک تاریخ مرتب کرنا چاہتا ہوں"۔ چنانچہ بالزک نے ہیومن کامیڈی سپردِ قلم کی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب لکھنے کا خیال اُسے ڈینٹے کی ڈوائن کامیڈی کا مطالعہ کرنے کے بعد پیدا ہُوا۔

ہیومن کامیڈی مختلف حصّوں میں منقسم ہے یعنی گھریلو زندگی کے مناظر، شہری زندگی کی تصاویر، سیاسی زندگی کا عکس، پیرس زندگی کی تصویریں، فوجی زندگی کے منظر، فلسفیانہ مطالعہ اور تجزیہ نفسی۔ جیسا کہ بالزک کا خیال تھا یہ کتاب ایک سو پنتیس الگ الگ حصّوں میں مکمل ہوتی مگر وہ ایسا نہ کر سکا اس لئے کہ وہ اُس کے بیشتر مجوزہ حصّے نہ لکھ سکا۔

آج تک کسی مصنف نے ایسے وسیع پیمانے پر اپنے افکار کی تخلیق کا خیال نہیں کیا اور نہ کوئی مصنف آج تک اس قسم کی ضخیم کتاب تحریر کر سکا ہے۔

بالزک کو فرانسیسی ادب میں وہی رتبہ حاصل ہے جو چارلس ڈکنز کو انگریزی ادب میں ہے۔ بالزک کی بے شمار قلمی تصاویر میں صنفِ نازک کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے۔ ہنری جیمز کہتا ہے "صنفِ نازک ہیومن کامیڈی کی روح و رواں ہے۔ اگر اس کتاب میں سے عورتوں کے کردار نکال لئے جائیں تو یہ لاثانی شاہکار بالکل بھدا ہو جائے گا —"

سکاٹ کی طرح بالزک کی ادبی سرگرمیاں بھی مالی ضروریات کی زائیدہ تھیں۔ مگر یہ مالی مشکلات خود اسی کی پیدا کردہ تھیں۔ اس کے باپ کا خیال تھا کہ وہ اُسے وکالت کی تعلیم دے مگر بالزک نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی اور ادب کو اپنا ذریعۂ معاش بنانے کا تہیہ کر لیا جس کی وجہ سے اُسے شروع شروع میں بہت مفلسی کی حالت میں زندگی بسر کرنا پڑی۔ ۱۸۲۵ء سے لے کر ۱۸۲۸ء تک وہ روپیہ پیدا کرنے کی مختلف تجاویز پر عمل کرتا رہا۔ اس عرصے میں اس نے طابع، ناشر اور ٹائپ فونڈر کی حیثیت میں روپیہ کمانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اس سلسلے میں وہ ایک لاکھ فرانک کا مقروض ہو گیا — یہ رقم وہ دس سال کی مسلسل کوششوں کے بعد ادا کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس قرض کے ادا کرنے میں جو محنت اُسے برداشت کرنا پڑی وہ اس واقعے سے ظاہر ہو سکتی ہے کہ وہ اکثر اوقات نصف شب سے لیکر دن کے چار بجے تک لکھنے میں مشغول رہا کرتا تھا۔

بالزک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُسے زندہ رہنے کا ذرا موقع نہیں ملا۔ وہ ہر وقت لکھنے میں مشغول اور قرض کی وجہ سے پریشاں رہتا تھا۔" اُس کی مالی مشکلات کی زیادہ تر وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ بہت فضول خرچ واقع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایسے امور پر بے دریغ روپیہ بہا دیا کرتا تھا جن کے متعلق وہ اچھی طرح علم و واقفیت نہ رکھتا تھا۔

گسطاو فلابرٹ :-

فلابرٹ نارمن نسل سے تھا۔ وہ ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۵۰ء سے لے کر ۱۸۵۶ء تک ایک کتاب "مادام بوداری" لکھنے میں مصروف رہا جو فرانسیسی ادب میں حقیقت نگاری کا بہترین شاہکار ہے۔

"مادام بوداری" انیسویں صدی کے وسط کی شہری زندگی کی ایک تصویر ہے۔ یہی زندگی وہ ماحول تھا جس میں اُس نے پرورش پائی تھی اور جسے وہ بخوبی سمجھتا تھا۔ گو فلابرٹ طبقۂ اعلےٰ سے تعلق رکھتا تھا مگر وہ امراء کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ "مادام بوداری" میں اُس نے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ طبقۂ اعلےٰ کا کوئی فرد بغیر انفرادی صلاحیتوں کے جب اُس دُنیا کو چھوڑ کر جس میں وہ آباد ہے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے، ہمیشہ نفرت انگیز ہوا کرتا ہے۔"

"مادام بوداری" کی چند نمایاں خصوصیتیں یہ ہیں :-

تیز مشاہدہ، اُن میچوں کے سمجھنے کی قدرت جو عام مردوں اور عورتوں کے افعال کے محرک ہوتے ہیں، طرزِ نگارش کی خوبصورتی اور دو عام اشخاص میں تمیز کرنے کا فن۔

اسی کتاب کو شائع کرنے کی بنا پر فلابرٹ عدالت میں پیش ہوا۔ الزام یہ تھا کہ مادام بوواری مخربِ اخلاق کتاب ہے مگر یہ کتاب درحقیقت پُراز اخلاق ہے حسب کہ اس کا واحد سبق یہ ہے کہ انسان کو اپنی قسمت کی حدود کے اندر مطمئن زندگی بسر کرنی چاہیئے۔

۱۸۵۷ء اور ۱۸۶۱ء کے درمیانی عرصے میں فلابرٹ (The Temptation of St. Anthony) اور (Salammbô) لکھنے میں مصروف رہا جو ۱۸۶۲ء میں طبع ہو کر لوگوں کے سامنے پیش ہوئیں۔

فلابرٹ بھی مولیئر اور بالزک کی طرح فرانسیسی اکیڈمی کا رکن نہ تھا۔ گو مادام بوواری کے مصنف کو ادب میں حقیقت نگاری کے ایک ماہر کی حیثیت سے جگہ ملنی چاہیئے۔ مگر فلابرٹ عارضی طور پر ایک رومان نویس بھی تھا۔ وہ رنگ اور روشنی کا چاہنے والا تھا، اور اس کے علاوہ اسرار بھی اُس کے لئے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے مادام بوواری تصنیف کرنے کے بعد (Salammbo) لکھی جس میں اُس نے قدیم (Carthage) کی از سرِ نو تخلیق کی ہے۔ جب فلابرٹ نے یہ کتاب لکھنی شروع کی اُس نے اپنے ایک دوست سے کہا "میں بدنُما اشیا اور بیہودہ ماحول سے سخت اُکتا گیا ہوں۔ اب میں کچھ عرصے کے لئے ایک نئے اور دلکش مضمون میں غوطہ زن رہ کر اس جدید دُنیا سے دُور رہنا چاہتا ہوں"۔

فلابرٹ کی وہ خط و کتابت جو ایک عرصہ تک جارج سین کے ساتھ ہوتی رہی تھی اُس کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ یہ خطوط ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کس پایہ کا ادبی صناع تھا۔

فلابرٹ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے الفاظ کی نشست اور اُن کی خوبصورتی پر بہت توجہ دیا کرتا تھا۔ وہ خوبصورت طرزِ نگارش کا اتنا مشتاق اور دلدادہ تھا کہ آخر میں اُس نے نفسِ مضمون کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اُس نے ایک دفعہ اپنے ایک دوست کو لکھا "میں ایک ایسی کتاب لکھنا پسند کروں گا جس کا نفسِ مضمون کچھ بھی نہ ہو جس کا وجود صرف طرزِ نگارش ہو، جیسا کہ کرۂ زمین ہوا میں بغیر کسی سہارے کے معلق ہے"۔

فلابرٹ کے افکار کا فرانسیسی ادب پر بہت اثر ہوا۔ زولا، دودے اور دی گونکور تو اُسی کے تتبع میں لکھنے والے ہیں۔

ایمل زولا:۔

ایمل زولا کا باپ نصف اطالوی اور نصف یونانی تھا۔ زولا پیرس میں ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوا۔ وہ ابھی کم سن ہی تھا کہ والد کا سایہ اُس کے سر سے اُٹھ گیا۔ افلاس کی بہت تکالیف جھیلنے کے بعد بمشکل اُسے ایک پبلشر کے یہاں منشی کا کام ملا جہاں اُسے فی ہفتہ ایک پونڈ ملا کرتا تھا۔ یہ ۱۸۶۲ء کا ذکر ہے مگر تین سال کے بعد ایک اخبار میں اُس کا ایک افسانہ شائع ہوا جو بہت قدر کی

نگاہوں سے دیکھا گیا۔ چنانچہ اُس نے افسانہ نویسی کا یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۸۶۴ء میں اُس نے اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کیا جو سب کے سب جذباتی و مثالی تھے۔

کچھ عرصے کے بعد زولا نے (Rougan-Macquant) کے نام سے ناولوں کا ایک سلسلہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ اُس کا خیال تھا کہ اس سلسلے میں عام خاندانوں کے افراد کی زندگی کی تصویر کشی کرے۔ چنانچہ وہ اِس مجوزہ سکیم کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے تیس سال تک لگاتار لکھتا رہا۔

اس سلسلے کی ہر کتاب عمومی زندگی کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔ (Ventre de Paris) میں بازاروں کا ذکر ہے (L'Assommoir) میں شراب خانوں کا (La Bete Humaine) میں ریل گاڑیوں کا تذکرہ ہے، (Germinal) کانوں میں مزدوروں کی زندگی پیش کرتی ہے۔ (L'Argent) دنیائے مالیات سے تعلق ہے (La Debacle ۱۸۷۰ء) کے وحشت خیز حادثات بیان کرتی ہے اور (Lourdes) میں مذہب کے توہمات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

زولا اپنے عزم کو مختصراً بدیں الفاظ بیان کرتا ہے " میں ایک خاندان کو پیشِ نظر رکھ کر اُس کے ہر فرد کا بغور مطالعہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کس طرف رجوع کرتے ہیں اور کس طرح وہ ایک دوسرے کے خلاف حرکات عمل میں لاتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں اپنے کرداروں کو ایک خاص تاریخی وقت میں پیش کروں گا تاکہ مجھے ایک اچھا ماحول مل سکے ـــ یعنی تاریخ کی ایک ہلکی سی چاشنی "

زولا کا مقصد اپنے وقت کی صحیح تصویر کشی کرنا تھا مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اِس لئے کہ اُس نے اپنی تصانیف میں صرف انسانی کمزوریوں اور برائیوں ہی کا تذکرہ کیا ہے۔

زولا بسیار نویس اور محنت کش تھا۔ اُسے اپنی زندگی میں بہت مایوسیوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ سب سے بڑی مایوسی جو جو اس فرانسیسی انشا پرداز کی راہ میں حائل ہوئی یہ تھی کہ وہ اکاڈیمی کا رُکن بننے کی سعی میں ناکام رہا۔

زولا کی طرزِ نگارش بہت بلند نہیں ہے مگر اُس کے مختصر افسانوں میں ہمیں اُس کے تخیل کے نادر نمونے ملتے ہیں جنہیں ادب میں بہت ممتاز جگہ حاصل ہے۔

زولا کا ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا اور وہ پیرس میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

الفانسے دودے :-

دودے ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوا۔ سولہ سال کی عمر میں اُسے مالی مشکلات کی بنا پر ایک اسکول میں ایک معمولی معلم کی نوکری حاصل کرنا پڑی۔ ایک سال کے بعد ہی وہ یہ ملازمت چھوڑ کر پیرس روانہ ہو گیا جہاں اُسے ایک اخبار کے عملے میں جگہ مل گئی۔ دو سال یا اس سے کچھ کم عرصے کے بعد وہ نپولین سوم کے سوتیلے بھائی کا سیکرٹری بن گیا اور اس حیثیت میں ۱۸۶۵ء تک کام کرتا رہا۔

اسی دوران میں اُس نے ادبی حلقے میں اپنی مشہور کتاب (Roisen Exil) سے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔

دوؔدے کو اکثر فرانسیسی ڈکنز کا نام دیا جاتا ہے۔ اُس کی تصنیف (de Petit chose) جس میں اس انگریزی ادیب کی پوری جھلک موجود ہے اس امر پر شاہد ہے کہ وہ واقعی اس نام کا اہل تھا۔ اُس کی حقیقت نگاری کا راز اس حقیقت میں موجود ہے کہ اُس کی تصانیف کے اکثر کردار گرد و پیش کی زندگی میں سے چُنے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر (la Matelle) اکادمی کے ارکان پر ایک حملہ ہے جس کے بیشتر کردار و حادثات حقیقی زندگی میں سے منتخب کئے گئے ہیں۔

زوؔلا کی طرح دادے بھی بہت محنت کش اور بسیار نویس تھا۔ وہ اکثر اوقات صبح چار بجے سے لکھنے میں مشغول ہوتا اور آٹھ بجے تک لکھتا رہتا۔ نوّ بجے لکھنا شروع کرتا اور بارہ بجے تک اپنے کام میں منہمک رہتا، دو بجے پھر قلم پکڑ کر چھ بجے تک لکھتا رہتا اور تھوڑا عرصہ آرام کرنے کے بعد وہ پھر آٹھ بجے سے لے کر نصف شب تک اپنے کام میں مشغول رہتا۔

دادے نے اپنی زندگی کے ایام بہت خوشی میں کاٹے۔ اُس کی ازدواجی زندگی پُر از مسرت تھی۔ دادط پیرس میں ۱۷ دسمبر ۱۸۹۷ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔

الفرودی میوسط:-

وکٹر ہیوگو کے ادبی حلقے کا سب سے کم عمر ممبر تھا۔ شروع شروع میں نوجوان میوسط اُس ادبی حلقے کو ایک شرابی کی نقل اُتار کر محظوظ کیا کرتا تھا —— اس وقت اُس کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی۔

میوسط پیرس میں ۱۸۱۰ء میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ اعلےٰ خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی ایک حد تک اچھی شہرت کا ادیب تھا۔ وکٹر ہیوگو نے شروع شروع میں نوجوان شاعر کی حوصلہ افزائی کی مگر میوسط کا رجوع بائرن کے سکول کی طرف تھا جس کا کلام اُسے زبانی یاد تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی اکثر منظومات اُسی کے تتبع میں کہی ہیں۔

میوسط کی ابتدائی شاعری فکر کی گہرائیوں سے خالی ہے مگر ۱۸۳۳ء میں جب وہ جارج سین کے ساتھ وینس میں بھاگ کر چلا گیا —— اور اُس برقی زندگی کے بعد وہ دونوں ایک غم افزا حالت میں ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔ اُس کے تمام افکار بالکل بدل گئے۔ طبیعت میں سنجیدگی اور گہرائی خود بخود پیدا ہو گئی —— محبت کے جذبات، غصہ اور حسد نے اُس کے دِل و دماغ کو تار تار کرنا شروع کر دیا۔

میوسط نے بائرن کی طرح لوگوں کی ہمدردی کو منعطف کرانے کی خاطر اپنے مجروح دل کی قاشیں پیش کرنا شروع کیں۔ اُس کے شدید ترین جذباتِ اُلفت گائے نہیں جا سکتے۔ میوسط خود کہتا ہے " اگر میں اِن جذبات کو گیت کی صورت میں پیش کرنے کی سعی کروں تو وہ اسے نازک پتیوں کی طرح کچل کر رکھ دیں گے"۔

میوسط کے افکار سحر انگیز، مترنم اور رومان آفریں ہیں ——— یہی وہ سحر خیز قدرت تھی جس نے اُسے اپنے زمانے کا بہترین شاعر بنادیا۔ اُس کے گیت خالص حُسن کی وجہ سے فرانسیسی شاعری کے گوہر تصور کئے جاتے ہیں۔

تھیوفل گوتیئے :-

گوتیئے طاربہ میں پیدا ہُوا مگر جوان ہوتے ہی پیرس میں چلا آیا جہاں اُس نے بہت غریبی کی حالت میں زندگی بسر کرنا شروع کی۔ اِن دنوں وہ اکثر اوقات دِن کا بیشتر حصّہ تصویر خانوں میں صرف کیا کرتا تھا۔ وہ اِن تصویر خانوں کی دیواروں پر آویزاں تصاویر گھنٹوں بُت بنا ہُوا دیکھتا رہتا ——— غالباً وہ اپنی روح کو رنگوں اور حُسنِ تشکیل کی غذا دیا کرتا تھا۔

اِن تصاویر اور اصنام کی خوبصورتی سے متاثر ہوکر گوتیئے نے تصویر کشی کا پیشہ اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر جب اُس نے دیکھا کہ اُس کے حسین خوابوں کی صحیح تعبیر کپڑے کے ٹکڑے پر پیش نہیں کی جاسکتی تو اُس نے بُرش اور رنگوں کو یک قلم موقوف کر کے لفظوں کی صنعت کی طرف توجہ دی ——— وہ آرٹ جس کا اُسے لاثانی ماہر ہونا تھا۔

ایک زمانے میں جب وہ صحافت نگاری سے گزر اوقات کر رہا تھا، وہ چند رومانی منظومات قلمبند کرنے میں مشغول تھا جن کا ہر ہر لفظ تصویر پر ایک مصوّر کے قلم کی جُنبش سے کم نہیں ہے۔

گوتیئے کا آرٹ خواہ وہ نظم کی صُورت میں ہو یا نثر کی صُورت میں بالکل یونانی ہے۔ دراصل وہ یونانی آرٹ کا بہت دلدادہ تھا اور اس آرٹ کے متعلق اُس نے اپنی چند تصانیف میں بہت کچھ لکھا بھی ہے۔

گوتیئے نے انگلستان کے مشہور جواں افکار شاعر کیٹس کی طرح ایک نظم لکھی ہے جس میں ہر ایک چیز سفید ہے (کیٹس نے اپنے سانیٹ کے لئے نیلا رنگ منتخب کیا تھا) یہ نظم ایک دوشیزہ کی تصویر ہے، سفید کپڑوں میں ملبوس، تالاب میں نہاتی ہوئی بطخوں کے پروں سے بھی زیادہ سفید ——— چاندنی رات میں تیرتی ہوئی برفانی چٹان اور ——— موتیا کی سیمین پنکھڑیوں سے بھی زیادہ سفید ——— یہ دوشیزہ اپنے پیانو کے پاس بیٹھ کر اپنے سفید ہاتھوں سے جو ہاتھی دانت کے بنے ہوئے پردوں سے بھی زیادہ سفید ہیں، اُس ساز کو چھیڑتی ہے۔

آرٹ اور صرف آرٹ کی تخلیق گوتیئے کا منتہائے نظر تھا۔

چارلس بادلئیر :-

بادلئیر پیرس میں ۱۸۲۱ء میں پیدا ہُوا اور ۱۸۶۷ء میں وہیں سپردِ خاک ہُوا۔ چونکہ بادلئیر صاحب جائداد تھا اس لئے وہ اس قابل تھا کہ اپنی زندگی شاعری کے لئے وقف کردے۔ مگر اس کے باوجود اُس کے تمام اشعار صرف ایک جلد پر مشتمل ہیں جو Flowers of Evil کے نام سے مشہور ہے۔

بادلیئر نہ مصوّر شاعر تھا اور نہ حسین اشیا کو تلاش کرنے والا ——— وہ سیاہ چیز کو سفید پر ترجیح دیتا تھا۔ اُس کی نظروں میں ایک لڑکی جس نے آغوشِ غربت میں پرورش پائی ہو اور جس کے پھٹے ہوئے غلیظ کپڑوں میں سے اُس کے کمزور بدن کی ہڈیاں نظر آ رہی ہوں کسی دوسری حریر پوش حسینہ سے زیادہ حُسن و جمال کی مالک تھی۔

بادلیئر کی شاعری، دہشت اور بدصُورتی اور اُن مہالک سے جو رات کے وقت منڈلاتے ہیں اور اُن بھُوتوں کی تصاویر سے جو رُوح کی تاریک گہرائیوں میں داخل ہوتے ہیں، بھری پڑی ہے۔ دراصل جب بادلیئر کوئی تصویر پیش کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ بالکل غیر فطری ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر "پیرس میں ایک خواب" میں ہم ایک ایسا شہر دیکھتے ہیں جو سنگِ مرمر اور دھات کا بنا ہوا ہے۔ جس کے بلند مینار اپنی پُراسرار روشنی سے منور ہیں۔ آبشار بلوریں پردوں کی طرح گرتے ہیں، نیلے پانی کے تالاب آہنی شیشوں کے مانند ہیں ——— باقی نظم بھی اسی قسم کی عجیب تشبیہوں سے بھری پڑی ہے۔

بادلیئر کی شاہراہ دوسرے شاعروں سے بالکل مختلف تھی۔ وہ خوشبوؤں کا شاعر تھا اور تصویروں سے اُسے کوئی نسبت نہ تھی۔ اکثر کہا کرتا تھا "میری روح خوشبوؤں پر تیرتی ہے، جیسا کہ دوسرے لوگوں کی موسیقی پر"۔

اُس کے اکثر اشعار پیچیدہ ہونے کے سبب سے ناقابلِ فہم ہیں۔

پال ورلین:-

ورلین اپنی نوعیت کا پہلا شخص ہے جس نے شاعری میں نام پیدا کیا۔ وہ اس قدر بدشکل واقع ہوا تھا کہ عورتیں اُسے دیکھتے ہی دہشت کے مارے چیخ اُٹھتی تھیں گویا وہ جنگلی بندر ہے۔ گو اُسے ایک دفعہ اپنے دوست پر گولی کا نشانہ کرنے کے جُرم میں جیل کی ہوا کھانی پڑی اور دوسری دفعہ اپنی ماں پر حملہ آور ہونے کی وجہ سے سپردِ زندان ہونا پڑا اور اُس کی موت انتہا درجے کی سوختہ سامانی میں واقع ہوئی مگر اُس کے اشعار اپنی خوبصورتی اور سادگی کی وجہ سے اس قابل ہیں کہ کوئی فرشتہ اُنہیں اپنے ساز پر گائے۔

ورلین ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا اور تادمِ آخر (۱۸۹۶) پیرس میں سکونت پذیر رہا۔ اُسے ورثے میں کچھ روپیہ حاصل ہوا تھا جو اُس اپنی ننھی ننھی کتابوں کی اشاعت پر خرچ کر دیا۔ یہ کتب یکے بعد دیگرے شائع ہوئیں۔ پہلی کتاب (Saturnian Poems) کے سے شائع ہوئی ——— یعنی منظومات جن کی تخلیق سرطان نامی غم افزا ستارے کی موجودگی میں ہوئی۔ ان اشعار میں غم تو ضرور ہے مگر شیریں اور سحر انگیز۔

ورلین کے پیشِ نظر صرف اپنی پُراسرار روح کے غم اور خوشیاں بیان کرنا تھیں لیکن وہ جس چیز کا بھی اظہار کرتا ہے۔ خواہ محبت گیت ہوں یا شراب کی مدح، خواہ ہسپتال یا جیل کے افکار ہوں۔ یا اپنے گناہوں، خوابوں یا اپنی جہالتوں کا ذکر ——— یہ سب اپنے سُریلے اور شیریں اشعار میں بیان کئے گئے ہیں کہ رُوح بے اختیار وجد کرنے لگ جاتی ہے۔

سعادت حسن

والٹیئر

فرانسس ماری اروئے جو ادبی دُنیا صرف والٹیئر کے مختصر نام سے متعارف ہے پیرس میں ۲۱ نومبر ۱۶۹۴ء کو پیدا ہوُا۔ اُس کا باپ متمول آدمی تھا۔ والٹیئر نے ابتدائی تعلیم (Jesuit College) ایسی نامی درسگاہ سے حاصل کی۔ گو یہ تعلیم پادریوں کے زیر اثر تھی مگر جیسا کہ اناطول فرانس اپنی ایک تصنیف میں لکھتا ہے کہ کلیسا کے بدترین دشمن وہ ہوتے ہیں جو اُس کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں ہم اُس کی زندگی کا بیشتر حصہ پادریوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے میں صرف ہوتا دیکھتے ہیں۔

شاعر، مورخ اور فلسفی کی حیثیت میں تو والٹیئر کے مقابلے میں چند اشخاص پیش کیئے جا سکتے ہیں مگر طنزیہ نگاری اور ہجو گوئی میں اُس کا کوئی مدِ مقابل نہیں۔ اس کے مشرقی رومان یا کہانیاں الف لیلہ کی طرز میں لکھی گئی ہیں۔

والٹیئر کی حاضر جوابی اور طنز گوئی کے متعلق بہت روایتیں مشہور ہیں۔ لوئی چہار دہم کے مرنے کے بعد جدید ناظم نے کفایت کی غرض سے شاہی اصطبل کے آدھے گھوڑے فروخت کر دیئے۔

والٹیئر نے وہ واقعہ سُن کر کہا "اس سے کہیں بہتر تھا کہ شاہی دربار سے نصف گدھوں کو نکال دیا جاتا"۔

۱۷۷۰ء میں اُس کا مجسمہ قائم کرنے کے لئے چندے کی فہرست کھولی گئی۔ اس وقت والٹیئر کے چہرے کی رونق بڑھاپے کی نذر ہو گئی تھی۔ رخسار پچک گئے تھے۔ بدن کی یہ حالت تھی گویا پُرانا چمڑا بوسیدہ ہڈیوں پر منڈھا ہے۔ آخر جب مجسمہ تیار ہو گیا تو والٹیئر نے شاہ فریڈرک کو لکھا "مجھے اب معلوم ہوُا ہے کہ دیگر علوم و فنون کے علاوہ آپ علمِ ابدان کے سرپرست بھی ہیں جبھی تو میرا مجسمہ تیار کرا کے جسم کا ڈھانچ مطالعہ کے لئے پیش کر دیا ہے"۔

والٹیئر اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر، مفکر، تمثیل نگار اور ادیب تھا۔ فرانس کے عہدِ حاضر کے مشہور نوبل پرائز یافتہ انشا پرداز اناطول فرانس کے خیال میں جنس لطیف کی آئینہ برداری میں شیکسپیئر بھی والٹیئر سے لگا نہیں کھا سکتا۔ والٹیئر المیہ تمثیل نگاری کا بادشاہ ہے انگلستان کا شہرۂ آفاق شاعر ٹامس گرے گو دہریہ خیال والوں سے متنفر تھا مگر پھر بھی وہ والٹیئر کی ٹریجیڈی کو شیکسپیئر کی تمثیلوں کا ہم پلہ قرار دیتا ہے۔

"والٹیئر مشہور صحافی بھی تھا۔ وہ بہت کثرت سے خطوط لکھتا۔ اُس نے ایک سو کے قریب کتابیں لکھیں۔ اُس کی تصانیف میں ایک لفظ بھی مہمل یا بیہودہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس وقت تک اُس کے دس ہزار مکتوب شائع ہو چکے ہیں"۔

بادلئیر نہ مصور شاعر تھا اور نہ حسین اشیا کو تلاش کرنے والا ——— وہ سیاہ چیز کو سفید پر ترجیح دیتا تھا اُس کی نظروں میں ایک
ا جس نے آغوشِ غربت میں پرورش پائی ہو اور جس کے پھٹے ہوئے غلیظ کپڑوں میں سے اُس کے کمزور بدن کی ہڈیاں نظر آرہی ہوں،
ی دوسری حریر پوش حسینہ سے زیادہ حسن و جمال کی مالک تھی۔

بادلئیر کی شاعری، دہشت اور بدصورتی اور اُن مہالک سے جو رات کے وقت منڈلاتے ہیں اور اُن بھوتوں کی تصاویر سے جو رُوح کی
سیک گہرائیوں میں داخل ہوتے ہیں، بھری پڑی ہے۔ دراصل جب بادلئیر کوئی تصویر پیش کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ بالکل غیر فطری ہوتی ہے
ثال کے طور پر "پیرس میں ایک خواب" میں ہم ایک ایسا شہر دیکھتے ہیں جو سنگِ مرمر اور دھات کا بنا ہوا ہے جس کے بلند مینار اپنی پُراسرار
وشنی سے منور ہیں۔ آبشار بلوریں پردوں کی طرح گرتے ہیں، نیلے پانی کے تالاب آہنی شیشوں کے مانند ہیں ——— باقی نظم بھی اسی قسم
ی عجیب تشبیہوں سے بھری پڑی ہے۔

بادلئیر کی شاہراہ دوسرے شاعروں سے بالکل مختلف تھی۔ وہ خوشبوؤں کا شاعر تھا اور تصویروں سے اُسے کوئی نسبت نہ تھی۔ وہ
لثر کہا کرتا تھا "میری روح خوشبوؤں پر تیرتی ہے، جیسا کہ دوسرے لوگوں کی موسیقی پر"۔

اُس کے اکثر اشعار پیچیدہ ہونے کے سبب سے ناقابلِ فہم ہیں۔

پال ورلین:۔

ورلین اپنی نوعیت کا پہلا شخص ہے جس نے شاعری میں نام پیدا کیا۔ وہ اس قدر بدشکل واقع ہوا تھا کہ عورتیں اُسے دیکھتے ہی دہشت
کے مارے چیخ اُٹھتی تھیں گویا وہ جنگلی بندر ہے۔ گو اُسے ایک دفعہ اپنے دوست پر گولی کا نشانہ کرنے کے جرم میں جیل کی ہوا کھانی پڑی اور
دوسری دفعہ اپنی ماں پر حملہ آور ہونے کی وجہ سے سپردِ زندان ہونا پڑا اور اُس کی موت انتہا درجے کی سوختہ سامانی میں واقع ہوئی مگر اُس کے
اشعار اپنی خوبصورتی اور سادگی کی وجہ سے اس قابل ہیں کہ کوئی فرشتہ اُنہیں اپنے ساز پر گائے۔

ورلین ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا اور تا دمِ آخر (۱۸۹۶) پیرس میں سکونت پذیر رہا۔ اُسے ورثے میں کچھ روپیہ حاصل ہوا تھا جو اُس نے
اپنی ننھی ننھی کتابوں کی اشاعت پر خرچ کر دیا۔ یہ کتب یکے بعد دیگرے شائع ہوئیں۔ پہلی کتاب (Saturnion Poems) کے نام
سے شائع ہوئی ——— یعنی منظومات جن کی تخلیق سرطان نامی غم افزا ستارے کی موجودگی میں ہوئی۔ ان اشعار میں غم تو ضرور ہے مگر شیریں اور سحر انگیز۔
ورلین کے پیشِ نظر صرف اپنی پُراسرار روح کے غم اور خوشیاں بیان کرنا تھیں لیکن وہ جس چیز کا بھی اظہار کرتا ہے۔ خواہ محبت کے
گیت ہوں یا شراب کی مدح، خواہ ہسپتال یا جیل کے افکار ہوں۔ یا اپنے گناہوں، خوابوں یا اپنی جہالتوں کا ذکر ——— یہ سب ایسے
سُریلے اور شیریں اشعار میں بیان کئے گئے ہیں کہ رُوح بے اختیار وجد کرنے لگ جاتی ہے۔

سعادت حسن

والٹیئر

فرانسس ماری اروئے جو ادبی دُنیا صرف والٹیئر کے مختصر نام سے متعارف ہے پیرس میں ۱۲ نومبر ۱۶۹۴ء کو پیدا ہوا۔ اُس کا باپ متمول آدمی تھا۔ والٹیئر نے ابتدائی تعلیم (Jesuit College) ایسی نامی درسگاہ سے حاصل کی۔ گو یہ تعلیم پادریوں کے زیر اثر تھی مگر جیسا کہ اناطول فرانس اپنی ایک تصنیف میں لکھتا ہے کہ کلیسا کے بدترین دشمن وہ ہوتے ہیں جو اُس کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں ہم اُس کی زندگی کا بیشتر حصہ پادریوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے میں صرف ہوتا دیکھتے ہیں۔

شاعر، مورخ اور فلسفی کی حیثیت میں تو والٹیئر کے مقابلے میں چند اشخاص پیش کئے جا سکتے ہیں مگر طنزیہ نگاری اور ہجو گوئی میں اُس کا کوئی مدِمقابل نہیں۔ اس کے مشرقی رومان یا کہانیاں الف لیلہ کی طرز میں لکھی گئی ہیں۔

والٹیئر کی حاضر جوابی اور طنز گوئی کے متعلق بہت روایتیں مشہور ہیں۔ لوئی چہاردہم کے مرنے کے بعد جدید ناظم نے کفایت کی غرض سے شاہی اصطبل کے آدھے گھوڑے فروخت کر دیئے۔

والٹیئر نے وہ واقعہ سُن کر کہا "اس سے کہیں بہتر تھا کہ شاہی دربار سے نصف گدھوں کو نکال دیا جاتا۔"

۱۷۷۰ء میں اُس کا مجسمہ قائم کرنے کے لئے چندے کی فہرست کھولی گئی۔ اس وقت والٹیئر کے چہرے کی رونق بڑھاپے کی نذر ہو گئی تھی۔ رخسار پچک گئے تھے۔ بدن کی یہ حالت تھی گویا پُرانا چمڑا بوسیدہ ہڈیوں پر منڈھا ہے۔ آخر جب مجسمہ تیار ہو گیا تو والٹیئر نے شاہ فریڈرک کو لکھا "مجھے اب معلوم ہُوا ہے کہ دیگر علوم و فنون کے علاوہ آپ علمِ ابدان کے سرپرست بھی ہیں جبھی تو میرا مجسمہ تیار کرا کے جسم کا ڈھانچ مطالعہ کے لئے پیش کر دیا ہے"۔

والٹیئر اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر، مفکر، تمثیل نگار اور ادیب تھا۔ فرانس کے عہدِ حاضر کے مشہور نوبل پرائز یافتہ انشا پرداز اناطول فرانس کے خیال میں جنسِ لطیف کی آئینہ برداری میں شیکسپیئر بھی والٹیئر سے لگّا نہیں کھا سکتا۔ والٹیئر المیہ تمثیل نگاری کا بادشاہ ہے انگلستان کا شہرۂ آفاق شاعر ٹامس گرے گو دہریہ خیال والوں سے متنفر تھا مگر پھر بھی وہ والٹیئر کی ٹریجیڈی کو شیکسپیئر کی تمثیلوں کا ہم پلہ قرار دیتا ہے۔

"والٹیئر مشہور صحافی بھی تھا۔ وہ بہت کثرت سے خطوط لکھتا۔ اُس نے ایک سو کے قریب کتابیں لکھیں۔ اُس کی تصانیف میں ایک لفظ بھی مہمل یا بیہودہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس وقت تک اُس کے دس ہزار مکتوب شائع ہو چکے ہیں۔"

"اگر والٹیر کی تمام کتابیں سوائے کینڈڈ کے تلف کر دی جائیں تو بھی وہ فرانس کے ادیبوں کی صفِ اوّل میں جگہ پاتا ہے ۔ یہ کتاب دراصل روسو کے ایک مکتوب کا جواب ہے جس میں روسو نے اُسے بے دین اور ملحد قرار دیا تھا۔ اس تصنیف میں وہ تمام جسمانی گناہوں کا نقشہ اور انسانی تباہی و بربادی کی تصویر کھینچ کر اس بُری طرح مضحکہ اُڑاتا ہے کہ پڑھنے والا خود بخود مصنف کا شریکِ تبسم ہو جاتا ہے"

والٹیر کے آہنی قلم نے آسمانی صحیفوں پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ اُس کے ذہن نے مذہب، فلسفے اور تاریخ کے میدانوں کو اپنی جولانگاہ بنایا۔ نثر، نظم، تاریخ، افسانہ، رومان اور تمثیل میں ہر جگہ والٹیر مذہب کی مخالفت کرتا ہے —— کلیسا حکومت کی گاڑی کا سب سے مضبوط گھوڑا تھا۔ والٹیر کی بیدزنی سے وہ ادھ مُوا ہوگیا۔ حکومت کی گاڑی رُک گئی مگر والٹیر اُسے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکا۔

اُس کے نزدیک شخصی یا جمہوری حکومت میں کوئی فرق نہیں ۔غربا کے لئے دونوں باتیں یکساں ہیں۔ خواہ اُنہیں ایک شیر شکار کرے یا ایک ہزار چوہے اُن کے متاعِ زیست پر ڈاکہ ڈالیں[۱]۔

والٹیر کی زندگی کے حالات پر جس کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں، اُس کی مثال نپولین کے سوا شاید ہی کوئی ہو۔ آخری عمر میں والٹیر نے اپنی پژمردہ قوت کو ابھارنے کے لئے شراب کا کثرت سے استعمال شروع کر دیا تھا۔ اس کے اثر کو زائل کرنے کی خاطر اُس نے بعد ازاں افیون کھانا بھی شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی رہی سہی صحت بھی برباد ہوگئی۔ آخر ۳۰ مئی ۱۷۷۸ء میں یہ باکمال شخص وفات پاگیا۔ اُس کے مرتے ہی یہ احکام جاری ہو گئے کہ اِسے کسی گرجا میں دفن نہ کیا جائے۔ مگر والٹیر کے احباب نے اُس کی لاش کو رسوم کے بغیر مضافات کے ایک گرجا میں خفیہ طور پر دفن کر دیا۔ اُس کی لوحِ مزار پر یہ الفاظ کندہ ہیں:-

"یہاں والٹیر آرام فرما ہے"

بعد میں فریڈرک اور دیگر مشاہیر یورپ نے پادریوں کو بہت لعن طعن کی اور اکاڈیمی نے نفرت کا ووٹ پاس کیا —— مؤرخ اس واقعہ کو انقلابِ فرانس کا محرک و ممد خیال کرتے ہیں ۔

سعادت حسن

تم ستاروں کو دیکھتے ہو اس لئے کہ وہ منوّر ہیں اور ناقابلِ فہم مگر تمہارے پہلو میں اُن سے زیادہ نرم روشنی اور اُن سے زیادہ عظیم اسرار موجود ہے —— عورت!

(وکٹر ھیوگو)

---

[۱] انقلابِ فرانس مصنفہ باری (علیگ)

والٹیئر کی صد سالہ برسی پر وکٹر ہیوگو کی تقریر

(یہ تقریر پیرس میں ۳۰ مئی ۱۸۷۸ء کو والٹیئر کی صد سالہ برسی کے موقع پر کی گئی)

ایک سو برس کا عرصہ گزرا آج ہی کے دن ایک شخص نے انتقال کیا تھا۔ وہ مرگیا لیکن ہم آج اس کو یاد کر رہے ہیں اور ہمیشہ یاد کرتے رہیں گے۔ وہ ہمارے لئے کیا چھوڑ گیا ہے؟ اپنے قابلِ یادگار کارنامے اپنی نہایت ہی مشکل اور خوفناک ذمہ داریاں، انسانی ضمیر کی تا ابد قائم رہنے والی ذمہ داریاں۔ زندگی میں اسے لعنتیں بھی ملی تھیں اور دعائیں بھی۔ ماضی نے اس پر لعنتیں بھیجیں اور مستقبل نے دعائیں۔ اور حضرات سچ پوچھئے تو عظمت اور کمال کی یہی سب سے بڑی نشانیاں ہیں۔ بسترِ مرگ پر اس کے ایک ہاتھ میں آنے والی نسلوں اور اپنے ہمعصروں کا نعرۂ مسرت تھا اور دوسرے ہاتھ میں نفرت و ذلت پر وہ عظیم الشان فتح تھی جو ملک نے اس کے سامنے پیش کی تھی۔ اس کی ہستی معاشری دائرہ سے باہر تھی۔ وہ خود ایک دَور تھا اس نے اپنا پیام دُنیا کو سُنایا۔ اس نے اپنا مشن دُنیا کے سامنے دلیری سے پیش کیا۔ کس نے اسے اس کام کے لئے منتخب کیا تھا؟ اس عظیم الشان طاقت نے جس کی روح صرف قانونِ انسانی ہی میں نہیں بلکہ قانونِ قدرت میں بھی برسرِ عمل رہتی ہے۔

زندگی کے اس مختصر چوراسی سال میں اس نے بہت کچھ دیکھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے شخصی حکومت کا تاریک بادل چھٹ گیا اور انقلاب کا آفتاب طلوع ہوا۔ جب وہ پیدا ہوا تو لوئی چہاردہم کی حکومت تھی اور جب اس نے انتقال کیا تو لوئی چہاردہم کا پوتا تخت پر تھا۔ اس طرح قدرت نے انتظام کر دیا کہ اس کا پالنا شخصی حکومت کا عروج دیکھ لے اور اس کا تابوت اس کے زوال کی تاریک خلیج سے بھی روشناس ہو جائے۔

حضرات! انقلاب سے پہلے ہماری معاشرتی حالت یہ تھی:۔

سب سے نیچے عوام

عوام کے اوپر مذہب کا نمائندہ چرچ

مذہب کے پہلو بہ پہلو انصاف مجسٹریٹوں کی شکل میں۔

انسانی معاشرت کے اس عہد میں عوام کیا تھے؟ ــــ جہالت۔ مذہب کیا تھا؟ ــــ تعصب۔ انصاف کیا تھا؟ ــــ ظلم۔ معاف فرمائیے میں شاید حد سے بڑھا جا رہا ہوں۔

میں آخری دو حقیقتوں پر بحث کروں گا۔ ٹولاوز میں ۱۳ اکتوبر ۱۷۶۱ء کو ایک جوان ایک نیچے مکان میں مردہ پایا گیا۔ موت رسی کے پھندے کے ذریعہ سے عمل میں آئی تھی۔ ایک بھیڑ جمع ہو گئی۔ پادریوں نے شہر میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ حکومت نے واقعہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ ایک خودکشی کا واقعہ تھا لیکن اسے ایک قتل کی صورت میں پیش کیا گیا۔ کس لئے؟ —— مذہب کے فائدہ کے لئے اور جرم کس پر عاید کیا گیا؟ —— غریب باپ پر، صدموں سے چُور نیم جاں باپ پر! وہ ایک ہیوگولونٹ[1] تھا اور اس نے بیٹے کو کیتھولک[1] ہونے سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ کتنی بعید از قیاس بات تھی۔ کتنا غیر ممکن جُرم تھا۔ باپ نے بیٹے کو مار دیا نہیں بلکہ باپ نے اپنے اکلوتے بچے کو پھانسی دے دی۔ تحقیقاتیں ہوتی رہیں اور انجام یہ ہؤا —— ماہ مارچ ۱۷۶۲ء میں جین کلاس، ایک بوڑھے آدمی کو جس کے سر کا ایک ایک بال سفید تھا جیل میں لے جایا گیا۔ اس کے ننگے بدن پر کوڑے مارے گئے۔ اسے ایک چکر پر لٹا دیا گیا۔ جسم چکر سے باندھ دیا گیا لیکن سر لٹک رہا تھا۔ اس حیوانی فعل کو دیکھنے کے لئے وہاں صرف چھ آنکھیں رہ گئی تھیں۔ ایک مجسٹریٹ جس کے ذمہ یہ کام تھا۔ ایک پادری آخری وقت دُعا کرنے کے لئے۔ اور ایک جلّاد جس کے ہاتھ میں ایک لوہے کی سیخ تھی۔ تکلیف کے عالم میں مجرم کی نگاہیں خدا اور مذہب کے در پر نہیں بلکہ حکومت کے در پر رحم کے لئے ہاتھ پھیلاتی ہیں۔ جلّاد لوہے کی سیخ اُٹھاتا ہے اور مضبوط ہاتھ کی ایک ہلکی سی جنبش سے غریب مجرم کا ایک ہاتھ جسم سے الگ ہو کر تڑپنے لگتا ہے۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ بیہوش ہو جاتا ہے دوائیں سنگھائی جاتی ہیں تاکہ ہوش میں آئے۔ سیخ کا دوسرا وار ہوتا ہے۔ بیہوشی پھر طاری ہوتی ہے اور پھر ہوش میں لایا جاتا ہے۔ ہر عضوِ بدن کو سیخ کے دو دو وار جسم سے الگ کرتے ہیں۔ مجرم کی رُوح آٹھویں وار میں جسم کو چھوڑ دیتی ہے اور وہ وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں اسے دعاؤں کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔ اچھی طرح مار ڈالنے کے لئے سیخ کا نوکیلا حصّہ اُس کے سینہ میں پیوست کر دیا جاتا ہے۔ سزائیں دو گھنٹے جاری رہتی ہیں۔ سنئے! اس کی موت کے بعد جوان کے خودکشی کرنے کا ثبوت مل جاتا ہے لیکن روح جسم میں دوبارہ واپس نہیں آسکتی۔ قتل سرزد ہو چکا تھا۔ کس سے؟ —— خود ججوں سے!!

دوسرا واقعہ۔ بوڑھے کے بعد جوان کا تین سال گزر گئے۔ ایک طوفانی رات کے بعد ایک پُل کی سڑک پر ایک لکڑی کی خستہ صلیب پڑی ہوئی پائی گئی جو تین صدی سے نہر کی پٹڑی پر نصب تھی۔ کس نے اس صلیب کو پھینکا تھا؟ —— کس نے دیکھا تھا؟ شاید کسی مسافر ہی نے پھینک دیا ہو لیکن یہ ایک فعل تھا جو مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ اس پاک اور مقدس مذہب سے جس نے رحم کی تعلیم دی ہے۔ جو ایک طمانچہ کے بعد دوسرا گال پیش کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ بشپ آف آمین نے شہر میں MONITOIRE[2] کا

---

[1] عیسائیت کے دو فرقے جن میں ایک زمانہ میں سخت اختلاف بلکہ دشمنی تھی۔ شمسی

[2] یہ ایک مذہبی قانون ہے جس کی رو سے کسی جرم کی تفتیش کے سلسلے میں بشپ ہر شخص سے حلفاً اقرار کرنے کا مجاز ہے۔ یہ خاص کیتھولک قانون ہے۔ شمسی

حکم صادر کر دیا۔ طرح طرح کی افواہیں شہر میں پھیلنے لگیں حکومت نے مجرم کا پتہ لگا لیا اپنے خیال ہی میں سہی۔ اس طرح کہ اس رات کو دو افسر اس پُل پر سے گزرے تھے۔ نشہ نے انہیں جامہ سے باہر کر رکھا تھا اور شاید وہ گانا گاتے ہوئے بھی سُنے گئے تھے۔ وارنٹ صادر ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے بھاگ کر جان بچائی اور دوسرا غریب لابیر گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ چلتا رہا۔ جج نے اسے مجرم ٹھیرایا۔ مقدمہ کی اپیل پارلیمنٹ میں پیش ہوئی لیکن فیصلہ بحال رہا ــــ میں مختصر کہہ رہا ہوں ــــ وہ سزا دینے کے کمرے میں لایا گیا۔ اس پر سزاؤں کی بوچھاڑ شروع ہوئی معمولی اور غیر معمولی ہر طرح کی تاکہ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کا نام ظاہر کر دے۔ کیسے ساتھی؟ ــــ وہ جو اس کے ساتھ پُل پر سے گزرے تھے اور گانے میں اس کے شریک تھے۔ سزا کے دوران میں اس کی ایک ٹانگ توڑ دی گئی۔ دوسری سزا کو دیکھ کر بیہوش ہو گیا۔ غریب مجرم کی کیا حالت ہو گی؟ دوسرے دن یعنی پانچویں جولن ۱۷۶۶ء کو وہ ایک میدان میں لایا گیا جہاں آگ دہک رہی تھی۔ اور اسے سزا کی خبر سنائی گئی۔ جلاد نے اس کا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا۔ اس کی زبان گرم لوہے سے داغ دی گئی۔ اور آخر میں رحم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ یہ تھی وہ تلخ موت جو جوان لابیر کو نصیب ہوئی۔ انیس برس کے سن میں کون ایسی موت پسند کرتا ہے!

اس وقت والٹیر نے ایک دردناک چیخ ماری۔ سارا فرانس بلکہ ساری دُنیا اس سے جاگ اُٹھی۔ والٹیر یہ تیرا سچا کارنامہ ہے۔ تو نے ماضی کے ان ظلموں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ تو نے دُنیا کو ہوشیار کر دیا شیطانوں اور ظالموں کی ناپاک روح سے تو نے نسل انسانی کی بھلائی چاہی اور کامیاب رہا۔ اے قابلِ ستائش ہستی تجھ پر خدا کی رحمتوں کا نزول ہو!

حضرات! یہ جاں گسل نظارے کہاں رونما ہو رہے تھے؟ ــــ یورپ کے ایک نہایت ہی شائستہ ملک میں۔ زندگی دلچسپیوں سے بھری تھی۔ عوام حالات سے بے خبر تھے۔ انہیں یہ بھی خبر نہ تھی کہ ان کے گردو پیش کیا ہو رہا ہے۔ ان کی یہ بے خبری انہیں زوال کی طرف کھینچ رہی تھی۔ بڑے بڑے شعرا (St. ANLAIRE و BOUFFLERS و GENTIL-BERNARD) اپنے اپنے نغمے گا رہے تھے۔ دربار عیش کی آماجگاہ تھا۔ پیرس بے خبر تھا کہ کیا ہو رہا ہے؛ ملک کے ایک کونے میں مذہب کے زیر اثر یہ فعل عمل میں آیا کہ انصاف نے ایک غریب بوڑھے کو چکر پر رکھ کر مار ڈالا۔ غریب بچے کی زبان گانا گانے کے جرم میں کاٹ ڈالی گئی!!!

ایسی ہولناک اور بیوقوف سوسائٹی کے درمیان والٹیر کی واحد ہستی تھی جس نے ان خرابیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اس کے مقابلہ کے لئے دُنیا کی ساری طاقتیں موجود تھیں ــــ دربار امراء اور دار السلطنت کی متحدہ قوتیں۔ اندھی مخلوق۔ ظالم انصاف جس کا کام صرف عوام کی گردن پر قدم رکھ کر بادشاہ کے سامنے سجدہ کرنا تھا۔ کلیسا اپنی ساری بُرائیوں اور تعصب کے ساتھ ــــ غرض اسے ساری طاقتوں سے جنگ کرنی تھی۔ اور آپ کو معلوم ہے اس کے پاس ان کے مقابلہ کے لئے کیا ہتھیار تھا؟ ــــ وہ ہتھیار جس میں ہوا کی سی سُبکی، آندھی اور طوفاں کی سی طاقتیں موجود ہیں ــــ یعنی "قلم"۔

اسی ہتھیار سے اُس نے جنگ کی اور اسی ہتھیار سے فتح پائی۔ آیئے ہم لوگ اس مقدس کارنامہ کی یاد میں تھوڑی دیر کے لئے اپنی گردنیں جھکالیں۔

والٹیئر کی فتح رہی۔ اس نے بہترین قسم کی جنگ چھیڑی تھی۔ ایسی جنگ جس میں ایک ہستی ایک ہجوم کا مقابلہ کرتی ہے۔ یہ جنگ تھی واقعات اور خیالات کی، عقل اور تعصب کی، انصاف اور ظلم کی، ظالم اور مظلوم کی۔ والٹیئر کی طبیعت غازی کی گرمی اور عورت کی نرمی سے مل کر بنی تھی۔ وہ عظیم الشان دماغ اور نرم دل کا مالک تھا۔ اس نے پرانے خیالات اور پرانے اصول پر فتح پائی اس نے ظالم امرا اور مجسٹریٹوں کو زیر کیا۔ اس نے کلیسا کو اپنے سامنے گردن جھکانے پر مجبور کیا۔ اس نے عوام کو خاک سے اٹھا کر تخت پر بٹھا دیا۔ وہ فرانس کو مہذب ممالک کے دائرہ میں لایا۔ خیال کیجئے تو حقیقی معنوں میں وہ کلاس اور لابیر کا تنہا ہمدرد تھا اس نے ساری دھمکیوں، تکلیفوں، نفرتوں اور جلاوطنی کا ہنس کر مقابلہ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شکست اس کے لئے بنی ہی نہیں اس نے تشدد کو تبسم سے شکست دی، ضد کو استقلال سے، اور جہالت کو حق سے!

ا! میں نے لفظ "تبسم" استعمال کیا۔ مجھے کچھ دیر بولنے کا موقع دیجئے۔ تبسم اور والٹیئر کا!!

حضرات! فلسفی کی طینت کا نمایاں رُخ کیا ہے؟ مصالحت۔ والٹیئر کی طبیعت ہمیشہ اس سے آشنا رہی۔ طوفاں گزرجانے کے بعد سمندر میں زیادہ سکون پیدا ہوجاتا ہے۔ غصہ کے بعد اس کی طبیعت ٹھنڈی ہوجاتی اور ان ٹیڑھے میڑھے لبوں پر تبسم کی جھلک رونما ہونے لگتی۔ وہ تبسم مجسم عقل ہوتا۔ اور میں کہتا ہوں کہ وہ تبسم ہی اصلی والٹیئر ہے۔ تبسم بڑھ کر ہنسی ہوجاتی ہے لیکن اس کی فلسفیانہ طبیعت اسے اعتدال سے نہ گزرنے دیتی۔ تبسم کس چیز کا مظہر ہے؟ ــــ مضبوط کے لئے وہ طعن ہے اور کمزور کے لئے ہمدردی کی نشانی، وہ ظالم کو مقابلہ کی دعوت دیتا ہے اور مظلوم کی پیٹھ ٹھوکتا ہے، بڑے کے لئے وہ نفرت کا جذبہ پیش کرتا ہے اور چھوٹے کے لئے رحم۔ آیئے ہم لوگ بھی اس سے متأثر ہوں۔ اس میں صبح کی پہلی شعاع کی سی نرمی ہے۔ وہ حق، انصاف اور خوبی پر نیا ملمع کر دیتا ہے۔ وہ روح کو ایک تازہ فرحت بخشتا ہے۔

والٹیئر کا تبسم صرف اس کے اندرونی جذبات کا آئینہ دار ہی نہ تھا بلکہ بہت ہی مفید بھی تھا۔ نئی سوسائٹی، برابری اور رعایت کی خواہشات، ملک میں برادرانہ تعلقات کی لہر، باہمی خوش اعتقادیاں، انسانی حقوق کی حفاظت، بے تعصبی، روحوں کی پاکیزگی صلح ــــ آپ غور کرسکتے ہیں یہ سب اس مشہور عالم تبسم کی برکتیں ہیں جن سے ہم آج ایک صدی کے بعد بھی فیضیاب ہورہے ہیں اس دن ــــ جو بہت جلد آنے والا ہے ــــ جب دُنیا میں عقل اور رحم کی سلطنت ہوگی، جب مجرم سزا کے بجائے معافی سے نادم کیا جائے گا ــــ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں اس دن آسمان پر والٹیئر کے لب اسی تبسم سے پھر آشنا ہونگے۔

حضرات! بنی آدم کے دو خادم جن کے ظہور میں اٹھارہ سو برس کا فاصلہ ہے ایک خاص رشتہ میں بندھے ہیں۔ بُت پرستی

ہولناک دیو کو شکست دینا، فریب کا قلع قمع کرنا تعصب بد اعتقادی اور دیگر برائیوں سے دُنیا کو نجات دلانا ظلم ستم اور جبر و تعدی سے دُنیا کو پاک کرنا، دُنیا میں حق کا تعارف، ظالم حکومت کی بیخ کنی، مذہب کے بے جا اقتدار کا خاتمہ، بنی آدم کے حقوق کی واپسی، غریب اور کمزور کی پُشت پناہی ——— یہ تھی وہ جنگ جو مسیح نے شروع کی تھی اور جس نے یہ مقدس جنگ پھر تازہ کی وہ والٹیئر کی پاک ہستی تھی!!

بنی آدم کے ان دو خادموں میں یہ فرق تھا کہ "مسیح روئے" اور "والٹیئر مسکرایا"۔ اسی "خدائی آنسو" اور "انسانی تبسم" سے مل کر ہماری یہ نئی تہذیب بنی ہے!!

کیا والٹیئر ہمیشہ مسکراتا ہی رہتا تھا؟ نہیں ــ وہ بعض اوقات خشم آلود بھی ہو جاتا۔ آخر وہ انسان تھا۔ حضرات! ہم کہہ سکتے ہیں کہ اعتدال فلسفی کا خمیر ہے۔ ایک عقلمند ہمیشہ بُردباری اور حلم کو راہ دیتا ہے۔ لیکن انسانی طبیعت اپنی خاصیت چھوڑ نہیں سکتی۔ میں پھر کہتا ہوں کہ طوفان گزر جانے کے بعد فضا میں سکون آ جاتا ہے۔

اگر منصف نے انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اگر مذہبی پیشواؤں نے عیاشی اور ہوسناکی کو راہ نہیں دی تو وہ تعریف کے مستحق ہیں اور اُن کی تعریف کی جائے گی۔ لیکن اگر انصاف کے معنی ظلم ہو جائیں اور اگر مذہب کے معنی جبر اور زبردستی کے لئے جائیں تو میں بھی اِن پر نفرین بھیجتا ہوں۔ ایسے وقت میں عوام اُٹھتے ہیں اور منصفوں کو جواب دیتے ہیں کہ قانون سے بہتر کوئی کام نہیں۔ مذہبی پیشواؤں سے کہتے ہیں کہ ہم ان پُرانے ڈھکوسلوں کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہمیں تمہاری دنیاوی آگ اور آسمانی عذاب سے کوئی غرض نہیں۔ اس وقت دُنیا کا خاموش "فلسفہ" سر اُٹھاتا ہے اور منصفوں کو انصاف کے سامنے اور مذہبی پیشواؤں کو خدا کے سامنے مجرم ٹھہراتا ہے۔

یہی کام ہے جو والٹیئر نے درحقیقت کیا۔ کتنا عظیم الشان اور قابل یادگار کارنامہ ہے!

والٹیئر کیا تھا؟ میں کہہ چکا۔ اب میں آپ کے سامنے اس کا عہد پیش کروں گا۔

حضرات! بڑے لوگ شاید ہی تنہا آتے ہیں۔ اونچے درخت گھنے جنگلوں میں بزرگ تر نظر آتے ہیں اسی طرح والٹیئر کے اردگرد بھی دماغوں کا ایک عظیم الشان جنگل تھا اور یہ جنگل اٹھارھویں صدی ہے دماغوں کے اس جنگل میں دوسرے اُونچے اُونچے درخت بھی تھے (BEAUMARCHAIS ، MONTESQUIE ، BUFFON) روسو[1] اور ڈیڈروٹ[2] بزرگی میں والٹیئر

---

[1] مشہور فرانسیسی مصنف (۱۷۷۸ - ۱۷۱۲) اپنے خیالات کی وجہ سے فرانس چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ اس کی تحریر نے "انقلاب فرانس" کے راستہ صاف کیا۔ ڈیڈروٹ سے بڑی گہری دوستی تھی۔

[2] ایک فرانسیسی فلسفی (۱۷۸۴ - ۱۷۱۳) سائیکلوپیڈیا تیار کرنے میں آخری عمر کے تیس سال صرف کر دیئے۔

کے بعد ہی آتے ہیں۔ اِن فلسفیوں نے عوام کو سوچنے کا صحیح اُصول بتایا۔ آپ جانتے ہیں کہ فعل سے پہلے ارادہ ہمارے کاموں کو کامیاب بناتا ہے۔ دماغ کی صحیح رفتاری ہمارے افعال اور حرکات کو درست قائم رکھ سکتی ہے۔ ترقی کے ان حامیوں نے ملک کو سچا فائدہ پہنچایا۔ اٹھارھویں صدی کے ایک سطحی مطالعہ کے بعد ہم اس فیصلہ پر آ سکتے ہیں کہ روسو نے عوام کی صحیح نمائندگی کی لیکن والٹیئر نسل انسانی کا نمائندہ ہے۔ وہ صاحبِ اقتدار اہلِ قلم دُنیا سے اُٹھ گئے لیکن ان کی روح "انقلاب" ہمارے لئے وقف ہے۔

ہاں "انقلاب فرانس" ان کی روح تھی۔ یہ ان کی ایجاد تھی۔ یہ ان کی تخلیق تھی۔ اس خطرناک کام میں جس نے ماضی کا خاتمہ کر دیا اور جو "کتاب حال" کا نیا باب کھولتا ہے انہیں کی روح سرگرم کار نظر آتی ہے۔ انقلاب فرانس کی تاریخ پڑھتے ہوئے ڈیڈروٹ روسو اور والٹیئر کی روحیں دوش بدوش ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔

یہ انہیں کا کارنامہ ہے۔ قابل فخر کارنامہ — قابل ستائش کارنامہ

حضرات! تاریخ کے مختلف ادوار کو ہم لوگ ان ناموں سے یاد کرتے ہیں 'عہد آگسٹس'، 'عہد لوئی دہم'، 'عہد لوئی چہاردہم'، اسی طرح تاریخ کا ایک باب 'عہد والٹیئر' کے نام سے بھی پکارا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے ناموں نے تاریخ کی تقسیم میں بہت سہولیت پیدا کر دی ہے۔ والٹیئر سے قبل یہ مختلف باب بادشاہوں کے نام سے موسوم کئے جاتے تھے لیکن والٹیئر بادشاہوں سے بڑی شخصیت کا مالک ہے۔ وہ ملک کا نہیں بلکہ خیالات کا بادشاہ ہے۔ اس نے ایک نئے دَور کا آغاز کیا ہے "تہذیب" پہلے "طاقت" کے زیر اثر تھی۔ لیکن زمانہ بدل گیا اب اس پر "خیالات" کی حکومت ہے۔ تلوار اور شاہی عصا کے عوض دُنیا پر اب "شعاع نور" کی حکومت ہے۔ یعنی "قوت" کی جگہ اب "آزادی" نے لے لی ہے۔ اب سوائے قانون عام اور آزادیٔ ضمیر کے دُنیا میں کوئی دوسری طاقت نہیں۔

ہمارے سامنے ترقی کے دو پہلو ہیں۔ اپنے حقوق کی حفاظت یعنی ایک "انسان" بننا اور اپنے فرض کی تکمیل یعنی "شہری" (citizen) بننا —— عہد والٹیئر کا یہی مطلب ہے اور اس مقدس واقعے "انقلابِ فرانس" کے یہی معنی ہیں۔

سولھویں اور سترھویں صدی نے اس کا سامان بہم پہنچایا۔ RABELAIS اور MOLIERE نے اپنی تصنیفوں میں حکومت اور کلیسا کو متنبہ کر دیا۔ اقتدار سے نفرت اور حق کی حفاظت کو قدرت نے خون بنا کر ان کی رگوں میں ڈالا تھا۔

آج جو یہ کہتا ہے کہ طاقت ہی اصل چیز ہے اُسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اپنے سے بہت زیادہ تہذیب یافتہ لوگوں سے گفتگو کر رہا ہے۔ یہ تین صدی پیچھے کی گفتگو ہے۔

حضرات! انیسویں صدی نے اٹھارھویں صدی پر ایک نیا رنگ چڑھا دیا ہے۔ ہم اس بات کو اس طرح ادا کر سکتے ہیں کہ اٹھارھویں صدی نے تحریک پیش کی اور اُنیسویں صدی نے اس کی تائید کی۔ ان دو جملوں میں ہم دو صدیوں کی ساری ترقیوں کا جوہر اور روح بیان کر دیتے ہیں۔

وقت آگیا ہے کہ حق انسانی موالفت (*Human Federation*) کو اپنا ضابطہ بنالے ۔

آج قوت کا استعمال تشدد کہلاتا ہے ۔ کون اسے برداشت کرسکتا ہے ؟ جنگ اس کا واحد انجام ہے ۔ انسانی تمدن کی تلوار سے فاتحوں اور جرنیلوں کو پابزنجیر انصاف کے تخت کے سامنے لاکر سزا کا طالب ہوتا ہے ۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہیرو کو اکثر دار کے منحوس تختے کی صورت دیکھنی پڑی ہے ۔ عوام یہ سمجھ گئے کہ جرم کی عظمت "جرم کو ناپید نہیں کرسکتی ۔ یعنی اگر قتل کرنا گناہ ہے تو قتل عام کوئی فائدہ مند چیز نہیں ہوسکتی ۔ اگر چوری جرم ہے تو یورش قابلِ ستائش عمل نہیں ہوسکتی ۔ مردم کشی ہمیشہ مردم کشی رہیگی ۔ اور قتل ہمیشہ قتل ۔ قیصر اور نپولین کا نام اختیار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ۔ وہ قادرِ مطلق سب کچھ دیکھتا ہے ۔ اس کی آنکھیں ڈاکو کی ٹوپی کے عوض تاج دیکھ کر دھوکا نہیں کھاسکتیں ۔

آیئے ہم لوگ حق کا نعرہ ماریں ۔ جنگ قابلِ نفرت چیز ہے ۔ "جنگ" اور "نفع" یہ دو متضاد الفاظ ہیں ۔ کون کہتا ہے کہ خون بہانا ، مظلوموں کی تعداد میں اضافہ کرنا فائدہ مند ہوسکتا ہے ؟ حاضرین آپ میں سے کتنے بھولے بھالے بچوں کے باپ ہوں گے ۔ کیا آپ پسند کریں گے کہ ڈاکو آپ کا بچہ لے جائے ۔ یہ کبھی پسند نہیں کیا جاسکتا کہ مائیں تکلیفیں اُٹھائیں اور بچے جنیں ، لوگ محنت ومشقت سے کھیت جوت کر غلہ پیدا کریں ، صناع شہروں کو خوبصورت بنائیں ، ادب کے نادر نمونے پیدا کئے جائیں ۔ ملک کا ادبی ذخیرہ تیار ہو اور یہ سب خدا کی خدائی میں ، آفتاب اور ماہتاب کی روشن چھت کے نیچے جنگ کے ہولناک دیوتا کے پیٹ میں چلا جائے ۔

اصل میدان جنگ یہ ہے ۔ سب سے بڑی قربانی یہ ہے جو ملک نے بنی نوع انساں کے لئے والٹیئر کی صورت میں پیش کی ہے ۔

"زندہ باد والٹیئر"

شمسی کاکوی

جب محبت دو ہستیوں کو اپنی گرمی سے پگھلا کر ایک مقدس قالب میں ڈھال دیتی ہے تو ان پر رازِ حیات عیاں ہو جاتا ہے ۔ تب اُن کی ایک ہی قسمت ہوتی ہے ۔ وہ اس وقت ایک رُوح کے دو بازُو ہوتے ہیں ——— اے محبت بلندیوں میں پرواز کرتی رہ !

وکٹر ہیوگو

ایک گھرانا

پندرہ سال بعد آج پھر میں اپنے دوست سائمن رادیول سے ملنے کے لئے جارہا تھا۔

کبھی وہ میرا بہترین دوست تھا —— میرے دل کا حقیقی رازداں —— ایسا دوست، جس کی صحبت میں آدمی اموش یا مسرور رہ کر اکثر شام کا طویل وقت گذار سکے، جسے آدمی اپنے دل کے سربستہ رازوں سے آشنا کر سکے جس کو بلا تکلف اپنے در لطیف، بلند اور پاکیزہ خیالات سے آگاہ کر سکے —— ایسے خیالات جن کی تخلیق باہمی ہمدردی کی پُرامن فضا میں ہوئی ہو!

ایک طویل مدت تک ہم ایک دوسرے سے شاذ ہی جدا ہوئے —— ہم دونوں اکٹھے رہتے، اکٹھے سفر کیا کرتے، اکٹھے سوچتے، ایک ہی قسم کی آرزوؤں کی پرورش کرتے۔ ایک چیز کو ایک ہی طرح دیکھتے، ایک سی کتابوں کی تعریف کرتے، ایک ہی طرح کے آرٹ کو پسند کرتے، ایک ہی طرح کے احساسات سے اثر پذیر ہوتے، اور ایک ہی طرح کی چیزوں کو دیکھ کر مسکرا اُٹھتے۔ غرض کہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔

ایک دن یکایک اس نے اپنے ہی صوبے کی ایک لڑکی سے شادی کر لی، جو شریک زندگی کی تلاش میں پیرس آئی تھی۔ نہ جانے اس سنہرے بالوں والی، نازک اندام، پست قامت، چابکدست لڑکی نے جس کی آنکھوں سے بے وفائی جھلک رہی تھی، جس کی شریر آواز سے اس کے شوخ طبیعت ہونے کا پتہ چلتا تھا، اور جو دوسری ہزاروں شادی کے قابل لڑکیوں کی طرح تھی، اس ذی فہم اور شُستہ مزاج آدمی کو کیسے منتخب کر لیا۔ کوئی بھی اس بات کو نہ سمجھ سکا۔ اسے اُمید تھی کہ وہ ایک محبت کرنے والی اور باوفا بیوی کی آغوش میں حقیقی اور زندہ جاوید مسرت حاصل کر سکتا ہے۔ وہ تصور کیا کرتا تھا کہ وہ اس سنہرے بالوں والی چھوٹی سی لڑکی کی شفاف آنکھوں میں یہ سب کچھ دیکھ چُکا ہے۔

اُسے شاید یہ معلوم نہ تھا کہ ایک ہوشیار، بلند حوصلہ اور حساس آدمی جب ایک مجازی چیز کی المناک حقیقت تک پہنچ جائے تو وہ اس سے فوراً متنفر ہو جاتا ہے۔ اور حقیقت شناسی کا احساس اس میں اُس وقت تک مُردہ نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی قوتِ ادراک عام چیزوں کو سمجھنے سے قاصر نہ ہو جائے۔

میں کس قسم کے انسان سے ملنے جا رہا ہوں؟ کیا وہ ابھی تک ویسا ہی زندہ دِل، زیرک، ہنس مکھ، اور پُرجوش آدمی ہے یا ازدواجی زندگی نے اس کو بالکل مُردہ کر دیا ہے۔ پندرہ سال میں آدمی بہت کچھ بدل سکتا ہے!

ٹرین ایک چھوٹے سے سٹیشن پر ٹھہری۔ جونہی میں گاڑی پر سے اُترا، ایک موٹا تازہ اور توانا آدمی میری طرف بازو پھیلائے اور "جارج جارج" کہتے بے تحاشا دَوڑا۔ اس کے گال سُرخ تھے اور اس کی توند بڑھی ہوئی تھی۔ مَیں اس سے بغلگیر تو ہو گیا مگر اسے پہچان نہ سکا۔

میں نے پریشان ہو کر کہا "بخدا تم تو بہت موٹے ہو گئے!"

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا" اور تم کیا چاہتے تھے! بھئی، اچھا رہنا سہنا، اچھا کھانا پینا، راتیں ہیں تو آرام کی، دِن ہیں تو آسائش کے۔ بس یہ ہے میری زندگی!"

میں نے اس کی طرف غور سے یوں دیکھا، گویا مَیں نے اس چوڑے چکلے چہرے سے کبھی محبت کی ہے۔ صرف آنکھیں ہی تھیں، جو ابھی تک نہ بدلی تھیں، مگر ان میں وہ پہلی سی روشنی نہ تھی۔ مَیں نے دل میں کہا: اگر یہ صحیح ہے کہ آنکھوں کی روشنی دماغ کا عکس ہوتی ہے تو یہ دماغ جو اس سر میں ہے، وہ نہیں جس سے کبھی مَیں اچھی طرح آشنا تھا۔

یُوں تو اس کی آنکھیں جوشِ مسرت اور دوستانہ گرمجوشی سے چمک رہی تھیں مگر ان میں فہم و فراست کا وہ نور باقی نہ تھا جس سے کسی شخص کی قابلیت کا پتہ اسی طرح چل جاتا ہے جس طرح گفتگو سے اس کی ذہنی کیفیت معلوم ہو جاتی ہے۔

سائمن یکایک بولا۔ "دیکھو یہ میرے دو بڑے بچے ہیں!"

چودہ سال کی ایک لڑکی، جو بالکل جوان معلوم ہوتی تھی، اور تیرہ سال کا ایک لڑکا، سکول کے لباس میں، ذرا ہچکچاتا ہُوا آگے بڑھا۔

مَیں نے آہستگی سے کہا "تمہارے؟"

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا "ہاں، ہاں"۔

"کتنے بچے ہیں؟"

"پانچ۔ تین گھر پر ہیں"۔

یہ جوابات اس نے اس درجہ فخر، خوشی، اور فاتحانہ انداز میں دیئے کہ میرا دل اس بہائم صفت، انجان، سادہ لوح آدمی کے بے جا فخر پر انتہائی جذبۂ رحم سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ جو اپنی تمام راتیں، ایک دیہاتی مکان میں رہ کر ابھٹ میں رہنے والے خرگوش کی طرح، بچے پیدا کرنے کے لئے وقف کر چکا تھا۔

مَیں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اسے وہ خود ہی چلا رہا تھا۔ ہم شہر کے ایک بے رونق اور سنسان حصے میں سے گذر رہے تھے۔ گلیوں میں سوائے چند کتّوں اور دو تین خادموں کے اور کوئی فرد نظر نہ آتا تھا۔ گاہے گاہے کوئی دکاندار دروازے میں بیٹھا اپنی

بٹ کو جنبش دیتا اور سائمن سلام کا جواب دیتے ہوئے میرا تعارف اس سے کرا دیتا۔ وہ مجھ پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں یہاں کے تمام دل سے واقف ہوں۔ میرے دل میں خیال آیا کہ یہ ڈپٹی بننے کے خواب دیکھ رہا ہے ـــــ ایسے خوشگوار خواب جو چھوٹے چھوٹے شہروں کے باشندے اکثر دیکھا کرتے ہیں ـــــ!

ہم جلد ہی اس جگہ سے گزر گئے۔ گاڑی ایک عظیم الشان پارک نما، باغ میں داخل ہوئی اور ایک بُرجیوں والے مکان کے سامنے رُکی۔ یہ مکان خاصا وسیع معلوم ہوتا تھا۔

سائمن بڑے فخر سے کہنے لگا "یہ ہے میرا چھوٹا سا غریب خانہ"!

میں نے جواب دیا "یہ تو بڑا خوبصورت ہے"۔

سامنے کی سیڑھیوں پر سے ایک عورت نمودار ہوئی۔ وہ ملاقات کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے اپنے بال بھی بڑے اہتمام سے اسی خاص موقع کے لئے بنا رکھے تھے اور اس کی پُرتپاک گفتگو میں بھی خاص ملاقاتی رنگ نظر آتا تھا۔ پندرہ سال پہلے جب میں نے اسے گرجا میں دیکھا تھا، اس کے بال اور اس کا چہرہ نہایت خوبصورت تھا۔ مگر اب وہ ایک تنومند عورت معلوم ہو رہی تھی اس کا لباس حد سے زیادہ نمائشی تھا۔ اس میں وہ تمام خوبیاں ـــــ پختگی، استقلال، حُسن، فراست، مفقود تھیں، جو صنفِ لطیف میں عموماً پائی جاتی ہیں۔ وہ صرف ایک ماں تھی ماں ـــــ ایک موٹی سی عام ماں ـــــ جس کا بچے پیدا کرنے اور کھانا کھانے کے سوا اور کوئی مشغلہ نہ ہو!

اس نے میرا استقبال کیا۔ میں ہال میں داخل ہوا، جہاں تین بچے قد کی ترتیب سے ایک قطار میں کھڑے تھے۔ وہ ان فوجی سپاہیوں کی طرح استادہ نظر آ رہے تھے، جو کسی میجر کے سامنے کھڑے ہوں۔

میں نے کہا "خوب۔ تو یہ ہیں باقی بچے؟"

سائمن نے نہایت مسرت سے مجھے ان کے نام بتائے ـــــ جین، سوفی، گنتراں ـــــ!

نشست گاہ کا دروازہ کھلا۔ میں اندر داخل ہوا۔ وہاں میں نے بازوؤں والی کرسی پر ایک لاغر، نحیف، بوڑھا دیکھا، جو بیٹھے بیٹھے کانپ رہا تھا۔

مادام راوبون آگے بڑھی اور بولی "یہ میرے نانا ہیں۔ یہ ستاسی سال کے ہونگے"۔

اس نے بوڑھے آدمی کے کان میں زور سے کہا "نانا جان، یہ سائمن کے دوست ہیں"۔

بوڑھا میرا خیر مقدم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ذرا بھاری آواز میں بولا "واہ وا۔ واہ وا"۔ اور اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہنے لگا "آپ نے قدم رنجہ فرمایا، آپ کی نوازش"!

ہُوں جواب دے کر چپکے سے کُرسی پر بیٹھ گیا۔

اِتنے میں سائین بھی آگیا۔ وہ کہنے لگا "خوب، تو تمہارا نانا جان سے تعارف ہوگیا۔ یہ تو برکت کا ایک گراں مایہ خزانہ ہیں، بچوں کا دل ہر وقت ان سے بہلا رہتا ہے۔ یہ کھانے کے اتنے شوقین ہیں کہ کھانے کی ہر چیز پر مرے مٹتے ہیں۔ اگر انہیں اجازت دے دی جائے تو شاید یہ ڈلیاں چٹ کر جائیں۔ تم ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے میٹھی چیزوں کو تو اتنی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ تم سے کیا کہوں۔ تم نے کبھی ان سے زیادہ دلچسپ آدمی نہ دیکھا ہوگا۔ تم ابھی سب کچھ دیکھ لوگے۔"

مجھے نہانے اور لباس تبدیل کرنے کا کمرہ بتایا گیا۔ یہ کھانے کا وقت تھا۔ سیڑھیوں پر سے قدموں کی بہت سی آوازیں سنائی دیں۔ مَیں نے مڑ کر دیکھا۔ تمام بچے جلوس کی شکل میں اپنے باپ کے پیچھے پیچھے آرہے تھے، شاید میری عزت افزائی کے لئے۔

میرے کمرے میں سے گیہوں، جئی اور گھاس کا ایک وسیع و عریض سنسان میدان نظر آرہا تھا، جس میں نہ کوئی درخت تھا نہ ٹیلا۔ یہ زندگی کا نہایت ہی وحشت انگیز نمونہ تھا جو اس سکوت پرور میدان کے پاس اس گھر میں نظر آرہا تھا۔

کھانے کی گھنٹی بجی، میں نیچے آگیا۔

مادام رادیراں نے میرا بازو پُرتکلف انداز میں پکڑا اور ہم دونوں کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک خادم بڑھے کی بازوؤں والی کرسی دھکیلتے ہوئے آرہا تھا۔ جونہی اس کی کرسی میز کے قریب پہنچی، بوڑھے نے، کانپتے ہوئے بڑی مشکل سے گردن موڑ کر ایک للچائی ہوئی مستفسرانہ نگاہ حلوے کی ایک پلیٹ سے دوسری پلیٹ پر ڈالی۔

معاً سائین نہایت خوشی سے تالی بجاتے ہوئے بولا" —— ان کی مضحکہ خیز حرکتیں دیکھ کر ابھی تم بہت خوش ہوگے"۔ جب بچوں نے یہ دیکھا کہ میں بھی حریص بوڑھے کی حرکتوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ان کے ساتھ شامل ہوں تو وہ یکدم کھکھلا کر ہنس پڑے۔ ان کی ماں کے ہونٹوں پر بھی تبسم نمودار ہوگیا۔

سائین نے اپنے ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے بوڑھے سے چلا کر کہا "آج شام تو میٹھے باسی چاول بھی موجود ہیں"۔ بوڑھے کا شکن آلود چہرہ تمتما اُٹھا۔ اور وہ سر سے پاؤں تک زور زور سے جنبش کرنے لگا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سائین کا مطلب سمجھ چکا ہے اور خوشی سے پھُولا نہیں سماتا۔

کھانا شروع ہوگیا۔

سائین نے کہا "دیکھنا ذرا اِدھر"۔

بوڑھا شوربا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے انکار کر دیا۔ مگر صحت کی خاطر اسے شوربا پینے پر مجبور کیا جارہا تھا۔ خادم نے زبردستی اس کے مُنہ میں چمچہ بھر شوربا ٹھونس ہی دیا۔ اس نے اسے زور سے باہر اُگل دیا۔ تمام شوربا فوارے کی طرح اس کے مُنہ

سے پھوٹ نکلا۔ اور اس کی چھینٹیں ہم سب پر اور میز پر جا پڑیں۔

بچوں کی ہنستے ہنستے چیخیں نکل رہی تھیں۔ ان کا باپ بھی بے حد خوش ہؤا اور کہنے لگا " نانا جان کتنے دلچسپ ہیں۔ نہیں نا؟"

کھانے کے دوران میں نانا جان ہی پر سارے کُنبے کی توجہ رہی۔ بڈھے کی نظریں میز کی پلیٹوں پر اس طرح جمی تھیں، جیسے وہ بھی ان سب کو نگل جائے گا اور اس کے زور زور سے کانپتے ہوئے ہاتھ انہیں اُچک لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ کبھی وہ اس کے بالکل قریب ہی رکھ دی جاتی تھیں۔ تاکہ تمام اس کی جاں توڑ کوشش، اس کی ضعیف گرفت اور اس کی صبر آزما خواہش سے جو اس کے روئیں روئیں سے ٹپک رہی تھی لطف اُٹھائیں اور اس کی حریص آنکھوں، اس کے حریص منہ اور اس کی حریص ناک کا جو انہیں سُونگھ ہی تھی، تماشا دیکھیں۔ اس کے مُنہ میں پانی بھر آیا اور جب وہ بے معنی لفظ مُنہ سے نکالتا تھا تو سارا پانی تولیے پر گر پڑتا تھا تمام کُنبہ اس مضحکہ انگیز کریہہ منظر کو دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔

وہ اس کی پلیٹ میں ایک چھوٹا سا ٹکڑا رکھ دیتے، اور وہ دوسرے کی امید میں اسے کانپتے ہوئے جلدی سے کھا جاتا۔

جب میٹھے چاول آئے تو وہ بالکل دیوانہ سا ہو گیا۔ اور فرطِ اشتیاق سے کراہنے لگا۔

گنتراں نے بلند آواز سے کہا " آپ بہت کچھ کھا چکے ہیں۔ اب آپ کو کچھ نہیں مل سکتا"

یہ سُن کر بوڑھا پھر چلّانے لگا۔ چلّاتے وقت وہ زور سے کانپنے لگتا۔ تمام بچوں نے ہنس ہنس کر اُدھم مچا رکھا تھا۔

آخر کار اس کا حصّہ، جو بہت تھوڑا سا تھا، اسے دے دیا گیا۔ جونہی اس نے چاولوں کا ایک لقمہ مُنہ میں ڈالا۔ اس نے حلق سے بلانوشوں کی طرح ایک نہایت دلچسپ آواز نکالی۔ اس کی گردن یوں حرکت کر رہی تھی جس طرح بطخ بڑا سا لقمہ نگلتے وقت گردن کو جلدی سے اوپر نیچے کرتی ہے۔

جب اس نے وہ کھا لیا تو اور مانگنے کے لئے زمین پر پاؤں مارنے لگا۔

بُڑھے کی دردانگیز حالت کو دیکھ کر میرا دل رحم سے بھر گیا اور میں نے اپنے دوست سے اسی کا واسطہ دے کر کہا " انہیں تھوڑے سے چاول اور دے دو"۔

سائمن نے جواب دیا " نہیں نہیں۔ اگر یہ اُس عمر میں زیادہ کھا لیں گے، تو ان کی صحت خراب ہو جائے گی"۔

میں چُپ چاپ بیٹھا غور کرتا رہا۔ . . . . اس عمر میں، اس کے لئے صرف ایک ہی خوشی باقی ہے اور صحت کا بہانہ کر کے اُنہوں نے وہ بھی چھین لی ہے . . . صحت! پوست و استخواں کے اس پنجر کو صحت کی اب کیا ضرورت ہے؟ کیا یہ لوگ اس کی زندگی کے دنوں کو بڑھانے کی فکریں ہیں؟ ہاں اس کی زندگی کو آخر اسے کتنے دن جینا ہے؟ دس، بیس، پچاس یا سو دن! یہ کیوں؟ کیا اپنی ذات کی خاطر؟ یا اپنی ناکام حرص کے مظاہرے سے دوسروں کے پیہم لطف اندوز ہوتے رہنے

کے لئے؛ اسے دراصل اس زندگی سے اب کوئی سروکار نہیں ——— اس کے دل میں اب صرف ایک ہی تمنا، ایک ہی خوشی باقی رہ گئی ہے، توکیوں نہ اسے پوری طرح اس آخری خواہش کی تکمیل سے حظ اُٹھانے کا موقع دیا جائے، یہاں تک کہ موت اس کا رشتۂ حیات منقطع کردے!

دیر تک تاش کھیلنے کے بعد، میں اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلا گیا۔ میں اس وقت بے حد غمگین ہو رہا تھا۔

میں کھڑکی کے قریب کھڑا ہوگیا۔ باہر ہُو کا عالم تھا، صرف پاس کے درخت پر بیٹھے ہوئے ایک پرندکی کمزور، صاف اور شیریں چوں چوں کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ شاید یہ ایک دلکش لوری تھی، جو وہ رات بھر انڈوں پر بیٹھا، اپنے ساتھی کو سُنا رہا تھا۔

میں اپنے دُنیادار دوست کے پانچ بچّوں کے متعلق سوچتا رہا، جو اس وقت غالباً اپنی بدصُورت بیوی کے پہلو میں خرّاٹے لے رہا تھا۔

(موپساں) ——— طاہر قریشی

خدا دو محبت کرنے والے دلوں کی مسرت میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کرسکتا، سوائے اس کے کہ وہ اُن کو دوام بخش دے محبت کی زندگی کے بعد، محبت کا دوام یقیناً ایک اضافہ ہے لیکن محبت کی اُس شدت میں کسی ناقابلِ بیان لذت کا اضافہ جو محبت روح کو عطا کرچکتی ہے، خدا کے لئے بھی ناممکن ہے، خدا معموری ہے کائنات کی اور محبت معموری ہے انسان کی۔

عاشق و معشوق تکلیفِ جدائی کو ہزاروں طریقوں سے فریب دیتے ہیں۔ یوں بظاہر وہ نہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں نہ پیغام بھیج سکتے ہیں۔ لیکن خط وکتابت کے لئے وہ بے شمار مخفی ذرائع رکھتے ہیں۔ وہ حکم دیتے ہیں پرندوں کے نغموں کو، پھولوں کی نکہت کو، بچوں کی ہنسی کو، سُورج کی روشنی کو، ہوا کی آہوں کو، ستاروں کی شعاعوں کو، تمام کائنات کو، اور کیوں نہ حکم دیں؛ ——— خدا نے ساری کائنات محبت ہی کی خدمت کے لئے پیدا کی ہے۔ محبت میں اتنی قدرت ہے کہ وہ کائنات کے ہر ذرے کو اپنے حکم کی تعمیل پر آمادہ کرسکتی ہے۔

اے بہار! تو ایک خط ہے جو میں اُسے لکھتا ہوں

وکٹر ہیوگو

فرانسیسی شاعری اور رومانوی تحریک

انقلاب فرانس ایک بم تھا جس کی تیاری میں ہر آزاد مفکر و ادیب نے ہاتھ بٹایا۔ لیکن جب یہ پھٹا تو اپنے ساتھ اپنے بنانے والوں کو بھی لے اُڑا۔

دھواں غائب ہؤا تو معلوم ہؤا کہ قدیم عہدِ حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے لوگوں کے دل ایک عظیم الشان ردِ عمل سے دوچار ہو رہے ہیں اور آخری دو صدیوں کی روایات کو نہایت شدت سے تباہ و برباد کر دیا گیا ہے! یوں معلوم ہوتا تھا کہ ادب کی بنیاد از سرِ نو ڈالی جائے گی۔

اگر آپ ذرا غور سے فرانسیسی ادب کا مطالعہ کریں تو آپ کو دو جذبے کارفرما نظر آئیں گے یا یوں کہئے کہ دو نہریں اس چمنستان کو سیراب کرتی نظر آئیں گی، جن کے طفیل فرانسیسی زبان شاہکاروں سے مملو ہے۔ ایک طرف تو ان تھک شوقِ جستجو ہے جس کی وجہ سے فرانسیسی نثر مخصوص امتیاز لئے ہوئے ہے اور یہ اس قوم کی قوتِ تنقید پر دال ہے۔ اسی نے "حقیقت پسندی" کی تخلیق کی (عریاں حقیقت کو صاف الفاظ میں صحت کے ساتھ بیان کر دینے کا نام "حقیقت پسندی" ہے)۔ دوسری طرف پہلے سے قطعی متضاد وہ جذبہ ہے جسے آپ "لسانیت" کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ اس زبان کی جھلک جو نہایت خوش مذاقی سے مرتب کی گئی ہو آپ کو Rabelais ربے لے کے طوفانی فقرات میں Bosseut باسوائے کی پرشوکت تحریرات میں اور کارنیہ کی Tirades میں نظر آئے گی!

سترھویں صدی کے استادانِ زبان پاسکال Pascal راسین Racine، لافونٹن La Fountaine اور لا-برویر La-Bruyere نے ان دونوں جذبات کو متحد کر کے زبان کو اک مکمل توازن بخش دیا۔ انہوں نے اپنی تصنیفات میں ٹھوس حقیقتوں کو حسین و جمیل زبان سے مرصع کر دیا ہے اور تنقیدی نظر کو کام میں لا کر مبالغہ آرائی سے پرہیز کیا ہے۔

جب اٹھارھویں صدی کا آغاز ہؤا تو زبان کی دُنیا میں ایک تغیر رونما ہؤا۔ لسانیت کو بڑی حد تک خیرباد کہہ دی گئی تھی۔ اس لئے اب آپ پائیں تو اسے خشک اور بے روح نثر میں زندگی کے آخری سانس لیتے ہوئے پائیں گے یا کبھی المیہ داستانِ عشق میں۔ والٹیر کا اسلوب بیان اپنے عہد کی خصوصیات کا آئینہ دار ہے۔ درخشاں مگر بے رنگ، محدود مگر نہایت معقول۔ رومانوی تحریک حقیقت پسندی کے خلاف پُر زور طور پر صدائے احتجاج بلند کر رہی تھی۔ تحریک نو کا دھندلا سا اثر دیدرو Diderot کی شوخ رنگ تحریرات میں

ر روشو Rousseau کے خطابی انداز میں صاف صاف جھلک رہا تھا۔ شیتوبری آں Chetaau Briand کی نثر نہایت بلند آہنگی سے رومانوی تحریک کا اعلان کر رہی تھی۔ اس سے انکار نہیں کہ وہ بھی بدل لسانیت کا خواہاں تھا مگر اس نے اس لفظ کے معانی کو ست وسعت دے رکھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے دل کی ساخت ہی لسانیت پسند تھی۔ اس کی تحریک کے وہ تین مقاصد جنہوں نے اسے زبان کے بہترین نمونے پیش کرنے کی توفیق دی اس کی اپنی ذات، فطرت اور عیسائیت تھی۔ عیسائیت کے متعلق اس کا ظریہ اٹھارھویں صدی کے نظریے کا بالکل عکس تھا۔ جو مذہبی عقاید محض خشک، مدلل اور نرے مذہبی عقاید ہی بن کر رہ گئے تھے ں نے انہیں اپنے زورِ تخیل اور شاعری کی رنگینی سے زندہ کر دیا تھا لیکن اسے والٹیر سے زیادہ مذہبی سمجھنا غلطی ہے جن نظریات ا نتیجہ والٹیر نے اپنے دلائل و براہین کی خشک روشنی میں دیکھا تھا شیتوبری آں نے انہیں اپنی زباں دانی اور قادر الکلامی بں ملبوس کر کے زیادہ جاذب نگاہ بنا دیا تھا۔ اس میں ایک بات کی کسر تھی۔ محرومیِ یقین!۔ اسے خود ستائی کا بہت شوق تھا بائرن طرح اسے اپنی ذات پر بہت حسنِ ظن تھا۔ بلند مرتبت، متین، مغرور، حساس، چاہتا تھا کہ ہر عورت اس کی پرستش کرے اور ہر د اُسے سراہے! پرشوکت مگر غیر حقیقی۔ نہایت نفیس مگر خالی۔ اور یہ سب زباں دانی اور لسانیت کی کرامت ہے لیکن اس سے انکار یں کہ اس کا اثر بہت وسیع ہے۔ اس کی درخشاں دُنیا جہاں وہ حکومت کرتا ہے اس کی تحریرات کی طرح پُرشوکت، رواں دواں، رومانوی اور تخیل انگیز ہے! نظارہائے فطرت اور مقدس و بعید ماضی اس کے ذہنی افکار پر ہر وقت چھائے رہتے ہیں۔ اس کی صنیفات نے مقبولیتِ عامہ حاصل کر لی اور کوئی ایک صدی بعد اُن کا اثر محسوس کیا جانے لگا! اس کے نظریات کو لے مرٹین ہارٹن Lamar نے اپنی نظموں کے ذریعہ سے کافی حد تک تقویت دی ہے! یہاں بھی وہی دلبستگیِ قدرت، مذہبی تصور، اور راہبیت ذات پر ور دیا گیا ہے۔ مگر ان میں شیتوبری آں کی سی رعنائی کہاں؛ زور ہے تو گھٹا گھٹا اور کیف ہے تو کم کم! ہاں شگفتگیِ شعریت اور سوز و گداز نے مرٹین کو فرانسیسی ادب میں حیاتِ جاوید دے دی ہے! اس کے جذبات کی انتہا Le Lac نامی نظم میں بدرجہ اتم موجود ہے! ں کی قوتِ بیان نہایت جوش و خروش سے اس کے جذباتِ عمیق کو سفحۂ قرطاس پر قلمبند کرتی ہے "کبھی وہ اسی جھیل کے کنارے پنی محبوبہ کی معیت میں آیا تھا، مگر آج تنہا اُداس بیچارہ اسی جھیل پر آوارہ ہے" غیر مختتم روانیِ سرود اس کی ہر نظم میں موجود ہے۔ ہمیشہ قائص سے مبرا، شگفتہ اور سُلجھی ہوئی۔

انقلاب کے دوران میں اور نپولین کے زوال کے بعد قوم کی تمام تر قوتیں ایک عرصہ کے لئے جنگ اور سیاست کے مسائل کے حل میں مصروف تھیں۔ پایانِ کار ۱۸۲۰ میں چند نئے ادیبوں کی کوششیں جلوہ گر ہوئیں۔ ان نوجوانوں نے ثابت کر دکھایا کہ فرانسیسی زبان میں ابھی وہ جوہر باقی ہے جو سخت سے سخت اور ٹھوس سے ٹھوس خیال کو بھی نفاست اور لطافت سے رقم کر سکتا ہے یہ تمام نوجوان رشتۂ ادب کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ نوجوان تھے۔ رگوں میں جوانی کا خون لہریں لے رہا

تھا، سرگرم عمل تھے۔ ممکنات مستقبل سے ان کی آنکھیں روشن تھیں۔ فوراً قدیم روایتی ادب کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا ایک نئے نظریۂ خیال سے اپنی ہمتوں کی جولانی کا تعارف کرایا اور سخت جدوجہد اور جوش وخروش کے بعد اپنے نظریے کا لوہا منوالیا۔ جس تغیّر سے انہوں نے اپنے عہد کو روشناس کرایا تھا وہ بذاتِ خود بہت اہم تھا اور اسی وجہ سے ۱۸۳۰ کا سال فرانسیسی ادب میں ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت سے لے کر آج تک فرانسیسی زبان کا ایک ایک فقرہ اور ایک ایک مصرع رومانوی تحریک کی ممنونیت کا نقش لئے ہوئے ہے۔ رومانوی تحریک سے قبل الفاظ پر پُرتکلف اور مصنوّر غلاف چڑھا رہتا تھا۔ یا یوں کہئے کہ روایتی ادب کا جُوا ایک ایک گردن پر نظر آرہا تھا۔ علمبردارانِ تحریک نے گویا نئی بوتلوں میں شراب کہنہ کو ذرا خوشگوار کر کے بھر دیا تھا۔ عمارت قدیم کے ناگوار اثرات کو ضائع کر کے نئے اور گوارا اثرات نمایاں کر دیئے تھے۔ اس تحریک کے فداکاروں نے ثابت کر دیا کہ اصُول کی پابندی کے بغیر بھی "اچھی نظم" کہی جا سکتی ہے۔ خزینۂ الفاظ پر بھی اچھا خاصا اثر پڑا۔ پہلے شاعری کے مخصوص الفاظ کے علاوہ اور لفظ استعمال کرنا گویا گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرنا تھا۔ "بلند" اور "حقیر" لفظ کی تخصیص پر شدت سے بحث ہوتی تھی۔ اور کسی کی کیا مجال جو "حقیر" لفظ کو اپنی شاعری میں اذنِ باریابی دے! اس سے شاعری کا حلقۂ اثر بہت تنگ ہو گیا تھا اور کان بار بار انہی الفاظ کے اعادہ سے گرانی محسوس کرتے تھے۔ اس تحریک کے ہواخواہوں کا بھلا ہو کہ انہوں نے شاعری کے دروازے ہر موزون و معقول لفظ پر چوپٹ کھول دیئے۔ انہیں بہت شدید اور تند رائے عامہ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ تغیّر اور اس کی فتحمندی کتنی دشوار تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ ایک دفعہ ۱۸۳۰ کے کچھ پہلے۔ اوتھیلو کا ڈرامہ سٹیج ہو رہا تھا۔ اور اس میں ایک لفظ Mouchoir موشوار (رومال) کے استعمال نے تھیئٹر ہال میں بلوہ پیدا کر دیا۔ تحریک رومانوی کی ہمّت سے الفاظ کا جو جمِّ غفیر شاعری کی دُنیا میں گھس آیا تھا اس کے دو اثر قابلِ غور ہیں شاعری کا عرصۂ خیال غیر محدود طور پر وسیع ہو گیا۔ فرانسیسی ادب ایک پُرانے سجے سجائے قیانوسی حجلے سے نکل کر کھُلی دنیا اور تازہ ہواؤں میں سانس لینے لگا۔ جو جذبات ابھی تک اچھوت تھے۔ تحریروں میں شدومد کے ساتھ ظاہر ہونے لگے! فرانسیسی نثر جو ابھی تک مکمل طور پر لسانیت کے زیر اثر تھی لیکن جس میں حقیقت پسندی کے جوہر ضرور نہاں تھے۔ رومانوی تحریک پسندوں کا ساتھ دینے لگی۔ یہ مسئلہ اب ایک تنازع کی صُورت اختیار کر گیا۔ اور تھیئٹروں کو اس نے اپنی جولانگاہ بنایا۔ مگر ڈرامہ کی کامرانی اس تحریک کے لئے کچھ قابلِ فخر بات نہیں ہے۔ وکٹر ہیوگو کے Hernani نامی ڈرامے میں صحیح زندگی کے جذبات نہیں ہیں۔ تکلف اور تصنع کا زور کافی عیاں ہے۔ کہنے کو تو وہ کہتا ہے کہ میں نے یہ ڈراما شیکسپیئر سے متاثر ہو کر لکھا ہے لیکن حقیقت میں اس پر والٹیر کی ذہنیت چھائی ہوئی ہے۔ ڈرامے کی ساری فضا جانی بوجھی لسانیت سے معمور ہے۔ رومانوی تحریک کی بدترین صفات وکٹر ہیوگو کے اس ڈرامے میں عیاں کی گئی ہیں۔ وہ واقعی الفاظ کا بادشاہ تھا۔ جوئے الفاظ ضیائے آفتاب کی طرح اس کے دل و دماغ سے بہ رہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ فنی نقطۂ نگاہ سے وہ عظیم الشان ہے۔ تاثیر کا جادو ایک ایک صفحہ میں

کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ وہ کونسا اعجاز ہے جو وکٹر ہیوگو کے زورِ قلم سے علیحدگی اختیار کرسکے۔ وہ تخیلات کے عجیب ترین نقوش آنِ واحد میں کھینچ سکتا ہے۔ ماضی کے رازہائے سربستہ کو اشاروں میں سامنے لاسکتا ہے۔ محبت کی راگنیاں، کرب اور راحت کے جذبات سے بھرپور اس کے سحرِ کلام کی محتاج ہیں۔ قدرت کے شیریں ترین راگ الاپ سکتا ہے۔ انسانی فطرت کی گہرائیوں تک پہنچ جانا اس کا ادنیٰ کام ہے۔ اس کا جادو نگار قلم وہ بحرِ بے پایاں ہے جو ایک زور اور بے پناہ طاقت کے ساتھ آگے کو بڑھتا چلا آتا ہے۔

Vigny وِن یے اگرچہ کثیر التحریر تو نہیں تھا مگر جو کچھ لکھتا ہے خوب لکھتا ہے۔ اور بعض تحریرات تو شاہکار کہلانے کی حقدار ہیں۔ وہ پُرخلوص، متین اور مفکّر تھا۔ اس کی متانت اور قنوطیت میں زندگی کی رمق ضرور باقی ہے۔ اُس کی بعض نظمیں تغافل آشنا فطرت ستم ظریف قسمت اور مسموم محبت کی شکوہ طراز ہیں۔ لیکن آخر کار درسِ تسلیم و رضا کا مبلغ بن کر ایک قابلِ فخر توکّل پر اپنے آپ کو چھوڑ دیتا ہے۔ ایک معتبر گیدڑ کو شکاریوں نے گھیر لیا اور غریب کا خاتمہ کردیا۔ اتنا سا واقعہ شاید اُس کے بلند ترین اشعار کی تخلیق کا باعث ہُوا۔ "مصیبت جھیلو۔ مرجاؤ مگر خاموشی سے"۔ انہی اشعار کا خاتمہ ہے۔ اس کی نثر بھی نہایت زوردار ہے۔ ایک منفرد اندازِ نگارش کی سرمایہ دار۔

Alfred de Musset الفرید دامیوسے وِن یے کے برعکس ہے۔ عاشق مزاج، تند خو، شہوانی، موہنا، بدقسمت اور حزین! اس کی شاعری کیا ہے اپنی ہی زندگی کے واقعات کی داستان!

صرف Fortunio فورتونیو والا گیت ہی اس کو اُستادانِ زبان کی صفِ اول میں کھڑا کرسکتا ہے۔ اس کی نظر انسانی فطرت کے مطالعہ میں کافی کامیاب ہے! اور تاریخی پہلو کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس نے اپنے ڈراموں کو زندہ جاوید کردیا ہے!ــــــ

اس کی تحریک کافی کامیاب ہوئی اور یہ محض اس کی برکت تھی کہ فرانسیسی شاعری ایک طرح از سرِ نو تخلیق ہوئی اور نثر کی دنیا میں بھی انقلاب آگیا! "بڑھے چلو اور تغیّر و تبدّل کیے جاؤ"۔ یہ تھا وہ سبق جو اس تحریک کا راہبر تھا! کوئی ۱۸۵۰ کے قریب اس تحریک کا خاتمہ ہوگیا!

اگر آپ اِن چند سطور کو بامعانِ نظر ملاحظہ فرمائیں تو کیا آپ اُردو کے موجودہ دَور میں اور اس تحریک میں کچھ تطابق محسوس نہ فرمائیں گے؟

(ترجمہ) ــــــــــــ دوست محمد خان

حسین حاسدہ

شہنشاہ نپولین کی مصری یلغار کے زمانے میں ایک فرانسیسی سپاہی عربی بردہ فروشوں کے ہاتھ آگیا اور دریائے نیل کے تپتے ہوئے ریگستان میں پہنچا دیا گیا۔ بردہ فروش مسلح ہو کر حملہ کیا کرتے تھے اور صرف رات کو ڈیرے ڈالتے تھے۔ ان کا مسکن ایک کھجور کے پیڑوں میں گھرا ہوا کنواں تھا جہاں انہوں نے رسد کا سامان پہلے سے بہم پہنچا رکھا تھا۔ ان کے دماغ میں خیال تک بھی نہ آیا تھا کہ ان کا قیدی کبھی بھاگ سکے گا لہذا انہوں نے صرف اس کے ہاتھ پیر باندھنے پر قناعت کی اور خود کھانا کھا کر اور گھوڑوں کو چارا ڈال کر سو گئے۔

جب بہادر قیدی نے اپنے دشمنوں کو بے خبر پایا تو اس نے اپنے دانتوں سے ایک خنجر اٹھایا اور گھٹنوں میں دبا کر ہاتھوں کے تسمے کاٹ دیئے۔ آزادی کی سانس لینے کے بعد اُس نے فوراً ایک بندوق مع گولی بارود کے لی اور کچھ خور و نوش کا سامان لے کر ایک گھوڑے پر سوار ہو کر اُس طرف چل پڑا جدھر اُس کو خیال تھا کہ فرانسیسی فوج کا ڈیرا ہوگا۔ اُس کو پھر ایک مرتبہ فوجی ہنگامہ دیکھنے کے لئے اس قدر بے تابی تھی کہ اس نے تھکے ہوئے گھوڑے کو اتنا تیز کیا کہ مہمیز کی رگڑ سے اُس کی پسلیاں چھل گئیں۔ گھوڑا دفعتہً بیہوش ہو کر گرا اور مر گیا۔ سپاہی جوش آزادی میں تنہا اور پا پیادہ روانہ ہو گیا لیکن اس کو شام ہو جانے کی وجہ سے مجبوراً رُک جانا پڑا۔ مشرقی آسمان کی جھلملاہٹ اور صفائی کے باوجود وہ اس قدر تھک چکا تھا کہ اُس میں آگے جانے کی قوت باقی نہ تھی۔ خوش قسمتی سے اس کو ایک پہاڑی نظر آئی جس پر کچھ کھجور کے درخت اُگے ہوئے معلوم ہوتے تھے یہ دیکھ کر اُس کی جان میں جان آئی۔ اس کی تھکن اس قدر بڑھ چکی تھی کہ ہر قسم کے خوف و خطر سے بے نیاز ہو کر وہ پتھریلی چٹان پر لیٹ گیا۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کی قربانی کر رہا تھا۔ اس کے دل میں صرف ایک خیال تھا اور وہ یہ کہ اس نے ناحق بردہ فروشوں کو چھوڑا جن کی خانہ بدوش زندگی اب اس کے حال پر مسکراتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اب وہ اُن سے بہت دُور بے کسی کے عالم میں تھا۔ مگر پھر وہ بے خبر ہو کر سو گیا۔

اس کی آنکھ سورج کی تپش سے کھلی کیونکہ وہ غلطی سے اس طرف لیٹا تھا جدھر کھجور کے دراز قد درختوں کا سایہ صبح کو نہ پڑتا تھا۔ اُس نے ان درختوں کو دیکھا اور اُن کی شاخوں سے بنے ہوئے تیروں کا خیال آتے ہی اس کو پھریری آگئی۔ اُس نے درختوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ اُس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اس نے دیکھا کہ تاحدِ نظر ریگستان ہی

ریگستان ہے جس کے ذرّے سُورج کی تپش سے بے شمار آئینوں کی طرح جھلمل جھلمل کر رہے ہیں اور آسمان پر سُورج کی روشنی سے ایک غبار آلود سفیدی آگ کے مسلسل شعلے کی صُورت میں دہک رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین و آسمان دونوں ایک ہی شعلے سے پھُونک دیئے گئے ہیں۔

نوجوان سپاہی اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک پیڑ کے تنے سے لپٹ کر رونے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اُس کے سائے میں بیٹھ کر انتہائے غم میں تپتے ہوئے صحرا کے نظارہ پر غور کرنا شروع کیا اور تنہائی کا غم مٹانے کے لئے ایک مرتبہ زور سے چلایا لیکن اس چیخ کی آواز سوائے اس کے دل کے اور کہیں نہ گونج سکی۔

یہ سپاہی بائیس سال کا جوان تھا۔ اس نے اپنی بندوق بھری اور پھر یہ کہہ کر "ابھی کافی وقت ہے" بندوق زمین پر رکھ دی۔ صرف یہی اس کی رفیق تھی جو اس کو نجات دِلا سکتی تھی۔

اس کو نیلا آسمان اور چمکتی ہوئی زمین دیکھ کر فرانس کا خیال آنے لگا۔ اپنے عزیز دوستوں کے چہرے دکھائی دینے لگے اور اور پیرس کے در و دیوار کی بُو اُس کی ناک میں آنے لگی۔ پھر اس کو ایک مرتبہ اپنی موجودہ حالت کا خیال آیا اور وہ اپنے آپ کو تسکین دینے کے لئے پہاڑی کے دوسری طرف گیا۔ یہاں کچھ پھٹے ہوئے کمبل کے ٹکڑوں سے پتہ چلتا تھا کہ یہ جگہ آباد رہ چکی ہے۔ اس نے نگاہ اُٹھا کر درختوں کو دیکھا تو وہ کھجوروں سے لدے ہوئے نظر آئے۔ زندگی کے خیال نے پھر ایک مرتبہ اس کے سینے کو اُمیدوں سے بھر دیا۔ اس نے خیال کیا کہ اس وقت تک رُکوں گا جب تک کہ یہاں سے کچھ عرب گزریں یا توپ کے چلنے کی آواز آئے کیونکہ اس وقت نپولین مصر ہی میں تھا۔

اُس نے تازہ کھجوریں توڑ کر کھائیں اور محسوس کیا کہ زندگی کی ایک لہر اس کے بدن میں دَوڑ گئی ہے۔ اب اس کو خیال آیا کہ شاید چشمے پر رات کو وحشی جانور پانی پینے آتے ہوں لہذا اپنے آپ کو محفوظ کر لینا چاہیئے چنانچہ اس نے چند لکڑیاں جمع کر کے ایک رُکاوٹ سی قائم کر لی۔ کھجور کے پتے جوڑ کر اپنے سونے کے لئے ایک چٹائی تیار کی اور تھکا ماندہ اس جھونپڑے میں لیٹ کر سو گیا۔

آدھی رات کے وقت اس کی آنکھ کسی غیر انسانی آواز کی وجہ سے کھلی۔ اس نے اندھیرے میں اُٹھ کر دیکھنا شروع کیا اور معلوم کیا کہ دو چھوٹی چھوٹی روشن چیزیں اس کے سامنے رقص کر رہی ہیں۔ پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ شاید اپنی آنکھوں کا عکس اُس کو دکھائی دے رہا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کو معلوم ہُوا کہ یہ کسی جنگلی جانور کی آنکھیں ہیں۔ چیتے، شیر اور گھڑیال کے خیال سے اس کے جسم میں لرزہ آ گیا۔

یہ جانور اُس کے بالکل نزدیک تھا اور اس کی متعفن سانس سپاہی کی ناک میں گھُس رہی تھی۔ اس وقت اس کی حالت

ائی رحم کے قابل تھی، اس لئے کہ اس کے ذہن میں ہر قسم کے وحشی جانوروں کا خیال آرہا تھا اور وہ بے حد بیکسی کے خوف میں
بتا رتھا۔ یکایک چاند افق سے رفتہ رفتہ ابھرا جس نے سپاہی کے سامنے ایک چمکدار خوبصورت چیتے کی کھال نمایاں کردی۔
جنگل کا بادشاہ سپاہی کی طرف مُنہ کیئے ہوئے لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں آہستہ سے کھلیں اور پھر بند ہوگئیں۔ سپاہی کے جسم
رزہ طاری ہوگیا اور طرح طرح کے خیالات کا ایک دریا اُس کے دماغ میں موجیں مارنے لگا۔ ایک دفعہ اس نے سوچا کہ اس کو
ی بندوق سے مار دے مگر پھر اس کو خیال آیا کہ وہ اس قدر نزدیک ہے کہ اگر جاگ اُٹھا تو نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ دو مرتبہ اس نے
ار کے قبضے پر ہاتھ رکھا لیکن دونوں مرتبہ جانور کے جاگ اُٹھنے کے خیال نے اُس کو اس فعل سے روکے رکھا۔ آخر کار اُس نے
وچا کہ اب صبح تک انتظار کرنا چاہئے۔
صبح ہوئی تو شیر کا خوبصورت جسم سپاہی کو واضح طور پر نظر آنے لگا۔ اس کا مُنہ خون سے بھرا ہوا تھا۔ جسم پر گول گول چھلّے
ں کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہے تھے۔ غالباً یہ مادہ تھی۔
بلّی کی یہ بڑی بہن شاہی انداز سے لیٹی ہوئی خراٹے لے رہی تھی۔
کچھ عرصے کے لئے سپاہی کی ہمّت نے اس کو جواب دے دیا۔ لیکن پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ دن کی روشنی میں
ہ کسی قدر دلیری محسوس کرنے لگا۔ اُس نے سوچا کہ اب تک وہ عرب بردہ فروشوں کی بندوقوں کا نشانہ بن چکا ہوتا چنانچہ اپنے
پ کو مردہ خیال کرتے ہوئے وہ شیر کا ہمت سے مقابلہ کرنے کو تیار ہوگیا۔
سُورج کی روشنی کے ساتھ شیرنی نے آنکھیں کھولیں، اُٹھ کر کھڑی ہوئی اور جمائی کے ساتھ انگڑائی لیتے ہوئے سپاہی کی
رف نہایت غور سے دیکھا۔
"بڑی حسین بلّی ہے" سپاہی نے غور کیا "اچھا خوب بن سنور لو تم سے آج ملاقات ہوگی" اور یہ کہتے ہوئے اُس نے
خنجر پر ہاتھ ڈالا۔
شیرنی آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ سپاہی نے بھی اپنی نگاہیں اس پر جمادیں تاکہ اُس پر مسمریزم کا اثر ہوجائے وہ اس قدر نزدیک
آگئی کہ سپاہی نے ہمت کرکے اپنا ہاتھ اس کے سر سے دُم تک پھیرا۔ دو تین مرتبہ ہاتھ پھیرنے سے اس نے اپنی دُم محبت اور
انس سے پلی ہوئی بلّی کی طرح اُٹھالی۔ سپاہی نے بار بار اس کے اُوپر ہاتھ پھیرنا شروع کیا اور محسوس کیا کہ شیرنی کو بھی لُطف
آرہا ہے۔ پھر وہ ایک مرتبہ اس کو کھڑا چھوڑ کر باہر نکل گیا اور پہاڑی کی دوسری طرف چل دیا۔ تھوڑی دیر میں نہایت آہستگی
سے جیسے ابابیل ہوا میں تیر رہی ہو شیرنی سپاہی کے پاس آگئی اور اس کی ٹانگوں سے اپنا جسم رگڑنے لگی۔ سپاہی نے اس
کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا کہ اس کو خنجر سے ہلاک کردینا چاہئے مگر اُس کے سر کی سختی نے معاملہ ذرا ٹیڑھا کردیا۔

پھر اس نے سوچا کہ اس کی گردن میں خنجر بھونک دے لیکن شیرنی نے اپنا سر اس کے قدموں پر رکھ کر اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیا جس سے وہ مسحور ہوگیا اور پھر اطمینان سے کھجوریں کھانے لگا۔ کھجور کی گٹھلی پھینکتے وقت اس نے دیکھا کہ وہ ابھی پوری طرح اس پر اعتماد نہیں رکھتی اور ہر بار جھجکتی ہے۔

شیرنی نے ایک دفعہ سپاہی کو اُوپر سے نیچے تک جانچا اور جب وہ کھجوریں کھانا ختم کر چکا تو اس کا بُوٹ چاٹنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد بُوٹ گرد و غُبار سے بالکل صاف ہوگیا۔

سپاہی سمجھا کہ یہ جنگل کی شہزادی اس وقت چونکہ پیٹ بھر چکی ہے اس لئے خاموش ہے لیکن جب بھُوک ہوگی تو مجھے نہ چھوڑے گی۔ شیرنی قدآور اور قوی تھی۔ سپاہی نے خیال کیا کہ وہ اگر ادھر اُدھر ہٹ جائے تو بہتر ہو تاکہ اس کے جی سے میرا خیال نکل جائے۔ اب اس نے غور کیا تو دیکھا کہ اس کے مرے ہوئے گھوڑے کی لاش تالاب کے قریب پڑی ہے، اور آدھی سے زیادہ کھائی جا چکی ہے، اُس کا دِل دہل گیا اور اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔ شیرنی نے دراصل اس کے گھوڑے کو کھایا تھا۔ اب اس نے سوچا کہ اس سے بھاگنا ناممکن اور بیکار ہے۔ لہذا اُسے مانوس بنانے اور محبت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ اسی طرح شاید نجات مل سکے۔

وہ لوٹ کر آیا اور شیرنی سے کھیلنے لگا۔ شیرنی بھی انس ظاہر کرنے لگی۔ سپاہی نے اُس کے کان کھینچ کر اُسے پیٹھ پر لِٹا دیا اور جسم پر ہاتھ پھیرا لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔

اس پر سپاہی کو اپنے عہدِ رفتہ کا خیال آیا۔ اُس نے اپنی پُرانی معشوقہ کے متعلق سوچا کہ وہ کس قدر حسد اور غصّہ سے بھری ہوئی تھی۔ اور یہ کہ ایک مرتبہ اُس نے اس کو خنجر دکھا کر یہ کہا تھا کہ اگر تم عہد شکن اور بے مروّت ثابت ہوئے تو میں اس سے کام لوں گی۔ اس کو اس خنجر کا ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔ اس نے اس کا نام پیار سے "حسین حاسدہ" رکھ دیا تھا اب وہ اسی نام سے شیرنی کو پکارتا تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگتی۔

اس نے شیرنی کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا "پیاری حسین حاسدہ، تم موت اور زندگی میں میری شریک ہو، دیکھو بے وفائی نہ کرنا"

اب اُسے معلوم ہونے لگا کہ جنگل آباد ہے۔ اگرچہ سپاہی رات کو کافی حفاظت کر کے سونا چاہتا تھا لیکن وہ رات آرام سے کاٹتا۔ جب وہ صبح اُٹھتا تو شیرنی وہاں نہ ہوتی تھی۔ وہ پہاڑی پر جاتا جہاں سے وہ کُودتی ہوئی اُس کے پاس آجاتی۔ اس کے مُنہ میں شکار کا خُون لگا ہوتا تھا۔

انسان کی قوتِ تخیل بہت زبردست ہے۔ جب سپاہی کو یقین ہوگیا کہ اب میں خطرے سے باہر ہوں تو اس نے

خیالوں میں محو رہنا شروع کر دیا وہ ریگستان کی چمکتی ہوئی ریتلی زمین اور رات کے جگمگاتے ہوئے آسمان کو شاعرانہ نگاہ سے دیکھنے لگا مگر جب اس سے بھی کام نہ چلا کیونکہ انسان کی فطرت میں محبت کرنا ہے تو اُس نے شیرنی سے ایک عجیب قسم کی محبت شروع کر دی۔ اور اُس کا بیشتر وقت اس سے کھیلنے میں گزرنے لگا۔ ایک دن یوں ہؤا کہ وہ شیرنی کے ساتھ بیٹھا کھیل رہا تھا کہ آسمان پر ایک بہت بڑا عقاب ہوا میں تیرتا ہؤا نظر آیا۔ سپاہی نے دُور تک اس کا اپنی نگاہوں سے پیچھا کیا۔ یکایک شیرنی کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی۔ سپاہی اور شیرنی نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیر تک دیکھا۔ سپاہی نے اپنا ہاتھ اپنی محبوبہ کے سر پر پھیرا۔ نہ معلوم کیا چیز تھی جس نے شیرنی کے جذبات کو ٹھیس لگائی اور اس نے اپنے خوفناک دانتوں سے سپاہی کا پیر پکڑ لیا لیکن نہایت نرمی سے۔ سپاہی نے خیال کیا کہ اب یہ مجھے ضرور کھا جائے گی۔ یہ خیال کرتے ہی اُس نے اپنا خنجر نکال کر اس کے گلے میں پوری قوت سے گھونپ دیا۔ شیرنی کے دل کے عمیق ترین حصّہ سے ایک درد انگیز آواز نکلی اور وہ سپاہی کو محبت بھری آنکھوں سے دیکھتی ہوئی جسم و روح کے تعلق سے آزاد ہو گئی۔

شیرنی کی آخری چیخ کے بعد بیابان کی خاموش فضا نے سپاہی کو زار و قطار روتے ہوئے دیکھا۔

(بالزک)

ابن الاسلام زبیری

کیسی مغموم ہے وہ روح جو غمزدۂ محبت نہ ہو

کسی ایسی ہستی کا نہ پایا جانا، کہ صرف اسی سے خلائے عالم پُر کیا جا سکتا ہو، کیسا اُداس منظر ہے۔ کس قدر درست ہے یہ خیال کہ محبوب ہو جانا گویا خدا ہو جانا ہے، ایک شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ خدا محبوب پر رشک کرتا ہے، اگر یہ یقین نہ ہوتا کہ ساری کائنات صرف رُوح کے لئے پیدا کی گئی ہے اور رُوح صرف محبت کے لئے۔

زیرِ نقاب ایک ہلکا سا تبسم روح کو ایوانِ خواب میں داخل کرنے کا ایک راستہ ہے۔

خدا دنیا کی ہر شے میں موجود ہے مگر وہ اُسے چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ موجودات تاریک ہے لیکن کسی سے محبت کر لینا اُسے روشن کر دینا ہے۔

(وکٹر ہیوگو)

موپساں اور ٹالسٹائی کا نظریۂ فنونِ لطیفہ

گائی دا موپساں، فرانسیسی شاعر و افسانہ نگار ۵ اگست ۱۸۵۰ء کو پیدا ہوا۔ اُس کا دادا ایک متمول زمیندار تھا جس نے اپنی موت پر اپنے لڑکے یعنی موپساں کے باپ کے لئے کافی جائداد چھوڑی۔

موپساں نے روئن لیس کی درسگاہ میں تعلیم حاصل کی۔ وہ ابھی فلسفے کی تعلیم ہی حاصل کر رہا تھا کہ اُس نے اپنی پہلی کتاب اشعار کے ایک مجموعے کی صُورت میں شائع کی۔

ایامِ جوانی میں موپساں ادبی گفتگوؤں میں بہت کم حصہ لیا کرتا تھا۔ اگرچہ اُس کے ملنے والے طرگنیف، الفونسو دادے اور زولا ایسے بلند پایہ ادیب و انشا پرداز تھے مگر یہ ملاقاتیں غالباً ادبی مشاغل کے سلسلے میں نہ تھیں اس لئے کہ اِن ادبا کی نظر میں موپساں اس وقت صرف ایک کھلاڑی کی حیثیت رکھتا تھا۔

ایک دوسرے مجموعۂ اشعار کی اشاعت کے کچھ سال بعد اُس نے ایک اخبار میں اپنے افسانے چھپوانے شروع کئے۔ اُس کے پہلے افسانے (*Boule de Suif*) نے ادبی دُنیا پر یہ ظاہر کر دیا ہے کہ وہ واقعی ایک کامیاب افسانہ نگار ہے اور اُس میں اس صنف سے متعلق تمام صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس افسانے کے طبع ہونے پر عوام کے علاوہ اُس کے ہم عصر انشا پردازوں کے تعجب کی بھی کوئی انتہا نہ رہی جب اُنہوں نے اُن کاغذ کے چند پُرزوں پر کسی پختہ افسانہ نگار کے معجز نما افکار جلوہ گر پائے۔ —— چند اور افسانوں کی اشاعت نے فرانس کے ہر اُس ادبی حلقے کو جو مصنّف کے انتخابِ مضمون سے متنفر تھا یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ موپساں واقعی اپنے فن کا بہترین ماہر ہے۔

موپساں شاید اپنے وقت کا بہترین مختصر افسانہ نویس ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اُس کا پہلا افسانہ *La Boule de Suif* فن کے لحاظ سے لاثانی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پیشِ نظر ایسی کوئی مثال نہیں ہے کہ کسی مصنّف نے اپنی ادبی سرگرمیوں کی ابتدا ایک فقید المثال شاہکار سے کی ہو —— یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ خود موپساں کی تصانیف میں ایسا کوئی افسانہ موجود نہیں ہے جو اس پہلی کاوش کا مدِ مقابل ٹھیرایا جا سکے۔

موپساں کی ادبی زندگی صرف دس سال کے قلیل عرصے تک جاری رہی۔ اس عرصے میں اُس نے بے شمار افسانے اور نصف درجن ناول سپردِ قلم کئے جو ادبی دُنیا میں کافی بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔

موپساں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اُس نے اپنی تصانیف میں (Naturalism) کو تباہ کر دیا ہے اس لئے کہ وہ اسے (حقیقت نگاری) کی آخری حد تک لے جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ موپساں نے کبھی موجد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ وہ صرف انسان کی زندگی کو بعینہٖ اُسی طرح بیان کرتا تھا جیسی اُس کی آنکھیں دیکھا کرتی تھیں یہ دوسری بات ہے کہ دُنیا کے لوگوں کے نزدیک اس کے مشاہدے کے نتائج بعض اوقات ناگوار ہوتے ہیں۔

بعض حضرات موپساں کو اس فن کے لحاظ سے رُوسی افسانہ نگار اُنطون چیخوف کا ثانی قرار دیتے ہیں ـــــ یہ ایک عظیم غلطی ہے۔ ان دونوں افسانہ نویسوں کے عمیق مطالعہ کے بعد یہ امر روشن ہو جاتا ہے کہ اُن کی نفسیات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ موپساں کی نظر انسان میں حیوانی جذبات دیکھتی ہے اور چیخوف انسانیت کے عمیق ترین گڑھوں میں محبت اور اُمید کی تلاش کرتا ہے۔

بیشک چیخوف بھی موپساں کی طرح ایک مصور تھا اور اُس نے ہمارے سامنے وہی پیش کیا جس کا اُس نے اپنے گرد و پیش مطالعہ کیا مگر ایسا کرتے وقت وہ ہمیشہ اُس زندہ چنگاری کی جستجو کیا کرتا تھا جو سرشتِ انسانی میں نہاں ہے ـــــ یہی وہ فرق ہے جو ان افسانہ نگاروں کے بظاہر یکساں فن میں پوشیدہ ہے۔

موپساں بھی اپنے اُستاد ہی کی طرح ایک بڑا اہلِ طرز (Stylist) ہے۔ اُس کی تصانیف کے مطالعے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت موزوں لفظ کی جستجو میں رہتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اُس نے ہر مقام پر غیر ضروری الفاظ سے اجتناب کیا ہے۔ موپساں کے آرٹ کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ نیکی کو بدی پر ترجیح نہیں دیتا، نہ وہ ایک کردار کو دوسرے کردار پر برتری بخشتا ہے، اور نہ وہ اپنی حکایت بیان کرتے وقت درمیان میں ٹھہر کر زندگی کے معانی پر بحث کرنا شروع کرتا ہے ـــــ دراصل اُس کا مقصدِ وحید اپنے مشاہدات بیان کرنا ہے۔ اُس کی طرزِ نگارش بہت سادہ مگر پُر معنی ہے۔ وہ پھیکے سے پھیکا لفظ بھی استعمال میں لے آئے گا اگر وہ اُس کی تصویر میں صحیح نقش کا کام دے سکتا ہے۔

موپساں کی آخری تصانیف میں یک لخت ایک غیر معمولی تغیر رُونما ہوا۔ یعنی اُس کے افکار میں پُر از الم زندگی سے جذبۂ ہمدردی کا اظہار جھلک دکھانے لگا۔ یہ ہمدردی ہمیں اُس کے اکثر افسانوں میں بھی نظر آتی ہے جو اُس نے ۱۸۹۰ء میں قلمبند کئے۔ (La Vie Errante) کی اشاعت کے بعد جو سیاحت سے متعلقہ تحریروں پر مشتمل ہے موپساں کی ادبی سرگرمیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ادب سے کنارہ کش ہو کر وہ مذہب میں دلچسپی لینے لگا۔ مگر اس عرصے تک اس کے اعصاب، شراب کی کثرتِ استعمال اور جسمانی بے اعتدالیوں کی وجہ سے بالکل خراب ہو چکے تھے۔ چنانچہ تھوڑے عرصے کے بعد ہی وہ فالج ایسے مہلک مرض کا شکار ہوا۔ اس مرض کی غیر معمولی تکلیف سے تنگ آ کر اُس نے جنوری ۱۸۹۲ء میں خودکشی کا اقدام کیا مگر بچ گیا۔ آخر وہ ۶ جولائی ۱۸۹۳ء

کو پیرس میں اس جہاں سے رخصت ہوگیا ——— کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے آخری ایام بہت تکلیف میں گذارے۔

موپساں، انگریزی افسانہ نگاروں ایڈگر ایلن پو اور او ہنری کی طرح مختصر نویسی کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ موپساں کا درجہ ان باکمال افسانہ نگاروں سے بھی بلند ہے۔ یہ فوقیت اُسے اپنے انتخاب مضامین کے وسیع تنوع کی وجہ سے حاصل ہے ——— موپساں نے "مافوق الفطرت افسانہ نگاری" کی مشکل صنف میں بھی ایلن پو کی طرح نہایت کامیابی سے طبع آزمائی کی ہے۔

اگر موپساں کچھ دیر اور زندہ رہتا تو یقین تھا کہ وہ اپنی موجودہ تصانیف سے کہیں زیادہ اہم تحریریں چھوڑتا کیونکہ آخری ایام میں وہ اپنے نظریے کو بالکل بدل چکا تھا! بہرحال ادب سے دلچسپی لینے والے حضرات اب بھی اِس جواں فکر افسانہ نویس کی ادبی خدمات کے معترف ہیں

روس کے شہرہ آفاق انشا پرداز و تمثیل نگار کاؤنٹ لیو طالسطائی نے موپساں کے افسانوں کے روسی تراجم کا تعارف لکھا ہے جس میں اس روسی مفکر نے موپساں کی تحریروں پر ایک عالمانہ تنقید کی ہے۔ اس تعارف کے چند اقتباسات نقل کرنے سے پیشتر ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ طالسطائی کے مشہور نظریۂ صنعت کے متعلق کچھ بیان کیا جائے۔

طالسطائی کی نظر میں صرف وہی دماغی تخلیق آرٹ ہو سکتی ہے جو متعدی (Infectious) ہو یعنی وہ اپنے خالق کے احساسات دوسرے دماغ پر منتقل کر سکے۔ اس طرح وہ ہر اُس پارۂ صنعت کو آرٹ تسلیم کرنے سے یکسر منکر ہے جو ناقابل فہم ہو۔ ہم یہاں خود طالسطائی کے الفاظ درج کرتے ہیں:-

"اپنے احساسات کو کسی دوسرے شخص کے دل و دماغ میں، حرکات، نقوش، آواز کے زیروبم، الفاظ یا رنگوں کے ذریعے سے اس طرح پیدا کرنا کہ اُس پر وہی حالت طاری ہو ——— یہ ہے آرٹ کی خاصیت۔"

"آرٹ یہ ہے کہ کوئی شخص ارادۃً بیرونی اشارات کے ذریعے سے اپنے احساسات دوسرے دماغ پر نہایت کامیابی سے منتقل کرے اور معمول عامل کے اُن احساسات سے پوری طرح متاثر ہو۔"

طالسطائی آرٹ کو حُسن کاری، خوبصورت اشیا کا پیدا کرنا، ایک کھیل یا ذریعۂ مسرت نہیں مانتا۔ وہ آرٹ کو ایک ذریعۂ اتحاد کہتا ہے جو انسان کو انسان کے ساتھ احساسات کی ایک ہی لڑی میں منسلک کردے ——— ارسطو، افلاطون، سقراط اور دیگر حکمائے یونان کا بھی کسی حد تک آرٹ کے متعلق یہی نظریہ رہا ہے۔ مگر وہ اِسے صرف مذہبی تعلیم کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔

طرگنیف[1]، طالسطائی کو موپساں کے افسانوں کا ایک مجموعہ دے کر اُس سے سفارش کرتا ہے کہ وہ اُس نوجوان فرانسیسی افسانہ نگار کے افکار کا ضرور مطالعہ کرے۔ اس کے علاوہ طرگنیف، طالسطائی کو موپساں کے متعلق چند ایسی باتیں بھی کہتا ہے جو اُس کے لئے

---

[1] طالسطائی کا ایک ہم عصر افسانہ نگار

ہت تعجب خیز ہوتی ہیں۔

طالسطائی تعارف میں لکھتا ہے :-

"چونکہ میں اُس زمانے میں جب طرگنیف نے مجھ سے موپساں کی ایک تصنیف کا مطالعہ کرنے کے لئے کہا اپنا نظریۂ حیات[1] بالکل تبدیل کر رہا تھا اس لئے میرے لئے ایسی کتابوں کا مطالعہ کرنا جن کے متعلق خود طرگنیف کے الفاظ بہت عجیب سے تھے، بہت مشکل تھا مگر چونکہ مجھے طرگنیف کو ناراض کرنا مقصود نہ تھا اس لئے میں نے اُس کتاب کا بغور مطالعہ کیا۔

اس مجموعے کی پہلی کہانی (La Maison Tellier) کا نفسِ مضمون فی الواقع بہت عامیانہ اور بازاری تھا مگر اس کے باوجود میں مصنف کی قابلیت کا معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ واقعی ایک قدرتی عطیے کا جسے ہم قابلیت کے نام سے پکارتے ہیں، مالک تھا۔ مگر بدقسمتی سے میں اس قابلیت میں وہ امر جو اُن تین اصولوں میں (جو آرٹ کے لئے لازم و ملزوم ہیں) سب سے زیادہ اہم ہے، نہ پا سکا۔

(۱) ایک صحیح یعنی اخلاقی رشتہ مصنف کا اپنے مضمون کے ساتھ (۲) اظہار کی وضاحت یا حُسنِ تشکیل (۳) خلوص، یعنی اپنے مضمون سے صناع کا پُورا اخلاص۔

ان تین چیزوں میں سے موپساں صرف آخری دو کا بڑی حد تک مالک ہے مگر اُس کے افکار میں سب سے ضروری امر کا فقدان ہے یعنی اُس کا رشتہ اپنے انتخاب کردہ مضامین کے ساتھ اخلاقی طور پر بالکل غیر درست ہے۔

میں اُس کی کتاب کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ اپنے مشاہدات کو جو دوسرے لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں بیان کرنے کی پُوری اہلیت رکھتا ہے، وہ ایک خوبصورت طرزِ نگارش کا مالک ہے، جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا بہت وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ اُس کے افکار میں وہ تعدیہ (Infection) بدرجہ اتم موجود ہے جس کے بغیر آرٹ، آرٹ نہیں ہو سکتا۔ مگر ان امُور کے باوجود بدقسمتی سے وہ اُس ضروری عنصر سے بالکل محروم ہے جس کے بغیر آرٹ ہرگز بلند مرتبہ نہیں ہو سکتا۔ یعنی اُس کی تحریروں میں اخلاقی رشتہ بالکل مفقود تھا ——— دیگر الفاظ میں وہ نیکی اور بدی میں تمیز کرنے سے قاصر ہے۔ وہ اُن باتوں کو بیان کرنا پسند کرتا ہے جو اُسے پسند نہ کرنی چاہیئے تھیں اور نہ اُن کے بیان کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے تھی۔

چنانچہ بدقسمتی سے مصنف نے اس زیرِ نظر کتاب میں بڑے شوق و محبت سے بیان کیا ہے کہ کس طرح عورتیں مردوں کو دامِ گناہ میں گرفتار کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور کس طرح مرد عورتوں کو اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے رغبت دلاتے ہیں اور وہ ملک کے

---

[1] طالسطائی نے اُس وقت آرٹ کی سرگرمیوں سے بالکل علیحدہ ہو جانے کا اعلان کر دیا تھا ——— دیکھو (Contemporary Russian Literature) از پرنس ڈی ایس مرسکی۔

مزدور پیشہ لوگوں کو نہ صرف حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے بلکہ اُن کو حیوانوں سے بدتر پیش کرتا ہے۔

زندگی کے صحیح نظریے کا فقدان، مزدور پیشہ لوگوں کی دلچسپیوں سے تغافل اور اُن کی بھدی تصویرکشی، وہ بڑا بھاری نقص ہے جو فرانس کے اکثر انشا پردازوں کے افکار میں موجود ہے۔ اُن میں موپساں بھی شامل ہے جو نہ صرف پیش نظر افسانوں میں بلکہ ہر اس مقام پر جہاں وہ عوام کے متعلق کچھ تحریر کرتا ہے، ان لوگوں کو ہمیشہ وحشی اور بھدے حیوان دکھاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرانسیسی مصنف اپنی قوم کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں مگر اس حقیقت کے باوجود کہ مجھے فرانسیسی کاشتکاروں کے درمیان بود و باش کا موقع نہیں ملا میں یہ ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا کہ وہ لوگ واقعی ایسے کاروکردار کے مالک ہیں جیسا کہ یہ مصنف ہمیں بتاتے ہیں۔

اگر فرانس جس نے اتنی نامور شخصیتیں پیدا کی ہیں جس نے آرٹ، ادب، سائنس اور انسان کی اخلاقی ترقی کے لئے اتنی خدمات انجام دی ہیں۔ اب بھی وہی فرانس ہے تو وہ مزدوری پیشہ جماعت جس کے کاندھوں پر فرانس قائم رہا ہے کبھی وحشی اور حیوان اور روحانیت سے عاری نہیں ہو سکتی چنانچہ میں موپساں اور اسی قسم کے دیگر مصنفوں کی بیان کردہ کہانیوں کو قابل اعتبار نہیں سمجھ سکتا۔ میری نظر میں وہ انشا پرداز جو موپساں کی طرح صرف عورتوں کی گردنوں اور کولھوں کی تعریف میں رطب اللساں ہیں اور جو مزدوری پیشہ لوگوں کی زندگی کو تمسخر آمیز لہجے میں بیان کرتے ہیں ایک عظیم صناعانہ (Artistic) غلطی کے مرتکب ہیں اس لئے کہ وہ صرف جسمانی امور کو لے کر باقی تمام ضروری چیزوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ موپساں کا خیال ہے کہ اخلاق و بداخلاقی اور نیکی و بدی میں تمیز کرنا کسی آرٹسٹ کا کام نہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک کامیاب مصور نے مجھے اپنی تیار کردہ تصویر دکھائی جس میں ایک مذہبی جلوس دکھایا گیا تھا۔ یہ تصویر فن کے لحاظ سے بہت خوب تھی مگر اس میں بھی صناع کا مضمون سے رشتہ مفقود تھا۔ میں نے اُس سے دریافت کیا "کیا تم ان مذہبی رسوم کو اچھا سمجھتے ہو، کیا ایسے جلوس نکلنے چاہئیں؟"

میرے اس متحیر کن جواب پر وہ صرف اسی قدر کہہ سکا کہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا اور نہ میں جاننا چاہتا ہوں۔ میرا کام اپنے مشاہدے کی تصویرکشی ہے۔

میں نے اُس سے پھر سوال کیا "مگر کم از کم تمہیں یہ جلوس پسند تو ہونگے"۔

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا"۔

"تو پھر تمہیں یہ رسوم ناپسند ہونگی"۔

"یہ بھی مجھے معلوم نہیں"۔ یہ تھا وہ جواب جو اُس کامیاب و بہترین فن کار مصور نے مجھے دیا ـــــ مصور جو زندگی کی تصویرکشی تو کرتا ہے مگر اُسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ اس مضمون سے جس پر وہ طبع آزمائی کر رہا ہے نفرت کرتا ہے یا محبت۔

"بدقسمتی سے موپساں بھی اسی تاریکی میں تھا۔ اور بدقسمتی سے اُس کے گرد و پیش کا ماحول ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ آرٹ کی صحیح

خدمت صرف حسن کاری تصور کی جاتی تھی ——— عورت کا حسن، جو نوجوان اور شکیل ہو، خاص کر برہنہ ہو اور پھر اُس کے ساتھ مرد کا شہوانی تعلق۔

"یہ غلط نظریہ نہ صرف موپساں اور اُس کے ہم عصر انشا پردازوں کے پیش نظر تھا بلکہ اُس وقت کے فلسفہ دان حضرات[1] یعنی ملک کی نوجوان نسل کے اُستاد بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھے۔"

"مگر موپساں فنی مہارت کا مالک تھا یا وہ اپنے مشاہدات بیان کرتے وقت بلا ارادہ 'حق' کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ دراصل وہ بلا ارادہ ہر اُس چیز میں جس میں وہ نیکی کی جستجو کرتا بدی دیکھ کر بیان کر دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسے اُس کی تمام تصانیف میں بجز ایک ناول کے صحیح راستے سے بھٹکا ہوا دیکھتے ہیں ——— اگر کسی جگہ وہ بُرائی کو بُرائی اور نیکی کو نیکی تسلیم کرتا ہے تو دوسرے مقام پر وہ بدی کو نیکی قرار دیتا ہے ——— یہی وہ چیز ہے جو کسی فنی تخلیق کی بنیادیں تباہ کر دیتی ہے، وہ بنیادیں جن پر آرٹ کی استواری کا انحصار ہے۔

"موپساں نے اپنے دو ناولوں میں رشتۂ حیات کو صحیح طور پر بیان کرنے کی کامیاب سعی کی ہے مگر جونہی وہ مندرجہ بالا فیشن ایبل نظریہ کی طرف پلٹا تو یہ خیال کرتے ہی کہ صناع کا کام صرف حسین اشیا کی تخلیق یعنی حسن کاری ہی ہے اُس کے افسانے آرٹ کے دائرے سے باہر ہو گئے۔"

"خوش قسمتی سے موپساں نے چند ایسے افسانے لکھے ہیں جن میں وہ اِس غلط نظریے پر کاربند نہیں رہا۔ انہی چند افسانوں میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ احساسِ اخلاق کی چنگاری اس مصنف کے دل میں پیدا ہو چکی تھی۔"

"اگر موپساں کی عمر نے وفا کی ہوتی تو یقیناً ہمیں اُس سے آرٹ کی صحیح خدمت کی توقع تھی۔"

سعادت حسن منٹو

ساری کائنات کا سمٹ کر ایک ہستی میں سما جانا اور اسی ہستی کا پھیل کر آلہانہ وسعت اختیار کر لینا ——— یہ ہے محبت

محبت سلام ہے فرشتوں کا تاروں کی خدمت میں

وکٹر ہیوگو

---

[1] یہ اشارہ فرانس کے مشہور فلسفی (Renan) کی طرف ہے۔

ماتمِ دلبری

دو دوست طعامِ شب ختم کر چکے تھے۔ انہوں نے ہوٹل کے دریچے میں سے جھانکا۔ سڑک لوگوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ وہ شام کی گرم ہوا محسوس کر رہے تھے جو گرمی کی راتوں میں پیرس کا خاص تحفہ ہے اور جو بدن سے مس ہوتے ہی سیاحوں کو گردنیں اُٹھا اُٹھا کر دریچوں میں سے باہر جھانکنے پر مجبور کر دیتی ہے اور جوان کے دل میں یہ خواہش پیدا کر دیتی ہے کہ وہ نیچے اُتر جائیں اور باہر کہیں آبادی سے دُور چل بسیں شاداب مرغزاروں میں، خوابوں کی دُنیا میں جہاں بہتے ہوئے دریاؤں پر ماہتاب نور برسا رہا ہو اور جہاں سبزہ زار کا گوشہ گوشہ بلبلِ ہزار داستان کے رسیلے نغموں سے سرشار ہو۔

دونوں میں سے ایک دوست نے جس کا نام ہنری سائمن تھا لمبی سانس لے کر کہا "آہ! میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔ کس قدر اُداسی ہے، دوست۔ قبل ازیں میں ایسی ہی شام کو اپنے بدن میں اِک آگ سی محسوس کیا کرتا تھا مگر اب ——: بجھی ہوئی راکھ، تأسّف، حسرت! زندگی کتنی تیز رفتار ہے!!!"

گو ہنری سائمن کی عمر کوئی بیتالیس برس کی ہوگی اور اُس کے سر پر کوئی بال نہ تھا تاہم اس کے اعضا کافی مضبوط تھے۔

پیٹر کارنیر نے جو جسم کا لاغر، عمر میں اس سے بڑا، نسبتہً زیادہ خوش دل اور بذلہ سنج تھا جواب دیا "دوست! میں نے اپنے بڑھاپے کو دُنیا میں سب سے کم محسوس کیا ہے۔ میں ہمیشہ مسرور رہا ہوں۔ میں نے اپنے اوقات ہنسی، خوشی اور قہقہوں میں بسر کیے ہیں۔ اگر کوئی ہر روز بلا ناغہ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتا رہے تو وہ کار کنانِ عمر کی تبدیلیاں جو وہ ہر لحظہ کر رہے ہیں محسوس نہیں کر سکتا کیونکہ اُن میں آہستگی اور باقاعدگی ہوتی ہے۔ اور چہرے کے خدوخال دھیرے دھیرے اس طرح بدلتے رہتے ہیں کہ یہ انقلاب ہمیں ان دیکھا معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس انقلاب کا احساس ہی تو ہے جو روز بروز ہمارے دل و دماغ پر ایک تکلیف دہ صُورت میں اثر پذیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس انقلاب کو اگر صحیح طور پر محسُوس کرنا ہو تو چھ مہینے تک آئینہ کے نزدیک نہ جاؤ۔ پھر دیکھو! اگر عورت ہو میرے دوست! کتنی قابلِ رحم ہستی ہے۔ اس غریب کی مسرت، زندگی، تسخیر، طاقت صرف اس کی خوبصورتی میں مضمر ہے اور پھر ستم ظریفی یہ کہ اِس نعمتِ عظمےٰ کی عمر صرف دس برس۔

میں آج تک اسی خیال پر اُدھار کھائے بیٹھا رہا کہ میں ابھی جوان ہوں گو میری عمر کا یہ پچاسواں برس گزر رہا ہے۔ اس طویل عرصہ میں مَیں نے نقاہت و ناتوانی کو اپنے پاس کبھی پھٹکنے نہیں دیا۔ میں ہمیشہ مسرور و شادماں رہا ہوں۔ مگر آہ اس تنزل کا حال

مجھ پر ایک عام مگر اس قدر اندوہناک صورت میں منکشف ہؤا کہ جس نے کوئی چھ مہینے تک لطفِ زیست مجھ پر حرام کر دیا میں نے بھی لوگوں کی طرح زندگی میں کئی بار محبت کی ہے۔ آہ نہیں۔ ایک بار۔ بارہ سال قبل۔ جنگ سے تھوڑی مدت بعد، میں نے پہلے پہل اُسے اڑیٹیٹ کے ساحل پر دیکھا۔ کوئی جگہ اتنی دلپذیر نہ ہوتی تھی جتنا یہ ساحل صبح سویرے نہانے کے وقت۔ یہ کوئی بہت لمبا چوڑا نہ تھا یوں سمجھو کہ گھوڑے کے نعل کی طرح چھوٹا اور گول۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں سے گھرا ہؤا کٹے پھٹے ٹکڑے کوئی بندرگاہ کی طرح باہر نکلا ہؤا کوئی اندر دھنسا ہؤا۔ ایک تو کسی دیو کی ٹانگ کی طرح سمندر میں بہت دُور تک نکل گیا تھا۔ اُس کے دائیں کنارے عورتوں کا ایک جمِ غفیر موجود رہتا تھا۔ چٹانوں کے درمیان یہ مختصر سا قطعہ اُن کی چمکیلی رنگ دار پوشاکوں سے ایک چمن زار بنا رہتا تھا۔ آفتاب اپنی پوری تابانی سے ساحل پر، رنگا رنگ کے چھاتوں پر، اور نیلگوں سمندر کی امواجِ مضطرب پر چمکتا رہتا۔ ہر طرف سے مسرت اور خوشدلی ٹپکا کرتی۔ ہر شے مسکراتی معلوم ہوتی۔ تم سمندر کے کنارے گھڑی دو گھڑی کے لئے تماشائی بن کر بیٹھ جاتے، پھر دیکھتے رنگ رلیاں ---- زن و مرد بدن پر لپٹی ہوئی فلالین کی چادر کو چھوٹی چھوٹی ہلکی کف آلود موجوں میں داخل ہوتے ہی باہر پھینک کر اک گونہ تیز قدمی سے جو بعض اوقات ایک لطف آمیز کپکپی یا ضبطِ النفس کا موجب ہوتی سمندر کے ٹھنڈے پانی میں کود پڑتے۔

اس جگہ کمزور اور توانا جسم اپنی اصلی حالت میں نظر آتے ہیں۔ صرف یہیں حُسن صحیح معنوں میں "از فرق تا بقدم" پرکھا جا سکتا ہے اسی جگہ میں نے پہلے پہل اُسے حُسن کی تمام دلفریبیوں اور دلکشیوں میں لپٹے ہوئے دیکھا۔ دوست! بعض حسین و جمیل صورتیں، پہلے ہی وار میں فتح حاصل کر لیتی ہیں اور ان کی لمبی لمبی سرگیں پلکوں سے نکلی ہوئی "کوتاہ نگاہ" قلب کی انتہائی گہرائیوں میں اُتر کر چین لیتی ہے۔ اُس کی آنکھوں کے اندر بھی ایک ایسی دلکشی نہاں تھی جسے ایک بار دیکھ لینا اور پھر جان و دل سلامت بچا کر لے جانا انسان کے لئے بہت دشوار تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میری زندگی اور میری پیدائش کا مقصد صرف اُس شوخ اور چنچل لڑکی کی محبت ہے۔ میں نے اپنی متاعِ دل و جاں اُس حسینہ کے قدموں میں ڈال دی۔ وہ میرے دل و دماغ پر حکومت کرنے لگی۔ اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے مجھے اُس کا خیال رہنے لگا۔ اس طرح محبت کے ہاتھوں ایک عورت کا غلام بن جانا کتنا عجیب و پرکیف مشغلہ ہے۔ ہم اسے ایک طرح کی سزا بھی خیال کرتے ہیں مگر ہائے اُس بربادیٔ شادماں پر ہزاروں شادکامیاں قربان اور لاکھوں مسرتیں فدا۔

اُس کا قدِ رعنا، اس کے پتلے پتلے ہونٹ۔ اس کے ہوا میں لہراتے ہوئے سیاہ گیسو اور چہرے کے بے عیب خد و خال میرے دل کی دھڑکن کو اس قدر تیز کر دیتے کہ مجھے اس کے دھڑکتے دھڑکتے رُک جانے کا احتمال ہونے لگتا۔ اس کا جنون میری رگ رگ میں سرایت کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی ہر شے میں مجھے وہ خود دکھائی دینے لگی۔ میں کتنی ہی دیر تک صرف اُس کے اُس خاص دلربایانہ انداز کو دیکھنے کی اُمید پر کھڑا رہتا کہ وہ کب اپنا نقاب اور دستانے اُتار کر اپنے پہلوؤں میں ایک دلآویز لچک اور

بازوؤں میں ایک ساحرانہ خم پیدا کرتے ہوئے انہیں کُرسی پر رکھ دے۔ اُس کے بھڑکیلے ملبوسات بے نظیر ہوتے۔ خدا کی قسم اُس سی بیش قیمت اور خوشنما ٹوپیاں کسی لڑکی کے پاس نہ تھیں۔

آہ بالآخر اُس کی شادی ہوگئی۔ اُس کا شوہر ہر شنبہ کو آتا اور دوشنبہ تک قیام کرتا۔ وہ مجھ سے کچھ کھنچا کھنچا سا رہتا حالانکہ مجھے اس سے حسد نہ تھا۔ میں نہیں جانتا کہ میں کیوں اس سے حسد نہ کرتا تھا مگر میری زندگی میں یہ پہلا شخص تھا جو میرے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔

آہ! میں نے اس حسینہ کو کس جوش سے چاہا تھا۔ وہ حسینہ وہ معصومہ کتنی خوبصورت تھی۔ اُس کی اُٹھتی ہوئی جوانی میں مجھے اپنی زندگی حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اُس کا حسن وجمال میری روح کی بالیدگی اور میرے دماغ کی تازگی کا موجب تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ پھُول اور موسیقی کا دوسرا نام عورت ہے۔ میں کبھی یہ سمجھ نہ سکا کہ اُس کے تابدار پردۂ رخسار کے پیچھے، اس کے رسیلے لبوں کی ایک معمولی جنبش میں، بناگوش کی گولائی کے اندر اور اس کی خوش وضع ناک کی اٹھان میں یہ زہرہ گداز حُسن کہاں چھپا بیٹھا ہے۔ اُس کا جسم موزونیت کا مجسمہ تھا۔

اسی طرح تین ماہ گزر گئے۔ میرا آب و دانہ مجھے امریکہ لے گیا۔ اُس کے روئے تاباں سے اس قدر دُور۔ میرا قلب ملُول اور دماغ افسردہ رہنے لگا۔ اُس کے تصور سے اپنی ذہنی قوتوں کو ایک لمحہ کے لئے آزاد کرنا میرے بس کی بات نہ رہی مگر رفتہ رفتہ میری طبیعت میں ایک سکون سا پیدا ہوتا چلا گیا اور میرے دماغ میں صرف ایک محبت آمیز یاد باقی رہ گئی دنیا کی ایک دلفریب، حسین اور عزیز ترین ہستی کی یاد جس کو واقعاتِ زندگی نے میری راہ میں لا ڈالا تھا۔

بارہ سال ایک عمر ہے مگر کسی نے اسے کبھی محسوس کیا؟ ایک برس دوسرے کے پیچھے دوسرا تیسرے کے بعد ایک سُرعت سے گزرا جاتا ہے۔ یہ طویل مدتیں کبھی کسی نے محسوس کیں؟ ماضی پر نظر ڈالیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہے۔ مگر یہ سفید بال کہاں سے نمودار ہو گئے۔ ہماری اتنی عمر کیونکر کٹ گئی۔ سچ کہتا ہوں مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ چند حسینوں کا ذکر ہے جب میں نے ساحل اٹریٹیٹ کے خوش آئند موسم کو الوداع کہی تھی

میں گذشتہ بہار کے موسم میں میزز لیفٹی میں چند احباب کے ہاں مدعو تھا۔ عین اس وقت جب ٹرین روانہ ہوئی میرے ڈبے میں ایک بھاری بھرکم بھدی سی عورت چار بچیوں کو ہمراہ لئے داخل ہوئی۔ میں اس گول مول سی ماں کا چہرہ اچھی طرح نہ دیکھ سکا اس کی ہیٹ مانع تھی۔ وہ چونکہ بھاگ دوڑ میں جلدی جلدی گاڑی میں سوار ہوئی تھی بیچاری کا سانس پھُول گیا تھا۔ اُن لڑکیوں نے بیٹھتے ہی بچپنے کی یاوہ گوئی شروع کر دی۔ میں نے چاروناچار اخبار کھول لیا۔

ہم اسینیرز کے پاس سے گزر رہے تھے جب میرے کانوں میں یہ آواز پڑی "جناب۔ معاف کیجئے گا ——— کیا آپ مسٹر کارنیر تو نہیں؟"

"جی ہاں بیگم صاحبہ"۔ یہ سنتے ہی وہ ایک مطمئن دلیر عورت کی طرح ہنسی تاہم اُس کی ہنسی اُداسی کی اک نامعلوم سی جھلک کو چھُپا نہ سکی۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں شاید؟" میں کچھ بوکھلا سا گیا۔ یہ چہرہ بہت آشنا معلوم ہوتا تھا مگر کہاں دیکھا تھا، کب! کچھ یاد نہ آتا تھا۔

"جی ہاں ——— ن نن نہیں۔ میں نے پہچان لیا ہے مگر آپ کا نامِ گرامی یاد نہیں آتا۔

اُس نے آنکھیں نیچی کرلیں اور کچھ شرما کر کہا "مسز جُولیا لیفر"

مجھ پر بجلی گر پڑی۔ ایسا تلخ حادثہ مجھے عمر بھر پیش نہ آیا تھا۔ میرا خون رگوں میں رُک گیا۔ میری آنکھوں کے آگے سوال آگیا۔ دل سینے میں ڈوبنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ میری آنکھوں کے سامنے سے نقاب دھجیاں ہو کر اُڑ گیا اور میں ایک مہلک اور تلخ ترین حقیقت کی خون آشامیوں اور ہلاکتوں سے آشنا ہو رہا ہوں یہ وہ تھی ——— آہ، کہاں وہ، کہاں یہ بھدی، گنوار، موٹی عورت۔ اور پھر یہ کہ اس نے چار بچے بھی جن لیے تھے۔ جب میں نے آخری بار اُسے دیکھا تھا وہ کیا تھی اور اب؟؟؟ اِن چھوٹی چھوٹی چار جانوں نے اپنی ماں کی طرح مجھے اور زیادہ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ چار لڑکیاں اس کے بطن سے تھیں۔ ماں کے چہرے کے کچھ نقوش اُن کے چہروں میں نشوونما پا رہے تھے۔ وہ قد میں ابھی سے لانبی تھیں۔ انہوں نے ماں کی جگہ لے لی تھی۔ وہ اب خود کیا تھی؟ وہ جو کبھی نخوت و ناز کا گہوارہ تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے اُسے کل دیسا دیکھا ہے اور آج ایسا دیکھ رہا ہوں۔ کیا یہ ممکن تھا؟ ایک شدید قلق، ایک مہلک رنج میرے سینے میں جاگ اُٹھا۔ میرا دِل فطرت کے یہ ہلاکت خیز فرائض اور ناپائدار و بے رحمانہ مشغلے دیکھ کر باغی ہو گیا۔ میں نے دیوانوں کی طرح اس کی طرف دیکھا اور اس کے بازو کو بے اختیارانہ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میں اِس معمّر عورت سے واقف نہ تھا۔ میں صرف اُس کی خوبصورت جوانی کو جانتا تھا جو مر چکی تھی۔ میرے ڈھلکے ہوئے آنسو اس جوانا مرگ پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ وہ بھی انسان تھی لرز گئی۔ الفاظ اُس کے مُنہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نکلنے لگے۔

"م م میں بہت بدل گئی ہوں نا؟ اتنے طویل عرصہ کے بعد آخر ہم کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں میں اب ماں بن گئی ہوں۔ صرف ماں۔ ایک اچھی ماں۔ الوداع ماضی ——— وہ بسر ہو چکا ختم ہو چکا ——— اُف یہ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ اگر ہم زندگی میں کبھی ملے بھی تو آپ مجھے پہچان نہ سکیں گے ——— آپ بھی تو آخر وہ نہیں رہے۔ آپ کو دیکھ کر میں کتنی دیر یہی سوچتی رہی کہ کہیں مغالطہ نہ ہو۔ سر بھی تو سفید ہو گیا ہے۔ آخر بارہ سال کا عرصہ ——— بارہ سال ——— میری بڑی لڑکی دس برس کی ہو گئی ہے۔"

میں نے لڑکی کی طرف نگاہ پھیری، اُس کے نوخیز حسن میں کچھ کچھ وہی دلکشی وہی سحر تھا جو کبھی اس کی ماں کی ملکیت تھا۔ اگرچہ اس
حر میں ابھی وہ پختہ نکھار نہ آیا تھا تاہم اس کی صورت بتا رہی تھی کہ وہ عنقریب اپنی ماں سے بہت کچھ ورثہ میں لے لیگی سب مجھے انسانی
ندگی اُس وقت بالکل ٹرین کے مانند معلوم ہوئی جو تیز و تند دوڑی جا رہی تھی۔ ہم میزر لیفٹی آپہنچے۔ میں نے اپنی دیرینہ رفیقہ کے
ھ پر ایک طویل بوسہ دیا۔ اور سوائے چند کمبخت رسمی لفظوں کے اور کچھ نہ کہہ سکا۔ جیسے میرے لبوں پر مہر لگ گئی ہو۔ میرا دماغ
ل رہا تھا۔ بھلا مجھے اُس وقت گفتگو سوجھتی تھی!

میں اُس حسرتناک شام کو اپنے کمرے میں تن تنہا آئینے میں اپنا عکس خدا جانے کتنی دیر تک دیکھتا رہا۔ میں گذشتہ زمانہ یاد
کر کے خیال ہی خیال میں اپنی پرانی بھُوری مونچھیں اور سیاہ بال دیکھ رہا تھا اور موجودہ چہرے کا مقابلہ قیافہ کے زور سے اپنے
جوان شگفتہ چہرے سے کر رہا تھا —— آخرکار یہ دل بہلاوا ختم کرنا پڑا۔ میں اب بوڑھا تھا —— بوڑھا —— آہ بڑھاپا۔
ڑھاپا!!!

(موپساں)

باری بٹالوی

آنسو

میرے دل میں آنسو ٹپک رہے ہیں
جیسے بارش ہو رہی ہو
یہ نقاہت سی کیا ہے
جو میرے دل میں رینگ رہی ہے؟

آہ! زمین اور چھتوں پر گرتی ہوئی
بارش کی نرم صدا!!
ماندہ دل کے لئے کتنا اثر رکھتی ہے!
آہ، بارش کی صدا!

آنسو بلاوجہ چھلکے جا رہے ہیں،
اس دل میں جو خود بیدل ہے!
کیا یہ دغا نہیں ہے؟

دل بلاوجہ محوِ گریہ و فغاں ہے
آہ یہ کیسا عذاب ہے
کہ اُس کی وجہ معلوم نہیں ہوتی

(پال ورلین)

سعادت حسن

وکٹر ہیوگو اور مسئلۂ سزائے موت

ہم اس مضمون میں وکٹر ہیوگو کی ایک تصنیف (The Last days of the Condemned) کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو اس نے اپنی جلاوطنی سے پہلے پیرس میں قلمبند کی تھی۔ اس کتاب کا نفسِ مضمون معاشری نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے۔

اس میں کسی کو کلام نہیں کہ یہ فرانسیسی انشاپرداز اُنیسویں صدی میں فطرتِ انسانی کا بہترین ماہر تھا۔ معاشرہ کے پیدا کردہ عیوب اور اخلاقی تباہیوں سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اُس کی ہر تصنیف میں ان کے خلاف احتجاج موجود ہے۔ وہ اُمرا کی تعیش پسندی کو نفرت و حقارت کی نظروں سے دیکھتا اور گرسنہ شکم و برہنہ جسم غربا کی حالت سے متاثر ہوتا۔ اُس کے نزدیک تمام عیوب معاشرہ کے پیدا کردہ ہیں اور انسان جب معاشرہ کی قیود سے آزاد ہونا چاہتا ہے تو وہ اپنے یکطرفہ، بغیر آئینی اور ناقابلِ قبول قوانین سے اُس کو مصائب و نوائب کے بھیانک گڑھے میں صرف اس خیال سے دھکیل دیتی ہے کہ اُس کی اصلاح ہو جائے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہو سکتا۔

جس بات نے ہیوگو کے دماغ کو حد سے زیادہ پریشان کیا جس مسئلے نے ہیوگو پر راتوں کی نیند حرام کردی جس قانون نے اُس کے قلم کو اعجاز بخشا وہ سزائے موت کا خونی فتوے تھا۔ چنانچہ اُس نے سزائے موت کے مجرم کے اندرونی احساسات و قلبی کیفیات سے اثر پذیر ہو کر ایک کتاب (The Last days of the Condemned) لکھی جس کا ترجمہ "سرگزشت اسیر" اس کے نام سے ہو چکا ہے۔

اس کتاب کا اندازِ تحریر پڑھنے والوں کے دماغ سے گزر کر اُن کے دِل پر نقش ہو جاتا ہے یہ کتاب فی الحقیقت ایک بین الملی مسئلہ کی المناک داستان ہے۔ لرزہ خیز حالات اور دردناک مناظر اتنے مؤثر الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں کہ قاری کی رگ رگ میں جذباتِ رنج و الم جاگ اُٹھتے ہیں اور سزائے موت کی وحشت و بربریت کا صحیح نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ یہ کتاب درحقیقت ایک مجرم کا روزنامچہ ہے جس نے آغازِ قید سے پھانسی کے دن تک کے واقعات اور حالات نہایت تفصیل سے بیان کئے ہیں جیل کی کوٹھری کے اندر قیدی کیسی زندگی بسر کرتے ہیں اور اُن کے ساتھ کیا ظالمانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ آخر میں اس باکمال مصنف نے سزائے موت کے سیاسی و معاشری پہلو پر بحث کرتے ہوئے اپنے خیالات کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ ہر حساس قلب اُس پر خون کے آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"سرگذشتِ اسیر" میں وہ منظر سخت رقت خیز ہے جب مجرم اپنی اکلوتی لڑکی سے جیل کی کوٹھڑی میں ملتا ہے:-

"نازک کلی، معصومیت کی تصویر، میری لختِ جگر میری بھولی بچی میری اپنی اماں کے ساتھ میرے کمرے میں آئی تھی ایسے
خوبصورت لباس میں کیسی بھلی معلوم ہو رہی ہے۔ میں نے اُسے گود میں اُٹھا کر اُس کے بالوں کو چومنا شروع کر دیا کبھی اُسے
چھاتی سے لگاتا اور نازک رخساروں کا بوسہ لیتا کبھی بھینچ لیتا، میری اِن حرکات پر حیران ہو کر اپنی اماں کی طرف دیکھ رہی تھی جو کونے
میں اس منظر سے متاثر کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔

"میری! میری پیاری میری" یہ کہہ کر میں نے اُسے اپنی رنج والم سے پُر چھاتی کے ساتھ زور سے بھینچ لیا۔

"ہائے جناب! آپ مجھے تکلیف دے رہے ہیں"، میری نے یہ الفاظ ہلکی سی چیخ مارتے ہوئے کہے۔

جناب؛ —— آہ میرے اللہ!! اُسے مجھ سے جُدا ہوئے تقریباً ایک سال ہو چکا ہے۔ وہ مجھے بھُول گئی ہے —— اُس کے
ذہن سے باپ کی شکل و شباہت اور آواز محو ہو چکی ہے، اس کے علاوہ مجھے اس ہئیت میں پہچاننا بھی تو بہت دشوار تھا لمبی
سی ڈاڑھی۔ یہ ذلیل لباس۔ اُف!! کیا میری تصویر اُس کے ذہن سے اُتر گئی ہے؟

کیا میں اپنی بیٹی کو اسی پیارے اور شیریں لہجے میں ابا کہتے نہ سنوں گا۔ اُف! دماغ پھٹا جاتا ہے۔ دل ٹکڑے ہُوا جاتا
ہے —— "جناب؛" اُف! یا میرے اللہ!!!

آہ! میں اپنی چالیس سالہ زندگی کے بدلے صرف ایک چیز کا خواہشمند ہوں —— اپنی موت کے عوض صرف ایک کلمہ
سننا چاہتا ہوں —— اپنی پیاری بیٹی کے مُنہ سے صرف ابا کا لفظ!

میں نے اُس کے ننھے اور سپید ہاتھ آپس میں جوڑتے ہوئے کہا "دیکھو میری! کیا تم مجھے جانتی ہو؟"

وہ میری طرف چمکتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر بولی "جی نہیں"

"میری، غور سے دیکھو میں کون ہوں"؛

اُس نے بھولے پن سے جواب دیا "ایک صاحب"

آہ! جس ذات سے میری تمام خواہشیں اور مسرتیں وابستہ ہیں، جو میری محبت کا مرکز ہے، میرے سامنے بیٹھی باتیں کر رہی
ہے مگر مجھے نہیں پہچانتی۔ اپنے تیرہ بخت باپ کی صُورت سے ناآشنا ہے۔

میں نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا "میری میں تمہارا باپ ہوں"

میری نے حیرت سے کہا "ہیں؛"

"کیا میں تمہیں پسند نہیں؛"

"نہیں جناب، میرے ابا تو بہت خوبصورت ہیں"

میں نے اُس کے چہرے کو اپنے آنسوؤں اور لگاتار بوسوں سے تر کر دیا۔ وہ گھبرائی اور چیختے ہوئے کہنے لگی۔

"آپ تو میرے گال اپنی ڈاڑھی سے چھیل رہے ہیں"۔

میں نے اُسے اپنے گھٹنوں پر بٹھالیا اور کہا "میری کیا تم پڑھ سکتی ہو؟"

"میں پڑھ سکتی ہوں۔ اُمی مجھے روز پڑھایا کرتی ہیں"۔

اچھا تو یہ پڑھو"۔ میں نے اُس کے ہاتھ سے ایک چھپا ہؤا کاغذ لیتے ہوئے کہا جس سے وہ غالباً کھیل رہی تھی۔

اُس نے کاغذ کو کھولا اور ننھی سی اُنگلی رکھتے ہوئے لفظوں کے ہجے کرنے لگی۔ ف، ت، فت، و، ی، وی۔ ا م، و، مو، ات، موت۔ فتویٰ موت۔ میں نے اُس کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا۔ وہ میری سزائے موت کا فتویٰ پڑھ رہی تھی جو بازار میں ایک پیسے کو بک رہا تھا ——— اُس نے یہ غالباً اپنی ماں سے لیا ہوگا۔

اس وقت میرے دل کی جو حالت ہوئی وہ احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔

میری چلّا کر بولی "مجھے میرا کاغذ دے دو"۔

"خدا کے لئے لے جاؤ اِسے" یہ کہہ کر میں کرسی پر گر پڑا۔ اب مجھے کسی کا خوف نہیں جبکہ میرے بربطِ دل کا آخری تار بھی ٹوٹ گیا ہے میں موت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کو تیار ہوں"۔

باقی تمام کتاب اسی طرح کے دردانگیز و مؤثر مناظر سے بھری پڑی ہے۔

یہ کتاب لکھتے وقت اُس کے پیشِ نظر کتابِ قانون کا سیاہ ترین ورق تھا جس میں متفقہ طور پر موت کی سزا کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ ہیوگو "سزائے موت" کو عدل و انصاف کے رُو سے غداری سمجھتا ہے اور تنسیخ سزائے موت کے جواز میں بہت سے قاطع دلائل و براہین پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ تنسیخ سزائے موت کے معاشری و مجلسی اسباب پر بحث کرتے ہوئے ثابت کرتا ہے کہ معاشرہ کو کسی شخص کو اُس چیز سے محروم کر دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے جو وہ عطا نہیں کر سکتی۔

جب یہ کتاب پہلی مرتبہ شائع ہوئی تو اُس کے سرورق پر مصنف کے نام کی جگہ ذیل کی چند سطور درج تھیں :-

"اس کتاب کی تکمیل دو اسباب کی مرہونِ منت ہو سکتی ہے۔ اولاً تباہ شدہ انسان کے احساسات مشاہدات و مدرکات بوسیدہ کاغذات کی صورت میں دستیاب ہوئے ہوں، جو لفظ بہ لفظ نقل کر دیئے گئے ہوں۔ ثانیاً کسی حساس مفکر، شاعر یا فلسفی کے خیالات کا مجموعہ جن کے عمیق سمندر میں وہ برسوں غوطہ زن رہا ہو اور اس وقت تک چین نہ لیا ہو جب تک اُس کے افکار نے کتابی صورت اختیار نہ کر لی۔ ان دو اسباب میں سے کسی ایک سے مصنف کے ذہنی رشتے کی استواری کا انحصار قارئین پر ہے"۔

کتاب کی پہلی اشاعت میں وکٹر ہیوگو نے جوئے فکر کو آزادانہ بہنے سے عمداً باز رکھا شاید اس لئے کہ وہ تفہیم نظریہ کا منتظر تھا۔ دوسری اشاعت میں اس نے اس امر کا اعلان کیا کہ "سرگزشت اسیر" کا مقصدِ وحید سزائے موت کی تنسیخ ہے مصنف کے پیشِ نظر کسی خاص مجرم کا تحفظ نہیں اور وہ تمام مجرموں کی طرف سے وکالت کرتا ہے خواہ وہ عہدِ حاضر کے ہوں یا ازمنۂ مستقبل کے۔

ہیوگو انسانی حقوق کا یہ مقدمہ سب سے بڑی عدالت یعنی سوسائٹی میں پیش کرتا ہے اس لئے کہ اُس کے خیال میں سزائے موت کے المناک تاثرات عدالت کی فصاحت میں گم ہو جاتے ہیں۔ وہ "زندگی اور موت کے سوال" کو جو ایک واضح اور عیاں مسئلہ ہے اُس کے حقیقی قیام گاہ پر روزِ روشن میں دکھانا چاہتا ہے۔

انہیں تاثرات کی تخلیق کے لئے اُس نے یہ کتاب لکھی تا کہ اُس کے تاثرات سے متاثر ہو کر سوسائٹی مصنف کے نظریے کو شرفِ قبولیت بخشے۔ اس خیال کے پیشِ نظر کہ اُس کے نظریے کی طرح اس کی کتاب زمان و مکان، امصار و افراد کی تخصیص سے آزاد ہو مصنف نے "سرگزشتِ اسیر" میں کسی خاص فرد، خاص مقام، خاص جُرم، خاص عدالت اور خاص جلّاد کا ذکر نہیں کیا۔ اُس نے جانفشانی کے ساتھ اپنے خیالات کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ ہر حساس قلب اُس پر خون کے آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔

اُس کے پیشِ نظر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ سزائے موت کا وجود دُنیا سے حرفِ غلط کی طرح مِٹ جائے اور اُس کی خواہش ہے کہ اقوامِ عالم کے روشن دماغ معلّم اُس کی اس خواہش کی تکمیل کے لئے کوشاں ہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس شجر کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا جائے جسے انقلاب کی تُند موجیں بھی تباہ نہیں کر سکتیں۔ ہیوگو لکھتا ہے:۔

"اگرچہ کلیدِ انقلاب قفلِ زیست کو وا کرتی ہے اور انقلاب اپنے پس و پیش قحط، زلزلے اور بجلیاں لاتا ہے تاہم اس تخریب میں تعمیر کا راز مضمر ہوتا ہے لیکن انقلاب بھی "سزائے موت" کو موت کے گھاٹ نہیں اُتار سکا۔

اس کتاب میں وہ اپنے ہم وطنوں کو دعوت مبارزت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تمہارے پاس سزائے موت کے جواز میں جس قدر بھی دلائل ہیں مجھے اُن سے آگاہ کرو۔ وہ لوگ جو سزائے موت کو جائز قرار دیتے ہیں دلائل پیش کرتے ہیں کہ ایسے متنفس کا وجود جس نے معاشری زندگی میں تلخی پیدا کی قابلِ اخراج ہے۔ سب سے بہترین دلیل جو وہ پیش کرتے ہیں وہ نظریۂ عبرت ہے۔ ہیوگو نظریۂ عبرت کے ابطال میں مثالیں پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"اگر ان مثالوں کی موجودگی میں بھی تم نظریۂ عبرت کے قائل ہو تو گردشِ ایام کا رُخ ماضی کی طرف پھیر کر ہمیں سولھویں صدی عیسوی میں لے چلو، حقیقت میں خوفناک بن جاؤ، ہمارے لئے تکالیف و مصائب کے دروازے کھول دو۔ گزشتہ زمانے کی وحشیانہ سزائیں از سرِ نو رائج کردو، ہر راہگذر پر تختۂ دار نصب کردو، بدنی سزا کو عام کردو۔ پیرس کے بازاروں میں دیگر دکانداروں کی طرح ایک دکان جلّاد کی ہو، جہاں انسانی گوشت پوست دیگر اجناس کی طرح فروخت ہو ——— فنا کو بادۂ ہر جام کرنے اور سزائے

موت کو اس طرح عام کرنے سے تم نظریۂ عبرت کو زیادہ کامیاب بنا سکو گے"۔

ہیوگو تنسیخ سزائے موت کے معاشرتی ومجلسی اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"جس انسان کے لئے تم موت کی سزا تجویز کرتے ہو اس کے معاشری حالات کی حسب ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں:۔

اولاً وہ شخص افرادِ خاندان اور صحبتِ احباب سے محروم ہے۔ اس صورت میں وہ صحیح تعلیم وتربیت حاصل نہیں کر سکا جب اُس کے دماغ کی اصلاح کے لئے کوئی سعی نہیں کی گئی تو تمہیں اس معاشرتی یتیم[1] کے قتل کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟

تم اُسے اس لئے قتل کرتے ہو کہ اُس کا زمانۂ طفلی عدم نگہداشت کی نذر ہوا۔ تم اُسے اپنے کئے کی سزا دیتے ہو۔ تم اس بدبخت کو جرم کا لباس پہناتے ہو۔

کیا تم اس وقت خوفزدہ نہیں ہوتے جب تم اُس کے بچوں اور بچیوں کا خیال کرتے ہو؟ —— اُن بچوں کا جن سے زندگی کا سہارا چھن جائے گا۔

کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ آئندہ پندرہ برس تک اس کا بیٹا بھی غالباً زندان میں ہو گا اور بیٹی تعیش پسند امرا کی نفسانی خواہشات کے بجھانے کا ذریعہ ہو گی"۔

وہ غربا کی لاانتہاہی وغیر مختتم تکالیف سے متاثر ہو کر لکھتا ہے:۔

"ترازوئے عدل کی طرف دیکھو۔ تمام مصائب غربا کیلئے اور تمام مسرتیں امرا کے لئے۔ دونوں پلڑے غیر مساوی ہیں۔ حکومت کو اس فریب دہی میں مدد نہ کرنی چاہئے کیونکہ اس سے غربا کے مصائب میں اضافہ ہوتا ہے۔

تم عدل وانصاف کو کام میں لاؤ تاکہ غربا کو معلوم ہو جائے کہ اُن کے لئے بھی نیلگوں آسمان کے نیچے کوئی جائے پناہ ہے، ایک ارضی جنت ہے جس کی لطیف فضاؤں سے وہ بھی متمتع ہو سکتے ہیں۔ ان کا مرتبہ بلند کرو تاکہ انہیں بھی معلوم ہو کہ امرا کی عشرت پرستی میں وہ بھی برابر کے شریک ہیں"۔

ہیوگو اخوت اور محبت کی تلاش کرتا ہے چنانچہ وہ اس کتاب کے دیباچے کے آخر میں تحریر کرتا ہے:۔

"میں تمہاری معاونت چاہتا ہوں۔ کس مسئلے میں؟ —— تبدیلیٔ قوانین میں۔

مسیح کے اخلاقی قانون انسانوں پر پھر حکمران ہوں گے۔ وقت آنے والا ہے جب ہم جرم کو مرض تصور کرینگے اور ججوں کی جگہ امراض کے رفع کرنے والے اور زندانوں کی جگہ شفاخانے ہوں گے۔ ایک نئے افق سے اخوت ومحبت کا آفتاب طلوع ہو گا"۔

"سرگزشت[2] اسیر" لکھنے کے بعد ہیوگو نے ایک مختصر افسانہ (Claude Gueux[3]) لکھا۔ اس افسانے کا مقصد بھی تنسیخ سزائے موت تھا۔

سعادت حسن منٹو

---

[1] Social Orphan [2] اس افسانے کا راقم الحروف انتقامِ اسیر کے نام سے ترجمہ کر چکا ہے۔ [3] یہ کتاب راقم الحروف کی ترجمہ کردہ ہے۔

وکٹر ہیوگو کی چند نظمیں

ہیوگو کے اشعار طرزِ ادا کی دل آویزیوں اور موسیقی کی گوناگوں کیفیتوں کا مخزن ہیں۔ نظم میں قافیہ اور وزن کا التزام اُس پر ختم ہے۔ الفاظ میں وہ لوچ اور ترنم ہے کہ روح بے اختیار وجد کرنے لگتی ہے۔ اُس کے اشعار پڑھتے وقت قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ صفحۂ قرطاس سے اُچھل کر اُس کے دِل میں اُتر گئے ہیں۔ مگر ہیوگو کی شاعری میں یہی ایک چیز نہیں۔ اُس کی شاعری اس سے بھی بہت بلند ہے۔ اُس کے جذبات و افکار میں پاکیزگی ہے، خلوص ہے، پائندگی ہے، رس ہے، گہرائیاں ہیں۔ وہ حُسن کو پاک نظروں سے دیکھتا ہے، محبت اُس کے نزدیک خدا کا قرب ہے ——— یہی شاعری کی معراج کمال ہے اور اسی کمال نے اُسے اکنافِ عالم میں مشہور کر دیا۔ یہاں ہم قارئین کی خدمت میں اس باکمال غنائی شاعر کے کلام کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرتے وقت اصل زبان کا لطف بڑی حد تک جاتا رہتا ہے مگر راقم نے مقدور بھر اُردو میں اصل کا اچھا نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے:۔

اگر میرے اشعار کے پَر ہوتے

میرا نازک و شیریں گیت،
تیرے باغ میں اُڑ کر چلا جاتا۔
اگر ابابیل کی طرح جو اُڑتی ہے اور گاتی ہے ———
ہاں ابابیل کی طرح میرے راگ کے پَر ہوتے

جب موسم گرما دُنیا سے رُخصت ہو جاتا۔
تو میرے گیت تیرے درخشاں کاشانے کے گرد چکر کاٹتے۔
اگر میرے ناکام خیالات کی طرح
ہاں تعبیر سے ناآشنا خوابوں کی طرح میرے راگ کے پَر ہوتے

لوری

میں محافظ ہوں تیرا ، کسی سے نہ ڈر ، پھر سو جا !
فرشتے تیری بند پلکوں پر بوسوں کا مینہ برساتے ہیں ۔
میں یہاں موجود ہوں کہ مبادا کوئی بُرا یا دردانگیز خواب تجھے مغموم کردے

تیرا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیکھ کر طوفان گزر جاتا ہے ،
بادل چھٹ جاتے ہیں ، ستارے نیلی قبا میں چمکتے ہیں ۔
سنجیدہ رات ، خوشگوار صبح میں تبدیل ہو جاتی ہے ——
تجھ سے پیار کرنے کے لئے

محبّت

لوگ مجھ سے سوال کیا کرتے تھے —— "محبت کیا ہے ؟"
میں انہیں اپنی سمجھ کے مطابق مناسب جواب دے دیا کرتا تھا
مگر یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب میں خود محبت کے حقیقی معنوں سے بےخبر تھا ۔
میرا دل برف کے مانند سرد تھا ۔
اُس میں محبت کی ایک شعاع بھی نہ تھی
تجربات نے میرے پہلے خیال کو غلط ثابت کر دیا ۔
آج میں خود لوگوں سے پوچھتا ہوں —— "محبت کیا چیز ہے ؟"

میں ایک ایک سے دریافت کرتا ہوں ——
"میرے سینے میں یہ آگ کیوں سُلگ رہی ہے ؟"

یہ کیسا ہاتھ ہے جس کی نازک انگلیاں میرے کلیجے کو ہر وقت مسلتی رہتی ہیں ؛
میں اندر ہی اندر کیوں پُھنکا جا رہا ہوں ؛
میرا دل شمع کی طرح کیوں پگھل رہا ہے ؛

میں جنُوں کی حالت میں دریا کے کنارے چلا گیا ـــــ کہ شاید
اُس کی رقصاں لہروں کا نظارہ میرے قلبِ مضطرب کو تسکین دے سکے۔
ایک گوشہ میں بیٹھا میں بڑبڑایا ـــــ "محبت کیا چیز ہے ؛"
ایک سال خوردہ بزرگ لاٹھی ٹیکتا ہؤا اُس طرف سے گزرا ـــــ اُس کا جسم کمزوری کے باعث لرز رہا تھا
اُس نے میری صدا سُنی اور مسکرا کر کہا ۔ "محبت ایک فطری کمزوری ہے جو ہمیں اپنے ابوالآبا سے ورثے میں ملی ہے۔"

وہ چلا گیا ـــــ مگر اُس کا جواب مجھے مطمئن نہ کر سکا، میں نے پھر بہ آوازِ بلند کہا "محبت کیا چیز ہے ؛"
ایک بوڑھی عورت کا ادھر سے گزر ہؤا ـــــ اُس نے میری دردانگیز صدا سُنی
اس نے نمناک آنکھوں سے کہا
محبت عہدِ شباب کا وہ شیریں خواب ہے جو منت کشِ تعبیر نہیں ـــــ خواب جس کی لذت
تمام عمر لوحِ دل سے محو نہیں ہوتی ۔

یہ جواب بھی مجھے مطمئن نہ کر سکا ۔
پھر وہی صدا میرے دِل سے نکلی ـــــ
"محبّت کیا چیز ہے ؛"
جواب میں ایک خوبصورت نوجوان یہ گاتا ہؤا گزر گیا ۔
"محبت قوت ہے، مسرت ہے، لذت ہے"

میں اپنے آوارہ خیالات کو یکجا کرنے نہ پایا تھا ـــــ کہ ایک فلسفی میرے قریب آیا۔

وہ بغل میں ایک بھاری بھرکم کتاب دابے ہوئے تھا۔
بال بکھر رہے تھے ——— اُس نے میری طرف غور سے دیکھا
میں نے اُس سے دریافت کیا ——— "محبت کیا چیز ہے"؟
اُس نے اپنی پیشانی کو شکن آلود کرتے ہوئے کہا
"محبت ——— محبت مَوت کی طرح انسانی قالب کی ماہیت تبدیل کر دینے والی چیز ہے۔"

اسی اثنا میں علمِ ہیئت کے ایک ماہر کا اِدھر سے گزر ہُوا۔
ہاتھ میں دُوربین تھی اور نگاہیں آسمان پر جمی ہوئی تھیں ——— میں نے پوچھا
"تمہارا ذہن آسمان تک کی خبر لاتا ہے، کیا تم یہ بتا سکتے ہو، محبت کیا چیز ہے؟"
بولا "محبت وہ کشش ہے جس کی وجہ سے ستارے آسمان پر اپنی اپنی جگہ قائم ہیں۔"

اس جواب سے بھی میں مطمئن نہ ہُوا ——— میں پھر اپنے خیال میں ڈوب گیا۔
اب پھر وہی سوال وردِ زبان تھا ——— "محبت کیا چیز ہے؟"
میری صدا ایک بچے نے سُنی جو اپنی گیند اُچھالتا دوڑتا چلا آ رہا تھا۔
اُس نے جواب دیا "محبت میری امّی ہیں ——— محبت میرے ابّا ہیں ——— ان دونوں کے سوا اور کسی کے پاس محبت نہیں؟"
اس خُرد سال بچے کا جواب پُرمعنی ضرور تھا مگر محبت کے حقیقی معنی پھر بھی میری سمجھ میں نہ آئے۔
میں بار بار یہی پکارتا رہا ——— "محبت کیا چیز ہے؟ ——— محبت کیا چیز ہے؟"

شام کی تاریکی کاجل کی طرح برسنے لگی ——— پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں چلے گئے۔
دریا کا پانی ساکن ہو گیا ——— لوگوں کی آمد و رفت بند ہو گئی۔
لیکن میں بدستور وہیں بیٹھا اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا ———
"محبت کیا چیز ہے؟ ——— محبت کیا چیز ہے؟"

یکایک میری نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھیں ——— بادلوں میں سے کوئی جھانک کر کہہ رہا تھا۔
"محبت خدا ہے ——— خدا محبت ہے!"

میرے مُنہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی ——— میں بیہوش ہو کر گر پڑا
ہوش میں آنے پر میں نے لوگوں کو اپنے گرد گھیرا ڈالے ہوئے پایا ———
میں اُن سے کہہ رہا تھا
"محبت کرو اور خدا ہو جاؤ"

نقاب کشائی

اے موہوم سایو، تمہارے قاتل کون ہیں؟ ——— بولو!
کس نے تمہارے سینے میں یہ مہلک خنجر گھونپ دیا ہے؟
اے زمانہ کی سربلند ہستیو، اپنی مہرِ خاموشی توڑو،
اپنی تاریکی سے نکل کر حقیقت کی نقاب کشائی کرو!
تمہارا نام ———؟
"مذہب"
اور تمہارا قاتل ———؟
"پادری"
تم تینوں، تمہارے نام؟
"سچائی، نیکی، ایمان ———"
تمہیں کس نے گرا کر موت کے حوالے کیا؟
"کلیسا نے"
اور تم اندھیرے میں کون ہو؟

"مجھے 'حقوق عوام' کے نام سے پکارتے ہیں"
اچھا بتاؤ تم کس کے ہاتھوں ہلاک ہوئے؟
"حلفِ وفاداری کے ہاتھوں"
اور تم جو خون میں غرق ہو؟
"میرا نام 'عدل' تھا"
تمہیں کس نے ہلاک کیا؟
"منفعت نے"

عوام کا تحمّل

کتنی بار لوگوں نے کہا ہے —— "طاقت کیا ہے؟"
جو آج راج کرتا ہے کیا وہ کل تخت سے نہیں اُتر جائے گا؟
ہر گھڑی عوام کے لئے نئی مصیبت کا پیغام لاتی ہے —— مگر
وہ ایک عالی مزاج کی طرح —— ظالم مگر عادل انجام کا انتظار کرتے ہیں۔
واقعات کی رفتار کا نتیجہ دیکھتے ہیں
اعتمادِ نفس نے انہیں قوتِ برداشت دے دی ہے۔
انتہائی طاقت رکھنے کے باوجود ہاتھ نہیں اُٹھاتے ——
اپنی عطا کردہ طاقت سے مسلح —— "فردِ واحد" کو "قوم" کے خلاف بے سود کوشاں دیکھ کر —— وہ اُسے طاقت آزمائی کے لئے ڈھیل دے دیتے ہیں۔

سعادت حسن

اپنی محبوبہ کے مرنے پر

اے بے رحم وسفاک موت !
میری محبوبہ کی زندگی نے تجھے کیا دُکھ پہنچایا تھا
جو تُو نے اسے مجھ سے چھین لیا ،

ہم دونوں ایک تھے ،
ایک رُوح تھی
اور دو زندگیاں ۔

اے سنگین و بدخُو موت !
تیرا انتقام اُس وقت تک پُورا نہ ہوگا
جب تک کہ تُو میری زندگی کا بھی خاتمہ نہ کرلے

میری محبوبہ ،
آہ میری محبوبہ اور میں ،

وہ اب مرچکی ہے
میں زندہ ہوں
مگر بے جان
اُسی رنگین پتھر کی طرح
جو قبرستان کی دیوار میں لگا ہو !!

(وکٹر ہیوگو ۔ یکوئے ولال)

ترجمہ عظیم قریشی

جارج سیں کی تصویر

(گسٹاؤ فلابرٹ کی طرف سے جارج سینڈ کے نام ایک خط)

کراؤسے

ہفتہ کی شام ۔ ۔ ۔ ۔ سنہ ۱۸۶۶ء

تمہاری تصویر، آہ دُنیا کی ایک حسین ترین اور جلیل القدر ادیبہ کی تصویر مجھے مِل گئی !! اے اللہ کتنا محبوب و دلکش چہرہ ہے اور کِس قدر سادہ معصوم !! میں اس کا قدِ آدم فریم بنوا کر اپنی پہلی ہی فرصت میں اِسے اپنی مطالعہ گاہ کی دیوار پر آویزاں کردونگا !!

ایک دوست نے ایسے ہی ایک موقع پر اپنے ایک دوست کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا " یہ دُنیا کی سب سے بڑی عزت ہے جو میرے گھر آج نصیب ہوئی ہے !! " اسی فقرے کو دُہرا کر اگر میں تمہارا شکریہ ادا کروں، تو وہ یقیناً تمہاری شان کے شایاں نہ ہوگا، کیونکہ تم میری نظروں میں ایک دوست کے رُتبے سے کہیں بالاتر ہو !!

اِن دونوں میں سے مجھے کاوچ والی تصویر زیادہ پسند آئی، مارشل نے تو تم میں صرف "شرافتِ نسوانی کی جھلک" دیکھی ہے !! مگر میں (جو بخرانٹ حسن پرست ہوں) دوسری کے اندر "ایک طباع مصنفہ کا دماغ" پاتا ہوں جس کے رنگین تصورات سے میری جوانی ایک طویل عرصے سے لطف اندوز ہوتی رہی ہے !!

ترجمہ عظیم قریشی

ہم آج ارضِ محبت میں ہیں !
کہاں چلیں !
چلیں یا یہیں ٹھہرے رہیں ——
اور یا کشتی کھینا شروع کردیں ، پیاری !

ہمارے ملاح عشق پیشہ نوجوان ہیں ،
ہمارے بادبان فاختاؤں کی چونچیں ،
ہمارے تختۂ جہاز زرِ خالص ،
ہماری رسیاں جواں مرگ دوشیزہ کے بال ،
ہم آج ارضِ محبت میں ہیں ،

ہم تمہیں کہاں لے چلیں ، شیریں ؛
اجنبیوں کے کھیتوں میں ؟
اپنے وطن کے مرغزاروں میں ؟
یا جہاں آتشیں پھول کھلتے ہیں ،
یا سپید کلیاں لہلہاتی ہیں ؛
ہم آج ارضِ محبت میں ہیں !

مترجمہ سعادت حسن — گوئٹے

بودلیئر کی ایک نظمِ منثور

بودلیئر کو نثر میں بھی تقریباً ویسی ہی قدرت حاصل تھی جیسی نظم میں - اس کی کتاب "چھوٹی چھوٹی منثور نظمیں" بھی اس کے اشعار کی طرح بہت مقبول ہوئی - بودلیئر کو سیاہ رنگ اور دھندلکے سے (غالباً پُراسرار ہونے کے باعث) خاص دلچسپی تھی - اس کے برعکس مشہور فرانسیسی افسانہ نگار اور شاعر گوتئے کو سفید رنگ پسند تھا - چنانچہ اس نے ایک عورت کے حسن کی تعریف میں ایک نظم لکھی تھی جس میں اس نے عورت کی ایک سفید اور روشن تصویر پیش کی تھی - اس نظم کو ہم "سفید راگ" کہہ سکتے ہیں لیکن بودلیئر نے ایک دوسری عورت کی تعریف میں ایک نظم لکھی جو اسی مناسبت سے "سیاہ راگ" کہلا سکتی ہے - اس نظم کا عاجلانہ ترجمہ جو ظاہر ہے کہ اصل کی طرح دلکش نہیں ہو سکتا ذیل میں درج کیا جاتا ہے :-

وہ سیاہ لباس میں ملبوس رات اور تاریکی کی ایک دیوی معلوم ہوتی ہے - اس کی آنکھیں دو ایسے پاتال توڑ غار ہیں جن میں اَن بُوجھے اسرار جھلملا رہے ہوں لیکن ان آنکھوں کی ایک ہی غلط انداز نگاہ تلملاتے ہوئے کوندے کی طرح رات کے تاریک سینے کو پھاڑ کر نُور کا ایک طُوفان برپا کر سکتی ہے -

---

وہ آبنوس کا ایک سُورج ہے ، ایک کالا ستارہ ! لیکن اس کے گرد و پیش نور و مسرت کی شعاعیں رقص کر رہی ہیں - نہیں ! بلکہ وہ ایک چاند ہے - شاعروں کے پیلے پیلے چاند کی طرح ایک ٹھٹھرتی ہوئی شرمیلی دُلہن نہیں بلکہ وہ تُند چکّر کھاتا اور چکراتا ہُوا چاند جو ایک

ڈراؤنی، کالی، طوفانی رات میں گھنگھور گھٹاؤں سے دست و گریباں ہو رہا ہو۔

ہاں! وہ نقرئی ستارہ نہیں، جو میٹھی نیند سونے والوں کے سنہرے خوابوں پر جلوہ افشاں رہتا ہے۔ بلکہ ایک سیاہ تاب، جھلائی ہوئی دیوی جسے آسمانی جادوگروں کے منتر نے نامعلوم مدتوں سے ڈرتی ہوئی زمین کے لرزتے اور کپکپاتے ہوئے سینے پر ایک جناتی ناچ ناچنے کے لئے مجبور کر رکھا ہو۔

اُس کے چھوٹے سے سر میں شکار کی خواہش کا ایک آہنیں عزم کروٹیں لے رہا ہے، لیکن اِس کے باوجود اُس کے چہرے کا حسن روح پر ایک نورانی بادل بن کر چھائے جاتا ہے۔ اُس کے ترشے ہوئے نتھنوں کی سانس کوئی منتر پھونکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اس کے سُرخ و سفید اور پیارے پیارے شیریں ہونٹوں میں ایک ایسی رنگین تابنا کی جھلکیاں دکھا رہی ہے۔ جس کی مثال اُس معصوم پھُول سے دی جا سکتی ہے جو کسی آتش فشاں کے دہانے پر کھِل رہا ہو۔

حامد علی خاں

ٹیلیفون ۵۹۹

پتہ درست کر لیجئے

جب آپ یا آپ کے عزیز بیمار ہوتے ہیں تب آپ کو حکیم اجمل خاں صاحب کے دواخانہ کی تلاش ہوتی ہے، دھوکہ باز عطار اپنی فہرستوں اور اشتہاروں میں ان کا نام بڑی خوبصورتی سے طرح طرح استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ آپ کو دھوکہ دے سکیں۔ آپ دھوکا کھا جاتے ہیں اور آپ کے پاس دھوکا باز عطاروں کے کارخانوں سے غلط دوائیں بھی پہنچ جاتی ہیں اور جب آپ کو ان سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچتا ہے تو آپ حکیم اجمل خاں صاحب کے دواخانہ کو بدنام کرتے ہیں، اسلئے آپ پتہ نوٹ کر لیجئے اور یاد رکھئے کہ حکیم صاحب مرحوم نے اپنے نام سے کوئی دواخانہ اپنی زندگی میں نہیں کھولا بلکہ جو دواخانہ عطائی اور جاہل عطاروں کے دھوکہ سے بچانے کیلئے سنہ ۱۹۰۳ء میں جاری کیا، اس کا نام

ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی

رکھا جس کی کل آمدنی سالانہ دو لاکھ روپیہ کے قریب ہے اور جس میں ڈیڑھ سو آدمی فرمائشات کی تعمیل کرتے ہیں اور جس کا کل نفع آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج دہلی پر صرف ہوتا ہے۔

طبیہ کالج کا خرچ تقریباً دس ہزار روپیہ ماہوار ہے جو ہندوستانی دواخانہ برداشت کرتا ہے۔ گویا

ہم آپ سے ایک ہاتھ سے لیتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے آپ پر صرف کر دیتے ہیں

حکیم صاحب کا مشن صحیح دوا بہم پہنچانا اور مستند حکیم پیدا کرنا تھا، زندگی میں انہوں نے اس مقصد کو پورا کیا اور اب ان کے جانشین ہندوستانی دواخانہ کے سرپرست عالی جناب حکیم محمد احمد خاں صاحب بالقابہ تنہا ان کے مشن کو پورا کر رہے ہیں۔

نوٹ (۱) باہر سے جو بعض اپنے حالات مرض لکھکر روانہ کرتے ہیں ان کو حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا ہے اور حکیم صاحب کے مشورہ کے بعد حسب فرمائش دوائیں روانہ کر دی جاتی ہیں یا اُن کو مجوزہ دوا سے مطلع کر دیا جاتا ہے۔

(۲) پانچ سیر تک کا پارسل بذریعہ ڈاک روانہ ہو سکتا ہے، پانچ سیر سے زیادہ وزن کا پارسل بذریعہ سواری گاڑی روانہ ہوگا لیکن اس کیلئے نصف قیمت پیشگی آنا ضروری ہے۔

(۳) کارخانہ میں ہر زبان کی فہرستیں تیار رہتی ہیں۔ اُردو، ہندی، انگریزی، گجراتی اور بنگالی میں سے جس زبان کی فہرست مطلوب ہو مفت طلب کیجئے۔

(۴) پتہ صاف اور خوشخط لکھئے۔

چند مفید دوائیں

مصفی خون کی ہر قسم کی خرابی کو دور کرنے میں اکسیر ہے۔ گرمی دانے، پھوڑے پھنسیاں، داد، چھاجن، برص، سوزاک، آتشک سب میں یکساں مفید ہے۔ جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اسلئے حفظ ماتقدم کیلئے حالت تندرستی میں بھی استعمال کر سکتے اور بچوں کو بھی دے سکتے ہیں۔ ترکیب استعمال۔ ایک ایک خوراک ٹھنڈے پانی میں ملا کر صبح دوپہر و شام پی جاتی ہے۔ قیمت ۲۴ خوراک ڈیڑھ روپیہ (محصول ڈاک علاوہ)

اکسیر نسواں رحم سے رطوبت آنے (لیکوریا) اور حیض کی بے قاعدگی میں نہایت مفید ہے۔ حمل نہ ٹھہرنا یا بار بار ساقط ہو جانا، حیض کا درد سے آنا، کمر اور پنڈلیوں کا درد، رحم کا ضعف، درد رحم، ان سب شکایتوں میں حیرت انگیز نفع پہنچاتی ہے۔ ہسٹیریا میں بھی مفید ہے۔ حاملہ کیلئے اس کا استعمال ممنوع ہے۔

قیمت فی شیشی بارہ آنہ ۱۲ (محصول ڈاک علاوہ)

ملنے کا پتہ:- ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی

بجلی کی منظور شدہ درسگاہ

ہے

سکول فار الیکٹریشنز لدھیانہ

جو گورنمنٹ رجسٹرڈ ہے۔ اس میں ہر قابلیت کے طلبا داخل ہوتے ہیں
سکول کا اپنا پاور ہوس ہے جس میں اے سی و ڈی سی دونو قسم کے بڑے ڈائنیمو ہیں
سٹی اینڈ گلڈز انسٹیٹیوٹ کے امتحان کیلئے بھی طلبا کو تیار کیا جاتا ہے۔ جناب
وزیر تعلیم اور چیف الیکٹریکل انجنیئر پنجاب اس سکول کی تعلیم ضبط اور نظم
ونسق پر اطمینان فرما چکے ہیں۔ انسپکٹر آف انڈسٹریز پنجاب نے
تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ایسی اچھی تعلیم کی توقع صرف انگلستان
کے سکولوں سے ہی کی جا سکتی ہے۔

پراسپکٹس مفت بھیجے جاتے ہیں

"مینجر"

رسالہ "ہمایوں"

کے

۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۳ء تک کے

مختلف پرچے دفتر میں موجود ہیں۔

ضرورت مند اصحاب فی پرچہ ۲؍ کے ٹکٹ ارسال کر کے طلب فرما سکتے ہیں

مینجر "ہمایوں" لاہور

افسانہائے عشق

مثالی محبت کی پاکیزہ حکایات کا ایک بے نظیر مجموعہ

یہ حامد علی خاں بی اے جائنٹ ایڈیٹر ہمایوں کی وہ کتاب ہے جس کی
تعریف میں اس کے شائع ہوتے ہی طول و عرض ملک کے نقاد اور اخبارات و رسائل متفق الرائے ہو کر رطب اللسان ہو گئے ہیں

زمیندار کی رائے ہے کہ انداز تحریر شگفتہ اور دلاویز ہے۔ الفاظ میں سلاست اور لوچ ہے پڑھنے سے طبیعت ایک کیفیت اہتزاز محسوس کرتی ہے۔

رسالہ ساقی دہلی کی رائے ہے کہ حسن کی ہلاکت پسندی اور عشق کی نامرادی ہر افسانے کا موضوع ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب اپنے اندر ادب لطیف کا خزانہ لئے ہوئے ہے۔

رسالہ ندیم (گیا) کی رائے ہے۔ عورت کے احساسات کی تصویر کشی نہایت مشکل امر ہے اور ایک ماہر نفسیات کی دسترس سے بھی باہر لیکن یہ افسانے جذبات نسائی کے بھی پورے پورے مظہر ہیں۔ ترجمہ میں شوکت الفاظ اور دلکش مؤثر اسلوب نگارش نشست الفاظ۔ انتخاب مرادفات اور موقع استعمال پر پوری قدرت کے لحاظ سے اردو ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ **قیمت ایک روپیہ تیرہ آنے معہ محصول۔**

حامد کے سو شعر

یہ کتاب معنوی محاسن کے علاوہ ظاہری لحاظ سے بھی قابل دید ہے۔ تمام کتاب چکنے اور دبیز کاغذ پر رنگین چھپی ہے اور خوبصورت سرورق پر بلاک کی چھپائی ہے۔ قیمت فی جلد دس آنے معہ محصول ڈاک

اعاظم کی آرا پروفیسر سید محمد جمیل صاحب واسطی ایم اے ان اشعار میں سے چند ایسے ہیں کہ جن میں نے پہلے ایک دفعہ بھی پڑھے ہوں اور ایک دفعہ پھر سننے کا شوق نہ ہوا ہو۔ حامد کی شاعری پیچ پنجابی شاعری کے نئے دور کی ترجمان ہے۔ جناب سید عبد الرشید صاحب عالم - یہ ننھی منی اور حسین و جمیل کتاب اتنی گراں مایہ ہے کہ ... ایک ... معلوم ہوتی ہے۔

دفتر ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور

بہار نمبر
سالانہ چندہ
رسالہ "ندیم" گیا
بہار نمبر
لندپایہ مقالوں، معیاری فسانوں، اعلیٰ ڈراموں،
جد آفریں نظموں، پرکیف غزلوں،
لچسپ مزاحیہ مضامین اور آرٹ
ی رنگین تصاویر کا حامل
ہوگا۔
بہار نمبر
کی نمایاں خصوصیت یہ ہوگی کہ اسکے لکھنے والے
سب کے سب بہاری حضرات
ہوں گے۔ اور اس کی
تصویریں بھی بہاری آرٹسٹوں کی
شاہکار ہونگی
کا
دوسرا
بہار نمبر ۱۹۳۵ء
ستمبر ۱۹۳۵ء میں نہایت ہی آب و تاب سے
شائع ہو جائے گا
بہار نمبر
بہار کے ادب اور آرٹ کا بہترین نمونہ ہوگا
قیمت صرف (علاوہ محصولڈاک)
مستقل خریداروں کو مفت
بہار نمبر
ں آرٹ کی تصویروں کے علاوہ صوبہ کے
شہور ادبا اور شعراء ونیز دلچسپ مناظر
مقامات کی تصویریں ہونگی۔
انتظار کیجیے
میں شائع ہوگا
ستمبر ۱۹۳۵ء
مشتہرین کیلئے خاص رعایت رکھی گئی ہے
N. Ahmad
Rajhati

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمایئے

اعلیٰ طبقہ کی خواتین سر میں لگانے کیلئے اس کارخانہ کا تیار کردہ بانو ہیر آئل استعمال کرتی ہیں۔

یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے۔

سید عبداللطیف پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

قواعد

۱- "ھمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ۱/ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸/

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳- لارنس روڈ- لاہور

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلۃ آنربیبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔اے

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ اگست ۱۹۳۵ء

جلد ۲۸ — نمبر ۲

تصویر:- بھولا ہوا سبق

چندہ سالانہ ۶ ششماہی ۳ مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸/

جہاں نما

ایڈورڈ ہفتم اور ہندوستان

ایڈورڈ ہفتم کی جو سوانحعمری سر سڈنی لی نے مرتب کی ہے اس میں بادشاہ اور اس وقت کے وزیر ہند لارڈ مارلے کی کچھ دلچسپ خط وکتابت شائع ہوئی ہے۔ لارڈ مارلے اور لارڈ منٹو (وائسرائے) دونوں تہیہ کر چکے تھے کہ لارڈ (اس وقت مسٹر) سنہا وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن نامزد کیے جائیں۔ بادشاہ کو اس اقدام پر سخت اعتراضات تھے۔ سوانحعمری میں لکھا ہے:۔

یہ تجویز کہ وائسرائے کی کونسل میں ہندوستانی اراکین بھی داخل کیے جائیں ۳ مئی ۱۹۰۷ء ہی کو کیبنٹ کی منظوری حاصل کر چکی تھی لیکن بادشاہ اور دار الامراء کے بہت سے اراکین نے اس بنا پر اس سے اختلاف کیا کہ اس سے والیان ریاست برا مانیں گے چنانچہ اس کے بعد دو سال گذر گئے جب مسٹر سنہا کا نام جو ایک قابل ہندو قانون دان تھے وائسرائے کی کونسل کے ایک مناسب رکن کے طور پر پیش کیا گیا۔ ۲۴ فروری ۱۹۰۹ء کو لارڈ مارلے نے بادشاہ سے ایک طویل ملاقات کی۔ مارلے نے لکھا ہے کہ دیسی رکن کی نامزدگی کا خیال بادشاہ کے لئے بہت تکلیف دہ بن رہا تھا۔ مارلے نے اس باب میں بادشاہ کو دو خط لکھے پہلے خط کا جواب بادشاہ نے ۱۲ مارچ کو بیارٹز سے دیا:۔

ملک معظم کو افسوس ہے کہ وہ اس بات کے متعلق اپنا نقطۂ خیال تبدیل نہیں کر سکتے اور انہوں نے بھی اس باب میں اتنا ہی غور کر لیا ہے جتنا کہ لارڈ مارلے نے۔ ان کی اب بھی یہی رائے ہے کہ یہ تجویز سلطنت ہند میں برطانی حکومت کے قیام کے لئے گوناگوں خطرات کا موجب ثابت ہوگی۔ اس خیال کی صحت کے دلائل وزیر ہند اور وائسرائے کو یکساں اچھی طرح معلوم ہیں لیکن چونکہ آخر الذکر کو اس باب میں بہت اصرار ہے اور کیبنٹ کونسل کے آخری اجلاس میں اراکین حکومت اس امر کے متعلق متفق الرائے تھے اس لئے ملک معظم کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ بادل ناخواستہ اپنی رائے سے دست کش ہو جائیں۔

دوسرے خط کے جواب میں بھی بادشاہ نے احتجاج کرتے ہوئے بہت تلخ جذبات کا اظہار کیا لیکن یہ بھی تسلیم کیا کہ ایک متفق الرائے بابِ حکومت کے خلاف کوئی چارۂ کار نہیں۔ مارلے نے جواب میں لکھا کہ میرا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ ملکۂ وکٹوریہ کے وعدے کا یہ ایفا اعلیٰحضرت کے لئے اپنی ہندوستانی رعایا کے دلوں میں محبت اور عقیدت کے گہرے جذبات پیدا کرنے کا

موجب ہوگا۔

ملکۂ وکٹوریا کے نام کے اس استعمال کے متعلق بادشاہ نے حاشیے پر یہ چبھتے ہوئے فقرے لکھے :۔

"یہ میرے خط کا جواب ہے! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ملکۂ وکٹوریا کا نام کیوں لیا جائے اور اس باب میں یہ ذکر کس طرح اثرانداز ہوسکتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ کبھی اس نئے اقدام کی اجازت دیتیں اگرچہ مجھے مجبوراً اس قابل اعتراض کاغذ پر دستخط ثبت کرنے پڑے ہیں"—— ای۔آر۔ ۲۰ مارچ

لارڈ منٹو کی بھی اس موضوع کے متعلق بادشاہ سے خط و کتابت ہوئی تھی۔ بادشاہ کے خطوں میں سے ایک خط کا کچھ حصہ درج ذیل ہے :۔

"مائی ڈیئر منٹو—— چونکہ تم نہایت شدّت سے اس نئے اقدام کے حق میں ہو اور تم نے اس کی حمایت میں بہت سے قوی دلائل پیش کئے ہیں میں تم سے اور وزیرِ ہند سے اس بات میں اختلاف نہیں کرنا چاہتا —— لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس باب میں میرے خیالات بھی بہت قوی ہیں جو شاید پُرانے فیشن کے سمجھے جائیں لیکن میرا بیٹا جو ابھی ہی ہندوستان سے واپس آیا ہے مجھ سے پوری طرح متفق ہے۔

ہندوستان کی موجودہ بے چینی اور دیسیوں کی سازش کے پیشِ نظر یہ امر سلطنتِ ہند کے لئے بہت خطرناک ہے کہ کوئی دیسی وائسرائے کی کونسل کا رکن ہو کیونکہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے ایک دیسی کا آگاہ ہونا کسی طرح مناسب نہیں۔ اس کے علاوہ اگر ایک ہندو کو لیا جاتا ہے تو مسلمان کو کیوں نہ لیا جائے۔ آخرالذکر یقیناً پورے زور سے اپنا حق طلب کرے گا۔ اگر موجودہ تجربہ جس کے تم اس قدر حامی ہو بعد میں نامناسب ثابت ہُوا تو یاد رکھو پھر تم کبھی اس دیسی سے نجات حاصل کرنے کے قابل نہ ہوسکو گے۔ ہندوستانی والیانِ ریاست جو وائسرائے اور اس کی کونسل کی سیادت کو تسلیم کرتے ہیں کبھی یہ گوارا نہ کریں گے کہ ایک دیسی جو بلحاظ ذات پات کے اُن سے بہت کم رُتبہ ہے حکومتِ ملک میں حصہ لے۔ یہ دیسی خواہ کتنا ہی 'ذہین' کیوں نہ ہو اور تم یا تمہاری کونسل اسے خواہ کتنا ہی وفادار کیوں نہ سمجھے اِس سے اِنکار نہیں ہوسکتا کہ وہ تمہاری کونسل میں ایک خطرناک عنصر ثابت ہوسکتا ہے۔ اور اپنے ہموطنوں کو ایسی اطلاعات بہم پہنچا سکتا ہے جن کا تمہاری کونسل سے باہر نکلنا سخت نامناسب ہوگا۔"

ہندوستان میں کتب خانوں کی تحریک

ہندوستان میں کتب خانوں کی تحریک ابھی بالکل نئی ہے اور اِس لئے اسے ابھی پوری تقویت حاصل نہیں ہوئی لیکن

اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔

آل انڈیا لائبریری کانفرنس کا دوسرا سالانہ اجلاس کچھ عرصہ قبل لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس کے صدر ڈاکٹر اے سی وُلنر وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر آر۔ پی۔ پرنجپائے مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ اپنی تقریر میں نمائندوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے مسٹر پرنجپائے نے مختلف قسم کے کتب خانوں کا ذکر کیا اور کانفرنس کی توجہ دو اہم امور کی طرف منعطف کرائی۔

پرانی کتابوں کے جمع کرنے کا کام

ان میں سے ایک تو ان پرانی کتابوں کے جمع کرنے اور مناسب کتب خانوں میں رکھنے کا کام ہے جو ہندوستان بھر میں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں۔ اگر اس کام میں مزید تاخیر کی گئی تو یقیناً پرانی کتابیں ہمیشہ کے لئے کھو جائیں گی۔ یہ کام اب بھی کسی حد تک بعض صوبوں کی حکومتیں کر رہی ہیں لیکن اس کی رفتار بہت سست ہے۔ اس کے علاوہ یہ کام منظم طریقے سے بہت وسیع پیمانے پر ہونا چاہئے۔

ہندوستانی زبانوں میں تراجم کا کام

ایک اور اہم کام یہ ہے کہ مختلف ہندوستانی زبانوں میں مناسب ادبی ذخیرہ منتقل کیا جائے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کتابوں کی اشاعت کا کام کہاں تک اس کانفرنس کے دائرۂ عمل میں ہے لیکن میرا یہ ہمیشہ سے خیال رہا ہے کہ ہندوستانی زبانوں میں ہر موضوع کے متعلق عام فہم کتابیں شائع کی جائیں تاکہ ہندوستان کی آبادی کا وہ وسیع حصہ جو اپنی ملکی زبان کے علاوہ اور کسی زبان سے واقف نہیں جدید خیالات سے بالکل الگ تھلگ نہ رہے۔ ہندوستانی اکیڈیمی کی طرح بعض ادارات اس قسم کا کام کر رہے ہیں لیکن اس کی مثال سمندر میں ایک قطرے کے برابر ہے۔

ڈاکٹر وُلنر کا خطبۂ صدارت

ڈاکٹر وُلنر کا خطبۂ صدارت بھی بہت پُر از معلومات تھا۔ انہوں نے کہا بعض دوست ہم سے اضمحلال آمیز دلچسپی سے پوچھتے ہیں "لائبریری کانفرنس کیا چیز ہے۔" میرا خیال ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ ملک میں بہت سے کتب خانے موجود ہیں اور انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ ان کتب خانوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے بعض مشترک مفاد بھی ہیں جن کے متعلق وہ آپس میں گفت و شنید کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ پُل بنانے والے انجنیئروں اور روشنی کے میناروں سے تعلق رکھنے والوں کو کانفرنس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح کتب خانوں سے تعلق رکھنے والے بھی کانفرنس کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ عوام کے نزدیک کتب خانے پُلوں اور روشنی کے میناروں کے برابر اہم نہیں۔ ریلوے کا ایک ٹوٹا ہوا پُل یا روشنی کا ایک

مینار جو اپنا فرض ادا نہ کرے جان و مال کا زبردست نقصان کر سکتا ہے۔ اسی طرح پُلوں کی عدم موجودگی تجارت اور نظم و نسق کے لئے سدِ راہ ہو سکتی ہے اور روشنی کے میناروں کی کمی جہاز رانی کو خطرناک بنا سکتی ہے۔ لیکن کتب خانوں کے متعلق عوام حیران ہیں کہ انہیں کیا اہمیت حاصل ہے۔ کتب خانوں کے بند ہونے سے تجارت نہیں رُکتی نہ اس سے کوئی وبا پھیلتی ہے کسان تاجر، وکیل اور یہاں تک کہ معلمین بھی کتابوں کے بغیر یا چند کتابوں کے ساتھ اچھی طرح کام چلا سکتے ہیں۔ کتب خانے تو محض پڑھے لکھے لوگوں کے لئے دماغی تعیش کا سامان ہیں یا ایک یونیورسٹی یا کسی ادارے کا ایک رسمی تتمہ۔

اشاعتِ علم کی اہمیّت اور کتب خانوں کی تحریک کا مقصد

بہت سے لوگ اس بات کو مضحکہ خیز سمجھیں گے کہ علم کا منتقل کرنا سامانِ تجارت کے منتقل کرنے سے زیادہ اہم ہے اور اسی طرح نظم و نسق کے لئے علم کا نشو و نما آمد و رفت کے ذرائع کی ترقی سے زیادہ مفید ہے۔ یا علم کی روشنی انسانی زندگی کے لئے روشن میناروں اور جہاز رانی سے زیادہ ضروری ہے۔ اگر بعض لوگ علم کی فضیلت کے معترف بھی ہوں تو وہ علم کی اشاعت کے لئے کتب خانوں کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتے۔

کتب خانوں کی تحریک کے مقصد کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر ولنسر نے کہا کہ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ عوام اور حکومت کو کتب خانوں کی اہمیت کا اندازہ کرایا جائے اور اس بات کے متعلق عوام اور حکومت کے جمود کو توڑ کر انہیں احساس دلایا جائے کہ اس باب میں بخیلانہ طرزِ عمل بیہودہ جُزرسی ہے۔

غریب ملکوں کی مثال

اگر ہم بیرونی ممالک سے مثال حاصل کرنا چاہیں تو برطانیہ اور امریکہ جیسے امیر ملکوں کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر ولنسر نے دو غریب ملکوں کی مثال پیش کی۔ پہلی مثال سلوفینیوں کی تھی جو یوگوسلافیا کی آبادی کا ایک جزوِ قلیل ہیں۔ ان کی ایک الگ زبان ہے اور ان کی آبادی کا شمار ۱۵ لاکھ سے زیادہ نہیں جس میں سے دس لاکھ کے قریب چھوٹے چھوٹے شہروں میں اور پانچ لاکھ کے قریب ایسے دیہات میں آباد ہیں جن کی آبادی پانچ سو افراد سے کم نہیں۔ یہ ملک دولتمند نہیں اور اس کے باوجود میں نے گزشتہ سال کی ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ اس کے تمام شہروں اور بڑے بڑے دیہات میں سے اکثر میں عوام کے لئے کتب خانے اور ریڈنگ روم قائم ہیں۔ اور شہروں اور دیہات میں یکساں اکثر گھروں میں کتابوں کی الماریاں موجود ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک مکتبہ کے ۴۰۰۰۰ اور دوسرے کے ۳۰۰۰۰ رکن ہیں اور دو کے بیس بیس ہزار۔ بچوں کے کتب خانوں نے دس اور چودہ سال کے درمیان عمر کے ۲۳۰۰۰ بچوں کو ۱۰۰۰۰۰ کتابیں بہم پہنچائیں۔

بڑودہ | دوسری مثال بڑودہ کی ہے۔ اس کانفرنس کے ہر رکن کو معلوم ہوگا کہ اس ریاست میں ہز ہائنس گائیکواڑ کی ذاتی

توجہ اور دلچسپی کی وجہ سے کتب خانوں کے متعلق کتنا کام ہؤا ہے۔ بڑودہ میں کتب خانوں کی تحریک اِس نظامِ عمل کا ایک حصّہ ہے جو ہز ہائینس نے عوام کی تعلیم و تربیت کے لئے نہایت احتیاط سے مرتب کیا تھا۔ ۱۹۰۷ء تک ریاست کے بچوں کے لئے ابتدائی تعلیم لازم قرار دی جا چکی تھی۔ اس کے بعد جلد ہی یہ احساس کیا گیا کہ تعلیم عامہ کی ترقی کے لئے لائبریریوں کے ایک وسیع سلسلے کے قیام کی ضرورت ہے تاکہ شہر اور دیہات کے مردوں اور عورتوں کی رسائی علم کے ان دروازوں تک بہ آسانی ہو سکے جو اب تک ان کے لئے بند تھے۔ ہز ہائینس کو اصرار تھا کہ کتب خانوں کا فائدہ صرف چند انگریزی دان لوگوں تک محدود نہ ہونا چاہئے بلکہ لازم ہے کہ ریاست کا ہر فرد عوام کی یونیورسٹی ——— یعنی کتب خانے میں داخل ہو سکے۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں سرکاری کتب خانوں کے متعلق ایک تجویز مرتب ہوئی جو بہت جلد زیر عمل آگئی۔ ان کتب خانوں کا چندہ نہیں لیا جاتا۔ اب ریاست کے دیہات، قصبوں اور شہروں میں کتب خانوں کا ایک جال پھیلا ہؤا ہے۔ اس کے علاوہ سفری کتب خانے بھی ہیں۔ کتب خانوں کا یہ نظام آبادی کے ۶۰ فیصدی سے زاید حصّے کو کام دیتا ہے۔ تازہ ترین اعداد و شمار (۳۲-۱۹۳۱ء) سے مجھے معلوم ہؤا ہے کہ ۲۵ لاکھ کی آبادی کے لئے ۴۵ شہری اور ۸۰۰ سو سے زاید دیہاتی کتب خانوں کا انتظام ہے۔ اس کے علاوہ عورتوں اور بچوں کے لئے ۱۲ کتب خانے الگ ہیں اور ۲ سو ریڈنگ روم مستزاد۔

یورپ اور ہندوستان کی ان دونوں مثالوں کے مقابلے میں ہندوستان بحیثیت مجموعی نہایت پست حالت میں ہے۔

مذاہبِ عالم کا اتحاد

"ہندوستان ریویو" کی ایک گزشتہ اشاعت میں مسٹر جی۔ اے۔ چندورکر ایم۔ اے کا ایک بصیرت افروز مضمون شائع ہؤا تھا جس میں انہوں نے انسانی ثقافت کے انفرادی اور معاشری دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ تہذیب کی ترقی کی تاریخ میں جب کبھی معاشری پہلو کے بجائے انفرادی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا فائدے کے بجائے ہمیشہ الٹا نقصان ہؤا۔ ثقافت کا اجارہ نہ کبھی ایک قوم، نسل، یا جماعت کو ملا ہے اور نہ مل سکتا ہے۔ حقیقی ثقافت چند برگزیدہ لوگوں کی پرخلوص کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہے جو ایک معاشرہ کے افراد میں خواہ وہ امیر ہوں یا غریب حاکم ہوں یا محکوم، غلام ہوں یا آزاد علم و تہذیب اور صلح و آشتی پھیلانے کا موجب ہوتے ہیں۔ اگر اس قسم کی کوششیں کسی ایک گروہ کے ساتھ مخصوص ہو جائیں تو ثقافت کا مقصد اولیں ہی فوت ہو جائے گا اور ترقی کی جگہ ترقیٔ معکوس لے لے گی۔ حقیقی ثقافت میں بقائے اصلح کا سوال نہیں اس کا کام ناقابل کو قابل، ناتواں کو توانا، مفلس کو متموّل، بیمار کو صحت مند اور ذہین کو ذہین تر بنانا ہے۔ اس قسم کی ثقافت رحم و رأفت کی طرح خدا کی رحمت کی بارش ہوتی ہے اور یہ بخشنے اور قبول کرنے والے دونوں کے لئے موجب برکت

توجہ اور دلچسپی کی وجہ سے کتب خانوں کے متعلق کتنا کام ہوا ہے۔ برادوہ میں کتب خانوں کی تحریک اس نظام عمل کا ایک حصہ ہے جو ہز ہائنس نے عوام کی تعلیم و تربیت کے لئے نہایت احتیاط سے مرتب کیا تھا۔ ۱۹۰۷ء تک ریاست کے بچوں کے لئے ابتدائی تعلیم لازمی قرار دی جا چکی تھی۔ اس کے بعد جلد ہی یہ احساس کیا گیا کہ تعلیم عامہ کی ترقی کے لئے لائبریریوں کے ایک وسیع سلسلے کے قیام کی ضرورت ہے تاکہ شہر اور دیہات کے مردوں اور عورتوں کی رسائی علم کے ان دروازوں تک بہ آسانی ہو سکے جو اب تک ان کے لئے بند تھے۔ ہز ہائنس کو اصرار تھا کہ کتب خانوں کا فائدہ صرف چند انگریزی دان لوگوں تک محدود نہ ہونا چاہیئے بلکہ لازم ہے کہ ریاست کا ہر فرد عوام کی یونیورسٹی ——— یعنی کتب خانے میں داخل ہو سکے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۱ء میں سرکاری کتب خانوں کے متعلق ایک تجویز مرتب ہوئی جو بہت جلد زیر عمل آ گئی۔ ان کتب خانوں کا چندہ نہیں لیا جاتا۔ اب ریاست کے دیہات، قصبوں اور شہروں میں کتب خانوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ سفری کتب خانے بھی ہیں۔ کتب خانوں کا یہ نظام آبادی کے ۶۰ فیصدی سے زاید حصے کو کام دیتا ہے۔ تازہ ترین اعداد و شمار (سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء) سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ۲۵ لاکھ کی آبادی کے لئے ۴۵ شہری اور ۸ سو سے زاید دیہاتی کتب خانوں کا انتظام ہے۔ اس کے علاوہ عورتوں اور بچوں کے لئے ۱۲ کتب خانے الگ ہیں اور ۲ سو ریڈنگ روم مستزاد۔

یورپ اور ہندوستان کی ان دونوں مثالوں کے مقابلے میں ہندوستان بحیثیت مجموعی نہایت پست حالت میں ہے۔

مذاہب عالم کا اتحاد

"ہندوستان ریویو" کی ایک گزشتہ اشاعت میں مسٹر جی۔ اے۔ چندورکر ایم۔ اے کا ایک بصیرت افروز مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے انسانی ثقافت کے انفرادی اور معاشری دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ تہذیب کی ترقی کی تاریخ میں جب کبھی معاشری پہلو کے بجائے انفرادی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا فائدے کے بجائے ہمیشہ الٹا نقصان ہوا۔

ثقافت کا اجارہ نہ کبھی ایک قوم، نسل، یا جماعت کو ملا ہے اور نہ مل سکتا ہے۔ حقیقی ثقافت چند برگزیدہ لوگوں کی پُرخلوص کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہے جو ایک معاشرہ کے افراد میں خواہ وہ امیر ہوں یا غریب حاکم ہوں یا محکوم، غلام ہوں یا آزاد علم و بصیرت اور صلح و آشتی پھیلانے کا موجب ہوتے ہیں۔ اگر اس قسم کی کوششیں کسی ایک گروہ کے ساتھ مخصوص ہو جائیں تو ثقافت کا مقصد اولیں ہی فوت ہو جائے گا اور ترقی کی جگہ ترقی معکوس لے لے گی۔ حقیقی ثقافت میں بقائے اصلح کا سوال نہیں۔ اس کا کام ناقابل کو قابل، ناتواں کو توانا، مفلس کو متمول، بیمار کو صحت مند اور ذہین کو ذہین تر بنانا ہے۔ اس قسم کی ثقافت پر رحم و رفعت کی طرح خدا کی رحمت کی بارش ہوتی ہے اور یہ بخشنے اور قبول کرنے والے دونوں کے لئے موجب برکت

بھولا ہوا سدن

ہوتی ہے۔

راقمِ مضمون نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس باب میں قوموں کی زندگی کا اقتصادی پہلو بھی قابلِ توجہ ہے اور عوام کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لئے خانگی صنعتوں کا احیا، وارتقا بھی صحیح طریقِ کار ہے۔

مذاہبِ عالم کے اتحاد کا مسئلہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا یہ پیچیدہ ہے۔ اس پر بہت سے اقتصادی اور تعلیمی اثرات کا عمل درعمل ہوتا ہے۔ لیکن اس کام کی عظمت سے مرعوب ہو کر کسی شخص کو اس سمندر کے لئے اپنا قطرہ پیش کرنے سے ہچکچانا نہیں چاہئے۔ یہ مسئلہ انسانیتِ کبریٰ کا مسئلہ ہے۔ عہدِ حاضر کی روح ایک بین الاقوامی قوم کے نشو و نما کی متقاضی ہے۔ اتحادِ مذاہب اس کا قصرِ رفیع ہے اور ذہنی تعاون اس کے دروازے کی کنجی۔

ہور کا پیغام ٹیگور کے نام

سرسیموئل ہور نے ڈاکٹر ٹیگور کو ان کی پچھترویں سالگرہ پر مبارک باد دیتے ہوئے ذیل کا پیغام بھیجا:۔

"مشرق اور مغرب کے لئے ایک دوسرے کو سمجھنا ضروری ہے۔ اور اس کا ذریعہ انگریزی زبان سے بہتر اور کوئی نہیں۔ انگریزی زبان پر آپ کو جو قدرت حاصل ہے اس سے آپ نے اس مقصد کے حصول کے لئے بڑا کام کیا ہے۔"

ہور کا یہ خیال بہت مبارک ہے لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے ہندوستانیوں کا انگریزی لکھنا اور بولنا ہی کافی نہیں بلکہ انگریزوں کو بھی اردو میں وہی درجہ حاصل کرنا چاہئے جو ہندوستانی ان کی زبان میں حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر کامل طور پر باہمی افہام و تفہیم ناممکن ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

فاسیّت اور معاشری انقلاب

یورپ کی سیاسی بساط کے شاطر ـــــ مسولینی اور ہٹلر ـــــ دُنیا کو ایک دفعہ پھر آہن و آتش کا کھیل دکھانا چاہتے ہیں جنگ عظیم کے بعد کی اعضا شکنی، اضمحلال اور پست ہمتی پندرہ برس کے آرام و سکون کے بعد نئی جنگ کے لئے کمربستہ ہو رہی ہے۔ معاشی بے چینی اور سیاسی بے اطمینانی نے فاسیت کو پیدا کیا تھا ـــــ کس طرح: اس کا جواب بہت طویل ہے مگر چونکہ اٹلی نے اس پودے کو پروان چڑھایا۔ اِس لئے اِس مضمون میں ابتداً صرف اطالوی فاسیت کے نشو و ارتقا پر مجبوراً بحث کی گئی ہے۔ بہت سے مسائل کا تعلق تمام دُنیا کے (مثلاً جرمنی، آسٹریا، انگلستانی ـــــ اور کسی حد تک امریکی) فاسی رجحانات سے ہے جن سے اس مضمون کے دوسرے حصہ میں کسی قدر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

مضمون میں کتابوں اور اخباروں کے حوالے جابجا دیئے گئے ہیں تاکہ ہمدردانِ فاسیت کو میری جانب سے "طعن و تعریض" کا گمان نہ ہو ـــــ دراصل فاسیت سطح بیں قوم پرستوں کو (جو سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھتے ہیں) بہت جلد دھوکا دیتی ہے کیونکہ وہ اس کے مفاد و مضار کو تنقیدی نظر سے نہیں جانچتے۔ ہندوستان میں بھی مہاتما گاندھی اور ان کے متبعین کا رجحان روز بروز فاسیت کی طرف ہوتا جا رہا ہے۔

مضمون کے آخر میں بعنوان "طبقۂ نسواں اور فاسیت" چند "باغیانہ" خیالات کا اظہار ہو گیا ہے، جو شاید کچھ بزرگوں کے تکدرِ مزاج کا باعث ہو ـــــ مگر میں یہ اہم عمرانی مسئلہ چھیڑ کر خاموش بیٹھنا نہیں چاہتا ـــــ اگر ہو سکا تو میں آئندہ اس مبحث پر کچھ تحریر کرنے کی کوشش کروں گا۔ مضمون طویل ہو گیا تھا اس لئے "ہندوستان میں فاسی رجحانات" کو چھوڑ دینا پڑا۔ آئندہ ہندوستان کے سیاسی ارتقا کے ذیل میں اپنے خیالات کا اظہار کروں گا۔

ایک اور بات کھٹکتی ہے وہ یہ کہ میں نے مرسلہ مضمون کو علامہ اقبال کے ایک تازہ شعر... "شفق نہیں ... الخ" پر ختم کیا ہے اور ستم ظریفی یہ کی کہ اس کو فاسیت کی ابتر حالت کا آئینہ دار ظاہر کیا ہے ـ حالانکہ علامۂ موصوف فاسیت کے پروگرام سے ناخوش نہیں ـ جیسا کہ انہوں نے مسولینی کی "ندرتِ فکر و عمل" کی تعریف سے ظاہر کیا ہے ـــــ اِس جرأت کے لئے واقعی بہت افسوس ہے ـــــ اُمید ہے کہ بزرگوں کی "پرسشِ مزاج" سے بچا رہوں گا۔

(راقم)

(۱)

اگر نظامِ سرمایہ داری اور موجودہ معاشری حالات کا بنظرِ غور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت صاف ظاہر ہو جائے گی کہ فاسیت اُس خاص نظامِ معیشت کا نام ہے جو چند مخصوص حالات میں از خود پیدا ہُوا۔ جس طرح نظامِ اقطاعیت کے بعد سرمایہ داری کا وجود پذیر ہونا اقتضائے حالات تھا۔ اسی طرح فاسیت کا ظاہر ہونا بھی ناگزیر تھا ——— لیکن چونکہ چند تاریخی اور نفسیاتی وجوہ کے باعث اٹلی اس کا مہد اولیں بنا۔ اس لئے یہ امر چنداں موجب حیرت نہیں کہ لوگ اٹلی۔ مسولینی اور فاسیت کو ایک ہی سلسلہ کی لاینفک کڑیاں تصوّر کریں ——— یہ رجحان اتنا عام ہو چلا ہے کہ اخباروں میں جب کبھی فاسیت پر مضمون لکھا جاتا ہے تو اُس میں سوائے مسولینی کے شوقِ پرواز، کھانے پینے، دوڑنے بھاگنے کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ مسولینی کی زندگی کے مطالعہ سے فاسیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے مگر وہ اس قدر غیر اہم اور معمولی حالات کو واضح کرتی ہے کہ اُس کے دوسرے ضروری مسائل ہمیشہ تاریکی میں رہتے ہیں ——— لہٰذا یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً اٹلی کے جنگِ عظیم سے پہلے کے حالات کو مختصراً بیان کر دیا جائے۔ بعد ازاں یہ دکھایا جائے کہ کس طرح فاسی پارٹی برسرِ اقتدار ہوئی ——— اس کے بعد ہم فاسیت کے سیاسی و معاشری پہلوؤں پر زیادہ آسانی سے بحث کر سکیں گے ———

اگر ہم ۱۸۶۰ء یا انیسویں صدی کے اواخر کے اٹلی پر نظر ڈالیں تو ہمیں دو مختلف ملک نظر آتے ہیں۔ شمالی حصّۂ ملک جس میں خوش حال کسان رہتے ہیں۔ یہاں کے باشندے تعلیم یافتہ، مہذب اور حیاتِ جدیدہ سے آشنا تھے۔ ملک میں جو کچھ بھی صنعتی ترقی ہوئی تھی وہ اسی حصّۂ ملک کی رہینِ منّت تھی ——— برعکس اس کے جنوبی حصّۂ ملک ہر لحاظ سے غیر ترقی یافتہ تھا۔ زراعت پیشہ لوگ بہت غریب تھے۔ تعلیم عنقا تھی۔ تہذیبِ جدیدہ کا قدم یہاں نہ آیا تھا۔ لوگوں کے طرز ماند و بود میں ازمنۂ وسطیٰ کے تمدن کا رنگ جھلکتا تھا ———

اگر تمام ملک کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک زراعتی ملک ہے جہاں کسانوں اور عام لوگوں کی مالی حالت پست ہے، لوگ عموماً غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ کوئلہ اور دیگر کارآمد معدنیات کے فقدان کے باعث صنعتی ترقیاں مفقود ہیں۔ زراعت پرانے، غیر مفید اور فرسودہ اصولوں کے زیرِ ہدایت ہونے کی وجہ سے "غیر پیدا آور" تھی۔ کہیں ایسے کسان ملتے تھے جو شبانہ روز عرق ریزی کے بعد بھی معمولی نانِ شبینہ کو ترستے تھے اور کہیں ایسے بے فکر، خوشحال اور عیش پرست زمیندار نظر آتے تھے جو اپنی زمینوں کی کاشت سے قطعاً بے پروا تھے۔ ایسے لوگ سسلی کے علاقہ میں بہت پائے جاتے تھے اور یہیں لاغر اور گرسنہ شکم، افلاس زدہ کسانوں کا طبقہ ملتا تھا جو ان زمینداروں کی شرابِ عشرت کے لئے خوشہ ہائے تاک کو اپنے خون سے سینچتے تھے ——— یہ حالات تھے کہ میزینی اور دوسرے لبرل خیالات کے رہنماؤں نے اٹلی کو آزاد کرانے کی کوششیں کیں۔ اٹلی آزاد

ہُوا۔ بادشاہت کا دَور دورہ ہُوا۔ مگر یہ انقلاب سیاسی تھا۔ سماجی یا معاشی انقلاب نہ تھا۔ شمالی و جنوبی حصّوں کی تفریق بعینہٖ رہی۔ کسانوں اور زمینداروں کے متباین طبقوں کو نزدیک تر لانے کی مطلق کوشش نہ کی گئی بلکہ جنگ ہائے آزادی کے مصارف کے باعث اقتصادی بدحالی اور بھی بڑھ گئی ——

نئی حکومت کی طرف سے پارلیمانی سسٹم رائج کیا گیا۔ سینٹ اور ایوان بنائے گئے۔ عوام کو حقِ رائے دہی ملا۔ مگر حالات اس قسم کے طرزِ حکومت کے لئے غیر مساعد تھے ——

"بورژوا" (طبقۂ امرا) کی کمی تعداد اور عوام یعنی کسانوں کی بے علمی کے باعث وہ مسالہ نہیں ملتا تھا جس سے پارلیمانی حکومت کی تعمیر کی جاتی"۔

کچھ عرصہ تک کنسرویٹو (قدامت پسند) برسرِ اقتدار رہے مگر ۱۸۷۶ء کے بعد سے اِن کو بھی زوال ہُوا۔ اور پھر کوئی ایسا طاقتور ہاتھ نہ ملا جو ملک کی بدنظمی، انتشار اور بے چینی کو سنبھالتا۔ ملک میں ہر چہار جانب انارکی سی پیدا ہو گئی۔ شیرازۂ حکومت بکھر چکا تھا۔ عنانِ حکومت ایسے "ترقی پسند" گروہ کے ہاتھ میں آئی جس نے کھُلّم کھُلّا لُوٹ مار شروع کر دی۔ پبلک کے روپیہ کو لُوٹا، مُلک کو قرضوں میں پھنسایا۔ رشوت کا بازار گرم ہُوا۔ انتخاباتِ حکومت میں بھی یہی پراگندگی تھی —— الغرض حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے ——

کسانوں کی بدحالی، مزدوروں کی بے کسی نے اپنا آخری سہارا ڈھونڈا۔ یعنی ان ہی "ترقی پسند" لوگوں میں سے ایک اشتراکی پارٹی نے اُن کی رہنمائی شروع کی۔ اس میں شک نہیں کہ اشتراکی پارٹی مزدوروں کے مفاد کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتی تھی۔ اور وہ نہایت سکون، بے غرضی اور دلیری سے اُن کی رہنمائی کر رہی تھی مگر مذہبی نمائندے (کیتھولک پارٹی) اس کی سخت مخالف تھی۔ مزید برآں اشتراکی خود بھی کوئی منظّم حیثیت نہ رکھتے تھے، ان میں سے بہت سے سنڈیکیت (Syndi-catism) سے متاثر تھے اور بعض اصلاح پسند طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ اِن میں کبھی اتفاقِ رائے نہ ہوتا تھا۔ آپس میں نوک جھونک رہتی تھی، تعاونِ کار اور اشتراکِ عمل کے فقدان نے ان کی قوّت کو بالکل کمزور کر دیا تھا۔ تاہم کسی دُوسری پارٹی کے نہ ہونے کی وجہ سے اُن کا وجود بساغنیمت تھا ——

اشتراکی اپنے مخصُوص نقطۂ نظر کے باعث قومی مفاد کو زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ امن پسند (Paci-fist) تھے ——

کچھ عرصہ تک اشتراکی بے فکری سے اپنا کام کرتے رہے۔ اور غیر اشتراکی پارٹیاں مختلف گروہوں میں منقسم ہو گئیں۔

Cole : A Guide to Modern Politics ۵ل

یہاں تک کہ رفتہ رفتہ انہوں نے سیاسی مسائل میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا - اور بالکل بےحس، لاتعلق اور بے نیاز سے نظر آنے لگے - اندرونی مناقشوں نے کبھی اتنی فرصت نہ دی کہ وہ بین الاقوامی حالات پر غور کرتے ـــــ

لیکن اب جنگِ عظیم کی تیاریاں شروع ہونے لگی تھیں اور ۱۹۱۲ء میں کیتھولک پارٹی کافی مضبوط ہو گئی تھی - اُس کو رائے دہی کا حق پھر مل گیا تھا - ڈان سٹرزو (Don Sturzo کیتھولک پارٹی کا لیڈر) نے کسانوں کو اپنے زیرِ قیادت منظم کیا اور اس طرح سے اشتراکیوں کے بڑھتے سیلاب کے مقابل ایک سنگین دیوار حائل ہو گئی - اشتراکیوں کے انقلاب انگیز خوابوں کی تعبیر اس قدر بھیانک نکلی ـــــ سب سے طاقتور پارٹیاں دو تھیں ـــــ (۱) اشتراکی (۲) کیتھولک - لیکن دونوں کے مقاصد اس قدر مختلف تھے، دونوں میں آپس کے تنازعات اس قدر طول کھینچ چکے تھے کہ کسی قسم کی مصالحانہ کوشش اُن کو مشترک راہِ عمل پر گامزن نہ کر سکی - ملک کی حالت اس قدر تباہ تھی - رہنماؤں کی یہ حالت تھی کہ جتھہ بندی کے علاوہ خود ایک ہی پارٹی میں (مثلاً اشتراکیوں میں اصلاح پسند دسے انقلابیوں کی کشمکش) اتحادِ عمل مفقود تھا کہ جنگِ عظیم شروع ہو گئی ـــــ مگر اس طرح کہ اشتراکی ہر قسم کی مداخلت اور جنگ میں شرکت کے سخت مخالف تھے - ملک میں رائے عامہ کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہ تھا - آسٹریا، فرانس، جرمنی، روس وغیرہ مسلح ہو رہے تھے ـــــ کیتھولک پارٹی خاموشی سے ـــــ دُور بیٹھی ـــــ "مطالعۂ حالات" کر رہی تھی - جمہوریت پسند اُٹھے اور جنگ کے خلاف تبلیغ کرنے لگے، شاہ پرست آئے اور جنگ کو قومی مقاصد کے خلاف کہہ کر چلے گئے ـــــ تاہم ایک طبقہ ایسا تھا جو جرمنی اور آسٹریا کے استعماری مقاصد کا شدید مخالف تھا - وہ سمجھتا تھا کہ اٹلی کے قومی مفاد اور ایک عظیم قوت کے وقار کے لئے لازم ہے کہ جنگ میں شرکت کی جائے یہ طبقہ کنسرویٹو (قدامت پسند) اور قوم پرستوں کا تھا ـــــ یہ دبی دبی آوازیں، اشتراکی اور دوسرے اصلاح پسند عناصر کے پراپیگنڈا کا مقابلہ نہ کر سکتی تھیں کہ اچانک مسولینی جیسی جابر ہستی ـــــ اٹلی کے مکدّر مطلعِ حیات پر جلوہ ریز ہوئی -

مسولینی ۲۹ جولائی ۱۸۸۳ء کو ایک آہنگر کے ہاں پیدا ہوا - خلافِ توقع اُس کی ابتدائی تعلیم اچھی ہوئی تھی - لہذا وہ ایک سکول میں بہ حیثیتِ معلم کام کرنے لگا - بچپن میں بھی بہت لڑاکا تھا اور اُس کی پیکار طلب فطرت ہر وقت بے چین رہتی تھی ـــــ یہاں تک کہ ایک دفعہ جب وہ انتخاب بلدیہ کے سلسلہ میں ایک اُمیدوار کی حیثیت سے اپنا پراپیگنڈا کر رہا تھا تو فریقِ مخالف سے جا بھڑا - نتیجتہً قید ہوا مگر بھاگ نکلا اور سوئٹزرلینڈ میں پناہ لی - بعد ازاں پھر اٹلی واپس آ گیا - اور ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے روزی کمانے لگا - رفتہ رفتہ یہاں تک ترقی کی کہ اشتراکی اخبار (Avanti) کا ایڈیٹر ہو گیا ـــــ

جنگِ عظیم کے شعلے بھڑکنے لگے اور یہ اشتراکیوں سے الگ ہوا - اشتراکی امن چاہتے تھے اور یہ جنگ کا

ــــــــــــــــــــ

(Awakening Italy by Luigi Vizzari) ۵ل

خواہاں تھا۔ لہذا ۱۹۱۴ء سے اس نے خود اپنا اخبار 'Popolo d'Italia' نکالنا شروع کیا۔

گو یہاں بھی شروع شروع میں اُس کا رُجحان اشتراکیت کی طرف تھا مگر بعد ازاں وہ کٹر قوم پرست بن گیا اور جنگ میں شرکت کے لئے پراپیگنڈا کرنا شروع کیا۔ آخر کار ۲۴ مئی ۱۹۱۵ء کو اٹلی جنگِ عظیم میں اتحادیوں کے ساتھ شریک ہو گیا۔

جنگِ عظیم ختم ہوئی اور جب شکست خوردہ جرمنی اپنے مردے میدانِ جنگ سے ہٹا رہا تھا تو فاتح اتحادی لاشوں پر سے دریدہ کپڑے نوچ رہے تھے اور تباہ و پریشان حال دشمنوں سے ـــ ہر وہ چیز جو باقی رہ گئی تھی ـــ طرح طرح کے بہانوں سے لی جا رہی تھی۔ اٹلی نے بھی اپنا حصہ لینا چاہا ـــ اہلِ اطالیہ متوقع تھے کہ انہیں بہت کچھ ملیگا تاکہ اُن کے نقصانات کی تلافی ہو سکے (جنگِ عظیم میں اٹلی کے ۶۰۰۰۰۰ آدمی مردہ۔ ۱۰۰۰۰۰۰ زخمی اور ۲۲۰۰۰۰ ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گئے اُس وقت اٹلی کی کل آبادی مع افریقی مقبوضات کے کل ۳۸۰۰۰۰۰۰ افراد پر مشتمل تھی) ـــ لیکن اُسے کیا ملا؟ پریذیڈنٹ ولسن کی ناراضی۔ انگلستان، فرانس، امریکہ کے پریس میں "اطالوی بہادروں" کی مذمت۔ ملک میں بے امنی، بے کاری اور معاشی بدحالی۔ جرمن نو آبادیات میں سے اُس کو ایک غیر آباد، بنجر علاقہ تک نہ ملا۔ ایشیائے کوچک کے مفتوحہ علاقے سے بھی اُس کو نا اُمید ہونا پڑا۔ یوگوسلافیہ کی حقیر سی ریاست کے ساتھ تنازعات بڑھے۔ فیوم کی بندرگاہ پر چند فرانسیسی سپاہیوں کے ساتھ جھگڑا ہو گیا۔ ایک کمیشن تحقیقات کے لئے مقرر ہوا جس نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ وہاں سے اطالوی فوجوں کو ہٹا دیا جائے اور اُن کے بجائے اتحادی سپاہ مقرر کی جائے۔ اطالوی ناراض ہو گئے اور D'Annunzio's نامی ایک محبِ وطن شاعر کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور فیوم پر دھاوا بول دیا۔ تمام ملک میں چرچے ہونے لگے۔ حکومتِ وقت بالکل کمزور تھی۔ حالات پر قابو نہ پا سکی۔ حب الوطن اور قومیت پرستی کے سیلاب کو نہ روک سکی ـــ فاسی پارٹی نے موقع کو غنیمت جانا اور اِس نازک وقت میں قوم و ملک کی رہنمائی کے لئے آگے قدم بڑھایا ـــ مارچ ۱۹۱۹ء میں ایک چھوٹی سی جماعت (Fascio di-combattimento) کے نام سے معرضِ ظہور میں آئی۔ اس کا سرگروہ مسولینی تھا ـــ شروع شروع میں اس کا پروگرام اشتراکیت کا پرچار کرنا تھا۔ گو اب بھی اس نئی پارٹی کے اراکین سخت قوم پرست تھے اور امنیت سے بمراحل دور ـــ زیادہ تر جنگ سے لوٹے ہوئے سپاہی اس کے ممبر تھے ـــ جو اشتراکیوں کی بین الاقوامیت، امنیت اور صلح جوئی کے سخت مخالف تھے اور معاہدۂ ورسائی پر شدید نکتہ چینی کرتے تھے۔ اِن لوگوں میں کسان اور متوسط طبقہ کے خوشحال لوگ بھی شامل ہو گئے۔ اُنہوں نے کسانوں کی بغاوتوں اور ۱۹۱۹ - ۲۰ کی ہڑتالوں میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ مگر ان کا اصلی پروگرام اشتمالی یا کمیونسٹ انقلاب کا طالب نہ تھا۔ اور نہ یہ اطالوی اشتراکی پارٹی ہی کے حامی تھے اِن کا نقطۂ نظر اشتراکی تھا مگر قومیت اور عسکریت کا گہرا رنگ لئے ہوئے۔

اِدھر فاسیت جنم لے رہی تھی اور دوسری طرف اشتراکی پارٹی نے ۱۹۱۹ء میں کمیونسٹ انٹرنیشنل سے رشتہ جوڑا۔ نومبر ۱۹۱۹ء

میں انتخابات ہوئے اور اشتراکی پارٹی نے انٹرنیشنل کے زیر اثر پرولتاری اختیارِ مطلق کا پروگرام مرتب کیا اور تہیہ کر لیا کہ سوویٹ طرز کی حکومت قائم کی جائے۔ اِس وقت اِس پارٹی کی قوت ملک میں سب سے زیادہ پُراثر تھی۔ انتخاب میں ۵۰۰ نشستوں میں سے ۱۵۶ اِن کے حصّہ میں آئیں۔ مسولینی اور اُس کے معاونین میں سے کسی کو ایک سیٹ بھی نہ ملی۔ حکومت بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ اشتراکیوں نے ۱۹۲۰ء میں کارخانوں پر بزور قبضہ کر لیا۔ حکومت نے فوجوں سے مدد طلب کی مگر اُنہوں نے ہر قسم کی اعانت سے کورا جواب دے دیا ——— انقلابی سرگرمیاں زوروں پر تھیں ہر صبح سماجی انقلاب کا انتظار رہتا تھا۔ مگر انقلاب نہ ہُوا ——— اس کی وجہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کے الفاظ میں "منظم اور قابل رہنمائی کا فقدان" تھا اور یہ صحیح بھی تھا۔ باوجود اس کے کہ اشتراکی پارٹی نے اپنا رشتۂ عمل انٹرنیشنل سے جوڑ لیا تھا مگر پارٹی میں ابھی تک ایسے عناصر موجود تھے جو اس کی اپنی طاقت کو کمزور کئے دے رہے تھے ۔ نراجی (ANARCHIST) ایک طرف تھے، اصلاح پسند دوسری طرف اپنا زور لگا رہے تھے ۔ تیسری اور بالکل مخالف سمت میں سنڈیکیت سے متاثر رہنما اپنی قیادت کی کامیابی پر قصیدہ خوانی کر رہے تھے اور پھر ایک گروہ اُن انقلابی اشتراکیوں کا تھا جو دراصل پرولتاری اختیارِ مطلق اور سوویٹ طرزِ حکومت چاہتے تھے۔ ان متضاد عناصر سے جو مرکب تیار ہوتا تھا اُس کا نام اطالوی اشتراکی پارٹی تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قدر مختلف المشارب اور متفاوت الرائے گروہوں میں اشتراکِ عمل ناممکن تھا۔ یہی کمزوری تھی جس نے فاسیت کو کامیاب اور پرولتاری انقلاب کو ناکامیاب کیا ———

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسولینی نے ۱۹۱۹ء میں ایک فاسی پارٹی کی بنیاد ڈالی تھی۔ اب اس کی کیا حالت تھی ؛ اشتراکی پارٹی کی قوت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ نومبر ۱۹۱۹ء میں بمقام میلان اشتراکیوں کو ۱۸۰۰۰۰ ووٹ ملے اور مسولینی کی پارٹی کو صرف ۴۷۹۵ ۔ ۲۰-۱۹۱۹ء تک فاسیت کو عوام جانتے بھی نہ تھے۔ صرف سرکاری حلقوں میں اس کو کچھ مدد ملتی تھی۔ مسولینی کا اخبار فوجوں اور دوسرے متعلقہ حلقوں (مثلاً سرکاری محکمے، متوسّط طبقہ کے بورژوا) میں مفت تقسیم کیا جاتا تھا۔ فاسی پارٹی اس قدر کمزور، ناقابلِ اعتنا اور بے جان تھی کہ اس کو اپنا پروگرام بدل کر اشتراکی نصب العین اختیار کرنا پڑا۔ اس نے بھی بادشاہت اور امرا یعنی بورژوا کی مذمّت کی ۔ بین الاقوامی امنیت پر زور دیا۔ مزدوروں کو فیکٹریوں اور کارخانوں پر قبضہ کرنے پر اُبھارا۔ کسانوں میں زمین اور آلاتِ کشاورزی کو بزور چھین لینے کا پراپیگنڈا کیا۔ ہڑتالیوں کی مدد کی ——— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "ریاست[1] کو چاہے وہ جمہوریت پسند ہو یا شہنشاہت پسند، ہر طرح سے قابلِ نفرین قرار دیا۔"

اس انتشار اور بے بسی میں حکومت نے فاسیت کی ہر طرح سے مدد کی تاکہ وہ اشتراکیوں کے بین الاقوامی پراپیگنڈا اور پرولتاری انقلاب سے بچ جائیں ——— اسی مقصد کے لئے سرکاری حلقوں نے اشتراکی پارٹی کی پُرانی دشمن کیتھولک

[1] Mussolini, Popolo D' Italia, (April 6, 1920) "Palme dutt."

پارٹی کی ہر طرح سے اعانت کی اور حکومت ہی کے اشارۂ چشم سے ۱۹۱۹ء میں کیتھولک پارٹی کو ۱۰۰ نشستیں نصیب ہوئیں۔ علاوہ ازیں سب سے بڑا حربہ جو اشتراکی پارٹی کے خلاف استعمال کیا گیا وہ مراعات وحقوق کی منظوری تھی۔ مزدوری زیادہ کردی گئی اور اوقاتِ کار میں تخفیف کر دی۔ اس کا سب سے بُرا اور نمایاں اثر اصلاح پسند اشتراکیوں پر پڑا۔ اُنہوں نے اِن مراعات سے دھوکا کھا کر انقلابی سرگرمیوں میں پہلے سے بھی زیادہ تغافل برتنا شروع کیا۔ اور روز بروز انقلابی اشتراکیت سے بمراحل دُور ہوتے گئے۔

حکومت نے اشتراکی پارٹی کا تو یوں زور توڑا اور اُدھر اپنی طاقت منظم کرنا شروع کی۔ جنگ کے بعد فوج کی تعداد ۲۸۰۰۰۰ تھی۔ ۱۹۲۰ء کے آخر تک اس کی تعداد ۰۰۰۰۰ تک بڑھادی۔ ایک نئی فوجی جمعیت "رائل گارڈ" کے نام سے ترتیب کی گئی جس کی تعداد ۲۵۰۰۰ تھی ــــ اسی اثنا میں حکومت نے فاسیت کے سپاہی و فوجی ممبروں کو بھی مسلح کرنا شروع کر دیا ــــ اس طرح سے وہ پارٹی جو صرف فوجی سپاہیوں اور متوسط طبقہ کے بورژوا اسامیوں پر مشتمل تھی۔ حکومت کی مدد سے ایک مضبوط و منظم پارٹی بن گئی ــــ پرولتاری انقلاب کو ناکامیاب بنانے میں اٹلی کی بورژوا حکومت کا نمایاں حصّہ ہے۔

"فیکٹا اور گیولٹی[۱] (Facta and Giolitti) کی حکومتوں کا کام پرولتاری جماعت کو بیوقوف بنانا تھا۔ اُن کی "لبرل" اور "جمہوریت" پسند پالیسی نے پرولتاری ناقابلِ تسخیر جماعت کو مراعات دے کر ضعیف کر دیا۔ اُنہوں نے اصلاح پسند اشتراکیوں کی مدد کی تاکہ وہ اپنی پارٹی کی تنظیم و ترتیب میں خلل ڈال دیں۔"

جب یہ مرحلۂ اوّل طے ہوگیا اور پرولتاری جماعت منتشر ہوگئی اور اُن کی اندرونی تنظیم ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی۔ تو دُوسرا دَور شروع ہُوا جس میں فاسیت نے حکومت کے زیرِ سایہ اشتراکی عناصر کو کُلّیتہً کُچل ڈالنے کا تہیّہ کر لیا۔ اصلاح پسند اب بھی مراعات و حقوق پر بھروسا رکھتے تھے۔ وہ حکومت کی چشمِ التفات کے منتظر تھے۔ مگر اب کام ختم ہوچکا تھا۔ پرولتاری جماعت تباہ ہوچکی تھی۔ ان کی انقلاب پسندانہ حرکات اصلاح پسندوں کی لاپرواہانہ حکمتِ عملی کی نذر ہوچکی تھیں۔ فاسیت کا مضبوط و آہنی ہاتھ اُٹھا اور مزدور کے "میناخانہ" کو پاش پاش کر گیا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کیا مخصوص حالات تھے جن کے ماتحت فاسیت کو فروغ ہُوا۔ سطورِ بالا سے اس قدر واضح ہو گیا ہوگا کہ اٹلی کی سب سے بڑی پارٹی (اشتراکی) کی کمزوری اُس کی اندرونی بےانتظامی اور بےترتیبی تھی۔ اگر وہ سب کے سب پرولتاری اختیارِ مطلق کو قائم کرنا اپنا مطمحِ نظر سمجھتے اور مراعات اور دیگر حقوق پر دھیان نہ دیتے تو اٹلی میں یقیناً سوویٹ حکومت کا سیاسی اور سماجی انقلاب ہوچکا ہوتا۔ لیکن اُس میں اصلاح پسند طبقہ کا پیدا ہوجانا اُس کے لئے مہلک ثابت

---

[۱] پالمی دت : فاسیت اور سماجی انقلاب۔

ہُوا ـــــ اشتراکی حکومت سے لڑ سکتے تھے، وہ کیتھولک پارٹی کے خلاف کامیاب جنگ کر سکتے تھے، یہ سیلِ عرم فاسیت کی ریت کی سی کچی دیوار کو بہا کر لے جا سکتا تھا ـــــ مگر اپنے اندرونی مناقشوں، اندرونی کمزوریوں اور اصلاح پسند طبقہ کی اصلاح اس کے بس میں نہ تھی۔

اشتراکی نقطۂ نظر کے مطابق نظامِ سرمایہ داری آمادہ بہ زوال ہے۔ اس کی اندرونی کمزوریاں اتنی زیادہ ہیں کہ وہ اپنی زندگی خود مختارانہ قائم نہیں رکھ سکتا۔ وہ سہارا ڈھونڈتا ہے کبھی جمہوریت کا۔ کبھی سنڈیکیت کا۔ کبھی قومی اشتراکیت کا۔ اور کبھی فاسیت کا ـــــ

صنعتی ممالک میں ہر جگہ مزدوروں کی سبھائیں منظم پارٹیاں اور اصلاحی ادارے قائم ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو موجودہ نظام کی بجائے پرولتاری اختیارِ مطلق قائم کر سکتے ہیں صرف ایک خونیں یا پُرامن "انقلاب کی ضرورت ہے۔ جس سے بورژوا حکمرانوں سے جبراً اقتدار چھین لیا جائے ـــــ لیکن ہر ملک میں ایسے عناصر موجود ہیں جو مزدوروں کی انقلاب پسندانہ سرگرمیوں کو ہمیشہ بورژوا نظامِ حکومت کے ماتحت رکھتے ہیں۔ یہ عناصر وہ اصلاح پسند گروہ ہیں۔ جو بجائے انقلاب کے "مراعات وحقوق" کے طالب ہیں۔ جو پارلیمانی دستور سے اصلاحیں مانگتے ہیں۔ جو مجالسِ قانون ساز سے اوقاتِ کار میں تخفیف چاہتے ہیں۔ جو ثالثی ادارے قائم کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ محنت وسرمایہ کی باہمی کشمکش کا فیصلہ کیا کریں۔

یہ لوگ لینن کا یہ قول بھول جاتے ہیں۔ کہ" سرمایہ داری نظام کو اشتراکی نظام سے بدلنے کی درمیانی منزل صرف انقلاب ہے" ـــــ بلکہ یہ" بزرگ" مارکسیت اور لینینیت کے نظریوں کو مسخ شدہ، دست و پا بریدہ حالت میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مارکس کی تعلیم وتحقیق کے مطابق نظامِ سرمایہ داری از خود تباہ ہو جائے گا۔ یا یہ کہ جمہوریت ہی ریاست کی انتہائی ترقی یافتہ اور بہترین صورت ہے۔

لینن کا یہ سبق وہ بالکل بھلا بیٹھے ہیں: کہ

" صرف صنعتی مزدوروں کا طبقہ اشتراکیت کو وجود میں لانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ گو اس سے دنیا بھر کے محروموں کی دستگیری مقصود ہے ـــــ محروم جماعتوں کے انقلابی جوش کو بروئے کار لانے سے کبھی خائف نہ ہونا چاہئے خواہ یہ جوش کتنی ہی تباہی کا باعث کیوں نہ ہو۔ انقلاب کی شان یہی ہے کہ وہ سختی اور" جدین" سے پیش آئے۔ خواہ یہ رویہ اہلِ علم کے حسیات اور نازک جذبات پر کتنا ہی گراں کیوں نہ گزرے۔ جنہوں نے غاصبوں کے تمدن میں نشوونما پائی ہے"۔

جرمنی میں نازیت (قومی اشتراکیت یا فاسیت) کو کامیاب بنانے میں اسی اصلاح پسند گروہ کا نمایاں حصہ ہے۔ آسٹریا میں یہ گروہ (آٹو اور جولیس[2] کے زیرِ قیادت) ڈولفس کی حکومت سے مراعات چاہتا تھا۔ جس کا خمیازہ اسے ایک

---

[1] Intelligentia [2] Otto and Julius

خونیں انقلاب کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ جس سے اُس کی برسوں کی منظم قوت چشم زدن میں پر کاہ کی طرح نذر ہوا ہوگئی۔ اصلاح پسندوں کے اس مصالحانہ رویّہ کی تصدیق خود آٹوبی کے الفاظ ہیں جو اُس نے بصد حسرت، فاسی سپاہیوں سے شکست کھانے کے بعد کہے ہیں۔

"ہماری سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ ہم نے مصالحانہ کوششوں کو بے جا طول دیا اور بے کار "صلح وصفائی" کی کوشش کرتے رہے ——— ہمیں اس غلطی پر شرم محسوس کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارا مقصد ملک کو خونریز خانہ جنگی اور مزدور طبقہ کو تباہی سے بچانا تھا" ——— اس طرح سے ان "وفاداران قوم" نے ملک وملّت کو ایک خونیں انقلاب سے بچا کر اٹلی میں پرولتاری انقلاب کو ناکام کیا۔

یہی نہیں بلکہ ہر ملک میں ان مُصلحین کی پارٹیاں پائی جاتی ہیں۔ انگلستان میں موسلے (MOSLEY) کی فاسی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے برنارڈشا کی (FABIAN اشتراکیت) اپنا کام کر رہی ہے۔ ایچ۔ جی ویلز کی احیا کردہ اشتراکیت جو اسی طرح پارلیمانی اصلاحوں سے سماجی انقلاب پیدا کرنے کی خواہاں ہے۔ مزدوروں کے اصلی جذبۂ انقلاب کو لوریاں دے دے کر سُلا رہی ہے۔ فرانس میں ۷ رفروری ۱۹۳۴ء کو (Daladier) کی وزارت کا استعفا داخل کرنا اور دومرگ (Domergue) کی نیم فاسی حکومت کا برسر اقتدار ہونا بورژوا جمہوریت کا ادنےٰ کرشمہ ہے۔ امریکہ میں روزویلٹ کا تسلط، سخت قوم پرستی اور فاسی رجحان کا پتہ دیتا ہے۔

"جدید امریکہ پُرانے سرمایہ دارانہ نظام کی یادگار نہیں اور نہ یہ اشتراکیت ہی کی طرف جارہا ہے بلکہ اس کا رجحان فاسیت کی طرف ہے اور یہ فاسیت امریکی حالات کے عین مطابق ہے۔ جو متوسط طبقہ کے تجربہ، اُس کی روایات اور اُسکی اُمیدوں پر مشتمل ہوگی" ——— (نیویارک ٹائمز، جولائی ۱۹۳۳ء ——— بحوالۂ پالمی دت)

الغرض اٹلی میں سب سے اہم اور کامیاب حصّہ اسی پارٹی کا تھا جس کی وجہ سے فاسیت کامیاب ہوئی۔ اس کے بعد حکومت کا نمایاں حصّہ ہے جو اُس نے مزدوروں کی سرگرمیوں اور اشتراکی ریشہ دوانیوں سے بچنے کے لئے (فاسیت کی مدد کرنے میں) لیا۔

جب بے چینی بہت بڑھنے لگی۔ ہر چہار جانب بے اطمینانی، ہڑتالوں اور اشتراکی پراپیگنڈا نے قبضہ جما لیا۔ تو بورژوا حکومت نے فاسیت کی مدد کی ——— سرمایہ داروں اور بڑے بڑے زمینداروں نے فاسی سپاہیوں کو دہشت انگیزی پھیلانے اور پرولتاری تحریک کو کچلنے کے لئے روپیہ اور آلاتِ حرب مہیّا کئے۔ ساہوکاروں اور زر پرستوں نے فاسیت کی رُکنیت قبول کی ——— مسولینی کے بیان کردہ اندازہ کے مطابق اراکین کی تعداد ۱۹۲۱ء میں ۲۰۰۰ سے ۲۴۸۰۰۰

تک پہنچ گئی ۔حکومت کے افسروں نے فاسی ممبروں کو قواعد اور پریڈ سکھائی ۔ اُن کو ہتھیار دیئے گئے ۔ مزدوروں اور کسانوں سے تمام قابلِ اعتراض اسلحہ چھین لئے گئے ۔ہڑتالوں میں اُن کو دانستہ زدوکوب کیا گیا ۔ لطف یہ تھا کہ جب فاسی حملہ کرتے تھے تو ہڑتالی یعنی مزدور گرفتار ہوتے تھے اور عدالتیں اُن کو سخت سزائیں دیتی تھیں ۔

"حکومت[۱] نے فاسی حملوں کے وقت مداخلت سے انکار کیا ۔ گو وہ سراسر قوانین کی خلاف ورزی کرتے تھے" یہی نہیں بلکہ حکومت کا محکمۂ فوج کھلم کھلا اُن کی مدد کرتا تھا ۔

" فاسیوں کو فوج سے ہمدردی ۔ اعانت اور سامانِ حرب ملتا تھا ۔ باوردی افسر مزدوروں کو زدوکوب کرنے میں عملی حصہ لیتے تھے اور فاسیوں کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ فوجی بارکوں کو اپنے پرائیویٹ ذخائرِ حرب میں تبدیل کر لیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " (NOWRER, an American journalist)

مندرجہ بالا بیانات فاسیت کے مخالفین کے نہیں بلکہ اُس کے ہمدردوں کے ہیں —— اسی طرح A, Zerboglio کا یہ فقرہ —— "حکومت نے فاسیت سے کھلم کھلا فائدہ اُٹھایا" —— ایک فاسی مصنف کا ہے اور اس میں وہ سب کچھ بتا دیتا ہے کہ کس طرح ایک سرمایہ دار حکومت، پرولتاری انقلاب سے بچنے کے لئے، نت نئے بھیس بدلتی ہے ۔

اب ہم پھر مختصراً اُن اسباب پر نظر ڈالتے ہیں جن کے باعث فاسیت نے اٹلی میں فتح پائی ؛

(۱) اٹلی میں انقلابی جذبہ کو مردہ کرنے والی چیز حکومت کی طاقت نہ تھی اور نہ فاسیت ہی کے اقتدار کے باعث اسے زوال ہوا بلکہ اس کے انتشار کا اصلی باعث اس کی اپنی اندرونی کمزوری تھی جس کا موجب اصلاحی طبقہ کا وجود تھا —— جو ہمیشہ "مراعات وحقوق" کا طالب رہا ۔

(۲) فاسیت میدانِ جنگ میں اُس وقت نمودار ہوئی جب کہ اشتراکیت اپنے اندرونی تنازعات کے باعث خود ہی کمزور ہو کر پسپا ہو رہی تھی —— اُس وقت فاسیت آئی اور پولیس اور فوج کے زیرِ ہدایت پرولتاری انقلاب کو شکست دے کر اقتدار حاصل کیا ۔

(۳) فاسیت کا اقتدار بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر ظہور میں نہیں آیا ۔ بلکہ یہ بورژوا حکومت کی اپنی سوچی سمجھی تدبیر تھی ۔ جب تک اُن کی طاقت کمزور تھی اور وہ پرولتاری انقلابی جوش کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے ، وہ "مراعات وحقوق" دے دے کر اُن کو ٹالتے رہے —— جمہوریت دوستی کا دعوےٰ کرتے رہے ۔ مگر جب چپکے چپکے اپنی طاقت منظم کر چکے ۔ اُس وقت[۲] فاسیت کا روپ بدل کر شکستہ و فریب خوردہ مزدوروں پر آ پڑے ۔

---

[۱] Awakening of Italy [۲] فاسیت اور سماجی انقلاب از پالمی دت (Fascism and Social Revolution by Palme Dutt)

سطورِ بالا میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ فاسیت، انحطاط پذیر سرمایہ داری ہی کی ایک تبدیل شدہ صورت ہے، جب کسی ملک میں مزدور اپنے جماعتی مفاد کو سمجھنے لگتے ہیں۔ تو وہ اپنے حریف بورژوا کو شکست دینا چاہتے ہیں۔ اور بورژوا مزدوروں کی اس بیداری اور بے اطمینانی کو اپنی بقائے حیات کے منافی سمجھ کر طرح طرح کے حیلوں سے پرولتاری انقلاب کو دبانا چاہتے ہیں۔ اور حصولِ مقصد کیلئے وہ اصلاح پسند عناصر سے مدد لیتے ہیں۔ ہر ملک میں جہاں مزدوروں میں یہ "بیداری" پائی جائے گی ـــــ اور وہاں اصلاح پسند عناصر موجود ہوں گے ـــــ فاسیت از خود اپنا اقتدار قائم کرلے گی ـــ کیونکہ بورژوا اور سرمایہ داروں کے پاس سوائے فاسیت کے اور کوئی حربہ (سماجی انقلاب کو روکنے کے لئے) باقی نہیں رہتا ـــ اسی لئے کہا گیا تھا کہ "جس طرح نظامِ اقطاعیت کے بعد سرمایہ داری کا وجود پذیر ہونا اقتضائے حالات تھا۔ اسی طرح فاسیت کا ظاہر ہونا بھی ناگزیر تھا" ـــــ

علاوہ ازیں اگر ہم مختلف ممالک کے فاسی رجحانات کا مطالعہ کریں، تب بھی یہ بخوبی واضح ہو جائے گا کہ فاسیت ہر ملک میں اپنی صورت بدلتی رہتی ہے ـــ فاسیت میں قومیت پرستی اس قدر انتہائی صورت اختیار کر چکی ہے کہ اسے جغرافی حدود سے وابستہ رہنا پڑتا ہے ۔ مسولینی استعماریت کا دلدادہ ہے۔ اپنی بڑھتی آبادی کے لئے اٹلی کے تنگ جزیرہ سے باہر (مثلاً شمالی افریقہ میں) نوآبادیات تلاش کرتا ہے۔ ہٹلر بھی یہی چاہتا ہے مگر اپنا مطلب سیاسی چالوں میں چھپانا چاہتا ہے۔ وہ آسٹریا کے بچھڑے بھائیوں سے ملاپ کا خواہشمند ہے اور اس کے حصول کے لئے نسلی امتیازات کا ڈھونگ رچاتا ہے یہاں جرمن فاسیت، اٹلی کے فاسی پروگرام سے مختلف ہو جاتی ہے ـــــ سب سے واضح مثال انگلستان کی فاسیت کی ہے ـــ موسلے (Sir Oswald Mosley) استعماری مہمیں سر کرنا نہیں چاہتا ۔ وہ نوآبادیات قائم کرنے کا متمنی نہیں کیونکہ برطانیہ ـــــ (جہاں وہ فاسی پروگرام پر عمل کرنا چاہتا ہے) پہلے ہی ایک وسیع سلطنت کا مالک ہے ـــ اسی طرح ہر ملک میں فاسیت حالات کے مطابق اپنا رنگ بدلتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے معاشری و سیاسی نظریات پر کامل و قطعی تبصرہ نہیں کیا جا سکتا ـــ دوسری مشکل یہ ہے کہ اشتراکیت کی طرح اس کے پاس خاص اصول اور نظریے موجود نہیں ۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو حالات کے مطابق بدلتی رہتی ہے ۔ اس کے تمام اصول موقع و محل کے مطابق ترتیب دیئے جاتے ہیں جیسا وقت دیکھا ویسے ہی فاسیت کو بنا دیا ـــ تاہم چند مشترک باتیں ایسی ضرور ہیں جو تقریباً ہر قسم کی فاسیت میں پائی جاتی ہیں اور چونکہ ہم یہاں اٹلی کے واقعات سے بحث کر رہے ہیں ۔ اس لئے مابہ النزاع مسائل کو چھوڑ کر صرف اطالوی فاسیت کے بنیادی اصولوں کا مطالعہ کریں گے ۔

فاسیت اور اشتراکیت بالکل متضاد چیزیں ہیں ۔ اشتراکیت مادیتِ تاریخی کی قائل ہے ۔ وہ مارکس کے وضع کردہ

اصولوں کے مطابق دُنیا کی تاریخ کا مطالعہ کرتی ہے اور تاریخ عالم کی ہر چھوٹی بڑی تحریک (خواہ وہ سیاسی ہو یا مذہبی) میں معاشی ماحول کا
اثر دیکھتی ہے۔اُس کے نزدیک سوسائٹی کے نشوو ارتقا میں جزوِ اعظم ہمارا معاشی ماحول ہے۔ یہ فرض کر لینا کہ حیاتِ انسانی کے عروج و
زوال پر فقط یہی ایک چیز اثر انداز ہوتی ہے بالکل گمراہ کن خیال ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ اُن تمام اثرات میں سے جو انسان اور اُسکے
اعمال پر غالب ہوتے ہیں معاشی اثر سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی اس کو اتنی اہمیت دیتے ہیں اور وہ انسانیت
اور اُس کے مختلف سماجی مسائل کا حل اسی اثر میں ڈھونڈتے ہیں۔

فاسیت "معاشی اثر، خام اجناس، میکانکی ایجادات وغیرہ" کی اہمیت کو سمجھتی ہے مگر اس پر یقین نہیں کرتی کہ فقط یہی چیزیں
انسانی اعمال کی محرک ہیں یا انسان اور اُس کی خوشحالی و امنیت اِن پر منحصر ہے ——

" فاسیت ہمیشہ بہادری اور تقدس" میں یقین کرتی رہی ہے —— یعنی اُن اعمال پر بھروسا رکھتی ہے جو ہر طرح کے معاشی
اثرات سے محفوظ ہیں۔" (مسولینی)

اشتراکیت پسند جماعتی اور طبقہ واری جنگ (class-war) کے قائل ہیں۔اُن کے نزدیک سوسائٹی میں ہمیشہ دو متخاصم گروہ
موجود رہے ہیں — ایک غاصب ہے تو دوسرا محروم —— اِن میں برابر جنگ ہوتی رہتی ہے — اُن میں سے ایک کا فائدہ دوسرے کا
نقصان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دُنیا کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے کی دست برد کا شکار رہے۔ان کی کوشش یہ
ہے کہ ایک ایسے تمدن کی بنا ڈالی جائے اور موجودہ نظام کو تبدیل کر کے ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جس میں ان سماجی طبقوں کا
امتیاز کلیتہً مفقود ہو جائے —— جب تک یہ نہ ہوگا غاصبوں اور محروموں میں جنگ ہوتی رہے گی۔ دُنیا میں اس سرمایہ دارانہ نظام
کے باعث اسی طرح لڑائی جھگڑے، جنگیں، بے روزگاری، کساد بازاری، بے چینی اور فلاکت کا دَور دورہ رہے گا۔

فاسیت، اس جماعتی جنگ سے انکار کرتی ہے —— فاسیت "مساوات" سے انکار کرتی ہے، اُسے ہر انسانی فارغ البالی
پر یقین نہیں۔ وہ اشتراکیت کے پیش کردہ "معاشی خوشحالی" کے عہدِ زرّیں کو دیوانہ کا خواب سمجھتی ہے۔ وہ سوسائٹی کے ایسے دَور کو بنظرِ حقارت
دیکھتی ہے "جس میں انسانوں کو سوائے شکم سیری اور تن پروری" کے اور کچھ کام نہ ہوگا" —— (مسولینی) الغرض فاسیت سوسائٹی
کو ہمیشہ دو طبقوں میں منقسم دیکھنا چاہتی ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ دُنیا میں ہمیشہ آمر اور مزدور کا فرق رہے گا۔ یہ امتیازِ حاکم و محکوم کبھی
نہیں مٹ سکتا اور اسی میں فاسیت، انسانی سوسائٹی کا فائدہ تصور کرتی ہے ——

سیاسی نظریوں میں وہ جمہوری اور لبرل حکومتوں کی سخت مخالف ہے۔

فاسیت[1] اس پر یقین نہیں رکھتی کہ اکثریت —— صرف اس لئے کہ وہ اکثریت ہے —— انسانی سوسائٹی کی رہنمائی کر سکتی ہے
وہ اس خیال کی تردید کرتی ہے کہ جمہوریت گاہ بگاہ مجلس مشاورت قائم کرنے سے حکومت کر سکتی ہے۔ برعکس اس کے فاسیت

---

[1] مسولینی: *Political and social doctrine of Fascism*

انسانی تفریق (Inequality of man Kind) کے ناگزیر، مفید اور سودمند اصُول پر زور دیتی ہے جو کبھی کسی آئینی جد و جہد (مثلاً عام حق رائے دہی) سے نہیں مٹ سکتا۔"

جمہوری حکومتوں میں بظاہر تمام لوگ حکومت کے حصہ دار معلوم ہوتے ہیں مگر درحقیقت تمام سیاسی قوت چند افراد کے ہاتھ میں ہوتی ہے ——" جو ایک خود مختار بادشاہ سے بھی زیادہ مطلق العنان، جابر اور تباہ کُن ثابت ہو سکتے ہیں۔"

لیکن یہاں یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ اشتمالیت (بالکمیونزم) پارلیمانی اور جمہوری حکومتوں کی اس لئے مخالفت کرتی ہے کہ ایسے سیاسی ادارے، ایسی سوسائٹی کے مقاصد کے سراسر منافی ہیں جہاں سماجی طبقوں کا امتیاز بالکل ختم ہو چکا ہو۔ برخلاف اس کے فاسیت اُن سے اس لئے متنفر ہے کہ یہ "جمہوری نظام قوم پرستی کے تخیل کو ضعیف کر دیتا ہے اور سماجی تفریق کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے"۔ (G.O.H. Coll)

فاسیت لبرل خیالات اور پالیسی کی سخت ترین نقاد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُنیسویں صدی کے وسط تک لبرل پالیسی کار آمد ثابت ہوئی اور اُس زمانہ و ماحول کے ساتھ ساتھ برابر نوعِ انسان کی مدد کرتی رہی۔ مگر اُس کے بعد سے (یعنی اپنے مخصوص دَور سے گزرنے کے بعد) اب نہایت خطرناک اور ضرر رساں ثابت ہو رہی ہے۔ مسولینی کے خیال میں جنگِ عظیم کا کشت و خُون اسی خُون آشام دیوی (لبرل) کی بھینٹ تھا۔

"لیکن اب لبرل دھرم کے ویران شدہ مندروں کو ہمیشہ کیلئے بند ہو جانا چاہئے کیونکہ دُنیا سمجھ گئی ہے کہ اس کی پوجا معاشیات میں لا ادریت کی طرف لے جاتی ہے اور سیاست و اخلاقیات میں یہ مُجتنب اداؤں سے کام لیتی ہے —— اس کا راستہ جیسا کہ گذشتہ حالات سے ظاہر ہے۔ ہمیشہ تباہی کی طرف رہنمائی کرتا ہے"۔ (مسولینی)

ہاں تمام بتوں کو مسمار کر کے مسولینی اپنا بُت خانہ تیار کرتا ہے۔ وہ دنیا کے موجودہ مسائل کا فیصلہ فاسیت سے کرنا چاہتا ہے —— ہم دیکھ چکے ہیں کہ فاسیت نظام سرمایہ داری ہی کی تبدیل شدہ صُورت ہے۔ کیونکہ یہ سرمایہ و محنت کی باہمی تفریق و کشمکش کو مٹانا نہیں چاہتی۔ بلکہ اس آویزش میں وہ سوسائٹی کی نجات سمجھتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح سرمایہ دار —— مزدُور کو مراعات دے کر اُسکو اپنے قابو میں رکھنا چاہتا ہے۔ اُس کے علاوہ نظامِ سرمایہ داری میں شخصی ملکیت (Private Property) جائز ہے۔ اگر سرمایہ داری میں شخصی ملکیت کی اہمیت باقی نہ رہے تو وہ تمام مصائب جو اس نظام سے متعلق ہیں از خود رفع ہو جائیں۔ فاسیت بھی اس نقش قدم پر چلتی ہے —— جب اشتراکی انقلاب کرنا چاہتے ہیں تو اُن کی سب سے پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ شخصی ملکیت کو تمام "فتنوں" کا سرچشمہ قرار دیں اور مزدور طبقہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرا دیں کہ جب تک یہ رواج قائم ہے —— اور "ذرائع پیداوار" مختلف لوگوں یا محدود کمپنیوں کے قبضہ میں ہیں، اُس وقت تک اُن کی تکالیف کا خاتمہ نہیں ہو گا —— اور اسی لئے اشتراکیت

سماجی اور سیاسی انقلاب کے بعد اس "ادارہ" کو کلیتہً ختم کر دیتی ہے اور تمام قوت ——— سیاسی و معاشی ——— پرولتاری طبقہ کے ہاتھ میں دے دیتی ہے۔ لیکن فاسیت شخصی ملکیت کو ختم نہیں کرتی بلکہ اسے تمام خوبیوں کا سرچشمہ قرار دیتی ہے۔ مزدوروں کو ہر طرح سے ساہوکاری (Finance Capital) کے تابع رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ اُن سے ہڑتال کرنے کا حق بھی چھین لیتی ہے ——— انقلاب ہو جاتا ہے ——— لیکن "ریاست پر ساہوکاری روز بروز بلاواسطہ لیکن طرح طرح کے بھیس بدل کر مسلط ہوتی جاتی ہے۔ یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ فاسیت، اشتراکی انقلاب سے کتنی بعید ہے ——— وہ روز بروز سرمایہ دارانہ ذہنیت کے مطیع ہوتی جاتی ہے اور بعض اوقات سرمایہ و محنت کی باہمی آویزش میں جان بوجھ کر "سرمایہ" کی مدد کرتی ہے۔ اسی لئے کلارا زٹکین کی رائے میں "فاسیت مزدوروں کے لئے تازیانۂ عبرت ہے کیونکہ وہ روسی پرولتاری انقلاب کو دوسرے ممالک میں کامیاب نہ بنا سکے"۔

فاسیت میں "ریاست" کا تخیل بہت عجیب ہے۔ یہ خیالیت اور تصوّف کا ایک انوکھا اور ماوراء فہم مرکب ہے ——— پیچیدہ مسائل کو چھوڑ کر اس کے سادہ اصول حسب ذیل ہیں:۔

فاسیت خودی اور انفرادیت کی سخت مخالف ہے، قوم کے تمام افراد ریاست کے محکوم ہیں۔ ریاست کے کاروبار اور اس کے انتظام و انصرام میں رائے عامہ کو کچھ دخل نہیں۔ کسی فردِ واحد کو اتنی آزادیٔ عمل نہیں دی جا سکتی کہ وہ کسی طرح سے ملّت (یا بالفاظ صحیح تر) ریاست کو نقصان پہنچا سکے۔ بلکہ اُس کا ہر کام ریاست کے فائدے اور قیام و بقا کے لئے ہونا چاہئے ———

ریاست ہمیشہ ملّت و قوم (اور اس کے ساتھ ساتھ افراد) کے فائدے، اُن کی بہتری اور تربیتِ ذہنی و جسمانی کی نگراں رہیگی ——— فاسی ریاست کا کام صرف حفاظتِ جان اور بقائے امن ہی نہیں اور نہ یہ فقط ایک ایسا معاشی ادارہ ہی ہے جو لوگوں کی مادی ضروریات پورا کرنے کی گارنٹی کرے ——— بلکہ یہ "روحانی و اخلاقی" قوتوں کا مظہرِ اعلےٰ ہے۔ بلاشبہ ریاست اندرونی امن اور بیرونی حفاظت کی ذمہ دار ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ قوم کی اُس رُوحانی و اخلاقی قوت کی بھی ضامن ہے جو صدیوں کی تربیت کے بعد اُس کے مذہب و ایقان اور اعمال و افکار میں نشو و نما پا چکی ہے ———

ریاست ایک "زندہ و تابندہ" حقیقت ہے جو نہ صرف حال سے تعلق رکھتی ہے بلکہ ماضی بھی اس کے ساتھ وابستہ ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ مستقبل بھی اس کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ریاست فرد کے بجائے تمام قوم کے مفاد کو پیشِ نظر رکھتی ہے ———

"ریاست اپنے افراد کو تہذیب و تمدن سکھاتی ہے۔ اُن کو حیاتِ انسانی کے مقاصد سے آگاہ کرتی ہے۔ ان کی منتشر قوت کو منظم کرتی ہے۔ اور اُن کے متضاد اغراض کو منصفانہ طے کرتی ہے . . . . . اور آئندہ نسلوں کے لئے موجودہ لوگوں کے سائنس اور آرٹ وغیرہ کے کارناموں کو محفوظ کرتی ہے"۔ (مسولینی)

فاسیت امن وسکون کو ناپسند کرتی ہے کیسی قوم کی ترقی، خوشحالی اور قوت کا راز پیکار وتصادم میں پنہاں ہے۔ امن وآرام سے قوم سُست رگ، کاہل اور بزدل ہوجاتی ہے ـــــ جنگ ایالت، جاہ وحشم اور قوت کی نشانی ہے ـــــ یہ اپنے پرستاروں کو غیر فانی شہرت وناموری بخشتی ہے ـــــ "ریاست قوم کے اُن رہنماؤں کی یاد کو جنہوں نے اس کے حدودِ سلطنت کو وسیع کیا ہے اور اُن اہلِ علم کے نام وعزّت کو جنہوں نے اپنی قابلیت فن سے اس کو بقائے دوام بخشا ہمیشہ تازہ رکھتی ہے۔" (مسولینی)

جس قوم میں ریاست کا مندرجہ بالا مفہوم مردہ ہوجاتا ہے اور جہاں افراد یا مختلف گروہوں کی نااتفاقی، بے راہ روی اور "پریشاں خیالی" ظاہر ہونے لگتی ہے ـــــ وہ قوم آمادہ بہ زوال ہوتی ہے۔

فاسی ریاست، توسیع سلطنت (یعنی قوم کی وسعت وافزائش) کو دلیلِ حیات سمجھتی ہے ـــــ وہ "جغرافی حدود" میں محصور رہنے کو زوال وتباہی سے تعبیر کرتی ہے ـــــ ہر وہ قوم جو ابھی پستی ونکبت کے غار سے نکلی ہے جو صدیوں کے بعد اپنی غفلت کی نیند سے بیدار ہوئی ہے (اور اٹلی یقیناً ایسی ہی قوم ہے) وہ ہمیشہ استعماریت پسند ہوتی ہے۔ اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنا اقتدار وتسلط ہر جگہ جمائے ـــــ چار دانگِ عالم پر چھاجائے اس کے لئے ضرورت ہے کہ قوم منظم ہو، طاقتور ہو۔ اُسے احساسِ فرض ہو، اپنی زندگی کے مشن سے آگاہ ہو ـــــ تاکہ وہ اپنے مخالفین کو جو اُس کی راہِ ترقی میں سدِّ راہ ہوں، مار گرائے اور ہمیشہ کے لئے اُنہیں نیچا دکھادے ـــــ یہ تمام فرائض ریاست انجام دیتی ہے جس کے افراد اُس کی قوت ومحکمیّت پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔

آغازِ کار میں فاسیّت کا پروگرام حسب ذیل تھا:-

(۱) شہنشاہیت، طبقۂ اُمرا اور سینیٹ کا خاتمہ (۲) جمہوری طرزِ حکومت، مجلسِ ملّی کا انتخاب رائے عامہ کے ذریعہ قرار پایا (۳) بین الاقوامی تحدید اسلحہ اور جبری فوجی بھرتی کی ممانعت (۴) کلیسا کی زمین وجائداد کی ضبطی (۵) جنگی اسلحہ سے منافع حاصل کرنے کی مذمت اور تمام چھوٹی چھوٹی اور محدود ذرکنیت رکھنے والی کمپنیوں کی منسوخی (۶) تمام زمین کسانوں کی ملکیت قرار دی گئی۔ (۷) صنعتی کارخانوں کا انتظام مزدوروں کے سپرد کیے جانے کا وعدہ کیا گیا۔

لیکن جب فاسیّت برسرِ اقتدار ہوئی تو یہ تمام وعدے اور اُمیدیں "پالیسی" بن کر رہ گئیں۔ شہنشاہیت برقرار رکھی گئی جمہوریت کے بجائے اختیارِ مطلق نے قبضہ جمایا۔ تحدید اسلحہ اور جبری فوجی بھرتی کی ممانعت کی جگہ نئے اسلحہ اور نئی جنگ کی تیاری نے لی۔ کلیسا کا احترام بدستورِ سابق باقی رہا۔ شخصی ملکیت کی نافعیت اور ضرورت ظاہر کرکے کسانوں اور مزدوروں کو پہلے سے بھی زیادہ مضبوط شکنجہ میں کس دیا گیا۔

کئی برس کی "دماغ سوزی" کے بعد کہیں "کارپوریٹ" ریاست کا فارمولا تیار کیا گیا۔ جو سرمایہ داروں اور مزدوروں کو اریاست

رقوم کے فائدے کے لئے مصالحانہ روش پر چلائے گا۔ اُن میں اتحادِ عمل اور اشتراک کار کی روح پھونک دے گا۔ اور بتائیگا کہ آپس کے
نازعات چھوڑ کر قوم کی خدمت کرنا فرضِ اولین ہے ———

اس کے اجزائے ترکیبی مندرجہ ذیل ہیں :-

اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ معاشری تفریق قائم رکھی گئی ہے ——— سرمایہ دار اور مزدور دونوں الگ الگ "ذمہ دارانہ" حیثیت رکھتے ہیں ——— لیکن بجائے اس کے کہ تمام مزدوروں کو ایک خاص طبقہ سمجھ کر اُن پر سرمایہ داروں کو مسلط کر دیا جائے یہ بہتر سمجھا گیا کہ پیشہ کے لحاظ سے تقسیم کی جائے اور بعد ازاں "ساہوکاری" کو اُن کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے مقرر کیا جائے ——— یہ خیال نابکیت سے لیا گیا ہے لیکن جماعتی اور معاشری تفریق قائم رکھکر اُس کو ایک الگ صورت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہر ایک صنعتی کاروبار کے سرمایہ دار ایک یونین بناتے ہیں اور اسی طرح اُن کے ماتحت کام کرنے والے مزدور اپنی الگ یک یونین بناتے ہیں ——— (مثلاً ڈبل روٹی بنانے والے سرمایہ داروں کی ایک یونین اور کپڑا بننے کے کارخانہ داروں کی دوسری یونین، اسی طرح اُن میں کام کرنے والے مزدوروں کی الگ الگ یونین ہوگی)۔ اس یونین سے کچھ ممبر انتخاب کئے جائیں گے اور اسی طرح سے مزدوروں کی یونین سے کچھ ممبر چُن لئے جائیں گے اور یہ منتخب اراکین ایک کارپوریشن بنائیں گے جو خاص صنعتی کاروبار کے انتظام کی نگرانی کرے گی ——— ان ممبروں کا کام یہ ہے کہ اپنے اپنے مقاصد پیش نظر رکھیں اور متحدہ عمل سے اپنے مخصوص کاروبار کو ترقی دیں۔ گویا کارپوریشن، ڈائرکٹروں کا ایک بورڈ ہے ——— کارپوریشن کا صدر وزیرِ مجالس[۵۱] کی طرف سے کوئی سرکاری ممبر ہوگا۔ یہ کارپوریشن بظاہر خود مختارانہ حیثیت رکھتی ہے اور تمام متعلقہ امور کا فیصلہ و انتظام اس کے اراکین کے ہاتھوں میں ہے تاہم یہ اپنے تمام افعال کیلئے وزیرِ مجالس کے سامنے جواب دہ ہے ——— اس طرح سے کارپوریشن، ریاست ہی کا ایک حصّہ بن جاتا ہے ——— سرمایہ داروں اور مزدوروں کی ان سبھاؤں کے لئے ضروری ہے کہ "وہ وزارتِ مجالس کی اجازت و منظوری حاصل کریں۔" "اسکے اراکین کے لئے ضروری ہے کہ وہ سوشل اور سیاسی زندگی میں ایک خاص درجۂ اہمیت رکھتے ہوں۔" (Cole)۔

یونین کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص مفاد کو مدِ نظر رکھے۔ اُس کی نظر صرف اُس کے کاروبار تک محدود ہو اور اُس کی حتی الامکان یہ کوشش ہونی چاہئے کہ اُس کے تجارتی مقاصد کو فروغ ہو ——— اور کارپوریشن کا یہ کام ہے کہ وہ مزدوروں اور سرمایہ داروں کے متضاد مفاد کو اپنی "حکمتِ عملی" سے وجہِ فساد نہ بننے دے بلکہ اُن کو مصالحت سے طے کرے تاکہ وہ مل جُل کر نہایت مصالحانہ انداز میں اپنا کام سرانجام دیتے رہیں۔ علاوہ ازیں اس کا کام یہ بھی ہے کہ وہ تجارتی اعداد و شمار[۵۲] مہیا کرے، صنعتی سکول قائم کرے، تیار شدہ اشیا کی لاگت کم کرنے کے لئے کمیشن مقرر کرے اور صنعت کو فروغ دینے کے لئے جدید اصولوں اور میکانکی ایجادات کو استعمال میں لائے ———

---

۵۱ Minister of corporation ——— ۵۲ statistics

"تمام مقامی سبھائیں، مجالس اعلیٰ یا قومی سبھاؤں (National Unions) میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ اور یہ قومی سبھائیں تیرہ وفاقی مجالس کی ممبر ہوتی ہیں ——— جن میں سے چھ سرمایہ داروں کیلئے اور چھ مزدوروں کے لئے مخصوص ہیں اور تیرھویں ملازمت پیشہ لوگوں سے متعلق ہوتی ہے"۔ (Fascism - Major Barnes)

علاوہ ازیں مرکزی کارپوریٹ کونسل ہوتی ہے، جو ان سبھاؤں سے متعلقہ سماجی و معاشی امور کا فیصلہ کرتی ہے اس میں مختلف سبھاؤں کے اراکین بھی موجود ہوتے ہیں۔ اس کا صدر خود وزیر مجالس یا ریاست کا وزیر اعظم ہوتا ہے۔ اس مرکزی کونسل کو چند قانونی اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں جن کی مدد سے یہ کارپوریٹ سٹیٹ کے نظام کو قابو میں رکھتی ہے۔

مزدوروں کو ہڑتال کرنے کی سخت ممانعت ہے، بلکہ بعض اوقات اُن پر جرمانہ بھی کیا جاتا ہے۔ اُن کو کوئی حق نہیں کہ وہ بطور احتجاج کام کرنے سے انکار کردیں ——— ہر قسم کی شکایات اور باہمی تنازعات کا فیصلہ کارپوریشن کرتی ہے ——— اگر وہاں کوئی فیصلہ نہ ہوسکے تو قانونی عدالتوں میں چارہ جوئی کرنا پڑتی ہے ——— مگر اس کی قطعی ممانعت ہے کہ کوئی ہڑتال یا مظاہرہ کیا جائے ——— الغرض فاسیت چاہتی ہے کہ سرمایہ داروں اور مزدوروں کے مفاد کو "مصالحانہ انداز" میں پیش نظر رکھے۔ اُس کی کوشش ہے کہ وہ آپس میں لڑ جھگڑ کر اپنی قوت کا فضول مظاہرہ نہ کریں کیونکہ اس سے تمام قوم کو نقصان پہنچتا ہے ———

فاسیت کے معاشی نظام کو ہم دیکھ چکے ہیں۔ اب اس کے سیاسی اداروں کا مجملاً ذکر کیا جاتا ہے۔ اٹلی میں ابھی تک بادشاہت قائم ہے لیکن بادشاہ ایک "آئینی" حیثیت رکھتا ہے یعنی حکمران وہ ہے مگر انتظام سلطنت دوسروں کے ہاتھوں میں ہے ——— اُس کا درجہ بالکل شاہِ انگلستان کے برابر ہے، وہ باقتدار پارٹی میں سے سب سے زیادہ بااثر ممبر کو اپنا وزیر اعظم مقرر کرتا ہے (گو اٹلی میں سوائے فاسیت کے اور کوئی پارٹی نہیں) ——— وزیر اعظم اپنے کابینہ وزارت کے اراکین کو خود مقرر کرتا ہے اور اُن کو مختلف وزارتیں سپرد کرتا ہے ——— یہ وزیر، براہ راست وزیر اعظم کے سامنے جوابدہ ہیں ——— اور وزیر اعظم اپنے اعمال کیلئے صرف بادشاہ کے سامنے جوابدہ ہے ———

کابینہ وزارت کے ممبر اپنے اپنے محکموں کا انتظام کرتے ہیں مثلاً وزیر امورِ ملکی ——— اس کا کام کئی حصّوں میں منقسم ہوتا ہے۔ صوبائی حکومت، 'Prefects' کو تفویض کی جاتی ہے اور پھر ان کے ماتحت 'Podesta' ہیں جو اضلاع کے افسر اعلیٰ کی سی حیثیت رکھتے ہیں ——— اسی طرح وزیر مجالس کے انتظامات کئی ایک چھوٹے چھوٹے محکموں میں تقسیم کردیئے گئے ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان انتظامی افسروں کی بہت قوت ہے تاہم یہ مجلس وضع قوانین کے مطیع ہیں ——— وہ یہ نہیں کرسکتے کہ نئے قوانین اپنی مرضی سے حسب ضرورت وضع کرلیا کریں۔ بلکہ یہ کام ایک خاص مجلس وضع قوانین کے سپرد ہے۔ اس کے دو ایوان ہیں لیکن ان ایوانوں کے اراکین رائے عامہ یا پبلک کے انتخاب کردہ نہیں ہوتے بلکہ اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

(۱) سینیٹ ۔ اس کے اراکین "لائف ممبر" ہوتے ہیں اور ان کو بادشاہ، وزیر اعظم کی سفارش پر مقرر کرتا ہے، شاہی

خاندان کے شہزادے اس کے ممبر اپنے "پیدائشی حق" کے باعث ہوتے ہیں باقی اراکین وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی عمریں چالیس سال سے متجاوز ہوں اور جو ریاست کی کسی طرح سے نمایاں خدمت کر چکے ہوں ۔ مثلاً فوجی افسر، بڑے بڑے سائنسدان، ماہرانِ سیاست و قانون، مزدوروں کے رہنما، سرمایہ دار، اور مصنفین وغیرہ ۔

(۲) مجلس اراکین ـــــ اس میں زیادہ تر پیشہ ور لوگ ہوتے ہیں ۔ اور اُن تیرہ وفاقی مجالس کے اراکین سے انتخاب کئے جاتے ہیں ۔ جن کا ذکر ہم اُوپر کر چکے ہیں ۔ اِن کا کام فقط اپنے مخصوص مقاصد کا خیال رکھنا ہے اور ان کا سب سے ضروری فرض یہ ہے کہ مطلب برآری کے لئے کوشش کریں ۔ لیکن اُن کو اس بات کا خیال رکھنا لازم ہے کہ ان کی یہ خود غرضی ریاست اور قوم کے مفاد کے منافی نہیں

کوئی نیا قانون دونوں ایوانوں کی منظوری کے بغیر وضع نہیں کیا جا سکتا ۔ مجلس انتظامیہ بل وغیرہ پیش کر سکتی ہے اور ان بلوں پر دونوں ایوان بحث کرتے ہیں، اُن میں ترمیم و تنسیخ کرتے ہیں وہ سالانہ تخمینہ پر ہر قسم کی نکتہ چینی کرتے ہیں اور اُنہی کے ذریعہ سے مختلف طبقوں کی شکایات پر غور کیا جاتا ہے ـــــ لیکن ان کو یہ اختیار نہیں کہ وہ کابینہ وزارت کے خلاف "بے اعتمادی" کا ووٹ پاس کر سکیں ۔ یعنی وہ یہ اختیار نہیں رکھتے کہ کسی وزارت کو حسب منشا توڑ دیں ـــــ گو ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کی راہ میں ہمیشہ مشکلات پیدا کرتے رہیں اور ہر بات میں اُس کی مخالفت کریں، جس سے مجبور ہو کر بادشاہ وزارت کو تبدیل کر دے ۔

اگر کوئی ایسا قانون بنانے کی ضرورت پڑے جس سے آئینی مشین میں تبدیلی کرنا مقصود ہو تو اُس کے لئے فاسی مجلس عظمیٰ[۱] کی منظوری ضروری ہوتی ہے ـــــ یہ مجلس مندرجہ ذیل اراکین پر مشتمل ہوتی ہے :۔

(۱) چار لائف ممبر جن میں سے ایک مسولینی ہے (۲) دیگر اعیانِ سلطنت مثلاً فاسی پارٹی کا سیکرٹری، وزرائے ریاست فاسی ملشیا کا سردار اعلےٰ وغیرہ ۔ (۳) وزیرِ اعظم کے مقرر کردہ اشخاص جو اپنے کارہائے نمایاں کے باعث اس عہدے پر پہنچتے ہیں ۔ یہ ممبر صرف تین سال تک متعین کئے جاتے ہیں گو یہ مدت بڑھائی جا سکتی ہے ۔

اب ہم فاسیت کے معاشی، سیاسی، آئینی ..... تقریباً تمام پہلوؤں پر روشنی ڈال چکے ہیں ۔ مگر ابھی تک لفظ فاسیت کی صراحت باقی ہے ۔ یہ لفظ دراصل رومن ریاست کی یادگار ہے ۔ جب رومن مجسٹریٹ (حاکم عدالت) ملزموں کو سزائیں دیتے تھے تو کچھ افسر ـــــ ایک تبر اور چند چھڑیوں کا ایک بنڈل ہاتھ میں لئے ـــــ حاکم عدالت کے سامنے حاضر رہتے تھے ـــــ اس تبر اور چھڑیوں کے بنڈل سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں ۔ اوّل یہ کہ ریاست یعنی قوت اور حکومت کی ضرورت ہے یعنی کسی قوم یا سوسائٹی کے قیام و بقا کے لئے ایک ایسے ادارے کی ضرورت ہوتی ہے جو بزور اُسے اپنے قابو میں رکھے ـــــ دوسرے چھڑیوں کے بنڈل سے اتفاق، ایک جہتی اور اتحادِ عمل مُراد لی جاتی ہے ۔ یعنی ہر قوم کو قوت و حکومت اور اتفاق و یک جہتی کی ضرورت ہے ۔ فاسیت ان

---

[۱] Grand Fascist Council.

دونوں اساسی اصولوں پر قائم ہے ۔

اس کے علاوہ مختلف مصنفین نے مختلف طرح سے اس کی تعریف کی ہے مثلاً لونگی و لاری کے الفاظ میں فاسی پروگرام دوسری پارٹیوں کے نصب العین سے اس لئے مختلف ہے کہ اول الذکر سیاسی و اخلاقی دونوں پہلوؤں پر زور دیتا ہے مگر مؤخر الذکر فقط سیاسی (یا زیادہ سے زیادہ معاشی) مسائل کا حل پیش کرتی ہیں ۔

"فاسی لیگ" کا اخبار اس کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتا ہے :۔

"فاسیت جمہوریت کے خلاف قوم پرستوں کی بغاوت کا نام ہے اور یہ ریاست و حکومت کی طرف سے رہنمائی کرتی ہے۔ فاسی حکومت اشتراکِ عمل پر زور دیتی ہے . . . . . "

خود مسولینی کے الفاظ میں فاسیت کی بنیاد اس کے ریاستی تخیل پر قائم ہے، یعنی ریاست کی ہئیتِ ترکیبی اس کے فرائض اور نصب العین، فاسی پروگرام کو ظاہر کرتے ہیں . . . . جب کوئی فاسیت کہتا ہے تو اس کی مراد ہمیشہ "ریاست" سے ہوتی ہے ۔

الفاظ کے اِن پرپیچ گورکھ دھندوں کو سادہ اور غیر مبہم زبان میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ فاسیت کی اصلی روح حکومت اور اشتراکِ عمل ہے . . . . . . اور بس ۔

(۲)

اشتراکی کہتے ہیں کہ نظامِ سرمایہ داری انحطاط پذیر ہے، اس میں چند ایسے عناصر موجود ہیں جو اُسے تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں :

کیا یہ فیصلہ صحیح اور محکم دلائل پر مبنی ہے ؟

یہ معلوم کرنے کے لئے ہم کو دنیائے سرمایہ کے معاشی و سیاسی اداروں کا عمیق مطالعہ کرنا پڑے گا تاکہ ہم سچے واقعات کی بنا پر قطعی اور آخری رائے قائم کر سکیں۔ اس کے دو طریقے ہیں :۔ اوّل ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اس دنیائے سرمایہ میں ایسے کون عناصر ہیں جو از خود پیدا ہو کر اس کی موت و ہلاکت کا موجب بن رہے ہیں۔ دوسرے ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اس نظام نے نوعِ انسان پر کیا کیا احسانات کئے ہیں اور کیا یہ انعامات ایسے ہیں جو اس کے بقا و استحکام کی سفارش کرتے ہوں ۔

(۱) اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نمایاں چیز جو ہمیں نظر آتی ہے وہ سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشمکش ہے۔ اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں گروہ متضاد خواہشات رکھتے ہیں۔ ایک کا نفع دوسرے کی موت و حیات کا لاینحل مسئلہ بن جاتا ہے ان کے مفاد کا یہ تضاد مطلق سطحی نہیں بلکہ بنیادی اور بہت اہم ہے۔ جب تک ان میں سے ایک طبقہ کلیتہً مٹ نہ جائے، ان کے آپس کے تنازعات کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی ثالثی قوت، کوئی درمیانی راہ، کوئی مصالحانہ کوشش اُن کو خوشگوار اور پرامن راہِ عمل پر گامزن نہیں کر سکتی ۔

ان کے اس معاندانہ رویہ کی بنا منفعت جوئی، طلبِ زر اور خواہشِ اقتدار ہے۔ سرمایہ دار کی سب سے بڑی اور پہلی خواہش یہ ہوتی
ے کہ وہ نفع حاصل کرے، دولت کمائے، اور زر و جواہر کی مدد سے تمام مادی ذرائع راحت و عیش پر قابو حاصل کر کے حکومت
ے، اُس کا معمولی سے معمولی کام اسی مقصد کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔ مزدوروں کا لاؤ لشکر اسی مقصد کے لئے رکھا جاتا ہے۔ بڑے
ے کارخانے لمبی لمبی ریلیں، اُونچے اُونچے محل اسی مقصد کے لئے تعمیر کئے جاتے ہیں۔

خیر یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ مزدور غریب، سرمایہ دار کے عنایت کردہ قلیل مشاہرہ ہی سے جسم و روح کے تعلق کو قائم رکھنے کی
ناکام کرتے رہتے۔ مگر ایک نئی آفت سے دوچار ہونا پڑا جس کی موجودگی سرمایہ دارانہ نظام میں بالکل ناگزیر ہے۔ ایک کارخانہ دار کا
سرا کارخانہ دار رقیب ہے۔ ایک سرمایہ دار دوسرے سرمایہ دار کا حریف ہے۔ اُن کی رقیبانہ سرگرمیاں اُن کو ہمیشہ مصروفِ پیکار رکھتی
ں۔ وہ ایک دُوسرے کو شکست دینا چاہتے ہیں۔ اس جنگِ زرگری میں ان کا سب سے بڑا ہتھیار نفع ہے جس کا نفع زیادہ، اُس کی
رت زیادہ جس کی تجارت زیادہ اُس کا غلبہ زیادہ —— یہ نفع حاصل کرنے کے لئے وہ ہر ممکن کوشش عمل میں لاتے ہیں۔ مزدوروں
اُجرت کم کی جاتی ہے، اجناسِ خام کو کم سے کم قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، تیار شدہ اشیاء کو بہت گراں قیمت پر فروخت
جاتا ہے — اور سب سے آخر میں ضرورت سے زیادہ پیداوار کو (صرف نفع کثیر حاصل کرنے کے لئے) نذرِ آتش کر دیا جاتا ہے۔

مزدوروں کی اُجرت میں کمی ان میں ایک خطرناک بیداری پیدا کرتی ہے، کیونکہ اُن کی قلیل مزدوری اُن کی معمولی ضروریاتِ
ندگی کی بھی کفیل نہیں ہو سکتی۔ مزدور اُٹھتے ہیں، سرمایہ داروں کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ سال کے بیسیوں دن ہڑتال کی نذر
جاتے ہیں۔ مشینیں اور دوسرے آلاتِ پیداوار تباہ کر دیئے جاتے ہیں۔ سینکڑوں مزدور پولیس اور فوج (سرمایہ دار کے مسلح ایجنٹ)
گولیوں کا نشانہ بنتے ہیں ——

تاہم سرمایہ دار ان مصائب (مسلح بغاوتوں، ہڑتالوں وغیرہ) سے بچ نکلنے کی ایک نئی ترکیب سوچتا ہے۔ اُسکے روپے اور اشارہ
میکانکی ایجادات عمل میں آتی ہیں۔ سائنس نئے نئے آلاتِ پیداوار تیار کرتی ہے۔ سرمایہ دار اُن پر عمل کرتا ہے۔ دس مزدوروں کا
کام ایک مشین صرف ایک گھنٹہ میں کر دیتی ہے۔ اس طرح سے مزدور کم ہوئے مگر اشیاء زیادہ تیار ہوئیں۔ علاوہ ازیں ذرائعِ آمد و
فت کی ترقیاں، تار اور ٹیلیفون کی ایجادیں، تجارتی کاروبار میں زیادہ بیدار مغزی سے کام —— یہ سب حالات اشیاء کی لاگت
ں کمی کرتے ہیں۔ اور چیزیں قدرتاً سستی ملتی ہیں۔ مگر بوجوہ ذیل ایسا نہیں ہوتا —— اوّل تو یہی کہ مشینوں کی رفتارِ پیداوار
س قدر بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ دِنوں کا کام چند گھنٹوں میں کر دیتی ہیں جس کے باعث اشیا بہت زیادہ مقدار میں پیدا ہوتی ہیں
ور اُن کی طلب، رسد سے بدرجہا کم ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کے خریدار کون ہیں —— ؟ وہی مزدور اور کسان جن پر سرمایہ دار
دندانِ آز تیز کرتے ہیں —— مزدور بیکار ہیں —— اور جو باکار بھی ہیں اُن کی اُجرت بہت کم۔ کسانوں سے چیزیں کم قیمت پر لی

گئیں۔ اس لئے اُن کا منافع کم ــــ چنانچہ اُن کے پاس اتنے دام کہاں کہ وہ ان سستی چیزوں ہی کو خرید لیں معمولی ضروریاتِ زندگی کے خریدنے کے بعد اُن کے پاس پھُوٹی کوڑی تک نہیں بچتی ــــ اب سرمایہ دار کی آنکھیں کھُلتی ہیں ــــ مال گودام لدے بھرے ہیں۔ مگر کوئی خریدار نہیں۔ مال تیار ہے مگر منڈی ندارد۔ اب وہ ایک اور چال چلتا ہے۔ خریداروں کی مانگ سے بچا ہُوا مال وہ نذرِ آتش کر دیتا ہے۔ بڑی بڑی مشینیں تلف کر دی جاتی ہیں۔ کارخانے بند ہو جاتے ہیں، مزدور بیکار پھرتے ہیں ــــ اور اس طرح "ضرورت سے زیادہ پیداوار" سے بچنے کے لئے وہ یہ خطرناک راستہ اختیار کرتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو سرمایہ دار نظام میں بالکل ناگزیر ہے۔ منفعت جوئی ہمیشہ بد نتائج کی طرف راہنمائی کرتی ہے ــــ مشینوں کا استعمال، زیادہ نفع حاصل کرنے کی تمنا، ضرورت سے زیادہ پیداوار، مزدوروں کی اُجرت میں کمی، کارخانوں کا بند ہونا ــــ اور پھر اُن میں کام کرنے والے مزدوروں کا بیکار رہنا۔ یہ سب پُرشورش اور انقلاب آفریں حالات، دنیائے سرمایہ کے خود اپنے پیدا کردہ ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ تمدنِ دُنیا باوجود اپنے محیّر العقول کارناموں کے، باوجود تار، ٹیلیفون، لاسلکی اور دوسری مفید ایجادوں کے امن و چین سے ناآشنا ہے ــــ دراصل سرمایہ داری کے نشو و ارتقاء، اُس کی قوت و استحکام کا راز تجارتی منافع میں پنہاں ہے، اور یہ تجارتی منافع اسی صُورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ مزدوروں کو ہر طرح سے بے دست و پا کر کے اُن کو مشینوں اور میکانکی آلات کے ماتحت کر دیا جائے۔ اُن کی قوتِ تخلیق سلب کر لی جائے۔ اُن کے دماغ کی اپج اور طبیعت کی اُمنگ کو کچل دیا جائے ــــ اور سرمایہ داری یہی کرتا ہے۔ پایانِ کار اُس کا ناگزیر نتیجہ وہ مزدوروں کی ہڑتالوں (بعض اوقات مسلح بغاوت) کی صورت میں دیکھتا ہے ــــ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے بین الاقوامی حالات (جو اس زرپرستی کے باعث ظہور پذیر ہوتے ہیں) نظامِ سرمایہ داری کی کمزوری، اُس کے انحطاط اور بالآخر اُس کے زوال کی پیش بینی کرتے ہیں۔

سرمایہ و محنت کی کشمکش تو خیر (ایک حد تک) کسی ملک کی اندرونی جنگ تھی۔ لیکن سرمایہ داروں کی یہ خواہش کہ اجناسِ خام کم قیمت پر خریدی جائیں، ایک اہم بین الاقوامی مسئلہ پیدا کرتی ہے۔ یورپ بالخصوص انگلستان، جرمنی، فرانس وغیرہ نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے بعد سے سرمایہ دارانہ ذہنیت سے متاثر ہوئے۔ ان کے ولولۂ عمل نے ملکی منڈی کو بہت تنگ پایا۔ اور انہوں نے وسیع تر "بازی گاہوں" کی تلاش شروع کی۔ تاکہ وہاں صرف تجارت کریں، انگریز اور فرانسیسی ہندوستان میں آ دھمکے (اختصار اور تسہیلِ فہم کے لئے صرف ہندوستان کو لیا جاتا ہے) یہ لوگ صرف تجارتی غرض سے یہاں آئے تھے، اسلئے کہ یہاں سے مال لے کر اپنے اپنے ملک میں بھیجیں اور وہاں کی مصنوعات ہندوستان میں فروخت کریں۔ مگر معاشی پالیسی، سیاسی حکمتِ عملی سے بدل گئی۔ پہلے ہندوستان کے پیٹ پر قبضہ کیا اور پھر اُس کے دماغ پر مسلّط ہو گئے۔ یہاں کی مصنوعات، یہاں کے کاریگروں، یہاں کے کارخانوں کو تباہ کر دیا گیا۔ اور اس کی بجائے خام اشیاء کی پیداوار کو ترقی دی گئی۔ ان کو انگلستان بھیجا گیا، وہاں کارخانے تیار کئے گئے مصنوعات تیار کی گئیں اور پھر اُن کو ہندوستان بھیج کر کئی گُنے دام وصُول کئے گئے ــــ یہ منافع حاصل کرنے کی پالیسی تھی ــــ ہندوستان کو ایک وسیع قطعۂ زمین

تصور کیا گیا جہاں انگلستان کے کارخانوں کے حسب خواہش اجناس خام کی کاشت ہوتی تھی ــ اس طرح سے سرمایہ دار ملکوں نے "غیر مہذب" آرام طلب یا اپنے سے کمزور ملکوں میں تجارتی اثر و رسوخ پیدا کر کے ان کو سیاسی نقطۂ نظر سے بھی اپنا مطیع کر لیا۔ یہ انگلستان ہی پر موقوف نہیں بلکہ ہر سرمایہ دار ملک نے ایسا کیا۔ خام اشیا کے حصول کے لئے یہ نوآبادیاں پیدا کی گئیں اور یہ غیر ملکی سرمایہ دار وہاں کی آبادی پر ناجائز دباؤ ڈال کر اپنا منافع وصول کرتے رہے ــ اس سے جو نقصانات پیدا ہوئے اُن کے ذمہ دار یہی سرمایہ دار ہیں۔

نوآبادیاں "غیر مہذب" تھیں۔ مگر سرمایہ داروں نے اُن کو مہذب بنایا، نوآبادیاں صنعت و تجارت سے ناواقف تھیں مگر سرمایہ داروں نے اُن کو یہ "زرکشی" بھی سکھا دی، اُنہوں نے وہاں سرمایہ دار پیدا کئے۔ نوآبادیاں اپنے قدیم معاشری اداروں میں نہایت امن کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ مگر سرمایہ داروں کے جدید متمدن نظام نے نہ صرف وہاں بے چینی پیدا کی بلکہ تمام دُنیا کو میدان کارزار بنا دیا ــ جو انجام کار اس نظام کے لئے پیام موت ثابت ہو گا ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی ۔۔۔ جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہو گا

اس کی تفصیل یوں ہے:-

غیر ملکی سرمایہ سے (جو یقیناً غالب ملک کے سرمایہ دار بھیجتے ہیں) نوآبادیوں میں بھی کارخانے تیار کئے جاتے ہیں۔ جو غالب ملک کی ضروریات کی چیزیں تیار کر کے روانہ کرتے ہیں مثلاً ہندوستان سے سن کی بوریاں تیار کر کے روانہ کی جاتی ہیں۔ یا اس روپے سے نوآبادیات کی اندرونی ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے۔ مثلاً لال املی کے اونی سُوتی کپڑے تیار کر کے ہندوستانیوں کو "سودیشی" مال مہیا کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے یہ غیر ملکی سرمایہ ہندوستان میں بھی ایک نئی چیز پیدا کرتا ہے۔ یعنی 'سرمایہ داری'، دوسرے لوگ بھی جن کا روپیہ زمین دوز خزانوں یا زیور وغیرہ کی صُورت میں بیکار پڑا تھا۔ اب نئے نئے کارخانوں کی تعمیر میں خرچ کرتے ہیں ــ ہندوستانیوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وہاں مزدوروں کا لاؤ لشکر رکھ کے دن رات کارخانہ چلائے جاتے ہیں ــ تمام نئے ملکی سرمایہ دار اپنے ہی بھائیوں۔ اپنے ہی ملکی خریداروں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں ــ اس ساہوکاری کا سب سے نمایاں نتیجہ ایک خاص جماعت کی تشکیل میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ جماعت سرمایہ داروں کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اُس کے بغیر اُن کے کاروبار میں ترقی دشوار ہے ــ یہ جماعت مزدوروں کا طبقہ ہے جو نوخیز سرمایہ داری کے ساتھ ساتھ جنم لیتا ہے۔ یہاں بھی متضاد اغراض کی کشمکش جاری رہتی ہے ــ ملکی سرمایہ دار اور ملکی مزدور ان کی صف آرائی بھی وہی نتائج پیدا کرتی ہے۔ جو اب تک صرف سرمایہ دار ممالک میں ظاہر ہوتے تھے ــ

علاوہ ازیں ملکی سرمایہ داروں اور غیر ملکی سرپرستوں میں بھی ایک خاموش مگر تباہ کُن رقابت پرورش پاتی رہتی ہے۔ اُن کے تنازعات بھی مزدوروں اور دوسرے غریب طبقوں ہی پر مہلک اثر ڈالتے ہیں۔ کیونکہ تیار شدہ اشیا کے خریدار صرف یہی لوگ ہوتے ہیں۔ اور بالآخر یہاں بھی بے کاری، ضرورت سے زیادہ پیداوار، اگر ساتھ ہی ساتھ غربت، بے اطمینانی اور انقلاب پسندانہ سرگرمیاں پیدا ہوتی رہتی

ں ـــــ جب یہ ملکی بے چینی خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے تو وہاں کی سرمایہ دارانہ ذہنیت بھی اپنی پالیسی بدل دیتی ہے ۔ مثلاً ہندوستان
ے سرمایہ دار جانتے ہیں کہ غیر ملکی سرمایہ اُن کے شکار پر دست درازی کر رہا ہے ۔ اس لئے وہ اس مد اخلتِ بیجا کے خلاف احتجاج کرتے ہیں
اشائر کے خلاف شور و غوغا کیا جاتا ہے ۔ سیاسی کانفرنسیں کی جاتی ہیں ۔ آزادی طلب نعرے لگائے جاتے ہیں ۔ یہ سب صرف اس لئے
جاتا ہے کہ برطانیہ کی سرمایہ دارانہ حکومت کا خاتمہ کیا جائے ۔ اور اس کے بعد نہایت امن اور اطمینان سے اپنی من مانی کارروائیاں
یں ۔ ورنہ یہ حریت پرور نعرے بالکل بے حقیقت ہیں ۔ جیسا کہ ان ملکی سرمایہ داروں کے اعمال سے جلد یا بدیر ثابت ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ یہی کارخانہ دا
رس کو کھادی پرچار کیلئے چندہ دیتے دیتے ، سیاسی کانفرنسوں میں برطانوی استعماریت کے خلاف حقائق افروز تقریریں کرتے کرتے لنکاشائر کے
تھ تجارتی عہد نامے کر لیتے ہیں ۔ تاکہ دونوں مل کر وہی سا نفع بھی حاصل کریں ، اور مزدوروں کی خطرناک بیداری کو بھی جو اکثر و بیشتر ہڑتالوں
صورت میں ظاہر ہوتی ہے کچل دیں ۔ ان کی یہ پالیسی اپنی اصلی صورت میں اُس وقت ظاہر ہوتی ہے جب یہ لوگ جاپانی مال پر بھاری بھاری
صول درآمد لگا دیتے ہیں اور برطانیہ سے معاہدۂ اوٹاوا اور کلیر لیز مودی (Mody Clare Lees Pact) کی صورت میں رشتۂ اتحاد استوار کر لیتے ہیں ۔
طرزِ عمل سے ملکی سرمایہ دار اپنے ملک کی محدود فضا سے نکل کر بین الاقوامی سیاست میں ذمہ دارانہ حیثیت اختیار کر لیتے ہیں ۔ وہ اپنے غلام
محکوم ملک کی تمام حریت کوشانہ تحریکات کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اور اُن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کے ملک کو تسلطِ غیر سے نجات
مل نہ ہو بلکہ سرمایہ داروں کو اس قدر آزادی دے دی جائے کہ وہ بے روک ٹوک اپنی ستم شعارانہ اور تباہی خیز لوٹ مار جاری رکھ سکیں ۔ اس
مد کے لئے وہ غیر ملکی سرمایہ داروں سے تعاون کرتے ہیں ـــــ اب یہ صورت ہو جاتی ہے کہ ایک طرف غالب اور مغلوب ملکوں کے
مایہ دار اور دوسری جانب قدرتاً اپنی مشترکہ اغراض کے زیر اثر دونوں (غالب و مغلوب) ملکوں کے مزدور صف آرا ہو جاتے ہیں ۔ اور مزدوروں
یہ بین الاقوامی اتحاد ، تمام دنیائے سرمایہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کرتا ہے ۔

" دنیا کے مزدور و متحد ہو جاؤ " کارل مارکس نے یہ فقرہ واقعاتِ عالم کا تجزیہ کرنے اور اُن کو اشتراکی نقطۂ نظر سے پرکھنے کے بعد
زدوروں کے اسی بین الاقوامی اتحاد کی پیشگوئی کرتے ہوئے لکھا تھا ـــــ نو آبادیات میں صرف مزدوری ہی کی قوت ایسی
ں ہے جو سرمایہ داری اور استعماریت کے خلاف جد و جہد کر رہی ہے ۔ بلکہ وہاں کے قوم پرست طبقے بھی اپنے اپنے ملک کو غلامی کی
بیروں سے آزاد کرنا چاہتے ہیں ۔ ہندوستان میں برطانوی استعماریت کے خلاف " پر امن " کشمکش ، شام اور مراکو میں فرانسیسی
ع الارض کے خلاف دلیرانہ ، خونریز اور ایک حد تک کامیاب اقدام ، چینیوں جیسی سکون پسند اور عافیت اندوز قوم کا جاپانی ، امریکی اور برطانوی
ٹ مار کے خلاف شدید احتجاج ...... یہ سب نو آبادیات کے سوکھے چمڑے میں حیاتِ تازہ اور پژمردہ رگوں میں خونِ زندگی کے ابھرنے
کرشمہ ریزیاں ہیں ۔

یہ دونوں قوتیں (مزدور اور قوم پرست) بھی جن کا مقصدِ اولین استعماریت کو شکست دینا ہے ، سرمایہ داری ہی کی پیدا کردہ ہیں ۔

سب سے آخری قوت جو دُنیائے سرمایہ کے انحطاط کا باعث ہے وہ سرمایہ دار ملکوں کی آپس کی تجارتی مسابقت ہے۔ اس تجارتی مسابقت کا سب سے نمایاں خونیں مظاہرہ جنگِ عظیم تھی متحارب جماعتوں کی یہ خواہش کہ دُنیا کو از سرِ نو تقسیم کیا جائے تاکہ سب سے زیادہ طاقتور اور با اثر ملک کے حصے میں سب سے زیادہ نو آبادیات آئیں، جنگِ عظیم کا باعث ہوئی۔ جرمن سرمایہ داروں کو زک اُٹھانا پڑی۔ اور فرانسیسی، برطانوی، اطالوی اور سب سے بڑی گو نو دمیدہ طاقت امریکہ نے جرمنی کے حصے بخرے شروع کر دیئے۔ فوجی حیثیت سے جرمنی کو بالکل مفلوج کر دیا گیا، اور معاشی و سیاسی حیثیت سے اُس کو نو آبادیات سے محروم کر کے ایک بے حقیقت اور غیر اہم چھوٹی سی ریاست میں تبدیل کر دیا گیا ـــــ

لیکن جرمنی کے مزدوروں پر اب دو طرف سے مصیبت نازل ہوئی۔ اول اُن کے اپنے ملکی سرمایہ داروں کی غاصبانہ سرگرمیاں، دوسرے بین الاقوامی سرمایہ داروں کے جنگی قرضوں کا بار ـــــ جرمن پیکار جو حساس اور خود دار قوم پرست اُس کی تاب نہ لا سکا۔ اشتراکی پراپیگنڈا نے زور پکڑا، مگر کاٹسکی (Kautsky) کی تعلیم اور رہنڈن برگ کی اعانت نے فاسیت یا قومی اشتراکیت کی طرح ڈال دی۔

یہ تو صرف ایک مغلوب و مسلوب الاقتدار جماعت کے حالات تھے، فاتح سرمایہ داروں میں بھی ایک مہلک رقابت کے جراثیم پرورش پا چکے تھے۔ تعجب ہے جنگ ختم ہو گئی، صلحنامے مرتب ہونے لگے مگر پھر بھی آلاتِ حرب کی تیاری کے لئے ہر سالانہ تخمینہ مصارف میں ایک معتد بہ رقم زیادہ کر دی جاتی ہے ـــــ جاپان اور امریکہ بحرالکاہل میں بحری قوت کے لئے لڑ رہے ہیں۔ واشنگٹن کانفرنس کے فیصلہ کی دھجیاں امریکی ایوانِ کانگریس میں بکھری پڑی ہیں۔ برطانوی تدبر، جاپان کے جنگی عزائم کی لوریاں سُن کر سو چکا ہے ـــــ انگریز اور امریکی سرمایہ داری گلیشیا، رومانیا، موصل وغیرہ کے تیل کے چشموں کو وجہ جنگ بنائے ہوئے ہیں۔ شام اور مراکو میں قوم پرستوں کی مسلح بغاوت برطانوی استعمار کی ابلیسانہ کارروائیوں کا انکشاف کر رہی ہے۔ اطالیہ اور جرمنی "آسٹریا" کے نیم مردہ (یا نیم فاسی) شکار پر جنگی نعرے لگا رہے ہیں۔ مجلس تحدید اسلحہ بنی مگر بے نتیجہ ختم ہو گئی۔ معاشی کانفرنس بھی کوئی اہم کام کئے بغیر گہری نیند سو گئی۔ سیاسی کانفرنسیں ہوئیں۔ سٹریسا (Stresa) میں دولِ ثلاثہ (برطانیہ، فرانس اور اطالیہ) کا اجتماع ہوا مگر کیا فیصلہ ہوا یہی کہ جرمنی کا جبری بھرتی کا اعلان معاہدۂ ورسائی کے خلاف ہے۔ جرمنی جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے۔ جرمنی کو انجمن اقوام میں شامل ہو جانا چاہیئے۔ مگر یہ سب باتیں وہ ہیں جو ہر اخبار میں روزانہ نکلتی رہتی ہیں جو یورپ کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ تاہم مسولینی، میکڈانلڈ، سائمن، لاول وغیرہ ان لغو اور مہمل باتوں کے اعلان کو یورپ کی سیاسی بے چینی کا حل سمجھتے ہیں ـــــ

موجودہ یورپ کی ہر ایک سلطنت کسی نہ کسی دوسری سلطنت سے ڈرتی ہے۔ وہاں آپس میں کسی سیاسی مفاہمت کے نہ ہونے کے باعث ہر چہار جانب بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے اور اسی لئے ہمیشہ ریاکارانہ تدبیرہائے امن کے اعلان ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں بجائے امن کوش معاہدوں کے تجارتی پردہ میں جنگی معاہدے کئے جاتے ہیں۔ ایک ریاست دوسری ریاست کی اعانت کا عہد کرتی ہے۔ مگر پھر بھی صلح و امن کی فضا پیدا نہیں ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ روس اور فرانس میں ایک معاہدۂ اعانت ہو چکا ہے۔ مگر کیا یہ امر یقینی ہے کہ اگر جرمنی

کے سرمایہ دار، فرانسیسی سرمایہ پرستوں کے ساتھ اتحاد کرلیں۔ تو فرانس اپنے معاہد روس رجہاں یقیناً سرمایہ پرستوں کے خلاف ایک منظم قوت موجود ہے) کے خلاف جارحانہ اقدام نہ کریگا۔ جرمنی، اشتراکی روس کا سب سے بڑا دشمن۔ انگریز، روس کو ایک مضبوط ملک دیکھنا نہیں چاہتے۔ یہی حال فرانس، امریکہ، اطالیہ کا ہے۔ یہ سرمایہ دار ممالک نہیں چاہتے کہ ان کے ممالک کے مظلوم، بے اطمینان اور انقلاب پسند مزدوروں کو کہیں سے کسی قسم کی مادی یا اخلاقی مدد مل سکے، اُن کی یہ کوشش ہے کہ وہ روس کے جدید اشتراکی نظام کو بے نتیجہ ثابت کردیں۔ تاکہ ان کے اپنے مزدوروں پر یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ وہ سرمایہ داروں کے اشتراک و تعاون کے بغیر معاشری و سیاسی مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔ لیکن روس ان ہتھکنڈوں سے واقف ہے۔ اشتراکی حکومت دنیا بھر کے مزدور مندوبین کو علے الاعلان دعوت دیتی ہے کہ وہ آئیں اور اس جدید معاشری نظام کو بامعان نظر مطالعہ کریں، اور دیکھیں کہ وہ کس طرح سرمایہ پرستوں کے بغیر ایک مجتمع و مستحکم حکومت قائم کر سکتے ہیں۔ کس طرح ایک دست و پا بُریدہ حکومت جو ہر چہار جانب سے غاصب قوتوں سے گھری ہوئی تھی ایک خود مختار، مضبوط اور قابلِ رشک نظامِ حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی —— لہٰذا ان سرمایہ دار حکومتوں کی یہ پالیسی ہے کہ وہ اس تربیت گاہِ اشتراکیت کو تباہ کردیں —— اس کے لئے اُنہوں نے جرمنی کو اپنا آلۂ کار بنانا چاہا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے جرمنی جنگی تیاریوں کے خلاف آخر دم تک چپ سادھ رکھی تھی، امریکیوں نے بھی جرمنی کے خلاف آج تک کوئی شدید احتجاج نہیں کیا۔ لیکن جب فرانس نے دیکھا کہ اُس کی حریص نظریں سار کے علاقہ سے گزر کر اُس کے اپنے حدود پر پڑ رہی ہیں تو وہ چونکا۔ آسٹریا پر جرمنی کے غاصبانہ اقدام (اگر اُس نے کبھی عملی صورت اختیار نہ کی) نے اطالیہ، فرانس اور برطانیہ تینوں بظاہر خفتہ قوتوں کو بیدار کر دیا۔ وہ جانتے ہیں کہ جرمنی میں قومی بیداری یعنی اُس کی فاسیت وہ سب کچھ کریگی۔ جو خود اُن کی قوم پرستانہ پالیسی اُن کی اپنی فاسیت کرنے کے لئے تیار ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ جرمنی ایک دفعہ مسلح ہو کر درسائی اور لوکارنو کی تجویز کردہ قیود میں جکڑا نہیں رہ سکتا بلکہ وہ انہیں بیک جنبش ریزہ ریزہ کر کے ہمسایہ ریاستوں پر آ پڑے گا، جس میں سب سے پہلا نمبر فرانس کا پھر آسٹریا کا اور پھر —— شاید روس کا ہوگا۔ یہ صرف قیاسی خوف نہیں بلکہ ایک تلخ حقیقت ہے جس کے صرف خیال ہی سے فرانسیسی مدبروں اور برطانوی شاعروں کی روح کانپ اُٹھتی ہے۔

جاپان کی نوخیز استعماری قوت منچوریا کو ہڑپ کر چکی ہے اور اب اُس کی فتنہ خیز پالیسی چین کے وسیع اور زرخیز میدانوں کی تاک میں ہے۔ یہاں بھی برطانوی سرمایہ داروں نے جاپان کو روس کے خلاف بھڑکانا چاہا —— انہوں نے جاپانیوں کو چین میں جارحانہ کارروائیوں کی "مبہم" سی اجازت دے دی، تاکہ جاپانی اس طرف سے مطمئن ہو کر اشتراکی سیلاب کا سدِ باب کر سکیں، مگر امریکی منفعت جوئی نے جاپانیوں کی چینی طاقت کو اپنے مفاد کے خلاف سمجھ کر اس پر سخت احتجاج کیا اور یہی کشمکش بحری قوت کے نام پر جاری ہے —— اس کے علاوہ روسی مدبرین بھی بھانپ گئے کہ برطانوی استعماریت جاپانیوں کو چین کا شکار پیش کر کے اُسکو نیچا دکھانا

چاہتی ہے، چنانچہ انہوں نے خود جاپانیوں کو (بظاہر) چینی سرزمین میں غاصبانہ دراندازی کی اجازت دے دی جس کا واضح ترین مظہر چینی روسی ریلوے کا فیصلہ ہے جو جاپانیوں کے حسب منشا طے پایا ۔ مگر اشتراکیوں نے چین کو "بے بس" نہیں چھوڑا ۔ بلکہ اُنہوں نے امریکہ کی سرمایہ دار حکومت کو جاپان کی فوجی حکومت کے مقابل لا کھڑا کیا ہے تاکہ وہ بغیر کسی پس و پیش، منافقت اور ریاکاری کے اپنا جھگڑا نپٹا لیں ——— مگر ان دونوں کے مقاصد چینی سرزمین پر ایک دوسرے سے متصادم ہیں ۔ اور دونوں میں سے کوئی بھی محکومانہ متابعت قبول نہیں کر سکتا ۔ اس طرح سے ایک طویل اور غیر فیصلہ کُن جنگ جاپانیوں کو روس کے ساتھ اُلجھنے کا موقع نہ دیگی ——— دوسرے چین میں ایک منظم اشتراکی قوت موجود ہے ۔ جو کسی صُورت میں بھی جاپان یا کسی دوسری سرمایہ دار حکومت کی سرپرستی قبول نہیں کر سکتی ۔ تیسرے چین میں برسوں کے جمود و تعطل کے بعد ایک قومی تحریک نے ورپکڑ رہی ہے، جو چین کی منتشر قوت کو کسی مرکزی حکومت کے زیر اثر لانا چاہتی ہے ——— اس طرح سے چین میں جاپان کے خلاف تین طاقتیں موجود ہیں ۔ جن میں سے دو (اشتراکی اور قومی پارٹیاں) یقیناً ایک متحدہ محاذ سے مدافعانہ اقدام کر سکتی ہیں ——— اور جب تک سرمایہ دار ملکوں کو چینی خام اشیاء کی ضرورت ہے اور جب تک اُن کا مال چین کی کھلی منڈی میں نفع کثیر حاصل کر سکتا ہے ۔ وہ چین کو نہ چھوڑینگے، اور نہ اُن کی رقیبانہ سرگرمیوں ہی میں کوئی فرق آئے گا ۔ اُن میں یُونہی سرپھٹول ہوتی رہے گی ۔ حتےٰ کہ عوام کی متحدہ قوت کا سیلاب عظیم اس خس و خاشاک کو بہا لے جائے ۔

"اگر سرمایہ پرست ممالک، نو آبادیات کو فتح کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ نہ لڑیں، اگر سرمایہ داری کا پودا (اقتصادی و معاشی نقطۂ نظر سے بدحال ممالک (جہاں سے سرمایہ دار خام اشیا حاصل کرتے ہیں اور جہاں مزدوری بہت سستی پڑتی ہے) کو سرمایہ بھیجے بغیر پروان چڑھ سکے، اگر یہی سرمایہ جو نفع کثیر کی صُورت میں بچ رہتا ہے، بجائے بیرونی منڈیوں میں بھیجے جانے کے زراعت کی ترقی کے لئے خرچ کیا جائے، کسانوں کی مادی آسائش کے ذرائع پر خرچ کیا جائے، اور سب سے آخر میں اگر یہ منافع مزدوروں کے معیار زندگی کے بڑھانے پر صرف کیا جائے ——— تو ان مزدوروں پر غاصبانہ دست درازی کا جھگڑا پیدا نہیں ہو سکتا ۔ پھر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ نظام سرمایہ داری میں زراعتی طبقہ مفلس ہو جاتا ہے ۔ یا نو آبادیات اور محکوم ممالک میں اس نظام کے ماتحت بے انتہا ظلم کیا جاتا ہے ۔ یا یہ کہ سرمایہ دار ممالک (سرمایہ داری کے باعث) ایک دوسرے سے مصروف پیکار رہتے ہیں ۔ لیکن اگر یہ حالات پیدا ہو جائیں تو پھر اسے نظام سرمایہ داری کون کہے گا" ۔ (لینینیت از سٹالین)

اب ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ کونسے واقعات ہیں جو نظام سرمایہ کی بدولت پیدا ہو کر اسی کے زوال کا باعث بن رہے ہیں رہا دُوسرا سوال کہ سرمایہ داری نے انسان پر کیا احسانات کئے ہیں ۔ سو اب کچھ تحریر کرنے کی ضرورت نہیں، ہم ان انعامات سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کی زندگی پر ان کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑتا ہے ۔ در اصل یہ انعامات ہم پر بے طرح مسلط ہو گئے ہیں ۔

موجُودہ دُنیا دو بالکل الگ الگ، ایک دوسرے سے برا حل دُور حصّوں میں تقسیم ہو چکی ہے ۔ ان میں سے ایک حصّۂ دُنیا پر سرمایہ داری

تبعدہ ہے۔ اور دوسرے حصۂ دنیا پر اشتراکی نظام کارفرما ہے۔ دونوں کے معاشی فلسفہ اور سیاسی نظام میں نمایاں فرق ہے۔ سرمایہ پرست ممالک میں مزدوروں کے مادی ذرائع راحت میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ اُن کی اُجرت گھٹ رہی ہے، وہاں بیکاری بڑھتی جا رہی ہے۔ اشتراکی رُوس میں مزدوروں کی آسائش کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کی اُجرت بڑھ رہی ہے، اور بیکاری بتدریج کم ہو رہی ہے۔ سرمایہ پرست ممالک میں ہر روز ہڑتالوں کی تیاریاں کی جاتی ہیں۔ سال کے بیسیوں دن پُرشورش ہنگاموں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اشتراکی روس میں ہڑتال کلیتہً معدوم ہے۔ مزدوروں اور کسانوں میں کام کرنے کا ایک قابل رشک جذبہ اور جوش پایا جاتا ہے۔ سرمایہ پرست ممالک میں اندرونی بےاطمینانی بڑھ رہی ہے۔ انقلاب پسند عناصر پرورش پا رہے ہیں۔ وہاں امن عامہ مفقود ہے۔ اشتراکی روس میں وحدتِ مقصد اور اشتراکِ عمل پایا جاتا ہے۔ وہاں کے مزدور اور کسان اشتراکی قصر (جس کی بنیاد لینن نے ڈالی تھی) کی تعمیر میں منہمک ہیں۔ سرمایہ پرستی کے ممالک میں قوم پرستانہ جذبات زور پکڑ رہے ہیں، نوآبادیات میں قومی تحریکیں اپنی اپنی آزادی کے لئے کشمکش کر رہی ہیں۔ اشتراکی روس کے قومی اداروں میں برادرانہ اشتراک پایا جاتا ہے۔ وہاں قومی اور نسلی جنگ نہیں پائی جاتی۔ بلکہ یہ سب مختلف اللون قوم پرست، سویٹ طرزِ حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے میں بدل وجاں کوشاں ہیں اس زبردست انتقالی مگر بدرجہا بہتر منظر سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ مزدور، سرمایہ پرستوں کی محکومی کے بغیر آزادانہ ایک خود مختار منظم معاشری ادارہ قائم کر سکتے ہیں ـــــ مگر سرمایہ دار اپنی قوت مزدوروں کے بغیر قائم نہیں رکھ سکتا ـــــ دراصل سرمایہ دار، مزدور کا محکوم ہے اور یہی محکومی بالآخر اُسے بالکل بےدست و پا کردے گی۔

سرمایہ پرست ممالک باوجود اپنے ترقی یافتہ تمدن، قابلِ رشک ثقافت، سائنس کی ایجادات میکانکی قوت کے آمادہ بزوال ہیں۔ اشتراکی روس کی نوخیز، کمزور، دشمنوں سے گھری ہوئی طاقت ایک مضبوط منظم اور قابلِ تقلید حکومت بن رہی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا دُنیا کی موجودہ بیماریوں کا علاج اشتراکیت ہے؟ اشتراکی کہتے ہیں۔ بےشک۔ مگر فاسیت ایک نیا معاشری فلسفہ پیش کرتی ہے۔ وہ ایک جدید نظامِ حیات پیش کرتی ہے (گو دراصل یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ ڈھانچہ وہی ہے مگر لباس کی ظاہری تراش مختلف ہے) فاسیت سرمایہ داری کی مذکورہ بالا تباہ کُن اور از خود پیدا ہونے والی بیماریوں سے واقف ہے۔ مگر اُس کا دعوےٰ ہے کہ ان کا علاج اسی بیمار بدن میں چھپا ہے، اس کو کسی غیر کا شرمندۂ احسان نہ ہونا پڑے گا ـــــ اب ہم دیکھتے ہیں کہ فاسیت کا پیپ، سرمایہ داری کے رستے ہوئے ناسُور کو مندمل کر سکتا ہے یا نہیں؟

ہم دیکھ چکے ہیں[۱] کہ فاسیت، انحطاط پذیر سرمایہ داری کی آخری جائے پناہ ہے۔ ہر اُس مُلک میں جہاں معاشی و اقتصادی بدنظمی کا دَورہ ہے۔ سرمایہ داری بظاہر ایک انقلابی جنگ میں شریک ہو جاتی ہے۔ ہر چہار اطرافِ ملک میں حکومت کے دفاعی محکمے (پولیس اور فوج) مزدوروں کی مسلح بغاوتوں کو فرو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اخباروں میں ایک پُرہیبت خونیں انقلاب کی خبریں شائع کی جاتی

۱؎ فاسیت نمبر (۱) .....

ہیں۔ مزدوروں کی قوت اور اُن کے جذبۂ انقلاب کی بین الاقوامی پریس میں تشہیر کی جاتی ہے۔ مگر حقیقت میں یہ سب ظاہری ٹیپ ٹاپ ہے ـــ بلاشبہ سرمایہ دار انقلاب کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اُن کا طرزِ معاشرت، اُن کا نظامِ حکومت اور اُن کا فلسفۂ سیاست، اب بیکار ہو چکا ہے، اُنہیں معلوم ہے کہ موجودہ مسائل ہتہ کا حل، اُن کے کہنہ و فرسودہ صحیفۂ آئین میں نہیں مل سکتا۔ مگر ان کی کینہ توز، حریص اور ستم شعار طبیعت اپنی حاکمانہ حیثیت نہیں کھو سکتی۔ عوام کے جذبۂ انقلاب کی تسکین کی خاطر وہ ایک پُرامن انقلاب بپا کر دینا چاہتے ہیں۔ جس میں حاکم بدل جاتا ہے، مگر آئین وضوابطِ حکومت بدستورِ سابق قائم رہتے ہیں۔ ساہوکاری اب بھی تمام معاشی دُنیا پر مسلط رہتی ہے۔ مگر ذرائع "استحصال" میں تبدیلی ہو جاتی ہے ـــ اس چھپی، دبی ساہوکاری کا نام فاسیت ہے ـــ اٹلی میں انقلاب ہُوا لیکن کتنا پُرامن اور خاموش، جرمنی جیسے شورش پسند اور ہنگامہ دردمن ملک میں انقلاب ہوتا ہے مگر فضا پرسکون رہتی ہے۔ دونوں ممالک میں فاسیت اس اطمینان اور متانت سے داخل ہوتی ہے جیسے مزدوروں کے انقلاب پرور ہنگامے، اُنکے رہنماؤں کی شرربار تقریریں اُس کے پُرجوش استقبال کیلئے تیار کی گئی تھیں ـــ صرف آسٹریا میں ایک "نیم خونیں" انقلاب ہُوا اور اُس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مزدور آٹو اور جولیس (Otto and Julius) کی "مصالحانہ قیادت" کے خلاف آگ اور بارُود اُچھالنے لگے۔ اُن کے رہنماؤں کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ مزدور بالکل پُرامن رہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس پر پُورا پُورا عمل کیا ـــ "ہمارا خیال تھا کہ ہم مصالحانہ پالیسی سے کسی مفاہمت پر پہنچ سکتے تھے، ڈولفس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مارچ کے آخر یا اپریل کے شروع میں صلح کے متعلق گفتگو کرے گا ـــ اور وہ دستورِ حکومت اور پارلیمان کے ایجنڈا کی ترمیم و تنسیخ کے بارے میں بھی اپنی رائے ظاہر کرے گا ـــ مگر ہم نے غلطی کی کہ ڈولفس کے وعدے پر اعتبار کیا ـــ ہم نے اپنی طرف سے جنگ کو معرضِ التوا میں ڈال دیا تاکہ ملک کو ایک خونیں جنگ سے بچایا جا سکے . . . . ." (بوئر Buer)

اور دوسری جانب میجر فے اور ڈولفس کے جنگی سپاہی مزدوروں سے ہتھیار چھینتے رہے۔ اور چُپ چاپ فاسی پروگرام کے اعلان کی تیاریاں کرتے رہے۔ لیکن جب اشتراکیت پسند مزدوروں نے دیکھا کہ اس طرح خاموش بیٹھے رہنے سے وہ اپنا سب کچھ کھو رہے ہیں۔ تو وہ بالکل مجنونانہ، اپنے خسران اور نقصان سے غضب آلود ہو کر حملہ آور سپاہیوں سے جا بھڑے۔ یہ صرف ایک ہنگامی جوش تھا جو بآسانی فرو کر دیا گیا۔ اور بعد ازاں ان "پُرامن" رہنماؤں کی اُمیدوں کے خلاف فاسی پروگرام کا اعلان کر دیا گیا۔ فاسیت کا اس طرح برسرِ اقتدار ہونا ظاہر کرتا ہے کہ دراصل تمام قوت سرمایہ داروں ہی کے ہاتھوں میں رہتی ہے۔ اٹلی میں گِلوتی (Giolli-ti) کی حکومت نے مسولینی کی مدد کی اور فوجی اور مالی مدد دے کر فاسیت کی بنیادیں استوار کیں، جرمنی میں کرپ نان بوہن، سائمنز، فنک وغیرہ نے لاکھوں پونڈ کے سرمایہ سے ہٹلر کی قومی اشتراکیت کو پروان چڑھایا اور ہنڈن برگ نے ہٹلر کے سر پر چانسلری کا تاج رکھ دیا۔ آسٹریا میں اٹلی کی عنایت اور میجر فے کے "تدبّر" نے اشتراکیت کو نیچا دکھایا۔

کا قبضہ ہے۔ اور دوسرے حصۂ دنیا پر اشتراکی نظام کارفرما ہے۔ دونوں کے معاشی فلسفہ اور سیاسی نظام میں نمایاں فرق ہے۔
سرمایہ پرست ممالک میں مزدوروں کے مادی ذرائع راحت میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ اُن کی اُجرت گھٹ رہی ہے، وہاں بیکاری
بڑھتی جا رہی ہے۔ اشتراکی رُوس میں مزدوروں کی آسایش کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کی اُجرت بڑھ رہی ہے، اور
بے کاری بتدریج کم ہو رہی ہے۔ سرمایہ پرست ممالک میں ہر روز ہڑتالوں کی تیاریاں کی جاتی ہیں۔ سال کے بیسیوں دن پُرشورش
ہنگاموں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اشتراکی روس میں ہڑتال کلیتہً معدوم ہے۔ مزدوروں اور کسانوں میں کام کرنے کا ایک قابل رشک
جذبہ اور جوش پایا جاتا ہے۔ سرمایہ پرست ممالک میں اندرونی بےاطمینانی بڑھ رہی ہے۔ انقلاب پسند عناصر پرورش پا رہے ہیں، وہاں
امن عامہ مفقود ہے۔ اشتراکی روس میں وحدت مقصد اور اشتراک عمل پایا جاتا ہے۔ وہاں کے مزدور اور کسان اشتراکی قصر جس کی بنیاد لینن
نے ڈالی تھی اُس کی تعمیر میں منہمک ہیں۔ سرمایہ پرستی کے ممالک میں قوم پرستانہ جذبات زور پکڑ رہے ہیں، نوآبادیات میں قومی تحریکیں اپنی
اپنی آزادی کے لئے کشمکش کر رہی ہیں۔ اشتراکی روس کے قومی اداروں میں برادرانہ اشتراک پایا جاتا ہے۔ وہاں قومی اور نسلی جنگ
نہیں پائی جاتی۔ بلکہ یہ سب مختلف اللون قوم پرست سوویٹ طرز حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے میں بدل و جاں کوشاں ہیں
اس زبردست اختلافی مگر بدرجہا بہتر منظر سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ مزدور، سرمایہ پرستوں کی محکومی کے بغیر آزادانہ ایک خودمختار منظم معاشری
ادارہ قائم کر سکتے ہیں —— مگر سرمایہ دار اپنی قوت مزدوروں کے بغیر قائم نہیں رکھ سکتا —— دراصل سرمایہ دار، مزدور کا محکوم ہے
اور یہی محکومی بالآخر اُسے بالکل بے دست و پا کر دے گی۔

سرمایہ پرست ممالک باوجود اپنے ترقی یافتہ تمدن، قابل رشک ثقافت، سائنس کی ایجادات میکانکی قوت کے آمادہ بزوال
ہیں۔ اشتراکی روس کی نوخیز، کمزور اور دشمنوں سے گھری ہوئی طاقت ایک مضبوط منظم اور قابل تقلید حکومت بن رہی ہے۔ اس کی
کیا وجہ ہے؟ کیا دُنیا کی موجودہ بیماریوں کا علاج اشتراکیت ہے؟ اشتراکی کہتے ہیں۔ بے شک۔ مگر فاسیت ایک نیا معاشری فلسفہ پیش
کرتی ہے۔ وہ ایک جدید نظام حیات پیش کرتی ہے (گو دراصل یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ ڈھانچہ وہی ہے مگر لباس کی ظاہری تراش
مختلف ہے) فاسیت سرمایہ داری کی مذکورہ بالا تباہ کُن، اور از خود پیدا ہونے والی بیماریوں سے واقف ہے، مگر اُس کا دعوےٰ ہے
کہ ان کا علاج اسی بیمار بدن میں چھپا ہے، اس کو کسی غیر کا شرمندۂ احسان نہ ہونا پڑے گا —— اب ہم دیکھتے ہیں کہ فاسیت کا
لیپ، سرمایہ داری کے رِستے ہوئے ناسُور کو مندمل کر سکتا ہے یا نہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں[1] کہ فاسیت، انحطاط پذیر سرمایہ داری کی آخری جائے پناہ ہے۔ ہر اُس ملک میں جہاں معاشی و اقتصادی بدنظمی کا دور
دورہ ہے۔ سرمایہ داری بظاہر ایک انقلابی جنگ میں شریک ہو جاتی ہے۔ ہر چہار اطراف ملک میں حکومت کے دفاعی محکمے (پولیس اور
فوج) مزدوروں کی مسلح بغاوتوں کو فرو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اخباروں میں ایک پُرہیبت، خونیں انقلاب کی خبریں شائع کی جاتی

---

[1] فاسیت نمبر (۱)......

ہیں۔ مزدوروں کی قوت اور اُن کے جذبۂ انقلاب کی بین الاقوامی پریس میں تشہیر کی جاتی ہے۔ مگر حقیقت میں یہ سب ظاہری ٹیپ ٹاپ ہے ـــــ بلاشبہ سرمایہ دار انقلاب کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اُن کا طرزِ معاشرت، اُن کا نظامِ حکومت اور اُن کا فلسفۂ سیاست، اب بیکار ہو چکا ہے، اُنہیں معلوم ہے کہ موجودہ مسائل پیچیدہ کا حل، اُن کے کہنہ و فرسودہ صحیفۂ آئین میں نہیں مل سکتا۔ مگر ان کی کینہ توز، حریص اور ستم شعار طبیعت اپنی حاکمانہ حیثیت نہیں کھو سکتی۔ عوام کے جذبۂ انقلاب کی تسکین کی خاطر وہ ایک پُرامن انقلاب بپا کر دینا چاہتے ہیں۔ جس میں حاکم بدل جاتا ہے، مگر آئین و ضوابطِ حکومت بدستورِ سابق قائم رہتے ہیں۔ ساہوکاری اب بھی تمام معاشی دُنیا پر مسلط رہتی ہے۔ مگر "ذرائعِ استحصال" میں تبدیلی ہو جاتی ہے ــــ اس چھپی، دبی ساہوکاری کا نام فاسیت ہے ـــ اٹلی میں انقلاب ہوا لیکن کتنا پُرامن اور خاموش، جرمنی جیسے شورش پسند اور ہنگامہ دوست ملک میں انقلاب ہوتا ہے مگر فضا پُرسکون رہتی ہے۔ دونوں ممالک میں فاسیت اس اطمینان اور متانت سے داخل ہوتی ہے جیسے مزدوروں کے انقلاب پرور ہنگامے، اُنکے رہنماؤں کی شرربار تقریریں اُس کے پُرجوش استقبال کیلئے تیار کی گئی تھیں ـــــ صرف آسٹریا میں ایک "نیم خونیں" انقلاب ہوا اور اُس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مزدور آٹو اور جولیس (Otto and Julius Deutsch) کی "مصالحانہ قیادت" کے خلاف آگ اور بارُود اُچھالنے لگے۔ اُن کے رہنماؤں کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ مزدور بالکل پُرامن رہیں چنانچہ انہوں نے اس پر پُورا پُورا عمل کیا ـــــ "ہمارا خیال تھا کہ ہم مصالحانہ پالیسی سے کسی مفاہمت پر پہنچ سکتے تھے، ڈولفس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مارچ کے آخر یا اپریل کے شروع میں صلح کے متعلق گفتگو کرے گا ـــــ اور وہ دستورِ حکومت اور پارلیمان کے ایجنڈا کی ترمیم و تنسیخ کے بارے میں بھی اپنی رائے ظاہر کرے گا ـــــ مگر ہم نے غلطی کی کہ ڈولفس کے وعدے پر اعتبار کیا ـــــ ہم نے اپنی طرف سے جنگ کو معرضِ التوا میں ڈال دیا تاکہ ملک کو ایک خونیں جنگ سے بچایا جا سکے . . . . ." (بوئر Buer)

اور دوسری جانب میجر فے اور ڈولفس کے جنگی سپاہی مزدوروں سے ہتھیار چھینتے رہے۔ اور چُپ چاپ فاسی پروگرام کے اعلان کی تیاریاں کرتے رہے۔ لیکن جب اشتراکیت پسند مزدوروں نے دیکھا کہ اس طرح خاموش بیٹھے رہنے سے وہ اپنا سب کچھ کھو رہے ہیں۔ تو وہ بالکل مجنونانہ، اپنے خسران اور نقصان سے غضب آلود ہو کر حملہ آور سپاہیوں سے جا بھڑے۔ یہ صرف ایک ہنگامی جوش تھا جو بآسانی فرو کر دیا گیا۔ اور بعد ازاں ان "پُرامن" رہنماؤں کی اُمیدوں کے خلاف فاسی پروگرام کا اعلان کر دیا گیا۔ فاسیت کا اس طرح برسرِاقتدار ہونا ظاہر کرتا ہے کہ دراصل تمام قوت سرمایہ داروں ہی کے ہاتھوں میں رہتی ہے۔ اٹلی میں گیولیٹی (Giolitti) کی حکومت نے مسولینی کی مدد کی اور فوجی اور مالی مدد دے کر فاسیت کی بنیادیں استوار کیں، جرمنی میں کرپ نان بوہن، سائنسز، فنک وغیرہ نے لاکھوں پونڈ کے سرمایہ سے ہٹلر کی قومی اشتراکیت کو پروان چڑھایا اور ہنڈن برگ نے ہٹلر کے سر پر چانسلری کا تاج رکھ دیا۔ آسٹریا میں اٹلی کی عنایت اور میجر فے کے "تدبر" نے اشتراکیت کو نیچا دکھایا۔

لیکن کیا فاسیت نے بے کاروں کو کام دلایا۔ بھوکوں کی تسکین کی۔ گرتی ہوئی تجارت کو سنبھالا۔ مزدوروں اور کسانوں کو اطمینان بخشا؟ ہرگز نہیں۔ ہمارے سامنے جنگ عظیم کے بعد کے تمام واقعات ہیں۔ کیا یہ امر واقع نہیں کہ یورپ کا سیاسی مطلع کبھی اس قدر تیرہ و تار نہیں رہا۔ جتنا آج کل ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ وہاں بیکاری ہر روز بڑھ رہی ہے۔ وہاں کی تجارت تنزل پذیر ہے وہاں جنگ کے منصوبے ہیں۔ وہاں بے اطمینانی ہے، بے چینی ہے۔ اور عوام میں خوف، یاس اور پریشانی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ فاسیت نے بجائے معاشری انقلاب کے سیاسی انقلاب کو پسند کیا۔ اُنہوں نے حاکم بدل دیا۔ مگر اپنے معاشری نظام میں کوئی تبدیلی گوارا نہ کی۔ عوام میں بے چینی سیاسی طرزِ حکومت کے متعلق نہیں تھی۔ یہ چیز ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اصلی اور بنیادی کمزوری معاشی بدحالی تھی۔ جس کے باعث عوام میں انقلابی جوش پایا جاتا تھا ——

واقعات ایسے تھے کہ سرمایہ داری کو کلیتہً محو کر دیا جاتا — اور اُس کے بعد ایک نئے معاشی و اقتصادی نظام کی تشکیل کی جاتی فاسیت نے ایسا نہ کیا۔ لہٰذا اب تک وہ سرمایہ داری کی غلام ہے۔ اور اب تک اُنہی بیماریوں میں (جو سرمایہ داری کا ناگزیر نتیجہ ہیں) مبتلا ہے۔ روس نے اس بنیادی کمزوری کو بھانپ لیا تھا۔ اُنہوں نے اپنے معاشری نظام کو بدل دیا اور ایک جدید معاشی و اقتصادی پالیسی کی بنا ڈالی اور اُس کے ساتھ ساتھ اوضاع سیاسی میں تبدیلیاں کی گئیں —— چنانچہ آج کل وہ سرمایہ داری کے بغیر جی رہے ہیں، اُن میں بے کاری نہیں، وہاں ہڑتالیں نہیں ہوتیں، وہاں کسی کی آزادی غصب نہیں کی جاتی۔ بلکہ تمام لوگوں کو (خواہ کسی حصۂ ملک سے تعلق رکھتے ہوں) نویدِ امن دی جاتی ہے —— ؎

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دُوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

پس فاسیت کی سب سے بڑی اور پہلی غلطی یہی ہے کہ اُس نے معاشی نظام کو بدلنے کے بجائے سیاسی کل پرزوں کی مرمت کر دی — یہ بالکل میری انٹنوئی کی سی مثال ہے۔ جب کئی لُئی دِن کے بھُوکے لوگ ملکۂ فرانس کے پاس فریاد لے کر گئے اور کہا "ہم بھوکے ہیں، لیکن کھانے کو ایک خشک روٹی تک نہیں"۔ تو نازوں پلی ملکہ نے نہایت سادگی اور بھولے پن سے جواب دیا۔ "تو کیک کیوں نہیں کھاتے"؟

عوام کی روٹی اور کپڑے کی چیخ پکار کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ مگر 'بوئے خوش' اور 'جامۂ قز' کے کاروبار کرنے والوں کو نئے نئے اختیارات دے کر حکومت تفویض کر دی جاتی ہے —— یہ ہے فاسیت کا اصلی مقصد:-

لینن کا قول ہے "کوئی تحریک انقلاب انگیز نہیں کہلا سکتی، جب تک کہ اُس کے پاس انقلابی نظریات نہ ہوں"۔

کیا فاسیت کے پاس کوئی اپنا پیش کردہ انقلابی نظریہ ہے؟ کیا اُس کے پاس کوئی ایسا پروگرام موجود ہے جس پر وہ عمل پیرا ہو گی؟ کیا فاسیت اپنا نیا فلسفۂ معاشرت پیش کرتی ہے؟ —— نہیں، فاسیت اس قسم کے جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتی۔ اُس کا ہر ایک عمل نظریہ ہے، اور ہر نظریہ عمل۔

تاہم ایک دفعہ کوشش کی گئی تھی کہ ایک فاسی فلسفۂ معاشرت ترتیب دیا جائے، ۲۷ اگست ۱۹۲۱ء کو مسولینی نے بیانکی (Bianchi) کے نام ایک خط لکھا تھا۔ جس میں یہ خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ "فاسیت کو اب ایک "صحیفۂ احکام" کی ضرورت ہے۔ جو ہر ممکن ذریعہ سے خواہ جان لڑا کر، یا اس سے بھی بدتر، خودکشی کرکے حاصل کیا جائے۔ یہ فقرہ ذرا سخت معلوم ہوتا ہے اگر میں چاہتا ہوں کہ اب سے دو ماہ کے اندر انٹرنیشنل کانگرس کے انعقاد سے پہلے فاسیت کا مکمل فلسفہ تیار ہو جانا چاہئے"۔

کیا یہ "معجونِ فلاسفہ" کبھی تیار ہو سکا؟ اس کا جواب مسولینی خود ۱۹۳۴ء میں بالفاظ ذیل دیتا ہے:۔

"یہ ہو سکتا ہے کہ تم کو فاسیت میں، مشرح اور مفصل نظریات، باقاعدہ سرخیوں اور پاروں میں منقسم نہ ملیں لیکن اس کی جگہ ایک اور زیادہ واضح چیز نے لے لی ہے —— اور وہ 'ایمان' ہے"۔

(قارئین یقین فرمائیں میں اب بھی اس ایمان کی "زیادہ واضح" اہمیت نہیں سمجھ سکا)۔

یہ اُس نظامِ معاشرت کے فلسفہ کی حالت ہے جو دنیا کے جملہ سیاسی و اقتصادی اور عمرانی مسائل کا حل پیش کرتا ہے خیر اس سے قطع نظر ہم دیکھتے ہیں کہ دنیائے عمل میں فاسیت نے ایسے کون سے جوہر دکھائے ہیں جو اس کے دامن سے یہ بدنما داغ دھو سکیں۔ برسوں کی دماغ سوزی یا غالباً تجربہ کاری کے بعد فاسیت نے کارپوریٹ سٹیٹ کا فارمولا پیش کیا ہے۔ اس کی اصلیت کیا ہے؟ یہ فقط ایک پیچدار راستہ ہے جو آخر میں اُسی پرانی شاہراہ پر ڈال دیتا ہے۔ یعنی سرمایہ داری کی مزدوروں پر حکومت۔ کارپوریٹ ریاست کا سب سے اہم اصُول یہ ہے کہ اس میں جماعتی امتیاز قائم رکھا گیا ہے، اور سرمایہ دار اور مزدوروں کے جماعتی مفاد کو نظامِ سرمایہ داری ہی کی طرح برقرار رکھا گیا ہے۔ سرمایہ دار حاکم ہیں اور مزدور محکوم، اُن کے تنازعات کا فیصلہ حکومت کے مقرر کردہ ثالثی اداروں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔

یہاں دو باتیں قابلِ غور ہیں:——

(۱) جماعتی امتیاز قائم رکھا گیا ہے (۲) سرمایہ دار حاکمانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ نمبر (۱) کو ہم چھوڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ اس کی وجہ سے سرمایہ دار کو درجۂ فوقیت حاصل ہے۔ اگر ایک ایسا سماج قائم ہو جائے جس میں طبقہ وار امتیاز مٹ جائے تو سرمایہ دار کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ تمام ذرائع پیداوار "ریاست" یا قوم کے قبضہ میں چلے جاتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ فاسی کارپوریٹ ریاست میں سرمایہ دار کو پہلا سا درجۂ امتیاز حاصل ہے —— لہٰذا دیکھنا چاہئے کہ سرمایہ دار کے اعمال کا فاسی پروگرام پر کیا اثر پڑے گا۔ سرمایہ دار کی سب سے بڑی خواہش منافع حاصل کرنا ہے، کارپوریٹ ریاست میں بھی اُس کو منافع حاصل کرنے کی اجازت ہوگی۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنا سرمایہ غیر مفید اور بے کار تجارت میں لگائے —— ظاہر ہے کہ سرمایہ دار کے پاس کارخانے ہونگے۔ اُن میں اُجرت پر کام کرنے والے مزدور ہونگے —— لہٰذا نظامِ سرمایہ داری کی طرح یہاں بھی سرمایہ دار اور مزدوروں میں چپقلش باقی

POLITICAL AND SOCIAL DOCTRINE OF FASCISM BY BENITO MUSSOLINI ۵۲

سلہ بحوالہ پالمی دت ۔

رہے گی ——— خریدار کی طرح سرمایہ دار کی یہ کوشش ہو گی کہ وہ مزدوری کو کم قیمت (کم سے کم اُجرت) پر حاصل کرے۔ دوسری طرف مزدور کی (کم از کم تمنّا) تو ضرور ہو گی کہ زیادہ سے زیادہ اُجرت وصول کرے۔ لہٰذا ایک وجہ کشمکش تو یہ پیدا ہو گئی دوسرے اقتصادی بدحالی کے باعث، غیر ملکی مقابلہ یا دُوسرے معاشی حالات کے سبب سے اگر سرمایہ دار کو نقصان ہو گا۔ تو وہ لازماً مزدور کی اُجرت میں تخفیف کر دے گا ——— اگر سرمایہ دار کو توقع سے زیادہ نفع حاصل ہوتا۔ کیا وہ اُجرت بڑھا دیتا؛ ہرگز نہیں ——— مزدور یہ سوچ کر بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اور بہت سے حالات (جن کا ہم اُوپر ذکر کر چکے ہیں) سرمایہ اور محنت کی باہمی آویزش کا سبب بن جاتے ہیں۔ لہٰذا جہاں کہیں بھی سرمایہ دار اور مزدور کے متضاد اغراض ٹکرائیں گے وہیں کشمکش پیدا ہو جائے گی۔ اور پھر وہی بے کاری، ضرورت سے زیادہ پیداوار، گندم کے پکے کھیتوں کا جلایا جانا وغیرہ حادثات کا ظہور پذیر ہونا لازمی امر ہے۔ دراصل سرمایہ دار کا ہونا، ان ہولناک مصائب کی نہایت حقیر گارنٹی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ کوئی طاقت، (خواہ ثالثی ادارے ہی کیوں نہ ہوں) ان مشکلات پر قابو نہیں پا سکتی ———

فاسیت، معاشی منصوبہ بندی[1] کے ناقابل ہے، وہ عوام اور ملک کے فائدے کے لئے کسی پنج سالہ سکیم پر عمل نہیں کر سکتی، کیونکہ منصوبہ بندی کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے ضروریاتِ ملک و قوم کے مطابق ایک نقشۂ پیداوار تیار کیا جاتا ہے۔ اور اُسکے بعد اس نقشہ کے مطابق، مجوزہ اشیاء کی تیاری کیلئے مخصوص ادارے کام کرتے ہیں۔ مثلاً یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ... ایکڑ زمین کو ایک ۱۰ میل لمبی نہر سے سیراب کیا جائے گا۔ یا تین شہروں میں برقی روشنی کا انتظام کیا جائے گا۔ یا فلاں کارخانہ کے مزدوروں کو اتنے جوتوں اور کپڑوں کی ضرورت ہے ——— یہ سب اندازہ کر کے ضروری سالہ کی فراہمی کا انتظام ہو گا اور پھر یہ سب سامان مخصوص کارخانوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ جہاں سے تیار ہو کر یہ سب حاجتمند طبقوں میں تقسیم ہو جائے گا ——— یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ سب کام حصولِ منافع کی خواہش کے بغیر کیا جائے گا ——— لیکن فاسیت کی عملداری میں ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ وہاں مزدوروں اور کارخانوں کا مالک سرمایہ دار ہے اور اُس کی اوّلیں کوشش یہ ہے کہ نفع حاصل کرے، اُسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ ایک ہزار بوٹ تیار کرے، جب کہ منڈی میں ایک ہزار قمیصوں کی مانگ ہے۔ کیوں نہ وہ قمیص تیار کر کے گراں قیمت حاصل کرے۔ اُسے کوئی طاقت (سوائے منڈی کے حالات کے) مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ مخصوص اشیاء پیدا کرے۔ وہ صرف بازار کے اُتار چڑھاؤ اور سرد و گرم کا محکوم ہے۔ جس چیز کے پیدا کرنے میں زیادہ نفع حاصل ہو گا، وہی اُس کی توجہ کا مرکز بنیگی سرمایہ دار کی اسی خواہش کا نتیجہ ہے کہ بعض اوقات ضرورت سے زیادہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں اور بعد ازاں منڈی پر پُورا پُورا قبضہ (Control) کرنے کے لئے وہ آئندہ پیداوار کو بند کر کے مزدوروں کو بے کار کر دیتا ہے، اس کی توضیح یوں ہے:۔

اگر بازار میں ڈبل روٹیوں کی مانگ بڑھ جائے اور رسد کم ہو، تو قیمت بڑھ جائے گی۔ زیادہ قیمت دوسرے کارخانہ داروں

---

[1] Economic Planning

کو ڈبل روٹیوں کی مزید پیداوار کی طرف راغب کردیگی۔ کچھ عرصہ کے بعد قدرتاً ڈبل روٹیوں کی رسد اُن کی طلب سے زیادہ بڑھ جائے گی۔ جس کا نتیجہ ضرورت سے زیادہ پیداوار ہوگا۔ کارخانے بند ہوں گے اور مزدور بے کار۔

یہاں ایک اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ سٹیٹ، سرمایہ داروں کو مجبور کرسکتی ہے کہ وہ صرف قوم کی ضروریات کے مطابق اشیا تیار کرے —— لیکن اوّل تو ایسا ہو نہیں سکتا۔ کوئی ملک ان خود کفالتی (Self sufficiency) کوششوں میں کامیاب نہیں ہوسکتا —— اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو سرمایہ دار اپنے ذاتی منافع کے پیش نظر حکومت کے فرمان سے بغاوت کرنے پر مجبور ہوگا۔

فرض کیجئے حکومت چاہتی ہے کہ سرمایہ دار ۵۰۰ بوٹ تیار کرے، اور بعد ازاں حاجت مند طبقے میں تقسیم کردے —— اس پر دو اعتراض کئے جاسکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ جب سٹیٹ خود ایسا کرسکتی ہے تو وہ ذرائع پیداوار کو اپنے قبضہ میں کیوں نہیں کرتی۔ سرمایہ داروں کی الگ، خود مختار ہستی قائم رکھنے سے کیا فائدہ؟

دوسرے سرمایہ دار کو ایسی کیا پڑی کہ وہ حکومت کے اشارہ پر ۵۰۰ بوٹ تیار کرے، جب کہ وہ صرف ۵۰۰ بوٹ تیار کرکے ہندوستان کی منڈی میں کئی گنا دام وصول کرسکتا ہے —— اُس کا حاکم ریاست نہیں بلکہ منافع ہے۔ اگر وہ اسے سات سمندر عبور کرکے بھی حاصل کرسکتا ہے تو وہ ایسا ہی کرے گا۔

"سرمایہ دار ہرگز کوئی ایسی چیز (جس سے اُنہیں حصولِ منافع کی اُمید نہ ہو) پیدا نہیں کرسکتے، اور دُنیا کا مضبوط ترین مختارِ مطلق بھی اُن کو ایسا کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کریں گے، تو وہ یقیناً دیوالیہ ہوجائیں گے لیکن فاسی حکومت کبھی ایسی غلطی نہیں کرسکتی، کہ وہ سرمایہ دار کو بوٹ تیار کرنے پر مجبور کرے، جب کہ وہ اس تجارت سے کچھ نفع نہیں کما سکتے[1]...."

علاوہ ازیں فاسیت نے مزدوروں پر ایک ظلم اور کیا ہے۔ اُنہوں نے مزدوروں سے ہڑتال اور اجتماعی ہنگاموں میں شرکت کرنے کا حق چھین لیا ہے۔ بہانہ یہ کیا گیا کہ ان کی تمام شکایات کا ازالہ ثالثی ادارے کرتے رہیں گے۔ یہ نہایت دلچسپ استدلال ہے۔ نظام سرمایہ داری میں مزدور کو کم ازکم اپنے جائز حقوق کے منوانے کے لئے ہڑتال کرنے کی تو اجازت تھی۔ مگر فاسیت نے ریاکارانہ "اشک شوئی" سے اُن کو بالکل بے دست و پا کردیا۔ کیا امریکہ، برطانیہ، فرانس —— وغیرہ سرمایہ پرست ممالک میں ثالثی ادارے قائم نہیں ہیں، کیا وہاں مزدور سبھائیں نہیں ہیں، کیا وہاں ایسی انجمنوں کی کمی ہے جو سرمایہ و محنت کی آویزش کو حتےالامکان کم کرنے کی کوشش کرتی ہیں.... تاہم وہاں مزدور کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جبر و تشدد کے خلاف مظاہرہ کرسکے لیکن فاسیت ثالثی اداروں کے نام پر مزدور سے یہ آزادی بھی چھین لیتی ہے۔

العرض کارپوریٹ سٹیٹ کے اجزائے اعظم مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) جماعتی امتیاز کا قیام و استحکام۔ سرمایہ دار تمام قوت و زر کے مالک ہیں اور مزدور اُن کے مطیع و محکوم۔ (۲) سرمایہ دار اپنے ذاتی منافع

[1] خطرۂ فاسیت از جان سٹریچی (John Strachey)

کے لئے تجارتی کاروبار کرتا ہے۔ وہ مزدور کو اُجرت صرف اُسی حالت میں دیتا ہے جب کہ ایسا کرنا اُس کے حصولِ مقاصد میں معاون ہو۔

(۳) ثالثی ادارے قائم کر کے، مزدور سے ہڑتال کرنے کا حق چھین لیا گیا ہے

ظاہر ہے کہ فاسیت اور سرمایہ داری میں کچھ فرق نہیں۔ دونوں کا مقصد مظلوم خریداروں پر (جن میں اکثریت مزدوروں اور کسانوں کی ہے) دستِ ستم دراز کرنا ہے، اُنہیں اپنی زرکشی کا نشانہ بنانا ہے۔ اُنہیں محکوم کر کے ہمیشہ اسی غلامانہ ذہنیت کا شکار بنانا ہے کہ وہ، سرمایہ داروں کے بغیر زندہ نہ رہ سکیں........

اطالوی تجارت۔ تجارت وغیرہ کے اعداد و شمار[1] کا صرف سطحی مطالعہ ظاہر کر دیتا ہے کہ وہاں کی معاشی حالت کس قدر غیر استوار ہے۔

تمام قومی آمدنی ۱۹۲۸ء میں ۹۰ بلین لیرا تھی (لائر تقریباً ۸ر کا ہوتا ہے) لیکن ۱۹۳۱ء میں صرف ۶۰۔۷۰ بلین لیرا رہ گئی، تجارتی اور صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی کل تعداد ۲۸۲،۰۰۰ ۴ ۱۹۳۲ء میں تھی۔ ان میں سے ۱۵۱۸،۰۰۰ بے کار تھے۔ اور جنوری ۱۹۳۴ء میں ان بے کاروں کی تعداد ۱۵۸،۰۰۰ تک بڑھ گئی۔ اس کے علاوہ تقریباً ۲½ لاکھ ایسے مزدور ہیں جو صرف موسمی کاروبار کرتے ہیں اور پھر سال کے بقایا مہینوں میں بے کار رہتے ہیں ——— اس کا مطلب یہ ہے کہ جوں جوں تجارت گرتی جا رہی ہے، مزدور بے کار ہو رہے ہیں اور اُن کی اُجرت میں نمایاں تخفیف ہو رہی ہے۔ کیونکہ ۱۹۲۲-۲۹ء کے درمیانی عرصہ میں اداشدہ اُجرت ۶۰،۴۰ لائر سے ۴۱،۰۰ ملین لیرا تک گر گئی ——— یہ تخفیف صرف مزدوروں کی اُجرت ہی میں نہیں بلکہ تیار شدہ مصنوعات کی آمدنی پر بھی یہ ایک ٹیکس کی صورت میں اثر انداز ہوتی ہے، مثلاً دواؤں پر ۲۵ فیصدی ٹیکس، سن پر ۳۰ فیصدی، کپاس پر ۴۰ فیصدی، اُون پر ۲۷ فیصدی (وغیرہ) ٹیکس لگایا گیا ہے۔

یہ فاسیت کے عملی کارنامے ہیں۔ یہاں صرف اطالیہ کے اعدادِ تجارت لئے گئے ہیں۔ کیونکہ وہاں فاسیت بہت گہری جڑیں پکڑے ہوئے ہے اور وہاں فاسی انقلاب اپنا کام پورا کر چکا ہے۔ اگر جرمنی کی تجارتی حالت پر غور کیا جائے۔ تو وہ اس سے بھی پست نظر آئیگی۔ لیکن چونکہ وہاں اور بہت سے غیر مساعد حالات کارفرما ہیں اس لئے اُسے نظر انداز کر دیا گیا ——— تاہم یہ واضح رہے کہ زقوم سے ہمیشہ میوۂ تلخ حاصل ہوتا ہے ———

فاسیت "جنگ" میں ابدی راحت اور سرمدی عیش کی متلاشی ہے، وہ پیکار و تصادم کو کسی ملک کی حیات و بقا کے لئے ناگزیر سمجھتی ہے۔

"نوعِ انسان پیکارِ مدام سے عظمت حاصل کرتی ہے مگر عیش مدام سے وہ تباہ ہو جاتی ہے"۔ (ہٹلر)

اُن کے لئے 'زندگی' 'ستیزہ کاری' کا نام ہے، جہاں جنگ نہیں، وہاں موت ہے، سکون قاطعِ حیات ہے مگر فتنہ انگیزی پیامِ زندگی ——— یہ خواہشِ جنگ، یہ تقدیسِ پیکار کسی مقصدِ جلیل کی تبلیغ نہیں، کسی مذہبِ امن کی نوید نہیں ——— بلکہ یہ استعماریت ہے

---

[1] پالمی دت۔

جوع الارض ہے، کمزور اور ناتواں قوموں کو غلام بنانا اس کا محبوب ترین نصب العین ہے۔

"ہم چار کروڑ انسان ہیں، اور ایک تنگ مگر قابلِ پرستش "جزیرہ" میں محصور ہیں —— حالانکہ اٹلی کے مضافات میں ایسے ملک بھی ہیں جن کی آبادی نہایت مختصر ہے مگر زمین ہم سے دُگنی —— چنانچہ یہ صاف ظاہر ہے کہ اطالوی لوگوں کے لئے توسیع ملک کا مسئلہ زندگی اور موت کا سوال ہے"۔ (مسولینی)

اکثر دیکھا گیا ہے کہ وحدتِ خیال، اشتراکِ عمل کا سبب بن جاتی ہے۔ ایک ہی نصب العین کے حامیوں میں ہمدردی اور رفق و ملاطفت کا سلوک ہوتا ہے۔ اُن میں یگانگی اور اتحاد پایا جاتا ہے۔ مگر فاسیت نے تمام ممکناتِ امن کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے۔ دو فاسی ملکوں میں بھی کوئی سیاسی مفاہمت کافی عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی۔

اس کے دو سبب ہیں —— اوّل فاسیت کی سخت قوم پرستی۔ دوسرے اس کی جوع الارض جس کے بغیر اس کے فلسفۂ حیات کے مطابق کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی ——

اِن کی یہ دشمن آزاری (بلکہ ہمسایہ آزاری) دُنیا کو ہمیشہ مبتلائے فوضویت رکھے گی۔ جب تک فاسی قوم پرست حکومتیں قائم رہینگی دُنیا میں امن و عیش عنقا رہیں گے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت اٹلی اور جرمنی کی آسٹریا کے شکار پر باہمی رقابت ہے۔ حالانکہ آسٹریا خود بھی نیم فاسی رنگ اختیار کر چکا ہے۔ تاہم اٹلی اس کی خودمختاری قائم رکھنے کے بہانے سے جرمنی کو اُدھر کا رُخ کرنے نہیں دیتا۔

کیا ان کے متضاد مقاصد ان کو ہمیشہ مصروفِ پیکار نہیں رکھیں گے —— اس کا جواب مستقبل قریب کی جنگ دیگی —— جس کا دُھندلا سا عکس، اٹلی اور شمالی افریقہ کی کشمکش میں نظر آتا ہے۔ جب کہ مسولینی کا جذبۂ استعماریت، برطانیہ کے مصالحانہ الفاظ کی بھی تاب نہ لا سکا۔ اور اُس نے واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا "ہر ایک ملک اپنے نفع اور نقصان کو سوچ سمجھ سکتا ہے" دوسروں کو کسی کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کا کوئی حق نہیں"۔[۱]

یہ فاسیت کے جنگجویانہ مقاصد ہی کا نتیجہ ہے کہ عورتوں کو صرف جنگی سپاہی پیدا کرنے کی مشین بنا دیا گیا ہے ——

آج کل طبقۂ نسواں کی آزادی طلب دائیں تقریباً ہر ملک و قوم کے لئے وجہ پریشانی بن گئی ہیں —— عورتوں کی معاشی و سیاسی آزادی کا مسئلہ ایک الگ مبسوط مضمون کا طالب ہے۔ لیکن اتنی بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ جب صدیوں کی غلامی کے بعد ان کو آزادی نصیب ہوگی تو سوسائٹی میں ایک عظیم بدنظمی پھیل جائے گی۔ جنسی تعلقات میں بے راہروی ہر قسم کے قبیح اور گھناؤنے نتائج پیدا کریگی۔ عورتوں کو سماجی آزادی حاصل ہونے کے کچھ عرصہ بعد تک یہ سب کچھ ناگزیر ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ نسوانی آزادی کے وہ فوائد جن کے پیش نظر ہم نے اُن کو آزاد کیا تھا۔ اب بالکل حاصل نہیں ہو سکینگے۔ طوفانی شور انگیزی کے بعد جب سکونِ مطلق نصیب ہوگا تو اُس وقت ظاہر ہو جائے گا کہ عورتوں کی صدیوں کی غلامی نے انسان کو کس قدر غیر قابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

---

[۱] مسولینی کی تقریر۔ ۷ر جون ۱۹۳۵ء

یورپ میں نسوانی آزادی کے تین ارتقائی مدارج صاف نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلے عورت کو اس تلخ حقیقت کا احساس ہوا کہ مرد اپنے جنسی تعلقات میں بالکل غیر محتاط ہے۔ وہ باوجود ایک ہستیٔ خاموش کے ساتھ وابستہ ہونے کے دوسری عورتوں کی طرف بھی مائل ہو سکتا ہے۔ عورت نے اس احساس کے زیر اثر سب سے پہلے جنسی آزادی حاصل کی —— معمولی سی ذہنی کاوش (یا ہر روز کے تجربات نے) اُسے سمجھایا کہ جس طرح مرد اپنے جذبات کی تسکین کیلئے آزاد ہے اس طرح عورت بھی اپنے "امیال و عواطف" میں کسی کی محکوم نہیں رہ سکتی۔ اس کے بعد عورتوں نے سیاسی آزادی حاصل کی۔ اُن کو "حقِ نیابت" بخشا گیا اور پھر اس کے طفیل اُن کو تیسری چیز یعنی "معاشی مساوات" حاصل ہوئی۔ مرد کا وہ جذبۂ قوت جو عورت کو معاشی حیثیت سے غلام کرنے میں کارفرما نظر آتا ہے اب آہستہ آہستہ اپنا جادو کھو رہا تھا۔

"جب تک عورت آزاد نہ تھی۔ اُس کے جذبات اپنے نہ تھے، بلکہ اُس کی ہر ایک حرکت اپنے شوہر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وقف تھی۔" (برٹرینڈ رسل)

فطری حسیات کو جان بوجھ کر دوسروں کی خواہشات پر قربان کر دینا کیسے کیسے نتائج پیدا کر سکتا ہے اس کی زندہ مثالیں ہمیں اپنے گھروں کی معاشرت میں ملتی ہیں۔ اکثر پردے کی اوٹ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ناقابلِ بیان ہے۔

یورپی عورت نے ہر چند معاشی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر ابھی تک وہ کاملاً اس میں کامیاب نہیں ہوئی۔ وہاں عموماً ایسی عورتیں کارخانوں میں ملازم ہوتی ہیں جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ اگر وہ خود محنت نہ کریں تو بھوکوں مر جائیں —— لہٰذا اس قسم کی آزادی سے اُن کی ذہنی و اخلاقی حالت پر کوئی عمدہ اثر نہیں پڑ سکتا —— (ایسی آزادی ہمارے ہندوستان میں بھی غریب عورتوں کو حاصل ہے) جب تک یورپی عورت، معاشی حیثیت سے بھی مرد کے دوش بدوش کام کرنے کے قابل نہ ہوگی اُس وقت تک وہ اپنی آزادی کا کوئی قابلِ ذکر عمدہ اثر سماج پر نہیں ڈال سکتی وہ صرف جنسی تعلقات کی پُرہوس آزادی میں پھنسی رہیگی۔ اور وہ تمام حالات پیش آتے رہیں گے جن کا تذکرہ خود ہمارے ملک کی عورتوں کی آزادی میں حائل ہے —— یہ حالات تھے اور یورپی عورت کو برائے نام معاشی آزادی حاصل تھی کہ فاسیت آئی اور اس نے عورتوں کی یہ برائے نام معاشی آزادی بھی چھین لی اور اُن کو پھر واپس گھروں میں بھیج دیا —— فاسیت کے نزدیک "عورت گھر کیلئے اور مرد میدانِ جنگ کے لئے مبعوث ہوا ہے"۔ وہ عورت کو فقط اس لئے عزیز رکھتا ہے کہ اس سے جنگ کا ایندھن حاصل کیا جا سکے، ملک اور قوم کے نام پر اس سے بچے لئے جائیں اور ان کو استعماری جنگوں میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کیلئے بھیج دیا جائے۔

فاسی ریاستوں میں عورتوں کو تعلیمی مشاغل میں حصہ لینے سے روکا جاتا ہے۔ اُن کو بتایا جاتا ہے کہ جسمانی تربیت سب سے مقدم ہے عورتوں کو فقط جسمانی لحاظ سے تندرست و توانا ہونا چاہئے تاکہ وہ مضبوط اور بہادر بچے پیدا کر سکیں۔

"حیاتِ جاوید افراد کی قربانی کی طالب ہے۔ ماں کو چاہئے کہ وہ اپنی ذات کو بچے پیدا کرنے کے لئے وقف کر دے اور باپ کے لئے لازم ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں جاں فروشی کر کے اپنے بیٹوں کے لئے مستقبل کو جیت لے۔" (فان پاپن)

روسیوں میں ایک ضرب المثل مشہور ہے "عورت ستار نہیں ہے کہ اُسے بجایا اور کھونٹی سے لٹکا دیا"۔ مگر فاسی ریاستوں میں عورت واقعی ایک آلۂ تفریح ہے۔ یا بالفاظِ صحیح تر وہ صرف اس لئے تخلیق کی گئی ہے کہ وہ مرد کی محکوم رہے اور اُس کی شہواتِ نفسانی کی پرستش کیا کرے۔

"عورت ـــــ اُس کی جگہ گھر ہے اور اُس کا فرض تھکے ہوئے سپاہی کے لئے اسباب تفریح مہیا کرنا"۔ (جنرل گورنگ)

اٹلی اور جرمنی میں دوسرے سرمایہ دار ممالک کی طرح لاکھوں آدمی بے کار پھر رہے ہیں۔ اُن کو پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوتا مگر وہاں عورتوں کو شادی کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ بچے پیدا کرنے کے لئے انعام دیئے جاتے ہیں، کثیر الاولاد والدین کے ٹیکس معاف کر دیئے جاتے ہیں ـــــ کیا ان نوزائیدہ مزدوروں اور کسانوں کو کام مل سکے گا؟ اس کا جواب فاسی حکومت کچھ نہیں دے سکتی ـــ صرف میدانِ جنگ کی طرف اشارہ کر دے گی" کہ ان کی اصلی جگہ وہ ہے۔ جہاں یہ استعماریت کی بھینٹ چڑھا دیئے جائیں گے ـــ فاسیت چاہتی ہے کہ عورت ہر سال ایک دلیر بیٹا پیدا کرے جو سنِ بلوغ تک بھوکا مرے اور پھر حرفِ شکایت زبان پر لائے بغیر جنگ کے بھڑکتے شعلوں میں کود پڑے۔

فاسیت انحطاط پذیر سرمایہ داری کی آخری جائے پناہ ہے، یہ چاہتی ہے کہ سماج میں امیر اور غریب کا امتیاز باقی رہے۔ سرمایہ دار تمام قوت و اثر کے مالک ہوں اور مزدور اُن کے محکوم! ـــــ فاسیت اپنے قیام و بقا کے لئے استعماری جنگ کو ضروری قرار دیتی ہے، وہ سمجھتی ہے کہ نوعِ انسان کی نجات، پیکارِ مدام میں پنہاں ہے، اس جنگ کو جاری رکھنے کے لئے وہ عورت کو مرد کے تابع کر کے اُس سے تندرست بچے حاصل کرتی ہے، جن کو عہدِ طفلی سے جنگ کی تعلیم دی جاتی ہے، تاکہ وہ بڑے ہو کر ہمسایہ ملکوں کی حدود پر غاصبانہ اقدام کریں ـــــ فاسیت ہر ایک بین الاقوامی تحریک کی سخت دشمن ہے۔ اِس کا نصب العین کٹر قوم پرستی ہے ـــــ یہ ایک نہ ختم ہونے والی جنگ کا پیغام ہے، اور اس کا مقصدِ اوّلیں مزدوروں کے اشتراکی رجحانات کو کلیتہً نیست و نابود کر دینا ہے ـــــ علامہ اقبال کا یہ شعر فاسیت کو اصلی خدوخال میں پیش کرتا ہے ؎

شفق نہیں مغربی اُفق پر یہ جُوئے خوں ہے یہ جُوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ

محمد صدیق تاؤنی

مُشکلیں

مُشکل ہے یہ مُشکل!
ہاں ہاں سنبھل اے دِل!

مشکل نہیں آساں — راحت نہیں ارزاں
انساں ہے وہ انساں — حق جس کا ہو ایماں
غم میں بھی ہو خنداں — کم پر بھی ہو شاداں
ہر حال میں جو ہو — آپ اپنا نگہباں

انساں ہے وہ انساں!

ہو جائے گی آساں — مشکل ہے تو کیا ہے؟
بے دل نہ ہو اے دل! — ہر دُکھ کی دوا ہے
مانا کہ بہت کچھ — قِسمت میں لِکھا ہے
ہمت بھی ہے اِک شئے — جو اُس سے سوا ہے
اے سر بگریباں! — کیا سوچ رہا ہے؟
تُو کوئی گدا ہے؟ — تو کوئی خُدا ہے؟

ہونا ہے جو ہو جائے | کیا اِس میں دھرا ہے؟
دُکھ سُکھ کا یہاں اِک | چکّر سا لگا ہے
پائے گا وہ سُکھ بھی | دُکھ جس نے سہا ہے
پائے گا وہ دُکھ بھی | سُکھ جس کو ملا ہے
اور دُکھ ہی مِلے گر | کیا اِس کی دوا ہے؟
آخر تو ہے مرنا | نت کون جیا ہے؟
یُوں وُوں نہ کیا کر | عقل ایک بلا ہے!
کیونکر یہ ہُوا ہے؟ | کیونکر وہ ہُوا ہے؟
ہے کِس لئے دُنیا؟ | یہ زِندگی کیا ہے؟
جو کچھ ہے وہ ہے کچھ | ہو کچھ نہ تو کیا ہے؟
چھوڑ اِس کو اور اُس کو | اچھا کہ بُرا ہے
سُلجھاؤ بھی اِس جا | اُلجھن میں پڑا ہے
گُم رہ ہیں یہ راہیں | دل راہ نُما ہے
سینے میں جو ہو دِل | مشکل نہیں مشکل

اے دل مرے، اے دل!

بشیر احمد

احساسِ تنہائی

ایک دعوت میں ابھی ہم طعام سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ میرے ایک دوست نے مجھ سے کچھ دور تک سیر کو چلنے کے لئے کہا۔ چنانچہ ہم سڑک کے کنارے پٹڑی پر درختوں کے سائے میں جن میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں چل پڑے۔ پیرس کے شور و شغب کی صدائیں اس سکوت کو برہم کر رہی تھیں تازہ ہوا کے جھونکے ہمارے چہروں کو چھو کر گزر رہے تھے۔ تاریک آسمان پر ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی دھند میں ملی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ میرے ساتھی نے مجھ سے کہا" میں نہیں جانتا کہ کیوں ہر شام اس سڑک کی سیر میرے لئے دنیا کی ہر بات سے زیادہ روح آسا ہوتی ہے۔ ان لمحاتِ سکوت میں میری روح آزاد ہوتی ہے اور کچھ دیر کے لئے تو یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ میرے افسردہ دل میں کوئی سنہری کرن تھرتھراتی ہوئی کائنات کے کسی لطیف راز سے مجھے آگاہ کر رہی ہے۔ پھر معاً الوہیت کی یہ روحانی صدا خاموش ہو جاتی ہے اور میں اُداس ہو جاتا ہوں۔

ہم بارہا دیکھتے ہیں کہ دیوار کے ساتھ ساتھ دو متحرک سائے تاریکی میں گم ہو گئے یا کوئی جوڑا باغ کے کسی کونے میں باہم اُلفت کا اظہار کر رہا ہے۔ آہ! ان لوگوں کی حالت دیکھ کر مجھے ان کی بے بسی پر انتہائی رحم آتا ہے۔ انسان کی زندگی کے تمام سربستہ رازوں میں سے میں نے صرف ایک کو پایا ہے کہ اس ناپائدار زندگی میں ہمارے غم و حرماں کا باعث ہمارا "احساسِ تنہائی" ہے۔ دیکھو تو یہی لوگ جو شارعِ عام پر دیکھنے والوں کی مشکوک نگاہوں سے بے نیاز ہیں۔ ایک کوشش کر رہے ہیں ایک ایسی کوشش جو ہم سب کرتے ہیں یعنی وہ اس تنہائی کے احساس کو مٹانا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ گھڑی بھی گزر جائے گی وہ علیحدہ ہو جائیں گے اور تنہا رہیں گے اور ہمیشہ ہی یہ تنہائی اُن سے وابستہ رہیگی —— اور اسی طرح ہم بھی یوں ہی تنہا رہیں گے مگر صرف فرق اتنا ہے کہ کبھی اس کا احساس شدید ہوگا اور کبھی خفیف۔ میں کچھ مدت سے اس احساسِ تنہائی سے ایک عذاب جھیل رہا ہوں میں محسوس کرتا ہوں کہ میں دنیا میں اکیلا ہوں اور میری یہ تنہائی ہمیشہ یونہی قائم رہیگی —— خواہ ہم کچھ بھی کریں ہماری زبان میں ہماری حرکت میں، ہمارے دل کی ہر خواہش میں اور ہمارے ہر ایک عمل میں احساسِ تنہائی کی آمیزش ہوگی میں اسی لئے تو تمہیں سیر کے لئے ساتھ لے آیا ہوں کیونکہ میں اس تنہائی کو بے طرح محسوس کرتا ہوں میں جانتا ہوں کہ میری باتیں لطف سے خالی ہیں۔ کیونکہ میں کہے جاتا ہوں اور تم صبر سے سُنے جاتے ہو اور یوں ہم دو ہونے کے باوجود بھی تنہا ہیں۔ —— درست ہے نا؟

میں اُن نادار لوگوں کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں جن کے دل فریبِ مسرت کھائے رہتے ہیں اور یوں وہ زندگی کی تلخیوں سے کبھی آشنا نہیں ہوتے۔ کم از کم وہ ہماری طرح بے چین اور بے مزہ زندگی تو بسر نہیں کرتے۔ اور اپنے خیالات، احساسات اور مشاہدات کی محدود سی دُنیا میں مطمئن تو رہتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ تم مجھے ضرور دیوانہ تصور کر رہے ہوگے۔ یہی بات ہے نا ؟

مگر میرے دوست جب سے میں اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنے لگا ہوں مجھے یوں نظر آتا ہے کہ میں ایک جادۂ تاریک پر بڑھتا چلا جاتا ہوں اور میری منزل کوئی نہیں، اس تاریک اور طویل راستے میں میرا کوئی بھی ہم سفر نہیں اور میں نہیں جانتا کہ یہ راستہ کہاں ختم ہوگا اور کب ختم ہوگا ـــــ یہ نامعلوم راستہ ہماری زندگی ہے۔ کبھی کبھار چلتے وقت میں پریشاں سی صدائیں سنتا ہوں اور جب اُن کی جانب قدم بڑھاتا ہوں تو وہاں کسی کو نہیں پاتا اور نہ میں یہی سمجھ کر سکتا ہوں کہ یہ صدائیں کدھر سے آئی تھیں اور میں کب تک یُوں بھٹکتا رہوں گا۔

دوسرے لوگوں کو بھی اس الم انگیز حقیقت کا احساس ہوتا ہوگا مگر اُن کے لئے یہ لُو کے ایک گرم جھونکے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ ایک ساعت کے لئے آیا اور جھُلس گیا حالانکہ میں اسے ہر وقت ایک ٹھوس حقیقت کی طرح جانتا اور محسوس کرتا ہوں۔

یہ دُنیا ایک بیاباں کی طرح ہے اور ہم اس میں بسنے والے ایک دوسرے سے قطعاً اجنبی ہیں۔ کیا زمین جانتی ہے کہ آسمان کے ستاروں کی کیا حقیقت ہے، یہ جو آگ کے شعلے سے نظر آتے ہیں ان کا اصلی وجُود کیا ہے؛ اسی طرح انسان بھی اس حقیقت سے ناآشنا ہے کہ اس وقت دوسرے پر کیا گزر رہی ہے اور یوں خیالات کے اختلاف کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے زمین و آسمان کی وسعت سے بھی زیادہ دُور ہیں۔

آہ کس قدر ظلم ہے کہ ہم باوجود پاس پاس ہونے کے بھی ایک دوسرے کے دل کی کیفیات سے ناواقف ہیں۔ ہم چاہتے تو ضرور ہیں کہ یکجا ہو جائیں۔ باہم محبت کرتے ہیں۔ انتہائی محبت مگر ہماری ان ناکام کوششوں کا حاصل صرف یہی ہے کہ ایک جسم دوسرے جسم سے مل جائے۔ مجھے تنہائی کا شدید ترین احساس اس وقت ہوتا ہے جب میں کسی دوست کو اپنے دل کے کسی پوشیدہ راز سے آشنا کرتا ہوں کیونکہ یہی ایک وقت ہوتا ہے جب میں اختلاف کی اُس خلیج کو دیکھتا ہوں جو ہمارے خیالات کے درمیان حائل ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ میرے سامنے بیٹھا ہوتا ہے۔ اُس کی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوتی ہیں تاہم اُن کی آڑ میں اُس کی رُوح سے میں بالکل دُور ہوتا ہوں۔ وہ میری باتیں سُنتا ہے مگر میں یہ جاننے سے قاصر ہوتا ہوں کہ اپنے دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں اس کی اس کے متعلق کیا رائے ہے۔ کیا وہ میری گفتگو کو پسند کرتا ہے یا مجھ سے نفرت کرتا ہے یا محض میرا مذاق اُڑا رہا ہے اور مجھے ایک مجنوں تصور کرتا ہے۔ بھلا میں یہ کیونکر جان سکتا ہوں کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہا ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ اسے بھی مجھ سے اتنی ہی محبت ہے جتنی میں اُس سے کرتا ہوں۔ انسان ایک سربستہ راز ہے اور اس کے بیک وقت عیاں اور پنہاں خیالات ایک معمّا ہیں جس کا حل ناممکن ہے۔

اگر میں چاہوں بھی کہ اپنے دِل کی تمام باتوں سے تمہیں آگاہ کر دوں تو پھر بھی ایسا نہ کر سکوں گا۔ میرے دِل کی باتیں کسی دوسرے دِل کے لئے اجنبی سی ہونگی کیونکہ ہر انسان کا دِل و دماغ مختلف ہے۔ اب جب کہ میں تم سے باتیں کر رہا ہوں کیا تم واقعی میری باتوں کو سمجھ رہے ہو یا دل میں مجھے ایک بیوقوف اور پاگل کہہ رہے ہو؟ یقیناً تم مجھے دیوانہ تصور کر رہے ہو، تمہاری متحیر نگاہیں شاہد ہیں کہ تم میری بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے اور اگر کر رہے ہو تو سمجھنے سے قاصر ہو۔

تم خیال کرتے ہوگے کہ اس بھلے چنگے انسان کو آج کیا ہوگیا ہے مگر میرے دوست اگر تمہیں اُس روحانی لمحہ کا کبھی احساس ہو اور تم مجھے آکر صرف اتنا کہہ دو کہ تم میری باتوں کو صحیح جانتے ہو تو نہ جانے میری عمر کتنی بڑھ جائے کیونکہ خوشی کے لمحات عمر کو دراز کرتے ہیں۔

عورت نے جو تیتری کی طرح رقصاں ہے بارہا میرے ایمان کو زیر و زبر کیا ہے اور اس کی صحبت میں میرا الیقین کئی دفعہ متزلزل ہُوا ہے کیونکہ اس کا وجود اُس احساسِ تنہائی کو کچھ وقفے کے لئے نابُود کر دیتا ہے اور مجھے احساس ہوتا ہے کہ کوئی ہستی اور بھی ہے جو میری شریکِ حیات ہے مگر بعد ازاں میں اپنے دِل میں اِک اُلجھن سی محسُوس کرتا ہوں اور میری رگوں میں اِک چبھن سی پیدا ہوتی ہے۔

جب ہم محبت کی پینگیں بڑھاتے ہیں تو ہماری روح ایک خاص آزادی سی محسوس کرتی ہے اور ایک غیر فانی مسرت ہمیں مسحُور کر لیتی ہے مگر میں اسے بہار کی ایک رات کے گریز پا خواب سے زیادہ وقیع نہیں پاتا۔

تم اُن رنگین اور سنہرے لمحات سے واقف ہو جب کسی کے سنہرے گھنگھرالے بال تمہارے کندھوں پر پریشان ہوں اور دو ستاروں کے مانند روشن آنکھیں تمہیں جذب کر لینا چاہیں؛ اور کیا تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ نشہ کتنی جلدی زائل ہو جاتا ہے اور یہ چند لمحوں کی نشاط کس قدر بے ثبات ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب دو محبت کرنے والے دِل اکٹھے ہو جائیں گے تو تنہائی دُور ہو جائیگی مگر وہ دن وہ ساعت نہیں آتی جب ہم امتیازِ ما و تو سے بے نیاز ہو سکیں اور زندگی یونہی انتظار میں کٹ جاتی ہے اور احساسِ تنہائی پہلے سے بھی زیادہ مہیب اور شدید ہو جاتا ہے۔ اور ہر بوسے اور ہر نگاہِ لطف کے بعد ہمارے احساسِ تنہائی میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ اور پھر ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب ہم اُس عورت کو پہچاننا بھی نہیں چاہتے جو کبھی ہمارے دِل کی مالک اور ہماری زندگی کا واحد مقصد رہ چکی ہوتی ہے کیونکہ باوجود اس قرابت کے ہم اُس کی فطرت کو سمجھنے سے معذور ہوتے ہیں۔ ہماری محبت انتہائی رفعتوں پر ہوتی ہے اور ہماری روحیں آپس میں گھُل مل سی جاتی ہیں مگر معاً ہم ایک ایسا لفظ کہہ دیتے ہیں جو اُس کے مزاج کے خلاف ہوتا ہے وہ ہم سے دُور ہو جاتی ہے اور پھر ہمیں اس تفاوت کا احساس اسی طرح ہوتا ہے جیسے اندھیری رات میں اچانک چاند نکل آئے۔

سلامتی اسی میں ہے کہ عورت سامنے دیوی بنی بیٹھی رہے اور ہم خاموش اُس کی طرف للچائی ہوئی نگاہیں ڈالتے رہیں ہمیں یہی کافی سمجھنا چاہیئے کہ وہ ہمارے پاس ہے اس سے زیادہ کوئی توقع نہ رکھنی چاہیئے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ہماری

روح کسی غیر کی روح سے مل سکے۔

اب میری روح مردہ ہو چکی ہے اور میں زندگی کو ایک تماشا گاہ تصوّر کرتا ہوں اور تماشائی کی طرح سب کچھ دیکھتا ہوں مگر مُنہ سے کچھ نہیں کہتا کہ میرا عقیدہ کیا ہے اور میں کس سے محبت کرتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں مجرّد ہوں۔ میں نے دُنیا والوں سے گفتگو کرنے کے لئے چند حروف رٹ لئے ہیں اور اُن کی ہاں میں ہاں ملا دیتا ہوں۔ درانحالیکہ میں کسی سے بات تک کرنا نہیں چاہتا۔

ہم انہی باتوں میں بہت دُور نکل گئے اور میرے دوست نے اور بھی بہت سے باتیں کیں جو مجھے اس وقت یاد نہیں۔ اس نے اپنی نگاہیں ایک پتھر کی دیوار کی طرف اُٹھائیں اور کہا کہ "ہم سب اس پتھر کے مانند ہیں" اور پھر دفعتہً مجھ سے علیحدہ ہو گیا۔

میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ وہ شراب کے نشے میں تھا۔ یا اُسے کوئی الہام ہو رہا تھا۔ کبھی تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ سچّا تھا اور کبھی یہ سمجھتا ہوں کہ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔

(مولیساں)

مجید لشاری

اخوّت

انسانیت، قومیت سے بالاتر ہے۔ (افلاطون)

کوئی شخص اپنے لئے نہیں ہے بلکہ ہر شخص سب کے لئے ہے۔ (ولیم بوتھ)

انسانیت کی مساوات صرف خدا کی عنایت سے قائم ہو سکتی ہے۔ (لارڈ بیکنس فیلڈ)

میرا ہمسایہ ایک ایسا آدمی ہے جس کو میری ضرورت ہے یا جس کی مجھے ضرورت ہے اور یہ ایک ہی بات ہے۔ (جے۔ ای۔ رکاف)

میں یہ درخواست کرتا ہوں کہ دوسروں کے معاملات میں دلچسپی لو کیونکہ وہ تمہارے ہی معاملات ہیں۔ (آئی۔ میلکراہن)

اگر ایک مرتبہ انسان پر "اخوت" کی حقیقت کا راز منکشف ہو جائے تو وہ اپنے ہمسایوں سے کبھی غیر منصفانہ سلوک نہ کرے گا۔ (سیموئل۔ ایم۔ جونس)

محشر عابدی بی۔ اے

غنچۂ پژمردہ

چشمِ عبرت دیکھ رنگِ بیکسی چھایا ہوا
خاک پر غنچہ پڑا ہے آہ مرجھایا ہوا

کھو کے جورِ چرخ سے گہوارۂ ناز و نعیم
خاک پر سوتا ہو جیسے کوئی ننھا سا یتیم

رُوح ہے خاکِ چمن کی لب پہ یہ آئی ہوئی
یا تمنا ہے دلِ گلشن کی مرجھائی ہوئی

یہ دلِ افسردۂ عُشاقِ شور انگیز ہے
یا چمن کی مختصر سی "نظمِ درد آمیز" ہے

سینۂ نشو و نما کا ہے یہ قلبِ داغدار
یا دلِ فطرت کے "ارمانِ تبسّم" کا مزار

یا گرہ ہے دِل کی ہو جس سے طبیعت بیقرار
یا کسی بیمار دوشیزہ کی "چشمِ سوگوار"

یا کسی کے کان کا موتی ہے لیکن چُور ہے
یا نسیمِ عہدِ گُل کی سعیٔ نامشکور ہے

محفلِ گلزار میں اِک درد کا پہلو ہے یہ
دیدۂ گلشن سے یا ٹپکا ہوا آنسو ہے یہ!

یہ شگوفہ، آہ ٹھکرایا ہوا گلزار کا
آئینہ ہے زندگی کے سینکڑوں اسرار کا

ابنِ آدم! کھول آنکھیں، دیکھ حالاتِ جہاں
ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے زندگی کی داستاں

سُن رہا ہے کیوں انھیں تو نیند لانے کیلئے
یہ فسانے تو ہیں سوتوں کو جگانے کیلئے

اہلِ غفلت کا ہمیشہ مطلبِ دل فوت ہے
فِکر کی قندیل کا خاموش رہنا موت ہے

عالمِ فانی کی رگ رگ میں اُترنا چاہیئے
خاک کے پُتلے! تجھے کچھ غور کرنا چاہیئے

جوشؔ ملیح آبادی

سُلطان جی کی ستر ھویں

سترھویں کا دوسرا روز تھا۔ خلقت سیر سپاٹے سے اور دکاندار اپنی بکری سے فارغ ہو ہوا کر چلنے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ مدرسے کی جانب سے اس غضب کی گھٹا اُٹھی۔ چاروں طرف اندھیرا گھُپ چھا گیا جو کہیں برس جائے تو جل تھل ہی تھا۔ بے وقت کا بادل بے موسم کی گھٹا شان وگمان بھی تو نہ تھا۔

ہر شخص متعجب تھا۔ سیر کے رسیلے شہر کے چھبیلے مگن تھے مگر دکانداروں کی سٹ ہی سٹ پر جان تھی۔ گھٹا کیا بجلی اور چھلاوہ تھی کہ پلوں اور لمحوں بڑھی اور دیکھتے دیکھتے ہر طرف چھا گئی۔ اکا دکا بوندیاں پڑیں۔ مگر چھیڑ کا ڈھی نہ ہوا تھا کہ ہوا نے اُڑی۔ ہوا کیا خاصی زور کی آندھی تھی۔ آسمان اور زمین سب خاک میں اٹ گئے۔ سائبان اور تنبو، پردے اور چلمنیں کہیں کی کہیں پہنچیں۔ گھنٹے گرے۔ فانوس لُڑھکے۔ ہنڈیاں ٹوٹیں۔ غضب یہ تھا کہ اس پر بھی جھکڑ تھمنے کا نام نہ لیتا تھا۔ لوگ جاتے جاتے رُک اور چلتے چلتے تھم گئے۔ خاک آنکھ، مُنہ، ناک، کان میں تیر کی طرح گھُس رہی تھی۔ اب تو بے فکروں کے دم پر بھی آ بنی۔ ابر کی صُورت دیکھتے ہی باغ باغ ہو گئے تھے۔ مگر آندھی نے وہ بکٹے آنکھوں میں جھونکے کہ سانس لینا دوبھر ہو گیا۔

خدا خدا کر کے اندھیاؤ کم ہوا۔ ہوا بھی ہلکی پڑی تو سودے والوں نے اپنے چھبیے اور دکان والوں نے اپنی دکانیں۔ سیلانیوں نے اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال شروع کی کہ سترھویں میں کیا کمایا کیا کھویا۔ سترھویں کا بازار میدان حشر کا نمونہ تھا۔ ہر سمت نفسی نفسی کا عالم تھا۔ کوئی خوشی خوشی اُچھل رہا تھا۔ کوئی سر پکڑے رو رہا تھا کہ نفع تو گیا خاک میں الٹا نقصان ہو گیا۔ مانگے تانگے کے لیمپ چکنا چور ہو گئے۔ اس منظر میں سب سے زیادہ تعجب انگیز کیفیت یہ تھی کہ خوش ہونے والے اپنے محفوظ رہنے سے زیادہ دوسروں کے نقصان پر نہال نہال تھے۔ مجمع تقریباً سب مسلمانوں کا تھا۔ اور افراد شاد کام کا یہ جذبہ کہ دوسروں کے نقصان پر پھولوں نہ سماتے تھے، اسلام کے موجودہ دور کی پُوری تفسیر تھا۔ اس دھکا پیل میں جھٹ پٹا ہو گیا۔ بفکرے کرخندار جن کے کپڑے اس قیامت خیز ہنگامے میں محفوظ رہے تھے۔ دوسروں پر ٹھٹھے لگاتے پھرتے تھے۔

ایک شخص جس کی باچھوں تک پانوں کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ بسنتی چادر زیر بغل میں دبائے ہنستا ہوا ایک مسلمان حلوائی کی دکان پر آیا اور کہنے لگا "کہو جی اُستاد کلن! تم پر کیا بیتی؟"

کلّن - ارے بھائی نصیرو میں تو بن آئی مرگیا۔ گرہ سے جو جانا تھا وہ تو خیر گیا ہی۔ مگر یہ کیسی پڑی کہ مولا کے دونوں شیشے اور یہ چچا کریم کا لیمپ کرچی کرچی ہو گیا۔

نصیرو - یاں تو اُستاد شکر ہے تلو بچے۔ سندہ تو تم جانتے ہو آج ڈیڑ ڈیڑ مہینے سے ہو رہا ہے۔ خلیفہ سے کہا۔ وہ کانوں پر ہاتھ دھر صاف نالوٹ ہو گئے۔ ہم نے سوچا مرتی جاتی دُنیا ہے۔ آج مرے کل دوسرا دِن۔ کیا خبر دوسری سترھویں آئے یا نہیں یہ تو زندگی کے میلے ہیں۔ سندہ سندہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔ آکا بودی کو ٹٹولا۔ وہ اس گھر کہاں۔ بندو کو راگ دیا۔ وہ ڈھب پہ نہ چڑھا۔ قصّہ کوتاہ تم سے تو پردہ نہیں۔ تین روپے بدل ننھی کے بٹن بٹھائے۔ بھانجی کا چادرہ لیا۔ اتّو کی صدری لی۔ بوندیاں پڑتے ہی مسلمان ہو تو یقین کرنا۔ جان نکل گئی کہ یہ مانگے تانگے کے کپڑے برباد ہوئے۔ مگر وہ تو یُوں کہو۔ اللہ نے بڑا فضل کیا۔ آندھی آگئی۔

کلّن - ابے میری تو جان پر بن رہی ہے۔ تو اپنا جھکندن لے بیٹھا۔ یاں تو آندھی نے قیامت کردی۔ تو کہہ رہا ہے کہ بڑا فضل ہوا۔

نصیرو - بھائی اپنے سے خوب خدا ہے۔ ہم پر تو وِس نے فضل ہی کیا۔ ورنہ عمر بھر کی ناموشی تھی۔ چادرہ بھی بھانجی کا نہیں وِس کے میاں کا۔ اور اتّو کو تم جانتے ہو داماد بھائی ہے۔

کلّن - تو جا آگے بڑھ۔ میری بک بک کر کے کیوں جان کھائی ہے۔ یاں چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مُنہ دِکھانے کو جگہ نہ رہی۔ تُو نے رٹر رٹر لگا رکھی ہے۔

نصیرو ٹھٹھے مارتا ہُوا آگے بڑھ گیا۔ پنواڑی سے پیسے کا پان لے کر کھایا۔ اور ایک اور جوان آدمی کو دیکھ کر "کہو یار بنّو کیا حال چال ہیں ؟"

بنّو - یار یاں تو بڑو ئے بچے۔ مگر خلیفہ کے تمام کپڑے ستیاناس ہو گئے۔

نصیرو - (دانت نکال کر) وِس کو اپنے کپڑوں پر گھمنڈ بھی بہت تھا۔ کل کیسا اکڑا پھر رہا تھا!

ہائے مُسلم قوم وہ تیری اخوّت کہاں گئی جس پر تیرے اسلاف کو ناز تھا

حمیدہ سلطان
از دہلی

طلسمِ جاوداں

رہنے دے اب کھو نہیں باتوں میں وقت

اب رہنے دے!

اپنی آنکھوں کے طلسمِ جاوداں میں بہنے دے!

تیری آنکھوں میں ہے وہ سحرِ عظیم،

جو کئی صدیوں سے پیہم زندہ ہے

انتہائے وقت تک پائندہ ہے!

دیکھتی ہے جب کبھی آنکھیں اُٹھا کر تُو مجھے

قافلہ بن کر گذرتے ہیں نگہ کے سامنے

مصر و ہند و نجد و ایراں کے اساطیرِ قدیم:

"کوئی شاہنشاہ تاج و تخت لٹواتا ہُوا

دشت و صحرا میں کوئی شہزادہ آوارہ کہیں

سر کوئی جانباز کہساروں سے ٹکراتا ہُوا

اپنی محبوبہ کی خاطر جان سے جاتا ہُوا!

" . . . . "

قافلہ بن کر گذر جاتے ہیں سب،
قِصّہ ہائے مصر و ہندوستان و ایران و عرب!

رہنے دے اب کچھ نہیں باتوں میں وقت
اب رہنے دے!
آج میں ہوں چند لمحوں کے لئے تیرے قریب،
سارے انسانوں سے بڑھ کر خوش نصیب۔
چند لمحوں کے لئے آزاد ہوں،
تیرے دل سے اخذِ نور و نغمہ کرنے کیلئے
زندگی کی لذّتوں سے سینہ بھرنے کیلئے!
تیرے پیکر میں جو رُوحِ زیست ہے شعلہ فشاں
وہ دھڑکتی ہے مقام و وقت کی آہوں سے دُور
بیگانۂ مرگ و خزاں۔
ایک دِن جب تیرا پیکر خاک میں مِل جائے گا

زندگی تابندہ ہو گی اس کی گرمی اس کا نور،
اپنے عہدِ رفتہ کے جاں سوز نغمے گائے گی
اور انسانوں کو دیوانہ بناتی جائے گی!

رہنے دے اب کچھ نہیں باتوں میں وقت
اب رہنے دے!
وقت کے اس مختصر لمحے کو دیکھ
تو اگر چاہے تو یہ بھی جاوداں ہو جائے گا
پھیل کر خود بے کراں ہو جائے گا۔
مطمئن باتوں سے ہو سکتا ہے کون؟
رُوح کی سنگین تاریکی کو دھو سکتا ہے کون؟
دیکھ، اس جذبات کے نشے کو دیکھ،
تیرے سینے میں بھی اک لرزش سی پیدا ہو گئی!

زندگی کی لذتوں سے سینہ بھر لینے بھی دے،
مجھ کو اپنی رُوح کی تکمیل کر لینے بھی دے،

ن۔ م۔ راشد

قمار باز

(۱)

سامنے نوٹوں کا بنڈل پڑا تھا۔ جان نے چپکے سے اپنے پیروں کے نیچے دبالیا اور پھر پیر کھجانے کے بہانے جھک کر نوٹ جیب کے حوالہ کرتے ہوئے چل دیا ——— وہ مشہور جواری تھا۔

سڑک کی لالٹین کے قریب پہنچ کر اس نے نوٹ گنے، پانچ پانچ کے بیس نوٹ! کُل سو روپیہ! وہ مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ ایک بلند مکان کے قریب پہنچ کر وہ رُکا اور پھر سب کی نظر بچا کر چپکے سے مکان میں داخل ہوگیا ——— یہ قمار خانہ تھا اور رنگ برنگ کے آدمی تاش کھیلنے میں مشغول تھے۔ اس نے ایک اُچٹتی ہوئی نظر سب پر ڈالی ——— کوئی چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا، کسی پر مایوسی کے تاریک بادل چھائے ہوئے تھے ——— وہ بھی ان میں شریک ہوگیا۔

اس نے بازیاں لگانا شروع کیں اور دس دس کے دس داؤں ہارنے پر وہ مکان سے باہر آگیا۔ اُس کو کسی قدر افسوس تھا۔ اور جب وہ اس سڑک پر پہنچا جہاں اُس کو نوٹ ملے تھے تو اس کو سخت تعجب ہوا کہ ایک بیس بائیس برس کی لڑکی چاروں طرف کچھ ڈھونڈ رہی ہے ——— جان نے اپنے دل میں ایک ہلکی سی خلش محسوس کی!

"آپ کیا ڈھونڈ رہی ہیں ——— ؟" اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی - میں نے سو روپیہ کی چیک بھنائی تھی ——————— مگر بنک سے کچھ ہی دُور گئی تھی کہ معلوم ہوا کہ نوٹوں کا بنڈل کہیں گر گیا - میں وہی ڈھونڈ رہی ہوں۔"

جان نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا ——— "ہوں، تو تم نوٹ ڈھونڈ رہی ہو، سو روپیہ کے نوٹ ——— اچھا اگر میں بتا دوں ؟"

لڑکی جلدی سے چلا اُٹھی ——— "تم کو معلوم ہے، خوب! تو پھر بتاؤ مجھے، کہاں ہیں وہ نوٹ؟ اچھا ہوا کہیں کسی اُو کے پلے پڑتے تو غضب ہی ہوجاتا۔ وہ لے کے غائب ہوجاتا اور میں ہاتھ ملتی رہ جاتی۔"

جان نے رُک رُک کر کہا "مگر وہ نوٹ ——— اب میرے ——— پاس کہاں ؟"

"کیا کہا ——— ؟"

جان نے صاف صاف کہا " وہ نوٹ اب میرے پاس نہیں ہیں۔"
لڑکی کو غصہ آگیا ـــــ "کیا کہا تم نے۔ نوٹ اب نہیں ہیں؟ تو پھر گئے کہاں؟"
"میں ہار گیا ـــــ!"
"ہائیں! ہار گئے! کیا زیادہ پی گئے ہو؟ کیسے ہار گئے، کیوں ہار گئے، کیا حق تھا تم کو ہارنے کا ـــ؟ بولو!"
جان نے پُروقار آواز میں کہا ـــــ "معاف کیجئے گا خاتون! زندگی کا نام ہی ہار جیت ہے۔ اور ہار جیت کے جوار بھاٹے کا نام زندگی! یہ دنیا اور اس دُنیا کی کُل کائنات ہار جیت کے فیض سے قائم ہے۔ کل کیا ہوگا کون جانتا ہے؛ اور پھر ـــــ پھر ـــــ"
عورت نے ڈانٹ کر کہا "چُپ! کیا بکتا ہے، سیدھی طرح سے نوٹ حوالہ کر ورنہ بُلاتی ہوں پولیس کو ـــــ دغاباز کا بچہ!"
"اِن باتوں سے فائدہ؛ پولیس کے ذریعہ سے تمہارے ہاتھ خاک بھی نہ آنے کا۔ اس سے اچھا ہے کہ جو میں کہوں وہ کرو!"
"اچھا کہو کیا کہتے ہو۔ میرے پاس بیکار باتوں کا وقت نہیں ہے۔"
"تم نے سچ کہا ـــــ وقت کمبخت بھی بڑا قمار باز ہے، ہاں تو میں ایک شریف کا بیٹا ہوں، میرے پاس ابھی کچھ دولت ہے، بالکل فقیر نہیں ہوں۔ انسانی زندگی کی ہر چیز جُوا ہے۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے فلاس کھیل رہا تھا مگر قسمت بُری تھی اس لئے سَو تمہارے اور بیس اپنے بھی ہار گیا اور ـــــ"
عورت بات کاٹ کر بولی ـــــ "خاموش! بدمعاش، چور!" اور وہ غصہ و ناامیدی سے کانپنے لگی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ـــــ جان کا دل بھی رحم سے بھر آیا، بولا:۔
"تمہارے روپوں کے ضائع ہونے کا مجھے صدمہ ہے۔ اگر میں بازی جیت لیتا تو تم کو ضرور حصّہ دیتا، مگر ذرا سوچو تو کہ اگر کسی دوسرے بے ایمان شخص کو نوٹ ملتے تو تم کہاں ڈھونڈتی پھرتیں! میری اور تمہاری دونوں کی قسمت کا پھیر تھا جو میں ہار گیا۔ اور اب میں کیا کرسکتا ہوں سوائے اس کے کہ تمہاری ہر خدمت کو حاضر ہوں، بتاؤ کیا کام ہے؟"
عورت بھُوکی شیرنی کی طرح چلّا اُٹھی ـــــ "بڑے کام کا بچہ بن کر آیا ہے، چور زمانے بھر کا!" روپے سے ناامیدی نے اسے بے تاب کر دیا تھا۔
"جو جی چاہے کہو۔ میں جُوا کھیلنا نہیں چھوڑ سکتا۔ دُنیا کی زندگی، موت، طرزِ معاشرت، کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے غرض ہر بات میں جُوا ہی جُوا نظر آتا ہے، اس لئے میرا مذہب بھی جُوا ہے۔ میں تمہارے سَو روپیہ کے لئے سیدھی راہ

نہیں چھوڑ سکتا، یہ اور بات تھی کہ اس وقت میں ہار گیا۔ اگر اب بھی میرے پاس کچھ دام ہوتے تو جھٹ جاکر جُوا کھیلتا اور جیت لاتا۔"

عورت کچھ نہ بولی۔ خاموشی سے اس کی باتیں سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ جان بولا:۔

"تم شاید نہیں سمجھیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جوئے میں کبھی انسان ہارتا اور کبھی جیتتا ہے۔ ہر بار تھوڑے ہی ہار سکتا ہے۔ میں خود ابھی ایک پل میں ہزاروں روپے جیت کر لا سکتا ہوں۔ تمہارے پاس دس روپے تو ضرور ہونگے۔ یعنی تم اگر دس روپے مجھے اور دے دو تو ابھی تمہارا ہارا ہوا مال واپس ہو سکتا ہے۔ سمجھ گئیں تم؟"

عورت بولی "بے شرم! سَو کو تو جہنم میں جھونک آیا اور اب دس میں اور آگ لگانا چاہتا ہے، دُور ہو پاجی کہیں کا!"

جان نے اپنا لہجہ بدلتے ہوئے کہا:۔

"جی! قسم ہے کہ آپ کے روپے برباد نہ ہونگے۔ رہی ہار جیت تو وہ تو ہوتی ہی رہتی ہے، کبھی ہم جیتے کبھی وہ! ہاں تو پھر لائیے دس روپے ابھی آپ کے روپے واپس آجائیں گے ——— اور آپ کو صرف گھنٹہ بھر انتظار کرنا پڑے گا اچھا ہو اگر آپ اس ہوٹل میں انتظار کریں، اس سامنے والے رستوران میں!"

عورت کو کچھ کچھ یقین ہو چلا تھا۔ چُپکی کھڑی رہی۔ پھر دھیمی آواز میں بولی:۔

"اور تم میرے پاس واپس آؤ گے نا ———؟"

"ضرور! شریف آدمی کی زبان ایک ہوتی ہے۔"

عورت پھر پس و پیش میں پڑ گئی۔ روپیہ دے یا نہ دے۔ ایسے شخص کا کیا اعتبار جو دوسروں کے روپے سے جُوا کھیلتا پھرے۔ مگر معلوم تو کچھ شریف سا ہوتا ہے، جہاں سَو گئے وہاں دس اور سہی، اگر جیت لایا تو آنسو پُنچھ جائینگے ———

جان بولا:۔

"دیکھیئے مجھے آپ کے روپوں کا بہت افسوس ہے کہ بے کار ہار گیا۔ اسی وجہ سے چاہتا ہوں کہ جاؤں اور جیت لاؤں۔ ورنہ مجھے اس وقت خود فرصت نہ تھی جو کہیں آتا جاتا۔ مگر کیا کروں صرف آپ کے نوٹوں کا خیال ہے جو پھر قمار خانے میں جا رہا ہوں ——— اچھا تو پھر جلدی کیجئے ———!"

عورت نے دس کا نوٹ نکالا اور جان کے ہاتھ پر دے مارا۔

"لے بھائی! تیرا ایمان جانے۔ میں سامنے رستوران میں بیٹھی ہوں۔ اگر گھنٹہ بھر میں نہ آیا تو پھر پولیس کو خبر کردونگی سمجھ گئے ——— ہاں اپنا نام تو بتاؤ!"

"میرا نام ہے مسٹر جان۔ نمبر ۱۲ وسٹن روڈ (لندن)!" یہ کہہ کر وہ قمار خانے کی طرف چل دیا۔

ایک - دو - تین - جان نے جاتے ہی دس بارہ داؤں جیت لئے اور دم بھر میں اس کے پاس آٹھ سو کی رقم ہوگئی - تمام کھلاڑیوں نے اس کی خوب خوب پیٹھ ٹھونکی اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا ——— اس کو ڈر تھا اگر پھر ہار گیا تو ؟

(۲)

عورت رسٹوران میں کافی پی رہی تھی کہ جان نے پہنچ کر کہا :-

"لو دیکھو ! جیت لایا - میں نہ کہتا تھا کہ دُنیا کی ہر شے میں جوا ہے اور دُنیا کی ہر چیز جواری ! "

عورت حیران رہ گئی ——— "جیت لائے ، خوب ! جیت لائے ! - میں تو نا اُمید ہو چکی تھی ! اچھا ہوا - لاؤ دو ! "

جان نے آٹھ سو روپیہ کے نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے -

"خاتون معاف کرنا ، میں نے تم کو بڑی تکلیف دی ، مگر کیا کرتا مجبور تھا ، اب یہ سب تمہارے ہیں ! "

عورت کو یقین نہ آیا ——— "سب میرے ہیں ؟ اور تم ——— تم کچھ نہ لوگے ؟ " مسکرا کر ——— "پھر جوا کیونکر کھیلوگے ؟ "

"نہیں ، میں ایک پائی بھی نہ لوں گا ، روپے تو تمہارے تھے ، اگر ہار جاتا تو کیا کر لیتیں تم ؟ "

عورت مارے خوشی کے دیوانی ہوگئی ———

"بھئی واہ ! تم تو بڑے اچھے آدمی ہو ! میری پہلی باتوں کو معاف کر دینا ، دس روپیہ میں آٹھ سو ! بھئی واہ !! "

جان نے جواب دیا ——— "یہی تو جوئے میں مزا ہے ! دم بھر میں امیر غریب ہو جاتا ہے اور غریب امیر ، یہ جوئے کی گردش ہے اور اسی گردش کا اصلی نام ہے قسمت کا پھیر ! "

عورت خاموشی سے کافی پیتی رہی - اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے ، اور چہرے سے لالچ ٹپکنے لگا تھا - گلوگیر آواز میں بولی :-

"تو لو یہ روپیہ ! پھر جا کر کھیلو ! کُل ہزار مجھے دے دینا اور باقی سب تمہارا ، میں یہیں بیٹھی ہوں ، جاؤ سمجھ گئے ! "

جان نے رُک رُک کر کہا ——— "اچھی بات ہے - جو ہوگا دیکھا جائے گا ! "

عورت نے دوبارہ کافی کا آرڈر دیا - اور دیر تک پیالی سے نکلتی ہوئی بھاپ پر نظر جمائے رہی - اس کی نظروں میں پیالی کی بھاپ سے ہزاروں روپے کے نوٹ بن بن کر میز پر جمع ہو رہے تھے ——— اس نے سوچا ——— ایسا شریف ، نیک ، ایماندار شخص میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا ، وہ کسی قدر خوبصورت بھی تو تھا ——— اس نے کافی کی پیالی اُٹھائی اور پھر رکھ دی - پھر اُٹھائی اور پھر رکھ دی ، اب کافی ختم ہو چکی تھی ——— کہ ایک لڑکا اس کی

میز کے قریب آکر رک گیا اور بولا :-
"کیا آپ کا نام میری اسٹیفن ہے ؟"
"ہاں کیوں ؟"
"یہ خط ہے ، آپ کے نام !"
میری نے جلدی سے خط کھولا ، صرف ایک سطر لکھی تھی :-
قسمت کی ہار نے جیت کا پانسہ الٹ دیا میں بازی ہار گیا !"
"جان !"

(ماخوذ) قیصر

آخری اقوال

ریمزے میکڈانلڈ انگلستان کے وزیر اعظم کی قابل اور روشن خیال بیوی کی بابت جس نے عمر بھر مزدور عورتوں کی بہبود کے متعلق بہت سے مفید کام کئے اور جس نے ۱۹۱۱ء میں وفات پائی کہا گیا ہے کہ جب اس کی آخری ساعت قریب آئی اور اس کے شوہر نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ آنے والے وقت کی بابت کسی سے کچھ کہنا چاہتی ہے تو اس نے کہا " یہ محض تضیع اوقات ہوگی میں ہمیشہ تیار رہی ہوں - آؤ اب مل کر خدا کی تعریف کریں اس پر جو ہو چکا ہے - وہ ہمیشہ مہربان رہا ہے مجھ پر مجھے میرا کام میرے دوست اور میرا ایمان دینے میں - بس اب دن کے خاتمے پر میں اس کے پاس آرام لینے اور ایک ٹھکانہ ڈھونڈنے کو جا رہی ہوں "۔

جنگ عظیم کے زمانے کی مشہور بہادر نرس ایڈتھ کیول نے جسے جرمنوں نے اس جرم میں کہ وہ ایک انگریزی خفیہ کارندہ ہے گولی سے اڑا دیا مرنے سے پہلے یہ الفاظ کہے " یہاں کھڑی ہوئی خدا اور ازل و ابد کے سامنے میں اب سمجھتی ہوں کہ صرف حب الوطنی کافی نہیں - میں چاہتی ہوں کہ اس وقت میرے دل میں کسی کے خلاف نہ نفرت ہو نہ غصہ -

---

"گلچیں"

انسان اور کائنات

ہے لبِ بلبل پہ شورِ "مرحبا" میرے لئے
مانگتے ہیں صبح کو غنچے دعا میرے لئے

چاندنی کیا ہے؟ مرے ذوقِ نظر کی اک کنیز
ہے عروسِ کہکشاں زرّیں قبا میرے لئے

کامیابی عکس میرے ناخنِ تدبیر کا
دہر کا ہر عقدۂ مشکل ہے وا میرے لئے

تلخیٔ ایام، میرے واسطے صہبائے عیش
موت کا زہرِ ہلاہل ہے دوا میرے لئے

ہے محبت سے عبارت میری فطرت کا خمیر
میں وفا کے واسطے ہوں اور وفا میرے لئے

جو نہ بخشا جائے، ایسا جرم ہے میرا وجود
ہے مقرّر قیدِ ہستی کی سزا میرے لئے

وسعتِ کون و مکاں ہے تنگ میرے واسطے
عرش کا ہے کنگرہ تحت الثریٰ میرے لئے

دی مرے آنے کی غنچوں نے زمانے کو نوید
بلبلوں نے بزمِ عشرت کی بپا میرے لئے

میرے خوش کرنے کو ہیں طاؤس رقصاں دشت میں
چل رہی ہے باغ میں ٹھنڈی ہوا میرے لئے

کی گئی میرے لئے آراستہ بزمِ جہاں،
دی گئی ہے چاند سورج کو ضیا میرے لئے

میرے نظارے کی خاطر جھومتی ہے شاخِ گل
نغمہ زن ہیں قمریانِ خوشنوا میرے لئے

میری خاطر ہر کرن سورج کی محوِ اضطراب
جھومتی ہے شب کو تاروں کی فضا میرے لئے

میرے محسوسات کے حسنِ لطافت کو نہ پوچھ!
نبضِ خس کی ہے دھمک بانگِ درا میرے لئے

ظلمتوں سے اخذ کرتا ہوں میں نورِ سرمدی
موت کی چھاگل میں ہے آبِ بقا میرے لئے

میری راحت کے لئے انگارے بن جاتے ہیں پھول
چھوڑ دیتا ہے سمندر راستہ میرے لئے

مجھ کو گمراہی نے منزل کا بتایا ہے پتا
موجِ طوفاں بن گئی ہے ناخدا میرے لئے

پتّی پتّی گلشنِ جنت کی میری منتظر
روز و شب کرتی ہیں حوریں التجا میرے لئے

میری مستی کے لئے ہے دور میں جامِ حیات
ہو رہی ہے دہر کی نشو و نما میرے لئے

منظور حسین ماہرؔ القادری

مآلِ کار

(ناروے کی ایک کہانی)

"بجورسن (۱۸۳۲ — ۱۹۱۰) جو ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوا۔ ابتدائے شباب ہی میں ناروے کے لوگوں کا لیڈر بن گیا۔ اور انہیں حبِ وطن کی تلقین کرنے لگا۔ ابتداً اس نے بہت سی نظمیں لکھیں جو اہلِ ملک نے ازحد پسند کیں۔ ناروے کا "قومی ترانہ" بھی بجورسن ہی کا لکھا ہوا ہے اس کی ابتدائی کہانیوں نے ناروے کے ادب میں ایک نئے باب کا افتتاح کیا۔ اس نے ناروے کے پرانے مشہور واقعات کو منظوم ڈراموں میں مربوط کیا۔ مگر رفتہ رفتہ ۱۸۷۵ء میں وہ جدید منثور ڈرامے لکھنے لگا۔ اس نے اپنی تصانیف کے ذریعہ سے مختلف معاشرتی نقائص پر روشنی ڈالی۔ ابتدائے زندگی میں وہ بہت کٹر عیسائی تھا مگر رفتہ رفتہ اس کے مذہبی عقائد میں کمزوری آگئی۔ اس نے محسوس کیا کہ مذہب کے سخت اصول انسان کیلئے موزوں نہیں۔ آخری زندگی میں بجورسن کے بہت سے مخالف پیدا ہو گئے مگر پھر بھی ادبی کارنامیوں کے پیش نظر ۱۹۰۳ء میں جب اس کی عمر اکہتر سال تھی اسے نوبل پرائیز دیا گیا۔ یہ کہانی بجورسن کی ابتدائی کہانیوں میں سے ہے جو اس نے دیہاتی زندگی کے متعلق لکھی تھیں۔ اُمید ہے کہ اہلِ نظر اصحاب کیلئے یہ معارف وحقائق زندگی سے خالی نہ ہوگی۔"

(جیوا دمیرٹھی)

پہاڑوں کی تنگ اور گہری وادی میں ایک ناچتا گاتا دریا پتھروں اور چٹانوں پر گرتا پڑتا اپنے مرمریں جھاگوں کو ہمراہ لئے بہا کرتا تھا۔ دونوں طرف سنگلاخ پہاڑوں کی سربلند چوٹیاں اور ڈھلوان دیواریں کھڑی تھیں۔ ایک ڈھال بالکل بنجر اور برہنہ تھی۔ صرف تلیٹی میں سرسبز وشاداب درختوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ بھیچا بھچا یا کھڑا تھا جو کسی طرف کو بھی نہ پھیل سکتا تھا۔ اور جو بہار وخزاں میں یکساں آبشار کے فواروں میں غسل کیا کرتا تھا۔

ایک دن چھوٹی جھاڑیوں نے اپنے پڑوسی شاہ بلوط سے کہا "آؤ۔ ہم سب مل کر اس پہاڑ کو سرسبز بنا دیں"۔ شاہ بلوط نے نظریں جھکائیں اور چھوٹی سی جھاڑی کو بولتے دیکھ کر تکبّر سے سر اونچا کر لیا۔ اس نے جھاڑی کی درخواست کو لائق جواب بھی نہ سمجھا!

شمالی ہواؤں نے چیخنا چلّانا شروع کیا۔ ان کی صدائے بازگشت فضائے کوہ پر چھا گئی۔ منجمد دریا خاموشی سے سو گیا۔ ننگے پہاڑ کانپتے کانپتے ایک دوسرے پر جھک گئے۔ ہر طرف اُجاڑ نظر آنے لگا۔

غریب جھاڑی نے دوسری ڈھال والے صنوبر سے کہا "آؤ ہم پہاڑ کو کپڑے پہنا دیں"۔ صنوبر نے اپنی داڑھی ہلائی اور برچ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "ہمیں ضرور ایسا کرنا چاہئے۔ ہمارے سوا اور کون ہے جو یہ کام انجام دے سکے"۔

برچ نے گھبرا کر پہاڑ کی ڈھالوں پر جو ایک دوسرے پر اس طرح جھکی ہوئی تھیں کہ وہ بمشکل ہی سانس لے سکتا تھا ایک نظر ڈالی۔ اور کہا "یقیناً ہمیں اسے کپڑے پہنا دینے چاہئیں"۔ غرض یہ تینوں پہاڑ کو کپڑے پہنانے کے لئے چل کھڑے ہوئے۔ جھاڑی آگے آگے تھی اور یہ دونوں پیچھے۔ وہ تھوڑی دُور چلے تھے کہ انہیں گھاس ملی۔ جھاڑی اسے چھوڑ دینا چاہتی تھی مگر برچ نے کہا "نہیں گھاس کو بھی اپنے ساتھ لے لو"۔

بانچہ گھاس بھی ان کے ساتھ ہولی۔ تھوڑی دیر بعد جھاڑی کے پیر پھسلنے لگے مگر گھاس نے کہا "مجھے پکڑ لو"۔ اب جہاں کہیں ذرا بھی شگاف آتا
ے گھاس اپنی انگلی ٹیک لیتی۔ پھر جھاڑی اپنے پیر جما لیتی۔ اس طرح وہ رینگتے چلے جاتے اور ان کے پیچھے پیچھے صنوبر اور برج آپس میں باتیں کرتے آتے۔

آخر پہاڑ نے سوچنا شروع کیا کہ یہ کس قسم کی مخلوق ہے جو اس طرح مجھ پر چڑھی چلی آتی ہے۔ ایک صدی تک سوچنے کے بعد بھی وہ کوئی
یصلہ نہ کر سکا۔ آخر کار اس نے ایک چھوٹی سی ندی کو اس بات کی تحقیق کیلئے نیچے بھیجا۔

گرمی کا آغاز اور بہار کا موسم تھا۔ ندی بہتی چلی جاتی تھی۔ راستہ میں اُسے گھاس ملی۔ ندی نے کہا "اچھی اچھی گھاس کیا تم مجھے اپنے اندر
سے گزرنے کی اجازت نہ دوگی۔ میں تو اتنی چھوٹی ہوں"۔ گھاس چڑھائی میں مشغول تھی۔ اس نے رُک کر ندی پر ایک نظر ڈالی اور پھر کام میں لگ گئی۔
ی اس کے نیچے بہتی چلی گئی۔ "اچھی اچھی جھاڑی کیا تم مجھے گذرنے کی اجازت نہ دوگی۔ میں تو اتنی چھوٹی سی ہوں"۔ جھاڑی نے ندی کو غور
سے دیکھا مگر یہ خیال کر کے کہ گھاس نے اسے اجازت دے دی ہے جھاڑی بھی خاموش ہوگئی۔ ندی پہاڑ کی ڈھال پر بہتی چلی گئی اور صنوبر کے
اس آگئی۔ جو پہاڑ کی ڈھال پر کھڑا کانپ رہا تھا۔ "اچھے اچھے صنوبر کیا تم مجھے گزرنے کی اجازت نہ دوگے میں تو اتنی چھوٹی ہوں"۔ اس نے صنوبر کے
یروں کو بوسہ دیا اور متشکرانہ انداز میں مسکرائی۔ صنوبر کچھ شرمندہ سا ہوگیا اور ندی کو گزرنے کی اجازت دے دی۔ ہاں برج نے تو اس کی درخواست سے
پہلے ہی ندی کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔

"آہا۔ ہاہا" ندی مسکرائی اور پھیلنا شروع ہوئی۔ "آہا۔ ہاہا۔ ہاہا" ندی مسکرائی اور پہلے سے بھی زیادہ وسیع ہوگئی۔ "آہا۔ ہاہا۔ ہاہا۔ ہاہا"
ندی نے قہقہہ لگایا اور اپنے بھنڈارے سے بھی باہر نکل گئی۔ اس نے گھاس جھاڑی صنوبر اور برج کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا اور پہاڑ کی ڈھالوں
پر لڑھکا دیا۔ اس کے بعد صدیوں تک پہاڑ ننگا کھڑا رہا۔ ہاں کبھی کبھی وہ اس فتح کی یاد میں دل ہی دل میں مسکرا لیا کرتا۔

گھاس مُرجھائی، سُوکھی اور سرسبز ہوگئی۔ وہ دوبارہ پہاڑ کی چوٹی کی طرف چل کھڑی ہوئی۔ جھاڑی بھی گھاس کو دیکھنے کے لئے اُٹھ بیٹھی اور
اتنی دیر بیٹھی رہی کہ آخر کار کھڑی بھی ہوگئی۔ اس نے اپنا سر کھجایا۔ تھوڑا غور کیا اور پہاڑ میں اپنی جڑیں اس مضبوطی سے گاڑ دیں کہ ان کی تکلیف کو پہاڑ نے
بھی ضرور محسوس کیا ہوگا۔ صنوبر نے کہا "دوستو! مجھے کیوں چھوڑے جاتے ہو میں تمہارے ساتھ ہوں"۔ اس نے اپنے پَر پُرزے نکالے اور قدم بہ قدم
چلنا شروع کیا گویا وہ کبھی ناکام ہی نہ ہوا تھا۔ برج بھی جو گرد و غبار میں اٹا پڑا تھا ایک جھرجھری میں کھڑا ہوگیا اور سب کے ساتھ پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔

پہاڑ کچھ نہ سمجھ سکا کہ ان درختوں کی یلغار کا مقصد کیا ہے؟

آخر کار وہ دن بھی آگیا جب آگے آگے چلنے والی گھاس کو پہاڑ کی چوٹی نظر آنے لگی۔ گھاس چلائی "ارے۔ رے۔ رے" اور اس نے قدم بڑھایا۔
جھاڑی نے تعجب سے کہا "ہیں! یہ گھاس کو کیا ہو رہا ہے" اور وہ بھی اس کے پیچھے لپکی۔ صنوبر نے کہا "یہ معاملہ کیا ہے۔ یہ دونوں کہاں چلے جا رہے
ہیں" اس نے بھی دوڑنا شروع کیا اور تھوڑی دیر بعد وہ بھی ششدر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اب برج کو بھی جو سب کے پیچھے تھا تشویش ہوئی۔ اس نے جو
لپک کر دیکھا تو پہاڑ کی چوٹی پر پہلے ہی سے گھاس، جھاڑی، صنوبر اور برج کا گھنا جنگل موجود ہے!
چاروں درماندہ مسافر منزل پر تھک کر بیٹھ رہے۔ "آہ! کیا ساری دوڑ دھوپ کا انجام یہی ہے؟"

جواد میرٹھی

رخصت

رخصت! اے دوست یہاں آئے تھے رونے کیلئے
جوہرِ زیست رہِ عشق میں کھونے کے لئے

سوگیا ہے مرے ہاتھوں میں جوانی کا رباب
زندگی کیا تھی؟ بس اک نغمۂ اندوہِ شباب
میری پتھرائی ہوئی آنکھوں کو دے فرصتِ خواب

کہ مری رُوح بھی بے چین ہے سونے کیلئے

اُس طرف ایک سمندر ہے خموش اور مغموم
جس کی تہ میں نظر آتا ہے ستاروں کا ہجُوم

اُس سمندر کے کنارے پہ سفینہ ہے کوئی
منتظر میری سفینے میں حسینہ ہے کوئی
مجُھ کو جانے دے یہ مسعود مہینہ ہے کوئی

مجُھ کو درپیش ہے پیارے! سفرِ شہرِ نجُوم

مجُھ کو جانے دے خدُارا، مری منزل ہے وُہی
کر نہ رہنے کا اشارا، مری منزل ہے وُہی

مجُھ کو اُس ارضِ مقدّس کا سفر کرنے دے
عشق کے آخری میداں میں قدم دھرنے دے
رُوحِ محبوب سے ملنے کے لئے مرنے دے

مَیں بھی ہُوں ایک ستارا، مری منزل ہے وُہی

عدمؔ

بُدھ دیوتا اور اُس کا فلسفہ

آخر کپل وستو کی راجدھانی کے مبارک فرزند سدھارتھ نے شاہی محلات میں جنم لیا۔ کشتری گھرانا تھا اور اُس پر ولیعہدی۔ بچپن ہی میں فن سپہگری کے قواعد پر عبور حاصل کر لیا۔ ماں باپ اُس ہونہار بچے کی پیشانی میں اقبال کی جھلک دیکھتے ہونگے اور کہتے ہونگے کہ سدھارتھ بڑا ہو گا تو مہمات سر کرے گا۔ بڑے بڑے رن جیتے گا۔ مشہور سپہ سالاروں کو نیچا دکھائیگا۔ خونِ اعدا سے زمین لالہ زار کر دے گا اور اِس طرح باپ دادا کا نام روشن کرے گا۔ وہ کشتری نژاد تھے۔ کیا جانتے تھے کہ تلوار سے بہتر بھی کوئی آلہ ہے۔ مہمات سر کرنے سے زیادہ شاندار بھی کوئی کامیابی ہے۔

بوئے خوں کشتری امرا کی گھٹی میں تھی۔ کشت و خوں سے آنکھوں میں ٹھنڈک آتی تھی۔ اگر سیر و شکار کا دستور دُنیا میں نہ ہوتا تو زمانۂ امن میں وہ اپنی پیاس کیونکر بجھاتے؛ لیکن سدھارتھ کا طریق الگ ہی تھا۔ کمان میں تیر چڑھا ہے۔ معصوم ہرن چوکڑیاں بھرتا پاس سے گزر گیا ہے۔ مگر اُنگلی کی خفیف سی حرکت جس سے تیر کمان سے نکل کر اُس حیوان کے سینہ میں پیوست ہو جائے اُس کے لئے کارِ محال ہے۔ وہ سوچتا ہو گا کہ کیا شکاری کی کامیابی کا راز اسی میں ہے کہ ایک بھولا بھالا بے فکر جانور خاک و خوں میں غلطاں نظر آئے۔ اور زندگی کا ایک خوبصورت پروگرام اُس کے معمولی دل بہلاؤ کے لئے تہ و بالا ہو جائے۔ موت کی تکلیف اور انسان کی بیرحمی کا تمام نقشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے کھچ جاتا۔ تیر کمان ہاتھوں سے گر پڑتے اور وہ افسردہ خاطر آہیں کھینچتا واپس لوٹ آتا۔ ہنسی مذاق تو الگ رہا، یار دوستوں سے کلام تک نہ کرتا۔ ماں باپ بلائیں لیتے۔ بیوی فدا ہوتی۔ مگر وہ پژمردہ دل نہ بہلتا۔

گھڑیوں خیالات میں ڈوبا رہتا اور سوچتا کہ اُس زندگی کو خوشنما اور کامیاب کیسے کہیں جس کے گرد و پیش ہزاروں ذی روح خون سے لتھڑے ہوئے آہ و زاری کرتے نظر آئیں۔ مانا کہ ایک کی خوراک دوسرے میں ہے مگر انسان ادنیٰ مخلوق سے بالاتر ہے۔ انسان درد کو دیکھ سکتا ہے۔ دوسرے کی تکلیف محسوس کرتا ہے۔ تو عقل و ہوش رکھتے ہوئے اگر آنکھ اور کان کے دردناک پیغام پر توجہ نہ کرے تو اُس کی برتری کس کام کی۔ اُسے گزند رسانی سے تسکین نہیں ہو سکتی۔ دُکھ دینا اس کے لئے روا نہیں۔ خون آلودہ چادر صاف نہیں کہلا سکتی۔ مظالم سے آلودہ روح کیونکر پاکیزہ اور منور ہو سکتی ہے؟

اس قسم کے خیالات تھے جو سدھارتھ کے سینہ میں موجزن رہتے۔ نرم گدیلے اُسے آرام نہ دے سکتے۔ جب مخلوقِ خدا کیا

سے ہزاروں افراد پتھریلے فرش پر بسر کرتے تو وہ اپنے گُدگُدے بستر سے کیسے مانوس ہو سکتا تھا؟ اُس کی رات ایسے گزرتی جیسے کانٹوں پر لوٹ رہا ہو۔ محلات کی اینٹ اینٹ سے اُسے خون ٹپکتا نظر آتا۔

ایسے حالات میں گھر اس کے لئے جائے امن نہ تھا۔ اس رُوحانی تکلیف میں اُسے سچائی کا گوہر کیسے مل سکتا تھا۔ آج ہم ہمدردی کے رنگ میں کہتے ہیں کہ سدھارتھ نے ویرانہ کی تکالیف کیسے برداشت کیں۔ وہ تو ناز و نعمت میں پلا تھا اور ہمارے دل میں افسوس کی لہر اُٹھتی ہے۔ لیکن نہیں جسمانی آرام کا رُوحانی کیفیت سے بہت قریبی تعلق ہے۔ حقیقی راحت اُسے ویرانہ ہی میں مل سکتی تھی۔ اُس کی دماغی حالت اُسے آوارگی کا سبق دیتی تھی اور اِسی میں اُسے راحت کی اُمید تھی۔ ویرانہ میں اُس کے خیالات کی یکسوئی نے اُسے جسمانی تفکرات سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ہم نہیں کہتے اُس نے بیوی بچے کی محبت سے مُنہ موڑ لیا۔ نہیں اُسے تمام جہان کو محبت کا سبق دینا تھا۔ اُس کی آنکھ صرف ایک ہی نقطہ پر لگی تھی۔ اُس کا دِل ایک اضطراب سے نجات چاہتا تھا۔ وہ ایک بڑے مقصد کی تلاش میں تھا۔ دُنیا کے تمام حقیر مقاصد اُس کی آنکھ سے اوجھل ہو چکے تھے۔

علمائے دین کی صحبت میں وہ بیٹھا۔ پنڈتوں اور اولیاؤں کے سامنے اُس نے زانوئے ادب تہ کیا۔ تپ کئے نفس کشی اور فاقہ سے جسم کو مار اگر تمام کوشش لاحاصل ثابت ہوئی۔ جگہ جگہ اپنی تلاش میں پھرا مگر بے مُراد رہا۔ روحانی پاکیزگی کا درس کہیں سے حاصل نہ ہوا۔ وہ سیکھنے کو نکلا تھا مگر ایسا دِل ہمراہ نہیں لے گیا تھا جو عوام کی طرح جو دیکھتا سُنتا قبُول کر لیتا۔ نہیں اُس کی پیاس پریوں کی کہانیوں سے نہ بُجھ سکتی تھی۔ وہ حقیقت چاہتا تھا۔ حقیقت اُسے کسی جگہ سے نہ ملی۔

اُس کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے کہ نفس کُشی اور ریاضتِ جسمانی کے زمانہ میں ایک روز وہ محویت کے عالم میں آسن جمائے جنگل میں بیٹھا تھا۔ ضعف و نقاہت سے طاقتِ گویائی تک رُخصت ہو گئی تھی۔ پیٹ کی جگہ ایک گڑھا رہ گیا تھا جس میں طعام کا تو کیا ذکر آنتیں بھی تحلیل ہو چکی تھیں کہ ایک خوش رُو عورت خراماں خراماں آئی اور اُس کے سامنے کھیر کی ایک رکابی رکھ الگ کھڑی ہو گئی۔ اس ناتوانی کی حالت میں اگر سدھارتھ اُس لذیذ ضیافت سے انکار کر دیتا تو ہم کہتے وہ اِنسان نہ تھا پتھر کا بُت تھا۔ کھیر میں جو خوشبوئیں ملائی گئی تھیں وہ اُس کے دماغ و رُوح تک جا پہنچیں۔ اور تر و تازگی بخشنے لگیں۔ ساتھ ہی ایک نحیف اور کمزور سا ہاتھ بڑھا اور رکابی سے ایک بڑا نوالہ اُٹھا۔ سدھارتھ کو اُس سے بدرجۂ غایت تسکین و فرحت ہوئی اور زبان میں طاقتِ گویائی واپس آگئی۔ اُس عورت سے پُوچھتا ہے اَے نیک عورت یہ کیا ہے۔ وہ مُسکراتی ہوئی کہتی ہے اے بن کے دیوتا! میں نے منت مانی تھی کہ میرے ہاں اولاد ہوئی تو تیری ضیافت کروں گی۔ سو رماتا نے میری گود ہری کر دی ہے اور میں کھیر پکا کر تیری خدمت میں لائی ہوں۔ اس میں گاؤں کی بتیس گئیوں کا دودھ ہے اور بارہ بُوٹیوں کی خوشبُو ہے۔ یہ مَیں نے شکریہ اور محبت سے پکائی ہے کہ آپ اِسے قبُول کریں۔ سو مَیں دیکھتی ہوں کہ

میری مُراد پوری ہوگئی ہے ۔ پس میں خوشی خوشی لَوٹ جاتی ہوں ۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی چاندسی جبین بَن کے دیوتا کے پاؤں پر رکھ دی اور مسکراتی ہوئی چلی گئی ۔

بن کا دیوتا کھانے میں مشغول رہا ۔ ہر نوالے سے اُس کی آنکھوں میں چمک بڑھتی گئی ۔ کہاں بھوک کی کمزوری اور مایُوسی کا سماں ۔ کہاں خوش ذائقہ اور خوشبودار کھیر اور اُس عورت کا محبت بھرا کلام ۔ ابھی دنیا مصائب کی منزل اور درد کا مقام تھی ۔ ابھی مُسکرانے لگی ۔ اُس نیک عورت کے معمولی سلوک اور خوش کرنے کی آرزو نے سدھارتھ کی دُنیا کا نقشہ بدل دیا ۔ اُس کے لب خوشی سے کھِل گئے ۔ اور دِل شکریہ سے لبریز ہوگیا ۔ وہ عورت اُس پر فرشتہ ہوکر نازل ہوئی تھی ۔ محبت اور خدمت اُس کا پیام تھا ۔ وہی سدھارتھ جس کے دِل کو علما کے فلسفہ سے کوئی تسکین نہ ہوئی تھی جسے فاقہ کشی سے کوئی فائدہ نہ ہُوا تھا آج اُسی ذلیل دُنیا کے ایک معمولی فرد کے حُسنِ سلوک پر سر دُھن رہا تھا ۔ دِل میں فرحت و انبساط کی لہریں اُٹھ رہی تھیں ۔ آج اُس نے سچائی کا سبق سیکھ لیا اور زندگی کا مقصد بھانپ لیا ۔ وہ اب آوارۂ دشت نہیں تھا وہ بے چینی کے بھنور میں چکر نہیں لگا رہا تھا ۔ اُس کے سینہ میں ایک پُرسکون دِل تھا ۔ اُس نے وہ راز پالیا تھا جس نے اُسے مایُوس اور بے قرار سدھارتھ کے درجہ سے اُٹھا کر مہاتما بُدھ کی عالیشان مسند پر لا بٹھایا ۔ اُس کا دِل روشنی سے منوّر تھا ۔ اور اُس نے اپنے دست وبازو میں وہ قوت پائی جس کے بل پر وہ دُنیا کا نقشہ اُلٹ دینے والا تھا ۔ آج وہ قوم کا رہبر تھا ۔ دُنیا میں دُکھ درد ہوگا ، پڑا ہو ۔ اُس کا فرض رنج والم سے بھاگ نکلنا نہ تھا ، نہیں وہ دنیا میں پھر زندگی بسر کرے گا ۔ اور اپنے حُسنِ سلوک سے اخلاصِ نیّت سے رنج والم کم کرنے کی کوشش کرے گا ۔ انسان سے انسان کی محبت بڑھائے گا ۔ نفرت مٹائے گا اور سب کا بھلا چاہے گا ۔ کُشت وخون کے پودے کو جڑھ سے اُکھاڑ پھینکے گا ۔

بدھ دیوتا کی تعلیم نہایت سادہ اور عام فہم ہے ۔ دُنیا اُس کا پیغام سُننے کو تیار تھی ۔ وہ برہمنی مظالم سے تنگ آچکی تھی چاروں طرف سے آمنّا وصدّقنا کے نعرے بلند ہوئے اور زمانہ نے کروٹ بدلی ۔ پُرانا فلسفہ نہ رہا ۔ وہ خیالات نہ رہے جسم کو مٹانے سے روحانی پاکیزگی ہوتی ہوگی مگر اُس سے دُنیا کو کیا فائدہ ۔ زندگی کا مقصد یہ نہیں کہ آپ دُنیا سے الگ تھلگ رہیں ۔ خدمتِ خلق آپ کا بہترین فرض ہے ۔ خدمت کے لئے خوردونوش لازم ہے ۔ اچھی چیزیں کھانے سے رُوحانی فرحت ہوتی ہے لیکن محض جسم پروری درست نہیں ۔ خواہشات کی غلامی درجۂ انسانیت سے گرا دیتی ہے ۔ خواہشات مصائب کی جڑ ہیں ۔ اُن پر قابُو پانا زریں اصول ہے ۔ اہنسا گناہ ہے ۔ کسی جاندار کو دُکھ دینے سے حقیقی فرحت حاصل نہیں ہوسکتی ۔ قربانی سے کوئی فائدہ نہیں ۔ کسی کو دُکھ پہنچانے یا اُس کی جان لینے میں آپ کی نجات نہیں ۔ زندگی کی خواہش درست نہیں ۔ یہ نروان کی راہ میں رُکاوٹ ہے ۔ ذائقے اور لذّت پر غالب آنا ، بدخواہی کی سیاہی سے سینہ

دھوڈالنا اصل نروان ہے۔ آفاتِ دُنیا اور مصائبِ ارضی سے انسان بے نیاز ہو جائے تو نروان اِسی زندگی میں ممکن ہے۔

بدھ دیوتا نے ذات پات کی تفریق اُڑا دی۔ حسب و نسب انسان کو بڑائی نہیں بخش سکتا۔ بڑائی ذاتی اعمال کا نتیجہ ہے۔ اُس نے غرور اور نفرت کو جڑ سے اُکھاڑ دیا۔ قربانی اور سحر کے مسئلہ کو رد کر دیا۔ روحانی پاکیزگی کے لئے جسم کو مارنا اور اپنے آپ کو جسمانی تکالیف میں ڈالنا نامناسب قرار دیا۔ مسئلہ تناسخ کو صحیح جانا لیکن اس مسئلہ میں رُوح کو وہ نمایاں حیثیت نہیں دی گئی۔ اس لئے اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ مہاتما بُدھ نے عبادت اعمالِ نیک کی فہرست میں شامل نہیں کی اور نہ اسے روحانی ارتقا یا نجات کا ذریعہ جانا۔ دُنیا کی پیدائش کا سوال یا اُس ہستیٔ بالا کی تسبیح جس سے وجودِ عالم کا ظہور میں آنا مانا جاتا تھا ترک کر دیا۔ اُسے یا تو ہستیٔ بالا پر یقین نہ تھا یا اگر تھا تو محض اُس کی بزرگی کا وِرد کرنا اور اُس کے آگے سر جھکانا انسان کے فرائض میں شمار نہ کیا۔ جہاں تک معلوم ہوتا ہے اُس نے اُس ہستی سے انکار بھی نہیں کیا۔ صرف اِس سوال کو غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا اور رُوحانی اطمینان اور مسرت اپنے من میں تلاش کی۔

انسان کے دِل میں جب سے دُنیائے باطن کا خیال بیٹھا ہے۔ ظاہری دُنیا کے ساتھ ساتھ ایک اور دُنیا بھی اُسکے پیشِ نظر رہی ہے۔ اس عقدے کو سُلجھانے کے لئے اُس نے ایسے پیچ در پیچ راستے اختیار کئے ہیں کہ اُس کی عملی زندگی پس پُشت جا پڑی ہے۔ لیکن آج بھی ہمارے سامنے وہ مسئلہ ایک رازہی کی صُورت میں موجُود ہے۔ ہم لاکھ کہیں اس میں کوئی اُلجھن نہیں لیکن یہ محض ہمارا قول ہو سکتا ہے ایمان نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ مہاتما بُدھ نے وہ راستہ چھوڑ دیا۔ جس کی منزلِ مقصود کہیں نظر نہیں آسکتی۔ سچائی اُس کی تعلیم تھی۔ سچائی پر وہ قائم رہا۔ جو کچھ اُس نے دیکھا بیان کر دیا جو نہ دیکھا چھوڑ دیا۔ لیکن دُنیائے باطن کا خیال انسان کے دِل پر ایسا حاوی ہو چکا ہے ایسا رگ رگ میں سما گیا ہے کہ مہاتما کی زندگی کے بعد لوگوں کی توجہ پھر اُدھر پھر گئی۔ اور مخالفین کو موقع ہاتھ آگیا کہ پُرانے اعتقادات کو جو سینکڑوں سالوں سے جان کنی کی تکلیف میں تھے از سرِ نو زندگی بخش دیں۔

اشفاق حسین

محفلِ ادب

ملنگی

پنجاب کا مشہور خونریز ڈاکو ملنگی اپنی غارتگری کی مہیب داستانوں کے ذریعہ بہت کچھ روشناس خلق ہو چکا ہے اُس کے گروہ کی تاخت و تاراج کا رُخ جس طرف ہو جاتا تھا اُس رقبے کے باشندوں کی آنکھوں میں نیند حرام ہو جایا کرتی تھی۔ کیونکہ وہ علاقہ سُورج غرُوب ہونے کے بعد سے فرنگی کی بجائے ملنگی کے زیر حکومت سمجھا جاتا تھا۔

اس واقعیت میں شاعریت کو مطلق دخل نہیں کہ پنجاب بھر کی آوازِ خلق پنجابی زبان کے شعرا کی ہمنوا بن رہی ہے کہ:۔

"دِنے راج فرنگی داتے راتی راج ملنگی دا"

ملنگی کے لشکر کی یلغار امن پسندوں کے لئے قہرِ خدا کی سطوت حاصل کر چکی تھی، اُس کے دستِ تطاول نے بہت سی سُہاگنوں کے سُہاگ اُجاڑے، ہزاروں ننھے ننھے معصوم بچوں کو سایۂ پدری سے چھین کر گردِ یتیمی کے حوالے کیا سینکڑوں گھروں کو بے سفاکی سے بے چراغ کر دیا۔ مختصر یہ کہ کچھ دنوں تک درندگی، بیدردی اور جفا کاری نے ملنگی کا رُوپ دھارن کر لیا تھا۔ یہ ہے ملنگی کی دِل ہلا دینے والی بھیانک تصویر!

آؤ تمہیں اس تصویر کا دُوسرا رُخ بھی دکھاؤں۔ پنجاب کے جس جیل میں اسے کیفر کردار کو پہنچایا گیا اُس کے ایک اعلیٰ افسر نے راقم الحروف سے اِس عبرت آموز داستان کو سُناتے ہوئے بیان کیا کہ:۔

ملنگی اور اُس کے ساتھیوں کو جس صبح پھانسی دی جانے والی تھی ہم نے اُسے وقتِ مقررہ سے پہلے اطلاع دی کہ "ملنگی! کٹھن منزل قریب آ گئی ہے اپنے آپ کو اس سفر کیلئے تیار کر لو!" مگر اس جانگداز بشارت کا جواب جس بینظیر شہامت سے ہنستے ہوئے اس نے دیا۔ اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ ملنگی موت کو دردِ سر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

اپنے ایک انجام شریک ساتھی کو قرآن مجید کی تلاوت کرتے دیکھ کر للکارتے ہوئے بولا:۔

"کم بخت اب بھی قرآن پڑھنے سے باز نہیں آتا، تیری اس قرآن خوانی ہی نے تو یہ دن دکھائے کہ میدانِ جنگ میں بہادروں کی طرح جان دینے کی بجائے ہم مجرموں کی حیثیت میں پھانسی کے تختے پر زندگی ختم کر رہے ہیں چھوڑ اس قرآن خوانی کو!

اور بہادری سے موت کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہوجا!"

راوی کا بیان ہے کہ :-

"میں نے ملنگی کے مُنہ سے قرآن شریف کے متعلق یہ گستاخانہ فقرے سُن کر اُسے ملامت کی کہ کمبخت مسلمان ہوکر قرآن مجید کی توہین کرتا ہے اور پھر ایسے نازک وقت میں تو بڑے سے بڑا بے دین بھی خدا کی یاد کرتا ہے اور تُو خود تو درکنار دوسرے کو بھی آخری نیکی سے روکتا ہے۔"

ملنگی نے جواب دیا" جناب میں قرآن مجید کی توہین نہیں کرسکتا۔ اس وقت میں نے اپنے اس ساتھی سے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم گرفتاری سے پہلے جنگل میں ایک محفوظ مقام پر بیٹھے ہوئے تھے اور ہمارا یہ ساتھی جو اس وقت قرآن شریف پڑھ رہا ہے اُس وقت بھی قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف تھا۔

اچانک ہمارے جاسوس نے پولیس کے آنے کی اطلاع دی۔ ہم سب بھاگنے پر تیار ہوگئے، ہم اُس وقت بھاگ کھڑے ہوتے تو کبھی گرفتار نہ ہوسکتے۔ لیکن ہمارے اِس ساتھی نے کہا کہ میں جب تک قرآن کا یہ پارہ ختم نہ کرلوں چھوڑ نہیں سکتا۔ ہم نے اس ظالم سے ہر چند کہا کہ پولیس کی دوڑ آرہی ہے اور ابھی اُس میں اور ہم میں بڑا فاصلہ ہے۔ آؤ! بھاگ نکلیں مگر یہ ساتھی پارہ ختم کرنے سے پہلے ساتھ چلنے پر کسی طرح رضامند نہ ہُوا۔

ہم جان چکے تھے کہ پولیس کی جمعیت سے ہم کسی طرح سر براہ نہ ہوسکیں گے۔ ہماری اُس کی مُڈ بھیڑ ہوگئی تو اُس کی گولیوں کا شکار بنیں گے یا پھر پھانسی کے تختے پر موت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

یہ سب کچھ تھا! موت۔ پھانسی اور گولیوں کے بھیس میں ہمیں گھور رہی تھی۔

ایک طرف اس ساتھی کے ساتھ موت اور دُوسری جانب زندگی کے لئے فرار۔ اِن دو صُورتوں میں سے ہمیں کسی ایک کو انتخاب کرنا تھا۔ چنانچہ ہم نے دوست کے ساتھ مرنا گوارا کرلیا مگر اُسے تنہا چھوڑ کر جینا ہمیں کسی طرح منظور نہ ہُوا۔ کیونکہ دوستوں ہی کے ساتھ مرنے اور جینے کا کچھ لطف ہے۔"

مَیں نے یہ ساری کہانی ملنگی کے آخری خط کشیدہ فقروں کے لئے نقل کی ہے۔ یہ داستان ہماری دیہاتی معاشرت میں روزمرّہ کے واقعات کی حیثیت رکھتی ہے۔

ملنگی ایک ڈاکو تھا، درندہ، رحم کے نام سے ناآشنا، جور و بیداد کا خوگر یہ سچ ہے کہ اُس کے کالبدِ خاکی میں انسانیت کی بہت سی گھنونی بُرائیاں موجود تھیں۔ لیکن ایثار و دوستی کا جو درخشاں کارنامہ عہدِ وفا کی استواری کی شکل میں دکھایا وہ دوستداری کی تاریخ میں ہمیشہ اُس کے نام کو جگمگاتا رہے گا۔

"نہ چھوڑا مرتے دم تک ساتھ بیمارِ محبت کا
قسم کھانے کے قابل ہے ترے غم کی وفاداری" (حسرت موہانی)

یہ ہے کیریکٹر جس کی نشو و نما عموماً مشرقی فضاؤں میں ہوتی ہے۔

"شاہکار" (ناجور)

افکارِ پریشاں

خدا کی سب سے بڑی طاقت سُبک رو نسیم ہے،
تیز و تُند طوفان نہیں!

آفتاب کا لباس نُورِ محض ہے،
بدلیاں رنگا رنگ پوشاک پہنتی ہیں۔

اگر ماہتاب کے لئے آنسو بہاتے ہو،
تو ستاروں کو بھی نہ دیکھ سکو گے!

اُس کا پیارا چہرہ میرے خواب میں اس طرح آتا ہے
جیسے رات کی بارش!

ہم نے خواب دیکھا کہ ہم اجنبی ہیں!
ہم جاگ اُٹھے اور دیکھا کہ ایک دُوسرے کے پیارے ہیں!

غم میرے دِل میں اس طرح آرام سے سو رہا ہے،
جیسے شام خاموش درختوں میں۔

اے سمندر تیری گفتگو کیا ہے؛
دائمی سوال۔
اے آسمان تیرا جواب کیا ہے؛
دائمی خاموشی۔

زندگی کو بہار کے پھُولوں کی طرح کھِلنے دو!
اور مَوت کو خزاں کی پتیوں کی طرح مرجھانے دو!

جڑیں شاخیں ہیں، زمین میں پھیلی ہوئی۔
شاخیں جڑیں ہیں، ہوا میں چھائی ہوئی۔

دُنیا آرزو بھرے دِل کے تاروں پر دوڑتی ہے،
اور اس سے غم کے سُر نکلتے ہیں۔

پانی میں مچھلی خاموش ہے۔
زمین پر جانور شور کرتے ہیں۔
ہوا میں چڑیاں گاتی ہیں۔

لیکن انسان میں،
سمندر کی خاموشی، زمین کا شور اور ہوا کا نغمہ
سبھی کچھ ہے!

ننھی کلی کھِل کر پھول بن جاتی ہے اور چلّا اُٹھتی ہے،
"پیاری دُنیا! جلدی سے ختم نہ ہو جانا!"

پانی کی چڑیوں اور موجوں کی طرح
ہم کچھ دیر ساتھ رہتے ہیں
چڑیاں اُڑ جاتی ہیں، موجیں بڑھ جاتی ہیں،
ہم ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں!

پرندے کی تمنا ہے کہ وہ بادل ہو جائے!
بادل کو حسرت ہے کہ پرندہ نہ ہُوا۔!

آج صبح میں کھڑکی میں بیٹھا دیکھ رہا ہوں
دُنیا مسافر کی طرح آتی ہے
رواروی میں سلام کرتی ہے اور چلی جاتی ہے!

خُدا بڑی سلطنتوں سے اُکتا جاتا ہے،
لیکن ننھے پھولوں سے نہیں!

ہر بچہ یہ پیغام لے کر آتا ہے کہ:۔
"خُدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہُوا!"

پتّی پھول ہو جاتی ہے جب محبت کرتی ہے!
پھول پھل ہو جاتا ہے جب عبادت کرتا ہے!

دُنیا عاشق کے سامنے لامحدودیت کا نقاب اُٹھا دیتی ہے
اور اتنی مختصر رہ جاتی ہے جیسے ایک گیت یا ابدیت کا ایک بوسہ۔

یہ دُنیا کے آنسو ہیں جو اُس کے تبسّم کو رنگین بنائے رکھتے ہیں

میری آرزوئیں نادان ہیں میرے مالک!
وہ تیرے گیت کے بیچ میں فریاد کرنے لگتی ہیں،
تُو گائے جا اور مجھے سُننے دے!

خُدا ہم سے پھولوں کا شکریہ چاہتا ہے،
زمین اور سُورج کا نہیں!

اے خدا تیرا شکر!
کہ میں طاقت کی پہیوں میں سے نہیں،
بلکہ اس مخلوق میں سے ہوں جو اُن سے کچلی جاتی ہے!

"جامعہ"

پتہ درست کر لیجیے
جب آپ یا آپ کے عزیز بیمار ہوتے ہیں تب آپ کو حکیم اجمل خاں صاحب کے دواخانہ کی تلاش ہوتی ہے۔ دھوکہ باز عطار اپنی نرستوں اور اشتہاروں میں ان کا نام بڑی خوبصورتی سے طرح طرح استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ آپ کو دھوکہ دے سکیں آپ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اور آپ کے پاس دھوکہ باز عطاروں کے کارخانوں سے غلط دوائیں بھی پہنچ جاتی ہیں اور جب کہ ان سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچتا ہے تو آپ حکیم اجمل خاں صاحب کے دواخانہ کو بدنام کرتے ہیں اسلئے آپ پتہ نوٹ کر لیجیے اور یاد رکھیے کہ حکیم صاحب مرحوم نے اپنے نام سے کوئی دواخانہ اپنی زندگی میں نہیں کھولا بلکہ جو دواخانہ عطائی اور جاہل عطاروں کے دھوکہ سے بچانے کیلیے ۱۹۰۳ء میں جاری کیا اس کا نام
ہندوستانی دواخانہ دہلی پوسٹ بکس ۲۲
ہے جس کی کل آمدنی سالانہ دو لاکھ روپیہ کے قریب ہے جس میں ڈیڑھ سو آدمی فرمائشات کی تعمیل کرتے ہیں۔ اور جس کا کل نفع آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج دہلی پر صرف ہوتا ہے طبیہ کالج کا خرچ تخمیناً دس ہزار روپیہ ماہوار ہے۔ جو ہندوستانی دواخانہ برداشت کرتا ہے۔ گویا
ہم آپ سے ایک ہاتھ سے لیتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے آپ پر صرف کر دیتے ہیں۔
حکیم صاحب کا مشن صحیح دوا مہیا پہنچانا اور مستند حکیم پیدا کرنا تھا، زندگی میں انہوں نے اس مقصد کو پورا کیا۔ اور اب ان کے جانشین ہندوستانی دواخانہ کے سرپرست عالیجناب مسیح الملک حکیم محمد احمد خاں صاحب بدستور ان کے مشن کو پورا کر رہے ہیں۔
نوٹ
(۱) باہر سے جو مریض اپنے حالات مرض لکھ کر روانہ کرتے ہیں ان کو حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ اور حکیم صاحب کے مشورہ کے بعد حسب فرمائش دوائیں روانہ کر دی جاتی ہیں یا ان کو تجویز دوا سے مطلع کر دیا جاتا ہے۔
(۲) پانچ سیر تک کا پارسل بذریعہ ڈاک روانہ ہو سکتا ہے۔ پانچ سیر سے زیادہ وزن کا پارسل بذریعہ سواری گاڑی روانہ ہوگا لیکن اس کیلئے نصف قیمت پیشگی آنا ضروری ہے
(۳) کارخانہ میں ہر زبان کی فہرستیں تیار رہتی ہیں اردو، ہندی، انگریزی، گجراتی اور بنگالی میں سے جس زبان کی فہرست مطلوب ہو مفت طلب کیجیے۔
(۴) پتہ صاف اور خوشخط لکھیے۔
چند مفید دوائیں
روغن موم
شربت صدر
دواء الشفاء
ملنے کا پتہ ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس ۲۲ دہلی

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱/ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ساڑھے نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸/

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجیے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ ارنس روڈ۔ لاہور

nly Tit'e page printed at the Halftone Press, Dev Samaj Road, Lahore

رجسٹرڈ نمبر ل ۱۰۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرست مضامین

جلد ۷

"ہمایوں" بابت ماہ جون ۱۹۳۵ء

تصاویر:- (۱) غالب (۲) غالب کا مزار

چندہ سالانہ ۶؎ مع محصول — ششماہی ۳؎ مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸/

بزمِ ہمایوں

ہمیں اس علم سے اطمینان ہوا ہے کہ ہمایوں کے روسی ادب نمبر کو اہل الرائے حضرات نے پسند کیا ہے۔ چنانچہ غالباً دو مہینے کے بعد ہم ایک اور ایسا ہی نمبر فرانسیسی ادب کے متعلق شائع کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں ایسے نمبروں کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جہاں یہ عام ناظرین کے لئے دلچسپ ہوں وہیں ادبائے ملک کے سامنے شعر و ادب کی نئی جولانگاہیں پیش کرکے اُن کے تخیل کو تحریک دیں اور اُردو کا باغ ہر قسم کے پھولوں سے بھر جائے۔ غالباً اسی احساس سے متاثر ہو کر حضرت اثر صہبائی نے ہمیں یہ خط لکھا ہے:-

"روسی ادب نمبر موصول ہوا۔ آپ نے یہ خوب جدّت پیدا کی ہے۔ اگر نمبر نکالے ہی جائیں تو کچھ اسی قسم کے ہونے چاہئیں اُردو رسائل اکثر علمی و ادبی معلومات سے خالی ہوتے ہیں۔ خدا کرے "ہمایوں" ایسے ایسے نمبر نکال کر اس کمی کو پورا کر سکے۔"

حضرتِ موصوف کا یہ خیال بالکل بجا ہے خاص نمبروں میں اضافۂ حجم بجائے خود کوئی زیادہ قابلِ قدر چیز نہیں۔ جب تک ایسے نمبروں میں کوئی خصوصیت بھی پیدا نہ کی جائے۔ مختلف ممالک کے ادب کے متعلق خاص نمبروں کا جو سلسلہ ہم شائع کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے ہم دوسرے معاونین کے علاوہ مسٹر سعادت حسن کی اپج اور اُن کی غیر معمولی استعدادِ عمل کے ممنون ہیں۔ ملک کو ایسے نوجوانوں کی بہت ضرورت ہے *

خدا کا شکر ہے کہ "ہمایوں" کی معنوی ترقی کے لئے ہم نے جو ارادے کر رکھے ہیں اُن کے پورا کرنے کی کچھ نہ کچھ توفیق ہمیں مل رہی ہے اور اب تک "ہمایوں" کا کوئی قدم آگے بڑھ کر پیچھے نہیں ہٹا۔ لیکن یہ سب کچھ ان خواہشوں اور ارادوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو "ہمایوں" کے متعلق ہمارے دل میں ہیں اور اس کے لئے ہم دل ہی دل میں منفعل و شرمسار ہیں *

آج ہم پھر وہی پرانا راگ گاتے ہیں اگرچہ اس کا کوئی اثر ہمیں کبھی محسوس نہیں ہوا۔ "ہمایوں" اگر کسی مغربی ملک میں ہوتا تو آج اس کی اشاعت لاکھوں تک پہنچ چکی ہوتی۔ اس کی تو ہمیں اپنے نادار اور ناتعلیم یافتہ ملک سے توقع ہی نہیں لیکن ناظرینِ "ہمایوں" سے ہماری یہ توقع غالباً بیجا نہیں کہ وہ اِسی توسیع اشاعت میں امکانی مدد کر کے ہمیں زیادہ مفید کام کرنے کے قابل بنائیں ہر خریدار اگر چاہے تو کم از کم ایک خریدار اور پیدا کر سکتا ہے *

جہاں نما

مزارِ غالب

دہلی میں یادگارِ غالب کا قیام

کسی قوم کی انتہائی پستی کی ایک علامت یہ ہے کہ اس کے دِل میں اپنے اکابر کا احترام نہیں رہتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے نااہل دِل میں اکابر کی عظمت کا صحیح احساس پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس تلخ حقیقت کا عبرتناک ثبوت نظام الدین (دہلی) میں ہندوستان کے شاعرِ اعظم غالب کا کس مپرس مزار ہے جس پر زبانِ حال ہندوستانیوں کے ذلت آفریں جمود کی نوحہ خوانی کر رہی ہے۔

برمزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

یہ اس شخص کا مزار ہے جس کی عظمت کا طنطنہ اس کی زندگی ہی میں شہرت کے پر لگا کر ہندوستان سے باہر ایران کے پرنخوت ایوانوں میں صدائے بازگشت پیدا کر رہا تھا۔ اور جس کی شخصیت آج شرق و غرب سے یکساں اپنا لوہا منوا چکی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو کہ وہ محض ہندوستان ہی کا سب سے بڑا شاعر نہیں بلکہ مشرق کا سب سے بڑا شاعر ہے اور مشرق ہی کا سب سے بڑا شاعر نہیں بلکہ دنیا کے عظیم الشان شعراء کا ہمدوش و ہم داستان ہے۔ اس کا ہمہ گیر اور ہمہ رس تخیل ذرہ و آفتاب کے دِل کا یکساں محرم و رازداں تھا

ثابت و سیارۂ گردوں را رصد بستم بہ علم
رشتۂ تسبیح گوہرہائے غلطانش منم (غالب)

غنیمت ہے کہ نصف صدی کے بعد ہندوستان نے بھی اپنی غفلت کی نیند میں ایک کروٹ لی ہے۔ ہم ایک کے نامور شاعر اور مُصنف پنڈت برج موہن صاحب دتاتریا کیفی دہلوی صدر "اردو سبھا" لاہور کے ممنون ہیں کہ انھوں نے

جنوری کے اواخر میں لالہ سری رام مرحوم مصنف خمخانہ جاوید کے مکان پر دہلی کے ادباء و اکابر کو مدعو کیا اور ایک موثر تقریر کر کے انہیں مزار غالب کی افسوسناک حالت کی طرف توجہ دلائی۔ حاضرین اس تقریر سے بہت متاثر ہوئے اور اسی وقت انہوں نے ایک باقاعدہ جلسے کی صورت اختیار کر کے ایک انجمن کی بنا ڈالی جس کا مقصد یہ قرار پایا کہ غالب کے مزار کو اس کے شایان شان بنانے کی کوشش کی جائے۔ قبر پر ایک قبہ بنایا جائے اور اس سے ملحق چند حجرے تعمیر ہوں جو زائرین کی آرام گاہ کا کام دیں۔

انجمن کے عہدہ دار حسب ذیل اصحاب قرار پائے :-

صدر: علامہ برجموہن صاحب دتاتریا کیفی

نائب صدر: خواجہ حسن نظامی صاحب و لالہ دیش بندھو صاحب مالک تیج

معتمد: میر محمد حسین صاحب نمبر ۵۳۲ ایجرٹن سٹریٹ دہلی

خزانچی: حکیم عبدالمجید صاحب ہمدرد دواخانہ

نائب معتمدین: پروفیسر آغا محمد اشرف صاحب ایم اے - مولانا عشرت رحمانی ایڈیٹر نیرنگستان -

اسی وقت ایک مجلس انتظامیہ بھی بنائی گئی جس میں عہدہ داروں کے علاوہ حضرات ذیل شامل ہیں :-

مسٹر آصف علی ایم - ایل - اے - پنڈت امرناتھ صاحب ساحر - ڈاکٹر سید احمد صاحب - پنڈت آراین لکھسر صاحب اور ملا واحدی۔

ہمیں یہ سُن کر مسرت ہوئی ہے کہ اس انجمن نے باقاعدہ کام شروع کر دیا ہے - اور عنقریب اس کی باضابطہ رجسٹری بھی ہو جائے گی - چندہ جمع ہو رہا ہے - اور مسیح الملک حکیم محمد احمد صاحب نے مزار کی ملحقہ زمین جو اُن کی ملکیت تھی مکان تعمیر کرنے کے لئے انجمن کو دے دی ہے - اس کے علاوہ ہمدرد دواخانے کے مالک حکیم حاجی عبدالمجید صاحب نے تین سو گز زمین کا ایک ٹکڑا چھ سو روپے میں خرید کر انجمن کو دیا ہے۔

ملک کو اس اہم کام میں امکانی مدد دے کر گذشتہ غفلت کا کفارہ ادا کرنا چاہیئے - ہمیں امید ہے کہ بلا لحاظ مذہب و ملت ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، غرض کہ ہر ہندوستانی اپنی قومی روایات کے اس شاندار نئے شوالے کی تعمیر میں مدد دے کر اپنی غیرت قومی کا ثبوت دے گا۔

انجمن کے متعلق ہر قسم کی خط و کتابت میر محمد حسین صاحب معتمد انجمن یادگار غالب (۵۳۲ ایجرٹن سٹریٹ دہلی) سے ہونی چاہیئے۔

شکریہ - غالب کے مزار کی تصویر کے لئے ہم میاں مسعود اختر صاحب کی تصویر کشی کے منت گزار ہیں۔

غالب

پایۂ من جزبہ چشم من نیاید در نظر
از بلندی اخترم روشن نتابد در نظر
(غالب)

غالب کا مزار

کوکبم را در عدم اوج قبولی بوده است — شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن
مطرب از شعرم بہ ہر بزمے کہ خواہد زد نوا — چاکہا انداز جیب پیرہن خواہد شدن
حرف حرفم در مذاق فتنہ جا خواہد گرفت — دستگاہ ناز شیخ و برہمن خواہد شدن

(غالب)

مرزا غالب

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا

تھا سراپا رُوح تُو۔ بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اُس حُسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندّی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار

تیرے فردوسِ تخیّل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جُنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریّا رفعتِ پرواز پر

شاہدِ مضموں تصدّق ہی ترے انداز پر خندہ زن ہی غنچۂ دلّی گُلِ شیراز پر

آہ تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے

گُلشنِ وِیمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے،

لُطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں ہو تخیّل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہمنشیں

ہائے اب کیا ہوگئی ہندوستاں کی سرزمیں آہ اے نظّارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں

گیسوئے اُردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہی

شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہی

اے جہان آباد اے گہوارۂ علم و ہُنر ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در

ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر یُوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گُہر

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟

تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہی؟

اقبال

نذیر احمد کی کہانی

کچھ افتخار عالم اور کچھ مرزا فرحت کی زبانی

تمہید

مولانا مولوی نذیر احمد مرحوم کے واقعات زندگی کے قلمبند کرنے میں جس تسامح اور تساہل سے کام لیا گیا ہے اس کی نظیر شاید ہی ملے گی۔ خصوصاً مرزا فرحت صاحب سے جن کا دعویٰ ہے کہ "انشاء اللہ واقعات کے اظہار میں مجھ سے غلطی نہ ہوگی! اور یہ کہ "دیدہ و دانستہ کوئی واقعہ بڑھایا گیا ہے نہ گھٹایا گیا ہے نہ کسی واقعے میں جھوٹی تاویلیں کی گئی ہیں اور نہ باتیں بنائی گئی ہیں"۔ مولانا کی زندگی کے واقعات لکھنے میں اکثر جگہ فاش غلطیوں کا سرزد ہو جانا تعجب خیز امر ہے۔ مرحوم اگر کوئی ایسی ویسی شہرت کے شخص ہوتے تو مضائقہ نہ تھا۔ لیکن اردو زبان کے ایک نامور مصنف، ایک کثیر التصانیف مربی و محسن، ایک اپنی علیحدہ طرز تحریر کے موجد کی سوانح نگاری میں اس قدر تسامح بزرگوں کے حالات زندگی کی بے قدری کی ایک بیّن مثال ہے۔

مولوی افتخار عالم صاحب "حیاۃ النذیر" کے حصہ ہفتم کے اخیر میں لکھتے ہیں کہ "خدا کا شکر ہے کہ پانسو ساٹھ میدان صفحات طے کرکے راقم کے قلم سے یہ آخری سطریں ٹپک رہی ہیں"۔ لیکن ان میں ساڑھے چار سو سے زیادہ صفحات پر مولانا کی تصانیف کا اقتباس پھیلا ہوا ہے۔ اس سے بہتر تو یہ ہوتا کہ مولوی صاحب کلیاتِ نثرِ نذیر شائع کر دیتے اس وقت آپ اور زیادہ شکر گزاری کے ساتھ اطمینان کی لمبی سانس لیکر کہہ سکتے تھے کہ "تین ہزار سے زیادہ میدان صفحات طے کرکے راقم کے قلم سے یہ آخری سطریں ٹپک رہی ہیں"۔ ؎ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔ مولوی صاحب خود ہی اپنی تصنیف پر غور فرمائیں۔ ع ہم اگر عرض کرینگے تو شکایت ہوگی۔ آپ نے مولانا کے متعلق جو واقعات لکھے ہیں اُن کی صداقت کا حال اصل مضمون میں قارئین کے پیش نظر کر دیا گیا ہے لیکن اس مقام پر اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ مولوی صاحب نے اپنی تصنیف میں اکثر ضروری اور معرکہ آرا واقعات ضمیمہ آخر کے خلاف لکھے ہیں یا خود ہی اپنے ایک قول کی تردید دوسرے قول سے کی ہے

یعنی آپکے اقوال مجموعۂ اضداد بن گئے ہیں۔ کیا مولوی صاحب اس اختلاف بیانی کو محسوس نہیں کر سکے یا اپنے قول کے مقابلہ میں دوسرے کسی کے قول کو بے حقیقت سمجھ بیٹھے، یا آپ کی نظر اس نشتر گرگی پر نہیں پڑی یا عمداً مسودے کو کاٹنے بنانے، لکھنے مٹانے کی زحمت سے گھبرا کر ہرچہ بادا باد اس کشتی کو دریائے ادب میں ڈال دیا ؛

میں مولوی افتخار صاحب کو اسی کتاب کے ذریعہ سے پہچانتا ہوں۔ اور آپ کی کتاب پر جن برگزیدہ ہستیوں نے تنقیدیں لکھی ہیں اُن کے وسیلہ سے ظاہر ہے کہ بہت ہی مشہور و معروف بزرگ ہیں۔ آپ کی اس تصنیف سے پہلے کی شہرت تنقید نگاروں کی ناقدانہ نظروں پر پردے کا کام کر گئی ہوگی۔ اور انہوں نے نیک نیتی اور حسنِ ظن سے کتاب پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈال کر تبصرے لکھ دیئے ہونگے ورنہ مولوی عبد الحق صاحب (علیگ) جیسے فخرِ روزگار، موشگاف، باریک بیں اور محتاط ناقد کے قلم سے یہ عبارت نہ نکلتی کہ " جس محنت، جانفشانی اور لگاتار کوشش سے اس فرض کو انجام دیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے سوانحعمری کا حق ادا کیا ہے "۔

میں نے مولوی نذیر احمد مرحوم کی آنکھیں نہیں دیکھیں اور نہ میں رہنے والا اُن کا جامع مسجد کے نیچے۔ میری معلومات کے ماخذ کلیتہً افتخار صاحب کی تصنیف اور فرحت صاحب کا مضمون ہیں۔ ان بزرگوں کا اُردو داں طبقہ پر عموماً اور نذیر احمد مرحوم کے قدردانوں پر خصوصاً بے حد احسان ہے۔ اگرچہ یہ تحریریں رطب و یابس سے بھری ہوئی ہیں جیسا کہ آزاد مرحوم نے "آبِ حیات" میں میر تقی میر کے حالات لکھے ہیں۔ تاہم اس لحاظ سے کہ اربابِ نظر کے لئے خذ ما صفا دع ما کدر کی گنجائش باقی ہے قابلِ تحسین ہیں ۔

مجھے سب سے زیادہ شکایت مولوی فرحت صاحب سے ہے۔ آپ کا مضمون حیاۃ النذیر کے برسوں بعد لکھا گیا ہے تاہم چند جزئی باتوں کے سوا اس میں کسی نئی بات کا اضافہ نہیں ہوا وہی غلط روایتیں جو حیاۃ النذیر میں موجود ہیں نئے لباس میں پیش کر دی گئی ہیں۔ اگر مرزا صاحب مضمون نویسی کے آگے ان تحریروں پر بھی ایک نظر ڈال لیتے جو مولانا کے متعلق ہیں پھر اُن کی بے ربطیوں اور بے عنوانیوں کو ظاہر فرماتے تو دنیائے ادب آپ کی کس قدر ممنون ہوتی ؎

کیا کیا خضر نے سکندر سے   اب کسے رہنما کرے کوئی

مولوی صاحب کا اتنا فرما دینا کہ " جس موقع پر جو کچھ دیکھا اس کو جُوں کا تُوں لکھ دونگا " واقعات کی صداقت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ جوں کا توں لکھ دینے کی بجائے آپ اجتہاد سے کام لیتے تو ہم دُور اُفتادوں کی رہنمائی ہوتی ؛

مجھے اُمید ہے کہ مولوی افتخار عالم صاحب، مولوی فرحت اللہ بیگ صاحب، مولوی راشد الخیری صاحب، اور دیگر اہلِ بینش حضرات اس مضمون کو پڑھینگے اور مولانا کی سوانحعمری پر نظرِ ثانی فرما کر مجھ عقیدتمند کی تسکین فرمائیں گے ؛

ابتدائی حالات

"مولوی نذیر احمد صاحب کے نانا قاضی غلام شاہ بڑے آسودہ حال اور خوش گزراں تھے۔ اور مولوی سعادت علی کو موضع رہڑ میں خانہ داماد بنا کر رکھا تھا۔ قاضی صاحب کے بعد جائداد پر خاندان میں نزاع ہوگئی۔ اور مولوی نذیر احمد صاحب کے والد کو پھر بجنور آنا پڑا۔ اگرچہ مولانا مغفور کے ددھیال میں سلطنت دہلی کی طرف سے بڑی بڑی معافیاں تھیں مگر وہ ۱۸۳۷ء کے آئین نہم کی رو سے ضبط ہو گئیں۔" (حیاۃ النذیر ضمیمہ آخر ۸ مئی پیسہ اخبار)

"مولوی سعادت علی صاحب نذیر احمد کے نانا کے انتقال کے بعد خاص بجنور میں اپنے آبائی مکان میں آکر رہنے لگے۔ اس وقت مولانا کی عمر کوئی چار برس کی ہوگی عشرۃ اور توکّل دو ملازم اُن کے ماں باپ کیساتھ آئے تھے۔" (حیاۃ النذیر حصہ اول ص۹)

"ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے جو اوسط درجے کی استعداد رکھتے تھے حاصل کی۔ اس کے بعد مولوی نصر اللہ ڈپٹی کلکٹر بجنور جنہیں مولوی صاحب کے خاندان سے خاص الفت تھی مولوی صاحب کو تعلیم دینے لگے۔ مولوی نصر اللہ کے بجنور سے مظفر نگر تبدیل ہونے پر وہ اُنہی کے ساتھ رہے مگر ابھی تعلیم بھی پوری نہ ہونے پائی تھی کہ اُن کے والد نے انہیں دہلی بلا لیا۔" (ضمیمہ آخر پیسہ اخبار ۸ مئی)

"نذیر احمد مرحوم کا آبائی وطن بجنور تھا لیکن ننھیال دہلی میں تھی اسی تعلّق سے اُن کے والد مولوی سعادت علی بجنور سے آکر دہلی میں رہنے لگے۔ یہ ایک مسجد میں رہا کرتے تھے اور مسجد کی خدمت ہی اُن کی وجہ معاش تھی۔" (سینٹ سٹیفنز کالج میگزین ضمیمہ آخر حیاۃ النذیر)

"مولوی سعادت علی صاحب مرحوم اپنے صاحبزادوں کو دیکھنے اور خانصاحب سے ملنے مظفر نگر آئے تو خانصاحب نے ان سے فرمایا کہ "اب اپنے بچوں کو دلّی لے جاکر پڑھواؤ۔ اوّل تو میں عدیم الفرصت ہوں دوسرے ان کے پڑھانے کے لئے مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور مجھ کو اتنی فرصت نہیں۔" آخر کار مولوی سعادت علی صاحب اپنے دونوں صاحبزادوں کو دہلی لیکر پہنچے اور دونوں کو آپ نے ایک اُستاد کے حوالے کیا۔" (حیاۃ النذیر ص۱۵)

محاکمہ پیسہ اخبار کے اس جملے سے کہ "ان کے والد نے انہیں دہلی بلا لیا۔" متبادر ہوتا ہے کہ مولوی سعادت علی کا قیام ان دنوں دہلی میں تھا لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ قیام کس ضمن میں تھا۔ سینٹ سٹیفنز کالج میگزین لکھتا ہے کہ "مولانا کی ننھیال دہلی میں تھی"۔ بلحاظ تقدیم زمانی ممکن ہے کہ ان دونوں کے مغالطے کا باعث رسالہ انتخاب لاجواب ۲۵ جولائی ۱۹۰۶ء بنا ہو۔ کیونکہ مذکور اخبار مولانا کی ننھیال دلی بتاتا ہے۔ صاحب حیاۃ النذیر کے بیان سے معاملہ سلجھ جاتا ہے کہ "مولانا کے والد مولانا اور ان کے بھائی کو اعلےٰ تعلیم دلانے کی غرض سے دلی لے آئے اور مولوی عبد الخالق صاحب کی

خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے انہیں پنجابی کٹڑے کی وسیع مسجد میں رہنے کی ہدایت فرمائی "۔

قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی سعادت علی صاحب اپنے فرزندوں کی پڑھائی کا خاطر خواہ انتظام ہونے تک دلی میں ٹھہرے رہے۔ کیونکہ مولانا ریاضی میں کمزور تھے تو مولوی صاحب کو بہت فکر ہوئی تھی اور آپ مولانا کو لے کر مولوی قادر علی صاحب کے پاس پہنچے تھے۔ صلا ۳۴ " مولوی سعادت علی صاحب نے بعارضہ سل و دق بجنور میں انتقال کیا" صٹ

تعلیم و تربیت

" نو برس کی عمر تک بدر بزرگوار نے بیٹے کی لوح دل پر اخلاق محسنی کے پھول بوٹوں کی بیل چڑھائی۔ مولوی نصر اللہ خانصاحب کے فیضِ صحبت نے ان پھولوں میں وہ خوشبو پیدا کی کہ دماغ معطر ہو کر رہ گیا" صلا

" مولانا نے فارسی کی متداول کتابیں بیٹے کو خود پڑھائیں انہیں کتابوں میں مینا بازار، پنج رقعہ اور سہ نثر ظہوری بھی شامل تھیں جن کو امام بخش صہبائی کی شرحوں کے ساتھ پڑھا تھا۔ فارسی کے ساتھ مولوی سعادت علی صاحب نے عربی بھی شروع کرا دی تھی۔ ہمارے مولانا برابر نو برس کی عمر تک اپنے والد کی نگرانی میں تعلیم پاتے رہے۔ بیٹے کی نو برس کی عمر تھی کہ باپ نے اپنی تعلیم سے علیحدہ کر کے مولوی نصر اللہ خاں کے فیض تربیت میں داخل کیا۔ غرض ہمارے مولانا وہاں پانچ برس کے عرصہ میں نحو عربی میں شرح ملّا تک اور منطق میں تہذیب اور میر قطبی اور فلسفے میں میبذی تک پڑھا" صلا

نو برس تک مولانا والد سے پڑھتے رہے پھر پانچ برس مولوی نصر اللہ خاں صاحب سے عربی پڑھی اس سے صاف ظاہر ہے کہ دہلی جاتے وقت مولانا کی عمر چودہ پندرہ برس کی تھی۔ اس کی تصدیق "عصمت" بابت مئی ۱۹۱۶ء سے بھی ہوتی ہے کہ " استاد مرحوم کا وطن گو ضلع بجنور تھا اور دلی میں جس وقت تشریف لائے تو سن پندرہ سولہ کے قریب تھا زبان کو جو ماں کی گود سے لینا تھا لے چکی تھی۔ مگر مولانائے مرحوم نے دلی کی زبان اس طرح حاصل کی کہ اردوئے معلیٰ کا مزہ آگیا"۔ اب ایک سوال یہ ہے کہ مولانا نے پنجابی کٹڑے کی مسجد میں کتنے دنوں تعلیم پائی۔ صاحب حیاۃ النذیر نے اس مدت کی تعیین نہیں کی۔ اٹھارھویں صفحہ پر مولانا کے ایک لکچر کا اقتباس دیا گیا ہے کہ

" مجھ کو تو کسی مولوی نے آپ پڑھایا اور نہ پڑھنے دیا۔ آپ نہیں پڑھایا تو خیر ایک بات ہے شکایت تو اس کی ہے کہ پڑھنے بھی نہیں دیا۔ وہ اس طرح کہ مجھ جیسے کم عمر لڑکے مولویوں کے زنان خانے میں جاتے تھے اور ان سے خدمتگاری کا کام لیا جاتا تھا۔ معاوضہ اس کا کہ مسجد میں رہتے ہیں۔ پس مسجد اُن کے لئے بھٹیاری کی سرائے تھی اور اس کا کرایہ مولویوں اور مولونیوں کی خدمت۔ جس جس پہلو سے میں اس وقت کو یاد کرتا ہوں جب میں پنجابی کٹڑے کی مسجد میں تھا تو پاتا ہوں کہ میں

ساری عمر میں بدترین وقت تھا - اور اگر اس کو چار پانچ برس کا بھی امتداد ہوتو میں دین و دنیا دونوں طرف سے تباہ ہولیا تھا۔" صفحہ ۱

یعنی مولانا کو وہاں رہتے تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا کہ خوش بختی سے کالج میں داخل کر لئے گئے ورنہ اس افراتفری کی چار پانچ برس کی مدت میں وہ تباہ ہو جاتے ۔

مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کے مضمون "نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی" میں لکھا ہے کہ مولانا مسجد میں چار برس رہے اس مضمون کی ادبیت کی داد دینا اہل زبان کا حصہ ہے مگر اس کی تاریخی حیثیت بہت ہی مشکوک ہے۔ آئندہ چل کر میں اس پر بحث کرونگا ۔

غرض نام خدا مولانا کی عمر چودہ پندرہ برس کی اور مولوی علی احمد صاحب کی عمر سولہ سترہ برس کی تھی - بڑے بھائی صاحب کی عمر کا اندازہ مولانا کے اس جملے سے ہوتا ہے کہ "کالج کی تعلیم کی ابتدا تھی کہ وطن میں والد کا انتقال ہوگیا - دو ڈھائی برس کی چھوٹائی بڑائی سے دو متقارب العمر لڑکوں کے وظیفوں پر آٹھ دس آدمیوں کی خانہ داری کا بوجھ پڑنا حقیقت میں مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑنا تھا۔" صفحہ ۲ غرض پندرہ پندرہ سولہ سولہ برس کے دو متوسط قد کے تنومند، ورزشی جسم والے، چوڑے چکلے لڑکوں کو افتخار صاحب کا کم سن بچے کہہ کر یاد کرنا کوئی وقیع اسلوب بیان نہیں - چنانچہ فرماتے ہیں کہ " ہمارے مولانا اور مولوی علی احمد صاحب دونوں چونکہ کم سن تھے اس لئے بلا تکلف مولویوں کے زنان خانوں میں آتے جاتے تھے۔" صفحہ ۱ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ " مولانا چونکہ کم سن بچہ تھے مولویوں کے زنان خانے میں آیا جایا کرتے تھے۔" صفحہ ۲ اور پھر دہلی کالج کے تقسیم اسناد و انعامات کے جلسے کے موقع پر ایک پندرہ برس کے شریف اور غیور لڑکے کو لوگوں کی ٹانگوں میں سے گھسانا اور پھر سنگ مرمر کے فرش پر سے پھسلا کر گرانا اور پھر مولوی مفتی صدر الدین صاحب کے سامنے مولانا مضحکہ خیز طرز بیان ہے۔

کیا مفتی صدر الدین صاحب نے مولانا کا امتحان لیا؟

اس ضمن میں ایک بات نظر میں رکھیں کہ مولانا نے افتخار عالم صاحب کی روایت کے مطابق کون کون سی کتابیں کس کس سے پڑھیں -

اساتذہ	کتب
مولوی سعادت علی صاحب سے	قاعدہ بغدادی ، قرآن مجید
دیسی مکتب کے پرانے کھوسٹ میاں جی سے	خالق باری، محمود نامہ، کریما ، مامقیماں، دستور الصبیان

اساتذہ	کتب
مولوی سعادت علی صاحب سے دوبارہ	مینا بازار، پنج رقعہ، سہ نثر ظہوری مع شروح امام بخش صہبائی، اور عربی کی ابتدائی کتابیں ۔
مولوی نصراللہ خاں صاحب سے دہلی کالج میں	نحو میں شرح مُلّا تک، اور منطق میں تہذیب اور میر قطبی، اور فلسفہ میں میبذی تک پڑھا، علم ادب، علم معانی، علم فرائض اور ریاضی کی تکمیل کی، دیوان متنبی، عقائد سبعہ معلقہ، تاریخ یمینی، مقامات حریری، دیوان حماسہ، وغیرہ وغیرہ۔ کالج کے نصاب میں یہ کتابیں داخل تھیں۔ (حیاۃ النذیر حصہ اوّل)

لیکن مولوی فرحت صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا نے قرآن شریف سے شروع کرکے سبعہ معلقہ تک چار برس میں مسجد کے ملاؤں سے پڑھا اور مفتی صدرالدین صاحب نے اسی میں امتحان لیا۔ عمرو ابن کلثوم کے اس شعر کی ترکیب اور معنی پوچھے[۵]

ابا ہند فلا تعجل علینا — وانظرنا نخبرک الیقینا

مولوی افتخار صاحب کہتے ہیں کہ مفتی صاحب نے شرح مُلّا میں بحث مفعول لہٗ پڑھوائی اور ابوالفضل کے دفتر دوم سے کچھ عبارت سُنی۔ خاص اس مقام پر افتخار صاحب کے بیان میں بے حد تسلسل ہے اور مرزا صاحب کا بیان بھی کچھ کم مسلسل نہیں۔ افتخار صاحب کے بیان سے ظاہر ہے کہ مولانا دلّی آنے کے چند مہینوں بعد کالج میں داخل ہو گئے۔ کیونکہ آپ نے انہیں کتابوں کے نام لئے ہیں جنہیں مولانا نے ڈپٹی نصراللہ خاں صاحب سے پڑھا تھا +

فرحت اور افتخار صاحبوں نے کتابوں کے نام ان کی بحثوں، دفتروں اور شعروں کے حوالوں کے ساتھ اس قدر صفائی کے ساتھ پیش کئے ہیں کہ سچ اور جھوٹ میں تمیز نہیں ہو سکتی +

معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت محض فرضی ہے۔ مولانا کا کسی نے امتحان نہیں لیا۔ بلکہ مولوی مملوک علی صاحب کی سفارش اور مولوی عبدالخالق صاحب اور مولوی سعادت علی صاحب کی رضامندی سے آپ کالج میں داخل ہوئے ورنہ کتابوں کے ناموں اور عمر اور امتحان سے لیکر داخلہ تک کی مدت میں دو سوانح نگاروں میں اس قدر زمین آسمان کا فرق نہ پڑتا +

کالج میں داخل ہونے کے متعلق واقعات کا انکشاف

سینٹ سٹیفنز کالج میگزین نے ایک پتے کی بات لکھی ہے۔ جس سے یہ عقدہ بآسانی حل ہو جاتا ہے لیکن کسی دوسرے

نے اس کا اشارۃً کنایۃً بھی تذکرہ نہیں کیا کیونکہ اس کے ہوتے مولانا کے متعلق "من گھڑت واقعات کی عمارت ڈھے پڑتی ہے۔ لکھا ہے کہ "مولانا کو آرزو ہوئی کہ کوئی اعلےٰ سبق مولوی مملوک علی صاحب کے یہاں شروع ہو جاتے جو اس وقت شہر میں بڑے پایئے کے عالم تھے اور گورنمنٹ کالج دہلی میں عربی کے پروفیسر بھی۔ خود کہا کرتے تھے کہ مولوی صاحب کو فرصت نہ تھی میں نے باصرار التجا کی تو فرمایا کہ اچھا جس وقت ہم مدرسے جاتے ہیں تو آجایا کرو۔ راستے میں چلتے چلتے جو پڑھ سکو گے پڑھا دیا کریں گے ..... مولوی مملوک علی پینس میں سوار ہو کر کالج کو چلتے یہ کتاب لے کر ساتھ ہو لیتے۔ پینس کے ساتھ دوڑتے، ٹھوکریں کھاتے، گرتے، مگر واہ رے شوق اس پر بھی سبق ہو جانے کو دولت سمجھتے۔ مولوی مملوک علی کی ہمرکابی میں کالج کا راستہ دیکھ کر کچھ دنوں کے بعد ان کے بھی دل میں خیال آیا کہ آؤ کالج میں داخل ہو جائیں۔ باصرار تمام والد صاحب سے اجازت ملی اور یہ کالج میں داخل ہو گئے۔"

افتخار صاحب فرماتے ہیں کہ مسجد کے ملاؤں کو دہلی کالج اور اس کے طلبہ سے للّٰہی بغض تھا ثبوت کے طور پر لکھتے ہیں کہ "پرنسپل نے مولانا کی جسمانی اور دماغی ساخت پر نظر ڈالی تو ذہین پایا اور کہا کہ اب تو ایک مہینے کی چھٹی ہو گی ایک مہینے بعد آنا تو تمہارا نام لکھ لیا جائے گا..... اس واقعہ کی خبر جب پنجابی کٹڑے کی مسجد کے مولویوں کو پہنچی تو انہوں نے مولانا کو مسجد سے نکال باہر کیا۔ ہمارے مولانا مسجد سے چلے آئے اور اسی محلے میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی کرایہ پر لی وہاں رہنے لگے" صفحہ ۲۔

افتخار صاحب نے مولوی مملوک علی صاحب کا ذکر غالباً اس اعتراض سے بچنے کے لئے نہیں کیا ہو گا کہ جو طبقہ اتنی بات کا بھی روادار نہیں تھا کہ اُن کے یہاں کا ایک طالب العلم کالج میں داخل ہو کر عزت کے ساتھ پڑھتا اور وظیفہ پاتا رہے وہ اس بات کا کب روادار ہو سکتا تھا کہ ایک طالب العلم مسجد کی روٹیاں کھا کر انہیں ہضم کرنے کے لئے کالج کے ایک مولوی کی پینس کے ساتھ ساتھ دوڑتا پھرے۔ اگر افتخار صاحب کا مذکورہ بالا بیان سچا ہے تو میری دانست میں مولانا کا مسجد سے اخراج کالج میں داخل ہونے سے پیشتر ہونا چاہئے تھا۔

اسی واقعہ کو مولوی فرحت صاحب یوں بیان کرتے ہیں "ہم وہاں سے نکل اپنے گھر آئے۔ مولوی صاحب سے کچھ نہ کہا۔ کوئی سات آٹھ روز کے بعد کالج کا چپراسی مولوی صاحب کے پاس ایک کاغذ دے گیا اس میں لکھا تھا کہ "نذیر احمد کو کالج میں داخل کرنے کی اجازت ہو گئی ہے۔ کل سے آپ اس کو کالج میں آنے کی ہدایت کر دیجئے۔ اس کا وظیفہ بھی ہو گیا ہے۔ چپراسی تو یہ حکم دے چلتا بنا۔ مولوی صاحب نے مجھ کو بلایا۔ خط دکھایا۔ پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا جب ذرا سختی کی تو تمام واقعہ بیان کیا وہ بہت خوش ہوئے اور دوسرے روز لے جا کر میرا ہاتھ پرنسپل صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔"

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مولانا اپنے والد اور رؤیا خسر دونوں کی اجازت سے کالج میں داخل ہوئے تھے فقط اجازت
نہیں بلکہ خود مولوی صاحب نے لے جا کر مولانا کا ہاتھ پرنسپل کے ہاتھ میں دے دیا۔ افتخار صاحب کا بیان کہ
...یوں نے مولانا کو مسجد سے نکال باہر کیا۔ شاید اس زمانے کے مولویوں کی کوتاہ خیالی اور تعصب مذہبی کا ایک ایسا
...ن ہے جو غلو کا درجہ رکھتا ہے۔ افتخار صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا نے ایک مہینے بعد جا کر خود بخود کالج میں اپنا نام
...خل کرالیا۔ مولوی فرحت صاحب لکھتے ہیں کہ کوئی سات آٹھ روز کے بعد مولانا کی طلبی ہوئی ؎

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا

جب کبھی میں اس اختلاف بیانی کو دیکھتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ افتخار صاحب اور فرحت صاحب کی راست گو،
...غرض اور مستند ہستیوں پر نظر ڈالتا ہوں تو رہ رہ کر اندیشہ ہوتا ہے کہ کیا مولانا مرحوم بچپن کے زمانے میں اُن کے حافظہ
...غیر معمولی قوت کا لوگوں کو معترف بنانے کے لئے اس قسم کے واقعات گھڑ گھڑ کر سنا دیا کرتے تھے۔ چونکہ واقعہ فرضی
...ا جزئیات کی پابندی نہ ہو سکی کبھی کچھ کہہ دیا اور کبھی کچھ۔ اس پر طرہ یہ کہ مولانا نے جس زمانے میں اس واقعے کا ذکر کیا
...ہے اس وقت نہ مفتی صدر الدین صاحب زندہ تھے نہ مولوی سعادت علی صاحب نہ مولوی عبد الخالق صاحب نہ پنجابی
...ٹڑے کی مسجد تھی نہ کالج کا چپراسی نہ کوئی گواہ نہ کوئی شاہد پھر تصدیق ہو تو کیونکر ہو +

پھر بھی فرحت صاحب پر بحیثیت ایک سوانح نگار اور وہ بھی سب سے آخری سوانح نگار کے یہ الزام عاید ہوتا ہے کہ انہوں
نے افتخار صاحب کے بیان کی تردید کیوں نہیں کی اور اپنے قول کو مستند بنانے کے لئے شواہد کیوں نہیں پیش کئے +

مولانا کا سنِ ولادت

ہم اُوپر لکھ آئے ہیں کہ کالج میں داخلہ کے وقت یعنی ۱۸۴۵ء میں مولانا کی عمر بقول مصنف عصمت پندرہ سولہ برس
...ی اور بقول افتخار صاحب چودہ پندرہ برس کی تھی تو اس حساب سے مولانا کا سال پیدائش ۱۸۳۱-۱۸۳۰ء ہونا چاہئے ۱۸۲۰
سے ۱۹۱۲ تک بیاسی برس ہوئے۔ اقوال ذیل ملاحظہ ہوں :-

حیاۃ النذیر

ولادت ۲۳ جمادی الاوّل ۱۲۵۲ھ مطابق ۶ دسمبر ۱۸۳۶ء
وفات ۵ جمادی الاوّل ۱۳۳۰ھ مطابق ۳ مئی ۱۹۱۲ء
یعنی مولانا سال شمسی کے حساب سے پچھتر برس چار مہینے اٹھائیس دن اور
سال قمری کے حساب سے آٹھ دن کم اٹھتر برس بقید حیات رہے +

کرزن گزٹ	آپ کی عمر اگرچہ اٹھہتر سال کی تھی مگر قویٰ بہت مضبوط تھے ۔
البشیر	اُن کی عمر اسّی برس کے قریب تھی ۔
مسلم گزٹ لکھنؤ	مولانا کی عمر اس وقت غالبًا اسّی سے متجاوز ہوچکی تھی ۔
پیسہ اخبار	مولوی صاحب کا سن بیاسی[۸۲] برس سے کم نہ تھا (یعنی سنہ ولادت ۱۸۳۰ء ہوا - ناقد)

(از سید احمد مرحوم مصنف فرہنگ آصفیہ)

ان اقوال کے اختلاف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا سنہ ولادت اٹھارہ سو تیس اور چھتیس کے درمیان تھا لیکن رسالہ انتخاب لاجواب نے ۲۵ر جولائی ۱۹۰۶ء کے پرچے میں بسلسلہ مشاہیر عہد آپ کے جو حالات شائع کئے ہیں ان میں مندرج ہے کہ مولانا کی ولادت کا زمانہ بظن غالب ستمبر ۱۸۳۱ء ہے اور خود افتخار صاحب نے مولانا کی زندگی کے جن مرحلوں کو گنایا ہے ان کے اعتبار سے بھی یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے ۔ اگر سنہ محقق نہ ہوتا تو مولوی سید احمد مرحوم کو مولانا سے کیا خدا واسطے کا بَیر تھا جو اتنے وثوق سے کہتے ہیں کہ "مولانا کا سن بیاسی برس سے کم نہ تھا"

دروغ مصلحت آمیز کی بنا پر خود مولانا نے اپنی صحیح عمر کا پتہ دیا ہے یعنی اس لئے کہ پوری تنخواہ میں پنشن کا گھن جلد نہ لگ جائے ۔ ڈپٹی کلکٹری کے لئے سرکار میں نقشہ بھیجا گیا تو اس میں ولادت ۱۲ر ستمبر ۱۸۳۳ء درج کرائی ۔ گویا مولانا نے اپنی عمر تین برس کی گھٹا کر بتائی ۔ اب رہا افتخار صاحب کا یہ فرمانا کہ مولانا نے اس عام قاعدے کے برعکس کیا اور اپنی عمر تین برس کی بڑھا کر بتائی اور اس کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کرنا کہ ڈپٹی کلکٹری کا نقشہ جانے کے وقت مولانا بے ریش و بروت لڑکے تھے کہانتک صداقت پر مبنی ہے خود قارئین فیصلہ کریں ۔

مولانا کو ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹری ملی یعنی کالج سے نکلنے (۱۸۵۴ء) کے نو برس بعد ۔ اس وقت افتخار عالم صاحب نے جو سنہ ولادت قرار دیا ہے اس کے حساب سے مولانا کی عمر ستائیس برس کی تھی لیکن طالب علمی کے مختلف مدارج کی تفصیل کے اعتبار سے مولانا کی عمر بتیس برس کی تھی (والد کے پاس نو برس ، مولوی نصر اللہ خان صاحب کے فیض تربیت میں پانچ برس ، دہلی کالج میں نو برس ، کالج سے نکلنے کے بعد ڈپٹی کلکٹری تک نو برس ، جملہ بتیس برس) اب مولانا کی ریش و بروت پر بھی ایک نظر ڈال لیں "ڈاڑھی زنخدان پوش ، رخساروں پر چھدرے بال ، مونچھیں بڑی اور بھری ہوئیں" (حیاۃ النذیر حصہ چہارم حلیہ) ایک اور بات نظر میں ہونی چاہیئے کہ میاں بشیر کی ولادت ۱۴ر اگست ۱۸۶۱ء میں ہوئی یعنی مولانا جس وقت ڈپٹی کلکٹر بنے ہیں اس وقت آپ کے یہاں دو ڈھائی برس کا ایک لڑکا اور اس سے بڑی عمر کی دو لڑکیاں تھیں ۔ بتیس برس کی عمر والے تین بچوں کے باپ کو "بے ریش و بروت لڑکا" لکھنا سید افتخار عالم

صاحب جیسے ہی اہل الرائے حضرات کے لئے زیبا ہے۔ میں تو اسے مولانا کی توہین سمجھتا ہوں +

کالج میں داخل ہونے کے وقت مولانا کی عمر کیا تھی؟

اب دیکھنا چاہئے کہ مولوی افتخار عالم اور مولوی فرحت صاحبوں نے کالج میں داخل ہونے کے وقت مولانا کی عمر خود اپنی یا مولانا کی زبانی کیا بتائی ہے۔

مولوی افتخار صاحب "باپ کے انتقال کے وقت بیٹے نے عمر کے تیرہ مرحلے طے کر کے چودھویں سال میں قدم رکھا" صہ۲۱

مولوی نذیر احمد صاحب "کالج کی تعلیم کی ابتدا تھی کہ وطن میں والد کا انتقال ہو گیا"

مولوی فرحت صاحب "بھئی ہم بہت غریب لوگ تھے نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا، تعلیم کا شوق تھا اس لئے پھرتا پھراتا پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں آکر ٹھہر گیا۔ یہاں کے مولوی صاحب بڑے عالم تھے۔ اُن سے پڑھتا اور توکل پر گزارہ کرتا مولوی صاحب کے دوچار شاگرد اور بھی تھے انہیں بھی پڑھاتے مجھے بھی پڑھاتے۔ رات دن پڑھنے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ تھوڑے سے دنوں میں کلام مجید پڑھ کر میں نے ادب پڑھنا شروع کیا۔ چار برس میں مُعلّقات پڑھنے لگا۔ گو میری عمر بارہ برس تھی مگر قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے نو دس برس کا معلوم ہوتا تھا"

مولانا کے کلام سے ظاہر ہے کہ آپ کے والد کا انتقال ۱۸۴۵ء کے بعد ہوا۔ افتخار صاحب نے جو منشی مہاراج کی عنایت اور مولوی علی احمد صاحب کی تصدیق سے سال ولادت ۱۸۳۶ء قرار دیا ہے۔ اس حساب سے مولانا نو برس کی عمر میں کالج میں داخل ہوئے۔ مولوی نصر اللہ خاں صاحب کی فیض صحبت کی مدت یعنی پانچ برس کہاں کھپ گئے ؎

اٹکا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں   لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

مرزا صاحب نے اپنے مضمون کا رعب جمانے کے لئے ابتدا میں بہت سے خوش مزہ اور بے مزہ جملے لکھے ہیں مثلاً "جس موقع پر جو کچھ سُنا یا دیکھا اس کو جوں کا توں لکھ دونگا...... واقعات کے اظہار میں مجھ سے غلطی نہ ہوگی.... اب رہا سچ یا جھوٹ تو مجھے اس کی پروا نہیں وغیرہ وغیرہ" آپ کا مضمون مرزا غالب کے اس شعر ؎

نہ ستایش کی تمنا نہ صِلے کی پروا   گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

کا نمونہ ہے +

سوانح نگاروں نے مولانا کے جن حالات کو اوروں کے لئے سبق آموز اور عبرت انگیز سمجھ کر لکھا ہے انہیں

اس بے توجہی اور بے اعتنائی کے ساتھ لکھنا کہ اس کی حیثیت ہنسنے اور ہنسانے کے ایک ذریعہ سے زیادہ نہ ہو سوانح نگاروں کی ذمہ داریوں سے انحراف ہے۔

افتخار عالم صاحب نے جو سنہ ولادت قرار دیا ہے وہ محض بناوٹی ہی نہیں بلکہ اس کے صحیح مان لینے میں بہت سی قباحتیں اور احسان فراموشیاں بھی ہیں۔ اس لئے "انتخاب لاجواب" کا سن ۱۸۳۱ء سب سے زیادہ مستند ہے۔ مولانا کے حالات زندگی کی تفصیل مولوی بشیر الدین احمد صاحب کے بعد مولانا راشد الخیری سے زیادہ کون ہے جو بیان کر سکے۔ عصمت بابت مئی ۱۹۱۲ء میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "پنجابی کٹرہ جو دلّی نے ریلوے اسٹیشن پر اس طرح قربان کیا کہ آج اس کا نام و نشان تک نہیں میرے آبا و اجداد کا مسکن تھا اور پنجابی کٹڑے کی وہ مسجد جس میں میرے جد امجد مولوی عبد الخالق صاحب حدیث کا درس دیتے تھے طلبہ کا دار القیام ۱۸۴۵ء یا اس کے لگ بھگ کا ذکر ہے کہ علامہ موصوف تحصیل علم کی غرض سے اس مسجد میں داخل ہوتے"

اڈیٹر عصمت نے مولانا کے دلی آنے اور کالج میں داخل ہونے کا زمانہ قریب قریب ایک ہی بتایا ہے۔ افتخار عالم صاحب کے حساب سے دلی آنے کے وقت مولانا کی عمر چودہ برس کی تھی تو داخلہ (۱۸۴۵ء) کی مناسبت سے سنہ ولادت ۱۸۳۱ء ہوا۔

مولانا کی شادی کے اصل واقعات کیا ہیں؟

مولانا کی سوانح عمری میں مولوی افتخار عالم اور مولوی فرحت صاحبوں کی ایک اور اہم اختلاف بیانی:-

افتخار صاحب "مولوی عبد القادر صاحب مولوی عبد الخالق صاحب کے بیٹے تھے خدا نے اُن کو ایک بیٹی دی تھی جو اس وقت پانچ برس کی تھی۔ ہمارے مولانا نذیر احمد صاحب اس لڑکی کو لادے لادے پھرا کرتے تھے۔ بڑی ہونے کے بعد اسی لڑکی سے ہمارے مولانا کا عقد ہوا"

مرزا فرحت صاحب "مسجد کے پاس ہی عبد الخالق صاحب کا مکان تھا۔ اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے انہیں کے بیٹے ڈپٹی عبد الحامد ہیں جو سامنے والے مکان میں رہتے ہیں۔ ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا ادھر میں نے دروازے میں قدم رکھا ادھر ان کی لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوا لیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ خدا جانے کہاں سے محلے بھر کا مصالحہ اٹھا لاتی تھی پیستے پیستے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے تھے۔ جہاں میں نے ہاتھ

روکا اور اس نے بٹہ انگلیوں پر مارا بخدا جان ہی نکل جاتی تھی۔ میاں یہ وہ لڑکی تھی جو بعد میں ہماری بیگم صاحبہ ہوئیں "۔

فرحت صاحب نے پہلے ہی احتیاطاً کہہ دیا ہے کہ " ہاں یہ ممکن ہے بعض نام بھول جانے کی وجہ سے چھوڑ جاؤں یا غلط لکھ جاؤں "۔ کاش مرزا صاحب بعض نام غلط لکھنے کی بجائے انہیں چھوڑ جاتے۔ خدا جانے اس نوعیت کے مضمون کی کونسی ایسی 'تر نا ترت' ضرورت تھی کہ مرزا صاحب نے اسے قلم برداشتہ لکھ دیا۔ 'حیاۃ النذیر' موجود تھی۔ اس سے آپ کے شبہات کا بخوبی اور مکمل ازالہ ہو سکتا تھا۔ اگر مزید معلومات کی ضرورت تھی تو مولوی بشیر احمد صاحب سے دریافت فرما سکتے تھے۔ ملک کو کسی مشہور اہل قلم کی کثیر التعداد سوانح عمریوں کی اتنی ضرورت نہیں جتنی واقعات کی اصلیت اور داد تحقیق کی ضرورت ہے۔ عبدالحامد صاحب مولانا کے نسبتی برادر ہیں نہ کہ خسر۔

عبدالحامد صاحب کی بہن اگر مولانا کی ٹانگ لے سکتی تھی، مسالا پسوا سکتی تھی، اور بٹہ سے انگلیوں پر مار سکتی تھی۔ تو کم از کم مولانا کی ہم عمر تو ہوگی ہی۔ لڑکی کی عمر کے متعلق مولوی افتخار صاحب کا بیان سند کا محتاج ہے۔ مرزا صاحب کے بیان میں صداقت کی دھندلی روشنی مبالغے کے موٹے موٹے پردوں سے چھن چھن کر نکل رہی ہے۔

راشد الخیری صاحب " ان ہی دنوں میں (۱۸۵۸ء یا اس کے لگ بھگ) میری بڑی پھوپھی کے عقد کی تجویز پیش ہوئی ...... بڑی بڑی درخواستیں موجود تھیں ...... مختصر یہ کہ مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم کی نگاہ مولانا پر جا ٹھٹکی "۔ (صفحات ۱۶) خدا غریق رحمت کرے میری بڑی پھوپھی کو اس شادی کا ذکر اس طرح فرماتی تھیں کہ جب مسجد میں نکاح ہو چکا تو دولھا کو ہم سب نے بھی دیکھا۔ کرتا پاجامہ سفید تھا۔ ٹوپی بھی خاصی تھی۔ مگر جوتی کے کنے نکلے ہوئے تھے۔ اماں نے ایک عورت کے ہاتھ چپکے سے ایک روپیہ بھیجا کہ جوتا پہن لو تھوڑی دیر بعد وہی عورت پونے چار آنے واپس لائی اور کہا سوا بارہ آنے کی جوتی آئی ہے۔ یہ تعلق مولانا مرحوم کے لئے کوئی مابہ الامتیاز شئے نہ تھی۔ مدرسے کا سلوک ان سے وہی تھا جو ہمیشہ رہا اور جو سب طالبعلموں سے تھا"۔ صفحہ ۱۱

اس بیان سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ نوشہ کا لباس بہت ہی سادہ اور گھٹیا تھا۔ پاؤں میں سوا بارہ آنے کی جوتی تھی۔

۲۔ کالج میں داخل ہونے سے پہلے شادی ہوئی اور شادی کے بعد بھی وہ مسجد ہی میں رہے۔

۳۔ دولہا کو ہم سب نے بھی دیکھا اس بات کا قرینہ ہے کہ مولوئیں مولانا سے پردہ کرتی تھیں ورنہ یہاں تاکید کی کیا ضرورت تھی۔ پردہ نہ ہوتا تو نوشہ کو خصوصیت کے ساتھ اور وہ بھی اس خستہ حالت میں دیکھنا کونسا فرض تھا وہ تو صدہا

مرتبہ دیکھا جا چکا تھا۔ علاوہ ازیں نوشہ صاحب ایک دن کے لئے نہ سہی دو دن کے لئے نہ سہی تیسرے دن تو ضرور روٹیاں مانگنے اور مسالا پیسنے کے لئے زنان خانے میں موجود ہو جاتے۔

مولوی افتخار صاحب کا بیان ان نتائج کے سراسر خلاف ہے فرماتے ہیں کہ "بہر حال کچھ عرصے تک مولوی غلام حسین صاحب اور مولوی عبدالقادر صاحب میں ہمارے مولانا کے نکاح کی بابت کھچڑی پکتی رہی۔ آخر ایک دن درزی فیروزی بانات لے کر مولانا کا قد وقامت ناپنے کے لئے آیا اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ مولوی عبدالقادر صاحب کے ہاں دولہا کے جوڑے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس وقت مولانا کو اس کی خوشی ہوئی کہ مجھ کو بانات کا انگرکھا پہننے کو ملے گا" صد ۳۱

جس طرح مولانا کو مولوی عبدالقادر صاحب نے عقد کے وقت بانات کا انگرکھا بنوا دیا تھا اسی طرح مولانا نے مولوی عبدالقادر صاحب سے سو روپیہ لے کر دلہن کا جوڑا بنوا دیا۔ مولانا چھ روپے ماہوار اس قرضے کے اور تین روپے ماہوار خوراک کے ادا کرتے تھے۔ جس شخص کے پاس جوتی خریدنے کے لئے سوا بارہ آنے نہ ہوں جس کی شادی کا جوڑا کرتہ پاجامہ اور ٹوپی ہو اس کو اتنی ہمت کہاں سے آئی کہ سو روپیہ فقط دلہن کا جوڑا بنوانے کے لئے قرضہ لے اور قرضے کے چھ روپے ماہوار ادا کرتا رہے اور جس خسر نے فیروزی بانات کا انگرکھا سلوایا تھا اس کے متعلق یہ بدگمانی زیبا نہیں کہ اس نے سوا بارہ آنے کی جوتی تک داماد کو نکاح سے پیشتر نہیں دلوائی۔ افتخار صاحب نے مولانا کا بیاہ اس وقت رچایا ہے جبکہ آپ کالج کی تعلیم تقریباً ختم کر چکے تھے (۱۸۴۵-۵۵ء) اور جبکہ آپ کا وظیفہ چار سے چوبیس تک پہنچ گیا تھا تاکہ مولانا میں قرض لینے اور ادا کرنے کی اہلیت ثابت ہو سکے اور ضمناً آپ کے حساب سے لڑکی کی عمر بھی شادی کے قابل ہو جاتے۔

راشد الخیری صاحب نے مولانا کے مضبوط کندھوں پر خسر صاحب کے احسانات کا ایک گٹھے کا گٹھار رکھ دیا ہے استدعا ہے کہ مولانا راشد الخیری اور مولوی افتخار عالم صاحبان متفق طور پر اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش فرمائیں۔

'حیاۃ النذیر' میں مولانا کے بیاہ کے متعلق لکھا ہے کہ "اس نکاح کی بجنور میں مطلق خبر نہ تھی۔ چند روز کے بعد وہاں خبر پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ مولانا کی والدہ نکاح کی خبر سن کر دلی چڑھ آئیں اور بہت کچھ روئیں پیٹیں مگر اب کیا ہو سکتا تھا ان کے دل میں یہ سمائی کہ مجھ رنڈیا کے بچے کو بے وارث سمجھ کر دلی والوں نے چھین لیا" صد ۲۱ مولوی سعادت علی صاحب کا انتقال مولانا کے کالج میں داخل ہونے کے بعد ہوا تھا۔ اگر مولانا کا بیاہ ۱۸۴۵ء میں دلی آتے ہی ہو گیا تھا تو مولوی سعادت علی صاحب کی زندگی میں مولانا کی والدہ اپنے آپ کو رنڈیا کیوں کہتی ہیں! اور جبکہ مفتی صدر الدین صاحب نے خود مولانا کا نکاح پڑھایا تھا (صد ۳۱) تو مفتی صاحب نے امتحان لیتے وقت مولانا کو کیوں نہیں پہچانا۔ یہ بھی تو نہیں کہہ سکتے کہ مفتی صاحب سہرے میں چھپا ہوا چہرہ نکاح کی محفل میں نہیں دیکھ سکے تھے کیونکہ مولانا اور مولوی عبدالخالق صاحب

دونوں غیر مقلد تھے۔ غیر مقلدوں کے ہاں سہارا کہاں!

مولانا راشد الخیری صاحب کا فرمانا کہ " یہ تعلق مولانا نے مرحوم کے واسطے کوئی مابہ الامتیاز شے نہ تھی۔ مدرسے کا سلوک ان سے وہی تھا جو ہمیشہ رہا اور جو سب طالب علموں سے تھا۔ شام ہوتے ہی تھوڑی سی روئی اور تیل سب کو مل گیا اپنے ہاتھوں بتیاں بٹو اور جلاؤ وغیرہ وغیرہ " تصدیق طلب ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا داماد بنفے، کالج میں داخل ہونے، اور وظیفہ پانے کے بعد بھی مسجد ہی میں رہتے تھے یہ دستور مولانا کی فطرت اور شواہد کے خلاف ہے۔ کیا مولوی عبدالقادر صاحب اپنے مکان میں اپنے داماد کے لئے ایک کوٹھڑی خالی نہیں کرا سکتے تھے یا مولانا ایک علیحدہ کرہ کرایہ پر لے کر نہیں رہ سکتے تھے۔ خود مولانا نے اپنے ایک لکچر میں فرمایا ہے کہ " دن کا تو کیا حساب دوں مجھے یاد نہیں کہ زمانِ طالب علمی میں مَیں کسی ایک رات نیند بھر کر سویا ہوں۔ میں اسکالرشپ ہوئے پیچھے ایک چوکیدار کو چند پیسے مہینہ دیا کرتا تھا کہ مجھ کو رات کے دو بجے کتاب بینی کے لئے جگا دے میں گرمیوں میں مکان کے اندر گھٹ کر اور جاڑوں میں باہر صحن میں بیٹھ کر کتاب دیکھتا تاکہ سو نہ جاؤں " اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ کالج میں داخل ہونے کے بعد مولانا کا قیام مسجد میں نہیں تھا۔ اصل حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ مولوی سعادت علی صاحب اپنے دونوں فرزندوں کے ساتھ ۱۸۴۵ء سے ایک دو مہینے پہلے دلی آئے۔ عبدالخالق صاحب کے ایما پر مسجد میں ٹھہر گئے۔ چند روز مولانا نے مولوی مملوک علی سے کالج کو آتے جاتے پڑھا اور جنوری ۱۸۴۵ء میں والد اور دَدّیا خسر کی رضامندی سے کالج میں داخل ہو گئے۔ سعادت علی صاحب غالباً اس خیال سے کہ دونوں لڑکوں کو وظیفہ مل جانے کے بعد بھی مسجد میں ٹھہرنا ایک تو اس لئے کہ مسجد کے طلبہ اور کالج کے طلبہ کے نصاب میں فرق تھا۔ اس لئے خیالات کا تصادم ہوتا تھا اور دوسرے اس لئے کہ مسجد کے طلبہ کی طرز زندگی کا کوئی برا اثر اپنے لڑکوں پر نہ پڑے مسجد میں زیادہ مدت تک قیام کرنا مصلحت نہ سمجھ کر پہلے ایک کرایہ کی کوٹھڑی میں رہنے لگے پھر مولوی غلام حسین صاحب نے جو مولوی سعادت علی صاحب کے دوست اور مولوی عبدالقادر صاحب کے دور کے رشتہ دار تھے۔ اور اسی محلے میں رہتے تھے ان مولویوں کو اپنے ہاں لے جا کر ٹھہرایا تاکہ اپنے لڑکے احمد حسین کی پڑھائی بھی بخوبی ہو جائے اور ان پردیسی مولویوں کو کھانے کا بھی آرام ہو جائے۔ چنانچہ حیاۃ النذیر میں ہے کہ " مولانا تین روپیہ مہینہ کھانے کا دیا کرتے تھے۔ احمد حسین کے پڑھنے کی وجہ سے مولوی صاحب کے گھر والے ہمارے مولانا کو آسودہ بھی رکھنا چاہتے تھے مگر وہ خود غریب تھے مگر اپنی غریبی کی حد کے اندر اندر "

اس مقام پر ایک نہایت اہم معاملہ کے متعلق حیاۃ النذیر میں کوئی مواد نہیں ملتا یعنی یہ کہ مولوی علی احمد صاحب

والد کے انتقال کے بعد بھی نذیر احمد صاحب کے ساتھ رہے یا دونوں بھائی اپنے اپنے اڑھائی چاول الگ گلاتے تھے۔ ساتویں صفحہ پر ہے کہ "مولانا کے ساتھ ہی ساتھ مولوی علی احمد صاحب نے دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ دونوں بھائی سررشتہ تعلیمات میں پہلے پہل ملازم ہوئے۔" اگر یہ حقیقت ہے تو اس معمّا کا کیا حل ہے کہ "اس نکاح کی بجنور میں مطلق خبر نہ تھی۔ چند روز بعد وہاں خبر پہنچی تو وہاں کہرام مچ گیا۔" غور فرمایئے کہ والدہ کو خبر نہ ہونے کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں ایک یہ کہ مولوی علی احمد صاحب بھی اس بغاوت میں شریک تھے۔ لیکن یہ بات مولوی صاحب کے کردار سے بعید ہے آپ نے آخر عمر تک والدہ کا ساتھ دیا (صـ پیراگراف ۲) دوسری یہ کہ آپ نے نذیر احمد کی اس آزادہ روی کو اس قدر نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا کہ نہ خود اس کو روکا اور نہ والدہ کو اس کی اطلاع دی۔ اندھے کو کنوئیں میں گرتا دیکھ کر خاموش بیٹھ گئے نہ خود بچایا نہ دوسروں کو بچانے دیا۔ میں نے تو کسی شریف انسان کے متعلق ایسی کہانی نہیں سنی البتہ "قطمیر" کے غیر مہذب رشتہ داروں میں یہ بات عام ہے۔ یا ایک اور صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ علی احمد صاحب نے اس رشتہ کو خدا کی دین سمجھ کر والدہ کو اس لئے اطلاع نہ دی کہ کہیں وہ بڑھیا چلتی گاڑی میں روڑا نہ اٹکا دے۔ والدہ کی مزاحمت کا اندیشہ تو محض موہوم ہے۔ کیونکہ اس سے پیشتر کوئی ایسا موقع پیش نہ آیا تھا البتہ اس سے علی احمد صاحب کی ناخلفی کا ثبوت مل سکتا ہے۔ لیکن بیچارے اس سے بھی بری تھے۔

واقعہ یوں ہے کہ "مولوی غلام حسین صاحب کا ایک کارخانہ کارچوب کا بھی تھا۔ دالان میں ایک طرف کارچوب ہوتا تھا۔ اور دوسری طرف مولانا کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ کاریگروں میں برکت اللہ اور وجیہ اللہ دو بھائی تھے وہ مشاطہ کی معرفت شادی کے رقعے دوڑاتے رہتے تھے۔ مگر کہیں بات جمتی نہ تھی ایک مرتبہ مولانا نے ازراہ شوخ طبعی برکت اللہ کے رقعے میں اپنا نام لکھ دیا۔ فریق ثانی کی طرف سے تحقیقات ہونے لگی۔ شدہ شدہ مولوی غلام حسین صاحب تک نوبت پہنچی ہمارے مولانا مولوی غلام حسین صاحب کا ادب بھی کرتے تھے کیونکہ ایک تو وہ بوڑھے آدمی تھے دوسرے مولوی سعادت علی صاحب کے دوست بھی تھے۔ غرض کارخانہ برخاست ہوا تو مولوی غلام حسین صاحب جو کارخانہ برخاست کرکے اکثر بازار چلے جایا کرتے تھے۔ ایک دن خلاف عادت کارخانہ برخاست کرکے اپنی جگہ بیٹھے رہے ہمارے مولانا بھی اس وقت اکیلے تھے۔ انہوں نے رقعہ نکال مولانا کے روبرو ڈال دیا اور کہا کہ "برخوردار اگر تم نکاح کرنا چاہتے ہو تو اس کام کو مجھ پر چھوڑ دو میں مناسب جگہ تجویز کردونگا۔" مولانا رقعہ دیکھ کر بہت شرمندہ ہوئے کیونکہ وہ ایک ہنسی تھی جو انہوں نے برکت اللہ کے ساتھ کی تھی۔ مارے رعب کے ہمارے

مولانا مولوی غلام حسین صاحب سے ہست نیست کچھ نہ کہہ سکے۔ وہ خاموشی کو نیم رضا سمجھے۔ بات رفت وگزشت ہوئی۔ ادھر برکت اللہ نے بُرا مانا کہ میری بات میں اڑنگے لگاتے ہیں۔ اس شوخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا سے اور برکت اللہ سے بگاڑ ہوگیا۔ دعا، سلام، بات چیت موقوف۔ اس کے دو ڈھائی مہینے بعد پھر ویسا ہی اتفاق ہوا کہ مولوی غلام حسین صاحب کارخانہ برخاست کرکے بیٹھے رہے اور ہمارے مولانا کو اکیلا پاکر کہا کہ " لو میں نے تمہارا نکاح ٹھہرا دیا ہے۔ مولانا نے بات سنی کی اَن سنی کر دی اس بات کو کوئی ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ ایک قاب میں مولوی عبدالقادر کے ہاں سے کچھ مٹھائی ایک چپاری لائی اور اس نے وہ قاب مولوی غلام حسین صاحب کو دی۔ مولوی غلام حسین صاحب نے وہ قاب لاکر مولانا کے آگے رکھ دی اور کہا کہ " لو برخوردار تمہارے سسرال سے مٹھائی آئی ہے ان کے ہاں برادری سے کوئی حصہ آیا ہوگا یہاں کے دستور کے مطابق انہوں نے تمہارا حصہ بھیجا ہے۔" اب تو مولانا کے کان کھڑے ہوئے مگر اس وقت بھی ہست نیست مولانا نے کچھ نہیں کہا۔ اسی طرح وقتاً فوقتاً مولوی عبدالقادر صاحب کے ہاں سے تحفے تحائف مولانا کے نام مولوی غلام حسین کے ہاں آتے رہے اور مولانا کو وقتاً فوقتاً معلوم ہوتا رہتا تھا۔ اسی طرح چپ چپاتے مولانا کے نکاح کی پخت وپز ہو رہی تھی۔" (حیاۃ النذیر حصہ اول صفحات ۲۹ اور ۳۰)

یہ اقتباس واقعے کی جان ہے۔ مولانا کا ازراہ شوخ طبعی برکت اللہ کے رقعے میں اپنا نام لکھ دینا اور پھر مولوی غلام حسین صاحب کا تخلیہ میں اس واقعے کے متعلق دریافت کرنا۔ مولانا کا مرعوب ہوکر ہست نیست کچھ نہ کہنا۔ ان کا اس خاموشی کو نیم رضا سمجھنا۔ پھر دوبارہ مولانا کو اکیلا پاکر کہنا کہ " لو میں نے تمہارا نکاح ٹھہرا دیا ہے۔" اور دوسری مرتبہ بھی مولانا کا جھیپ جانا۔ غرض وقتاً فوقتاً سسرال سے تحفے تحائف کا آتے رہنا اور مولانا کا بدستور خاموش رہنا اور آخر تک چپ چپاتے نکاح کی پخت وپز ہوتے رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ غالباً نکاح کے دن تک مولوی علی احمد صاحب کو اس کی خبر نہ تھی یا علی احمد صاحب نے جب دیکھا ہوگا کہ ایک گرگ باراں دیدہ نے ایک غریب بے زبان بھیڑ کو پائی گدلا کرنے کی تہمت تراش کر بری طرح دھر لیا ہے تو کسی قسم کی ہل چل کو مشتے بعد از جنگ خیال کرکے صبر کر لیا ہوگا۔ اور والدہ کو اس لئے اطلاع نہیں بھیجی ہوگی کہ یہ علی احمد صاحب کے لئے باعث ننگ تھا کہ اپنے چھوٹے بھائی کے حرکات وسکنات کی نگہداشت ان سے نہ ہوسکی۔ اور مولانا کا شرمندگی سے بچنے کے لئے اپنے بڑے بھائی سے اس کا تذکرہ نہ کرنا ایک فطری امر ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ اس معاملہ میں مولانا محض بے گناہ تھے۔ مولوی غلام حسین صاحب نے ابوزید بن کر مشاقگی کی شطرنج میں ایک بے زبان اناڑی دیہاتی کو مات دے دی۔ افتخار صاحب کا قول کہ " مولانا کو دیہات کی بدسلیقگی اور

علم سے بے بہرہ ہونا۔ لباس کا پھوہڑپن، زبان کی کرختگی سب معلوم تھی۔ اہل البیت ادریٰ بما فی البیت مولانا شہر کے تکلّفات، یہاں کی سلیقہ شعاری، زبان کی نفاست دیکھ کر ریجھ گئے۔" (صلا) محض مولانا کے سسرال کی خوشامد ہے۔ ورنہ جس قطعہ زمین کی مائیں مولانا جیسے لڑکے جن سکتی ہیں وہاں ایسے لڑکوں کے قابل لڑکیوں کا وجود بھی لازمی ہے۔

صفحہ ۱۲۶ حصہ چہارم میں ہے کہ" دیہات کو بہت ہی برا جانتے تھے۔ میاں بشیر نے ایک مرتبہ بجنور جانے کی اجازت چاہی تو ان کو لکھ دیا ؎

دِہ مردِ دِہ مرد را احمق کند عقل را بے نور و بے رونق کند وغیرہ

لیکن افتخار صاحب نے میاں بشیر کے خط کا حوالہ نہیں دیا تاکہ معلوم ہو جاتا کہ وہ کس ضمن میں وہاں جانا چاہتے تھے جو مولانا کو ایسا جواب لکھنا پڑا یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی کہہ دے کہ قرآن شریف میں لاتقربوا الصلوٰۃ آیا ہے۔ افتخار صاحب نے مولانا کے کیرکٹر کا نقشہ اس قدر غیر مربوط کھینچا ہے کہ بے ربطی کی انتہا ہو گئی ہے۔

طالب علمی کے زمانے میں مولانا کی گداگری

مولانا کے والد کے متعلق افتخار صاحب لکھتے ہیں کہ" وضعداری میں اگلے زمانے کے بزرگ تھے پھر مولوی نصراللہ خانصاحب کے فیض تربیت کے بارے میں خود مولانا فرماتے ہیں کہ" میرا چال چلن اگر باپ کے ہاں وثیقہ تھا تو ڈپٹی صاحب کے ہاں اس کی رجسٹری ہوئی"۔ اس پر افتخار صاحب نے یوں خامہ فرسائی کی ہے کہ" اس میں کچھ شک نہیں کہ جس شخص میں جاہ و حشمت، حکومت و وجاہت، علم و فضل و سیر چشمی، شریعت و طریقت اتنے اوصاف جمع ہوں تو ایسے شخص کے ہاں مولانا نذیر احمد کے چال چلن کے وثیقہ پر کیوں نہ رجسٹری ہوتی"

قاضی غلام علی شاہ مولانا کے نانا مرفہ الحال تھے۔ اگرچہ مولانا نے نانا کی مرفہ حالی سے فائدہ نہیں اٹھایا لیکن اسی مرفہ حال باپ کی بیٹی تو آپ کی ماں تھی۔ افتخار صاحب نے ابتدا میں سچ کہا ہے کہ" عسُرۃ اور توکل دو ملازم اُن کے ماں اور باپ کے ساتھ (رہڑ سے بجنور) آئے تھے"۔ توکل کچھ اور چیز ہے اور گداگری کچھ اور شے۔ ایک میں عظمت ہے۔ اور دوسری میں ذلت۔

مولانا کے عام خاندانی عادات واخلاق کے بارے میں لکھا ہے کہ" وضعداری، شرافت، بھلمنسات خاندانی صفات ہیں متوارث جو بزرگوں سے ان کی نسلوں میں منتقل ہوتی چلی آتی ہیں اور اس قاعدے سے ہمارے مولانا نے بھی فائدہ اٹھایا ہے"۔ کوئی انسان اپنی خاندانی خصوصیات، ماحول کے بھلے یا بُرے اثرات سے محفوظ نہیں رہ

سکتا۔ مولانا بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ ایک مرفہ حال نانا کا نواسہ، ایک وضعدار باپ کا بیٹا، ایک ذی جاہ سیر چشم اور مشفق استاد کا شاگرد، بھک منگا، ٹکر گدا، لوگوں کی ٹانگوں میں گھسنے والا، چودہ پندرہ برس کا ہو کر بھی بچوں جیسا رونے والا نہیں بن سکتا۔ پندرہ برس کی تربیت کا اثر چند مہینوں میں کیونکر زائل ہو گیا۔ خصوصاً جبکہ مولانا کے وضعدار باپ مولانا کے کالج میں داخل ہونے اور وظیفہ پانے تک آپ کے نگران حال رہے ہوں۔

مولانا نے ایک لکچر میں فرمایا ہے کہ "میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں، والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے بڑے دیندار صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کا مرجانا منظور۔ اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں" یعنی مولوی صاحب نے بیٹوں سے نہ بھیک منگوائی نہ انگریزی پڑھوائی۔

اب سوال یہ ہے کہ کالج میں داخل ہونے تک مولانا اور آپ کے بھائی اور والد کے کھانے کا کیا انتظام تھا؟ افتخار صاحب لکھتے ہیں کہ "طالب العلم اپنے کھانے کا انتظام خود کرتے تھے۔ ان طالب علموں کی غالب معاش گداگری تھی دونوں وقت پنجابیوں کے گھروں سے ان کی روٹی مقرر تھی۔ الغرض مسجد کے طالب العلم بھی ان دو گروہوں میں منقسم تھے۔ اور ہر ایک اپنی مخالف پارٹی پر زبان درازیاں کر کے دوزخ شکم میں خوب گرما گرم کھانے بھرا کرتا تھا لیکن ہمارے مولانا نے صلح کل پالیسی اختیار کر رکھی تھی نہ اِدھر نہ اُدھر بلکہ دونوں طرف یعنی جدھر کچھ ملتا دیکھا اُدھر ہی کے ہو رہے۔ اس لئے جناب مولانا کا مذہب اس زمانے میں مذہب رکابیہ تھا۔ جیسا کہ اکثر طالب علموں کا ہوا کرتا ہے" "سینٹ سٹیفنز کالج میگزین لکھتا ہے کہ "مولوی سعادت علی بجنور سے آکر دہلی رہنے لگے یہ ایک مسجد میں رہا کرتے تھے اور مسجد کی خدمت ہی ان کی وجہ معاش تھی۔"

مذکورہ بالا اقتباسات میں خط کشیدہ جملے سے ظاہر ہے کہ مولوی افتخار صاحب کے ہاں گداگری کے کیا معنی ہیں! طالب علموں کی دستگیری اسلام کا خاص شیوہ ہے۔ ابتدائے اسلام سے آج تک مسجد اور مدرسے کا تعلق جسم اور جان کا تعلق رہا ہے۔ طالب علموں کا خرچ مسجد کے اوقاف یا محلّے کے فارغ الحال و علم دوست اصحاب کی توجہ سے چلا یا جاتا ہے۔ طلبہ کا کام فقط اتنا ہے کہ وقت مقررہ پر گھروں پر جائیں اور ما حضر لے آئیں۔ گداگری کے یہ معنی ہیں کہ صبح ہوئی اور جھولی لگا مسجد سے نکل کھڑے ہوئے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی آوارہ گردی کے بعد لوٹ آئے کسی نے دھتکارا، کسی نے پھٹکارا، کسی نے ڈانٹ بتائی، کسی نے کچھ دے دیا۔ مسجد کے اوقاف، ارباب کرم کی سخاوت اور صدقات کے ذریعہ سے علم حاصل کرنا اُن کے مستحقین کے لئے بھی باعث ذلت ہے یا نہیں یہ علیحدہ مسئلہ ہے۔

لیکن مولوی سعادت علی صاحب تو اس کے روادار نہ تھے۔ آپ کی امامت تو ثابت ہے۔ مولوی علی احمد صاحب میاں جی گری کرتے ہونگے ان دونوں کی آمدنی سے مولانا کا خرچ بھی نکل جاتا تھا۔ مولانا کا رکابی مذہب ہونا اس امر کا مزید ثبوت ہے کہ وہ اپنے والد اور بھائی کی کمائی سے کھاتے تھے۔ ہاں اگر کبھی کوئی میٹھی یا چکنی چپڑی چیز مل جاتی تو اس سے بھی انکار نہ تھا ؎ ہر شئے کہ بے سوال رسد دادۂ خداست

اب رہے مولانا کے یہ اقوال کہ "اکثر طالب علم باری باری سے دونوں وقت پنجابیوں کے گھروں سے ٹکڑے مانگ لاتے اور آپس میں بانٹ کھاتے اور انہیں میں ایک میں بھی تھا" اور "یہ لوگ مسجدوں میں رہتے۔ اور صدقات پر گزران کرتے کسی کو عار کا موجب ہو تو ہو مگر میں اس کو فخراً بیان کرتا ہوں کہ میری طالب علمی کا ابتدائی حصہ اسی طرح بسر ہوا" از قبیل تعریض ہیں بہ فحوائے آیتہ و مالی لا اعبد الذی فطرنی۔ اور اگر یہ تعریض نہیں بلکہ صداقت ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ مولوی سعادت علی صاحب کے فرزند اور قاضی غلام علی شاہ کے نواسے نذیر احمد اور ڈپٹی نذیر احمد دو علیحدہ شخصیتیں تھیں یا ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے والد اور نانا کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب غیر معتبر ہے۔

سخت حیرت کا مقام ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی سوانح نگاری کو خوش قسمتی سے مولوی سید افتخار عالم صاحب اور مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب جیسے دو جلیل القدر اور اعلٰے پائے کے ناقد سوانح نگار میسر آنے کے باوجود آپ کے سوانح حیات افسانے کے حدود سے باہر نہ نکل سکے۔

سر سید اور نذیر احمد کی ہم مکتبی کی داستان

ایک اور جگہ مرزا صاحب مولانا کے منہ سے فرماتے ہیں کہ "اس زمانے میں سید احمد خاں فارسی کی جماعت میں، منشی ذکا اللہ حساب کی جماعت میں، اور پیارے لال انگریزی جماعت میں تھے۔ میں عربی جماعت میں شریک ہوا" لیکن مولوی عبد الحق صاحب نے اپنے مضمون "مرحوم دہلی کالج" میں "کالج کے بعض قدیم طالب العلم" کے عنوان سے جن اصحاب کے نام گنائے ہیں ان میں سر سید کا نام نہیں ملتا۔ اگر سر سید دہلی کالج میں پڑھے ہوتے ہوتے تو اس فخر کالج طالب العلم کا نام اس ضمن میں ضرور لیا جاتا۔ حالی مرحوم نے 'حیاۃ جاوید' میں لکھا ہے کہ سر سید کی تعلیم گھر پر ہوئی اور جب انہوں نے پڑھنا چھوڑا ہے اس وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی۔ (حیاۃ جاوید طبع دوم صفحہ ۲۹) سر سید ۱۸۳۸ء میں نوکر ہوئے یعنی اس وقت جبکہ مولانا کے پدر بزرگوار بقول افتخار صاحب مولانا کی لوح دل پر اخلاق محسنی کے پھول بوٹوں کی بیل چڑھا رہے تھے۔ یا بہ لحاظ سن ولادت ۱۸۳۶ء (افتخار صاحب کی تحقیق کے مطابق) اس وقت جبکہ مولانا ابھی طفل شیر خوار تھے۔ اس صورت

ہیں یہ نذیر احمد کے ہم مکتب کیسے ہو سکتے ہیں! اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ شمالی امریکہ میں کسی کو قرآن شریف کا ایک قدیم نسخہ عیسیٰ روح اللہ کے زمانے کا ملا تھا۔

مولوی عبدالحق کی کتاب 'مرحوم دہلی کالج' پر ریویو کرتے ہوئے 'جامعہ' لکھتا ہے۔

"آخر میں ہم ادب سے یہ عرض کرینگے کہ ہمیں دہلی کالج کے طلبا کے ذکر میں سید احمد خاں کی معروف شخصیت کا نام نظر نہیں آیا۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ سید احمد بھی اسی کالج کی فارسی جماعت کے طالب العلم تھے۔" (جامعہ بابت ستمبر ۱۹۳۴ء)

تعجب ہے کہ ناقد صاحب کی نظر شخصیتوں پر ہے نہ کہ واقعات اور حقائق پر۔ انہوں نے خود تو تحقیق نہیں کی بلکہ مرزا فرحت صاحب کی سند پر لکھ دیا کہ سر سید اور نذیر احمد ہم مکتب ہیں۔ اس کا ثبوت کہ ناقد صاحب کا ماخذ فرحت صاحب کا مضمون ہے یہ جملہ ہے۔

"اہل ذوق نے اس کی عزیز کہانی مولوی نذیر احمد کی داستان کے سلسلہ میں مرزا فرحت اللہ بیگ کی زبانی ذرا سی سنی تھی۔ جس نے شوق کی آگ کو کم نہیں 'تیز تر' ہی کر دیا تھا"

اس معاملہ میں مولوی عبدالحق صاحب کی رائے اٹل ہے۔

ضمیمہ - متعلق نمبر ۴ صفحہ ۱۰۱ - امتحان کے بارے میں مختصر خلاصہ

مولانا ایک دن پنجابی کٹڑے کی مسجد سے نکل کر پھرتے پھراتے دہلی کالج تک پہنچ گئے۔ دیکھا کہ وہاں لڑکوں اور تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ یہ بھی لوگوں کی ٹانگوں میں سے گھستے گھساتے دروازے تک پہنچے۔ دیکھا کہ اندر مفتی صدرالدین صاحب اور کالج کے پرنسپل صاحب بیٹھے ہیں اور لڑکوں کو سندیں اور انعام تقسیم کر رہے ہیں۔ تھوڑے ہی وقت میں پرنسپل صاحب کو کسی کام سے باہر جانے کی ضرورت ہوئی۔ چپراسی نے رستے سے لوگوں کو ہٹانا شروع کیا۔ اس دھکا پیل میں مولانا دروازے کی سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر سے پھسل کر نیچے گر پڑے۔ سر میں چوٹ آئی۔ پرنسپل نے ازراہ ہمدردی آپ کو اٹھایا۔ آپ کی دلجوئی کی۔ پوچھا کہ کیا پڑھتے ہو۔ کہا کہ سبعہ معلقہ (بروایت مرزا فرحت) پرنسپل صاحب کو تعجب ہوا۔ وہ اپنا کام ملتوی کر کے مولانا کو مفتی صدرالدین صاحب کے پاس لیکر پہنچا۔ مولانا چوٹ کی تکلیف سے برابر رو رہے تھے۔ مفتی صاحب نے آپ کا امتحان لیا۔ پرنسپل آپ کی ذہانت سے بہت متاثر ہوا اور کہا کہ اگر تم جنوری ۱۸۴۵ء میں کالج آؤگے تو تمہیں داخل کر لیا جائے گا اور وظیفہ بھی ملے گا۔

میں نے اس خلاصے کا لکھنا اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ ان اصحاب کے لئے جنہوں نے مولوی افتخار صاحب یا مولوی فرحت صاحب کے مضامین نہیں دیکھے نفس مضمون کے سمجھنے میں دقت نہ ہو۔

محمد خاں

جنگل کی ہوائیں

اِک روز کہ رقصاں تھے ہواؤں میں شرارے
اوسان تھے دنیا کے خطا دھوپ کے مارے

سُوکھے ہوئے ہونٹوں پہ زباں پھیر رہے تھے
خورشید کے آغوش میں تپتے ہوئے ذرّے

ذرّے تھے کہ آتش کی چٹکتی ہوئی کلیاں
جُھلسے ہوئے بازار دہکتی ہوئی گلیاں

بے مہر حرارت کی ستائی ہوئی دنیا
مضطر تھی پسینے میں نہائی ہوئی دنیا

کرنوں کی زبانوں پہ تھا دوزخ کا فسانہ
اِس آگ میں دفتر کی طرف تھا میں روانہ

پہلو سے مرے تان اڑاتا ہوا گزرا
اِک طفلکِ گلفام یہ گاتا ہوا گزرا

جنگل کی ہوائیں .....
جنگل کی ہوائیں اے جنگل کی ہوائیں

ناخن کی کبھی کور اک انداز سے کُھٹکی
جھُوما کبھی گانے میں بجاتا ہوا چُٹکی

جنگل کی ہوائیں .....
جنگل کی ہوائیں اے جنگل کی ہوائیں
جنگل کی ہوائیں

یہ سنتے ہی جیسے ہی نظر میں نے اُٹھائی
اِک آن میں بدلی ہوئی دنیا نظر آئی

خنجر پہ شعاعوں کی مُعاً زنگ سا دوڑا
لَو دیتی ہوئی خاک پہ اِک رنگ سا دوڑا

ذرّوں کو نئے رنگ سے انگڑائی سی آئی
اور آنکھ دہکتے ہوئے سورج نے جھکائی

اللہ رے اُس طفلکِ رنگیں کی صدائیں
چلنے لگیں نرمی سے دبے پاؤں ہوائیں

گھبرا کے کڑی دھوپ نے دامن کو سمیٹا
دامن کے سمٹتے ہی جو دیکھا تو یہ دیکھا

خورشید پہ اک زُلف ہے لہرائی ہوئی سی
گویا سرِ گردُوں ہے گھٹا چھائی ہوئی سی

سرسبز دل آویز ہے گھنگھور گھٹا میں
وہ گھاس کہ تھی دھوپ سے مرجھائی ہوئی سی

میں ایک مہکتے ہوئے جنگل میں رواں ہوں
جنگل میں ہے اک نہر سی بل کھائی ہوئی سی

کہتے ہیں جسے حسرتِ دیرینۂ باراں
وہ حسرتِ دیرینہ ہے برآئی ہوئی سی

کانٹوں میں ہیں پھولوں کی جھپکتی ہوئی پلکیں
سبزے کی طرح خاک ہے اترائی ہوئی سی

کس ناز سے بالائے ہوا لوٹ رہی ہے
جنگل سے پپیہے کی صدا آئی ہوئی سی

خنکی کے درِ ناز پہ ہے سجدہ فشاں سی
گرمی کی جلن ابر کی ٹھکرائی ہوئی سی

جھومی سی گھٹاؤں میں مچلتی سی ہوائیں
اِک نیند سی کونین کو ہے آئی ہوئی سی

جنگل کی ہوائیں .....

جنگل کی ہوائیں اے جنگل کی ہوائیں

جنگل کی ہوائیں

یہ تان ہے بادل کی طرح چھائی ہوئی سی

جوشؔ ملیح آبادی

جنگل کی پری

آتول کے باپ کے دل میں اپنے بیٹے کے متعلق بڑی بڑی امنگیں تھیں، بڑی بڑی تمنائیں تھیں لیکن بدقسمتی سے لڑکے نے اِن امنگوں پر پانی پھیر دیا۔ کیونکہ جب وہ انٹرنس پاس کرکے انٹرمیڈیٹ میں پہنچا تو وہاں ایسا اٹک گیا کہ نہ تو اس کے والدین، اُس کو اس درجہ سے نکال سکتے تھے، نہ اُس کے اتالیق، جن کو اس کے والد نے گھر پر سبق دینے کے لئے مقرر کیا تھا۔

لیکن آتول کے دل پر ان پے در پے ناکامیوں سے ذرا میل نہ آیا۔ وہ کھیلتا، کھاتا، گُھرے اُڑاتا اور ایک فوٹو کا کیمرا لئے ہوئے مارا مارا پھرتا رہا۔ اُس کا اب صرف یہی ایک مشغلہ رہ گیا تھا کہ دن رات اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کی تصویریں کھینچا کرے۔ چنانچہ چند ہی مہینوں کے بعد وہ اس فن میں بہت ماہر ہو گیا۔ اس کے دوست اس کی تعریف کرنے لگے اور اس کے رشتہ داروں نے بھی اس کو برا بھلا کہنا چھوڑ دیا۔ اُس نے فوٹو کے بعض مقابلوں میں انعامات بھی حاصل کر لئے۔ اب آتول کی مسرتیں بے پایاں ہو گئی تھیں۔

اس کے چھوٹے بھائی بہن ہمیشہ اس کی طرفداری کرتے تھے۔ کیونکہ وہ روزانہ اپنی نئی نئی تصویریں دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آتول کو فوٹو کی پلیٹیں خریدنے کے لئے کبھی کبھی روپوں کی ضرورت پڑتی تھی، اور یہ روپیہ اس کے بھائی بہن، طرح طرح کے بہانے کرکے ماں سے وصول کرکے اُس کو دے دیا کرتے تھے۔

لیکن اس کے والد پر ان باتوں کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ بیٹے کی اس فوٹو گرافی کی مہارت سے اس کو خوشی ہونے کے بجائے غصہ آتا تھا، ایک روز بوڑھے راجانی بابو نے اس قدر سخت الفاظ میں اُس سے گفتگو کی کہ وہ الفاظ تیر کی طرح جا کر اُس کے دل پر لگے۔ اور وہ گھر چھوڑ کر نکل گیا۔

گھر سے نکل کر پہلے وہ اپنے ایک دوست کے ہاں جا کر ٹھہر گیا۔ چند روز تک دوستوں نے اُس کی بہت خاطر تواضع کی۔ اور پھر رفتہ رفتہ اُن کا جذبۂ رفاقت سرد پڑنے لگا۔ اور وہ آتول سے ملازمت تلاش کرنے کی خواہش ظاہر کرنے لگے۔ آتول نے رنجیدگی سے جواب دیا "بھلا مجھے ملازمت کہاں ملے گی"؟

اس کے دوستوں نے کہا کہ تم دفتروں، عدالتوں، مدرسوں، کالجوں میں، مختصر یہ کہ ہر جگہ کوشش کر سکتے

ہو۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے اس کی کوششوں میں ہر طرح سے مدد دینے کا وعدہ بھی کیا۔

لیکن آتول کوئی مفید خدمت انجام دینے کے لائق نہ تھا، اس لئے ملازمت اس کے لئے عنقا ہو رہی تھی۔ اب اُس کو اپنے موجودہ وقار اور عزت کو صدمہ پہنچنے کا بھی اندیشہ پیدا ہو گیا۔ اس اثنا میں اس کی ماں روتی ہوتی اس کے پاس آئی اور اُس کو سمجھا بجھا کر گھر لے گئی۔ اس کے باپ نے کوئی توجہ نہ کی۔ نہ تو وہ آتول سے بولا، نہ نظر اُٹھا کر اس کو دیکھا۔ بلکہ بالکل خاموش رہا۔ اور آتول بھی یہی چاہتا تھا۔

لیکن اب گھر، اس کے لئے امن اور آسایش کی جگہ نہ تھی، وہ اپنے والد کی سخت باتوں کو فراموش نہ کر سکتا تھا، حتیٰ کہ اب اُسے ماں کے پکائے ہوئے بہترین کھانوں میں بھی کوئی مزہ نہ آتا تھا۔ اب وہ ملازمت کی جستجو کرنے لگا۔ لیکن کلکتہ جیسے عظیم الشان شہر میں ملازمت کا مل جانا آسان نہ تھا۔ وہ تقریباً بالکل نا اُمید ہو گیا تھا۔ اس یاس و ناکامی کی حالت میں، اس کی سب سے کمسن بہن بینا نے اُسے ایک مفید مشورہ دیا۔

"لیکن بھائی جان آپ اپنی تصویروں کی اُجرت کیوں نہیں لیتے۔ اس طرح آپ کچھ نہ کچھ کما سکتے ہیں۔ آپ یہ سب مفت کیوں کرتے ہیں"؟

آتول نے سوچا۔ بہن کی رائے ٹھیک ہے۔ لیکن میں یکایک ایک پیشہ ور کیسے بن سکتا ہوں؟ مجھے ایک کمرہ اور ہر قسم کے سازوسامان کی ضرورت ہوگی۔ میرے پاس صرف ایک فوٹو کا کیمرہ ہے اور وہ بھی مُستعار لیا ہوا۔

اس کے مکان کے پاس ہی ایک فوٹو گرافر کی دوکان تھی، اس کا مالک ایک بنگالی تھا، لیکن اُس نے اپنی دوکان کا نام انگریزی رکھا تھا تاکہ گاہک زیادہ آئیں۔ آتول نے جا کر اُس کے منیجر سے ملاقات کی۔ بہت دیر تک گفتگو ہونے کے بعد، وہ ایک بہت ہی قلیل تنخواہ پر ملازم ہو گیا۔ اس کے بعد آتول بہت مطمئن اور مسرور گھر واپس آیا۔ اُس نے سوچا کہ اب اس کو ذرا ذرا سی چیزوں کے لئے والدہ سے روپیہ پیسہ مانگنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ مگر یہ دیکھ کر آتول کے والد نے انتہائی یاس اور نا اُمیدی کی حالت میں اپنا سر پیٹ لیا۔ اور دل میں کہا تو یہ وہ انجام ہے جس کو میرا بیٹا پہنچا۔ وہ بیٹا جس کے لئے میں نے اپنے دل میں بڑی بڑی آرزوؤں کی پرورش کی تھی۔

جس دُکان میں آتول ملازم ہوا، اس میں دو آدمی اور کام کرتے تھے۔ آتول کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ وہ ان دونوں کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکتا ہے۔ آتول ان دونوں کے مقابلہ میں، اپنے فن میں بہت

ماہر تھا، اور یہی امر اُن دونوں کی تکلیف کا باعث تھا۔ انہوں نے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی کہ آتول جہاں ہے وہیں رہے، اس سے زیادہ ترقی نہ کرے۔ یہ دونوں تمام گاہکوں کی فرمائشیں پوری کرتے تھے۔ اور آتول کو دوسرے کاموں پر بھیجا کرتے تھے، اُسے اکثر اوفات مُردوں، اور اسی قسم کے دوسرے ناگوار مناظر کے فوٹو لینے پڑتے تھے۔ اِس سے اُس کو سخت تکلیف ہوتی تھی لیکن وہ استقلال کے ساتھ اپنی خدمات انجام دیتا رہا۔

ایک روز صبح کو جب آتول دکان میں داخل ہؤا، تو اُس نے سُنا کہ سب سے بڑے فوٹو گرافر گوری آپتی کو بخار آگیا ہے اور وہ نہ آئے گا۔ دوسرا آدمی شیلن گاہکوں کی فرمائشوں کو پورا کرنے میں لگا تھا، اُس نے آتول سے بعض موعودہ فوٹو کی کاپیاں جلد تیار کر لینے کو کہا۔

آتول کا چہرہ غصّہ سے تمتمانے لگا۔ لیکن پھر بھی اُس کو حکم کی تعمیل کرنا ضروری تھا۔ اگر اس کے پاس کچھ نقد، کم سے کم دو ہی سو ہوتے تو وہ اس ملازمت پر لات مار کر چلا جاتا اور خود اپنی ایک دوکان کھول لیتا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ نہ صرف تنگدست ہی تھا بلکہ مقروض بھی۔ اس کے علاوہ وہ والدین سے کچھ مانگ بھی نہ سکتا تھا۔

یکایک مینیجر نے اُس کو بلوا بھیجا۔ آتول ڈارک روم (تاریک کمرہ) سے آنکھیں ملتا ہؤا باہر آیا اور پوچھا۔ "جناب! مجھے آپ نے کیوں طلب فرمایا ہے؟"

مینیجر نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اِن کے ساتھ جاؤ اور ......"

آتول نے قطع کلام کرتے ہوئے جواب دیا "لیکن جناب فوٹو کی کاپیاں خراب ہو جائیں گی"

مینیجر نے بے صبری سے سر ہلاتے ہوئے کہا "اُونھ، ہو جانے دو، شیلن فرصت پانے کے بعد انہیں دیکھ لے گا۔ یہ کام بہت ضروری ہے۔ تم کو فوراً جانا چاہئے۔ یہ صاحب انتظار نہیں کر سکتے"

آتول کو تعمیل کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اُس نے کیمرہ اور بیگ اُٹھایا اور اُس آدمی کے ساتھ روانہ ہؤا۔ اس قدر عجلت سے صرف ایک ہی بات اس کی سمجھ میں آتی تھی۔ کہ شاید کوئی مر گیا ہے ورنہ زندہ آدمیوں کا فوٹو لینے کے لئے کوئی ایسی جلدی نہیں کرتا۔ آتول سوچنے لگا کہ اس سے دریافت کر لوں کہ کون مر گیا ہے۔ لیکن وہ اس ڈر سے چپ ہو رہا کہ کہیں اس شخص کو اس سوال سے تکلیف نہ پہنچے۔ جب وہ دونوں سڑک پر پہنچے۔ تو اس آدمی نے پوچھا "کیا آپ ٹریم پر چلیں گے"؟

"کتنی دُور ہے"؟

" ذرا دور ہی ہے! ہم کو برہان نگر تک چلنا ہے "

یہ سنکر آتول اور زیادہ کبیدہ خاطر ہوگیا۔ اور اُس نے کہا " تو جناب ایک گاڑی لے لیجئے " میں یہ تمام بوجھ اُٹھا کر وہاں تک نہیں لے جا سکتا "

فوراً ایک موٹر اُن کے پاس آگئی۔ آتول اس میں اچھی طرح بیٹھ گیا۔ موٹر کو بھی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے ایک گھنٹہ کی ضرورت تھی، اور اس دوران میں وہ ایک مختصر سی نیند بھی لے سکتا تھا۔ لیکن گرد و غبار دھوئیں اور ناگوار بو کی وجہ سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ بیٹھے بیٹھے اپنی قسمت کو کوس رہا تھا، آخر کار موٹر ایک وسیع اور کشادہ میدان میں پہنچ گئی۔ اور ہوا کے خوشگوار جھونکے آنے لگے۔ اُس نے اپنے بالوں کو ہاتھ سے برابر کرتے ہوئے دریافت کیا " کیا اب ہم قریب پہنچ گئے ہیں "؟

اجنبی نے جواب دیا " ہاں! " اور موٹر ڈرائیور سے روکنے کے لئے کہا۔ وہ اب منزلِ مقصود پر پہنچ گئے تھے۔

ایک بہت خوبصورت باغیچہ دار مکان تھا۔ آتول نے سوچا، کہ اس گھر میں رہنے والے یقیناً دولتمند ہونگے۔ ورنہ وہ اتنی دور تک ٹیکسی میں ہرگز نہ آسکتا۔ ایک نوکر دوڑا ہوا موٹر کے پاس آیا۔ اور آتول کا سامان اُٹھا کر لے گیا۔ اجنبی نے کہا " ادھر سے تشریف لے چلئے "

آتول اس آدمی کے ساتھ ایک بڑے اور آراستہ ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ اس کے سامنے ایک خوبصورت باغیچہ اور سبزہ زار تھا، جس میں ایک طرف ٹینس کورٹ بھی بنا تھا۔ اس گھر کے مکینوں کا مذاق بھی بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ سارا گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا، بعض ہنس رہے تھے، بعض باتیں کر رہے تھے۔ اور بعض ہر طرف چل پھر رہے تھے، اس گھر میں رنج و غم کا شائبہ تک نظر نہ آتا تھا۔

جو شخص آتول کو لایا تھا وہ کوٹھے پر چلا گیا تھا، تھوڑی دیر کے بعد واپس آکر اس نے کہا " سب کی یہ خواہش ہے کہ فوٹو باغ میں کھینچا جائے، وہاں روشنی تو زیادہ نہیں ہے "؟

آتول نے کہا " نہیں " بہت ٹھیک ہے، مگر ذرا مجھے یہ بتا دیجئے کہ فوٹو کس مقام پر لیا جائے گا۔ تاکہ میں اپنا کیمرہ اسی جگہ لگاؤں "

باغ کے ایک گوشے میں ایک چھوٹی سی پہاڑی کا کونا آگیا تھا، اس میں سے ایک چشمہ نکل کر جھاڑیوں کے اندر روپوش ہوگیا تھا۔ یہ بہت خوبصورت منظر تھا۔

اب آتول کو یقین ہو گیا کہ اُسے کسی مردہ کی تصویر نہ کھینچنی پڑے گی۔ ایسا خوبصورت اور دلکش منظر ایک غمگین تصویر کشی کے لئے ہرگز منتخب نہیں کیا جا سکتا۔ اب اُس کی رنجیدگی اور برہمی میں بھی کمی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنا سامان ٹھیک کر کے انتظار کرنے لگا۔ اُسے چند آدمی سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان میں دو مرد تھے اور تین لڑکیاں۔ سب سے چھوٹی سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اور سب سے زیادہ خوشنما لباس میں ملبوس تھی۔ اُن کو دیکھ کر آتول نے محسوس کیا کہ یہ خوشنما منظر گذشتہ تمام پریشانیوں کا بدل ہے اور اس لئے اُس کو مسرت ہوئی۔ اس نے سوچا کہ بنگال میں کیسے کیسے حسن کے پیکر موجود ہیں؟

لڑکی کی عمر تقریباً سولہ یا سترہ برس کی تھی۔ وہ بہت حسین اور نازک اندام تھی، لیکن سب سے زیادہ دلکش جو چیز اُس میں آتول کو معلوم ہوئی، وہ اس کی سیاہ اور دراز زلفوں کا جال تھا جس میں اُس کی نگاہیں پھنس کر رہ گئی تھیں۔ آتول نے سوائے تیل کی اشتہاری تصویروں کے اور کسی کے ایسے خوبصورت بال نہ دیکھے تھے، گھنے، لہریلے، بال، برسات کے سیاہ بادلوں کی مانند نظر آ رہے تھے، ایسے سیاہ بادل جو جولائی کے مہینہ میں، آسمان کو ڈھک لیتے ہیں، جب لڑکی نے اپنا رُخ بدلا تو اس کا چہرہ بالوں میں چھپ گیا۔

وہ ایک سبز رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے تھی، جس کے کنارے سرخ تھے اور اس میں گلابی پھول بنے ہوئے تھے۔ آتول یہ دیکھ کر خوش ہوا۔ کہ وہ بہت کم زیور پہنے ہوئے ہے اس کی خوشنما گردن میں پھولوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ اور کلائی میں بھی پھولوں کے کنگن بندھے ہوئے تھے۔ ایک خاتون اس لڑکی کو پکڑے ہوئے لا رہی تھی۔ اُس نے، لڑکی کو ایک طرف بٹھا دیا۔ چند پھول جمع کئے اور ایک خوبصورت گلدستہ بنا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ کچھ پھول جُوڑے میں بھی لگا دیئے۔ اس کے بعد کھڑی ہو کر اس کو دیکھنے لگی۔ وہ اپنی اس جدّت سے بہت مطمئن ہو گئی۔

اس آدمی نے آتول سے کہا" ادھر دیکھئے۔ آپ اس میں کوئی تبدیلی تو نہیں کرنا چاہتے؟"
آتول نے بلا کسی تبدیلی کے اپنا کام شروع کر دیا۔ اُس کو تین رُخوں سے تین تصویریں کھینچنی تھیں۔ اس کے بعد سب لوگ چلے گئے۔ جب وہ پھر ملاقات کے کمرے میں واپس آیا، تو پسینہ سے شرابور ہو رہا تھا۔
اجنبی نے آتول سے کہا" بڑی گرمی ہو رہی ہے۔ کیوں جناب! کیا لیمنیڈ اور برف منگواؤں؟"
آتول نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے اثبات میں جواب دیا۔ ایک نوکر گیا اور بہت جلد برف وغیرہ لے کر واپس آیا۔

پانی پینے کے بعد آتول نے صاحب خانہ سے رخصت کی اجازت مانگی۔

اس نے جواب دیا "بھلا آپ ایسی گرمی میں کیسے جاسکتے ہیں؟ اگر آپ چند لمحے اور توقف کریں تو ہماری موٹر آپ کو اسٹوڈیو تک پہنچادے گی۔ وہ ابھی ذری دیر میں آتی چاہتی ہے۔"

اب آتول کا غصہ اور ساری تھکن کافور ہوچکی تھی، اس نے کہا "یہ آپ کی نوازش ہے مگر مجھے اسٹوڈیو تک پہنچانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ مجھے شام بازار میں اُتار دیں ہیں وہاں سے ٹرم پر چلا جاؤنگا۔"

اُس نے ابھی اپنا جملہ ختم ہی کیا تھا کہ موٹر آپہنچی۔ آتول اپنا کیمرہ لے کر اس میں بیٹھ گیا۔ جب گاڑی روانہ ہوئی تو اس نے کوٹھے کے چھجے کی طرف نظر ڈالی، لیکن وہاں کوئی موجود نہ تھا، اسٹوڈیو پر پہنچ کر اُسے منیجر کے سوا اور کوئی نہ ملا۔ شیلن پہلے ہی کھانے کے لئے جاچکا تھا۔

اُس نے آتول کو دیکھتے ہی کہا "تو پھر میں اب جاتا ہوں، جب شیلن واپس آجائے تو تم کھانے کے لئے چلے جانا۔" اُس نے آتول کا جواب تک نہ سُنا اور چل دیا۔ لیکن چند قدم جانے کے بعد وہ پھر پلٹ کر آیا، اور بولا "تم کو معلوم ہے کہ یہ تصویریں بہت جلد بھیجی جانے والی ہیں۔ وہ لوگ جارہے ہیں۔ اس لئے فوراً کام شروع کردو۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

یہ سن کر آتول کو غصہ آگیا۔ اس نے سوچا۔ یہ دنیا بھی کس قدر عجیب مقام ہے۔ کام، کام، کام، آخر میں بھی گوشت اور خون کا بنا ہوا ہوں، مجھے بھی کھانے اور آرام کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص نے اس حقیقت کو فراموش کردیا ہے۔ مگر بیکار بیٹھنے سے بھی تو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس لئے کام کرنا ہی بہتر ہے۔

جب اس نے تصویر کی پلیٹوں کو دھو کر صاف کیا اور اُن کو دیکھا، تو مسرت کے لہجہ میں بول اُٹھا "کیسی خوبصورت! کیسی اچھی!" یہ تصویریں، قلمی تصاویر سے زیادہ دلکش نظر آرہی تھیں، خود آتول نے کبھی اس سے بہتر تصویریں نہیں کھینچی تھیں۔ وہ ان کو دیکھنے میں اس قدر محو ہوگیا کہ اُسے شیلن کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ اس کو یہ کہتے ہوئے سُن کر چونک پڑا۔ "تم اب جاسکتے ہو۔"

آتول کھانا کھا کر جلد ہی واپس آگیا۔ منیجر بھی اس اثناء میں واپس آچکا تھا، اور پلیٹوں کو دیکھ رہا تھا، آتول یہ دیکھ کر غصہ سے دیوانہ ہوگیا، اور اس نے چاہا کہ منیجر کو ایک طمانچہ رسید کرے لیکن یہ بیسویں صدی ہے۔ اس لئے اس کو اپنی خواہش کو ضبط کر کے رہ جانا پڑا۔

مینجر نے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "بڑی اچھی ہیں! لیکن تم کو تصویریں جلد تیار کرنی چاہئیں گوری پتی سخت علیل ہے اور ایک ہفتہ سے قبل اُس کی واپسی کی کوئی توقع نہیں ہے ممکن ہے کہ وہ تصویریں کل منگوالیں، ان کو نصف درجن تصویروں کی ضرورت ہے۔"

آتول جلد جلد کام کرنے لگا۔ وہ مینجر اور شلین کی طرح چائے پینے بھی نہ گیا۔ لیکن وہ ایک مجرم ضرور بن گیا۔ اس نے تینوں پلیٹوں میں سے ایک ایک تصویر چرالی۔ اور اس روز تھکن کا بہانہ کرکے جلد ہی گھر چلا گیا۔ دوسرے دن اس نے سب تصویریں تیار کرلیں تاکہ شام کو جب کوئی لینے آئے، تو اُسے دے دی جائیں۔ اُس نے اپنی تین تصویروں کو بہت احتیاط سے تیار کرکے، اپنے صندوق کے کپڑوں میں چھپا کر رکھ دیا۔ اور ہر تصویر کے نیچے "جنگل کی پری" تحریر کردیا۔

زمانہ بدستور گزرتا گیا۔ جب آتول تنہا ہوتا تو اکثر "جنگل کی پری" کی تصویریں نکال کر اُن کو بہت توجہ اور حرص کی نگاہوں سے دیکھتا۔ لیکن اس نے اپنے تصور میں بھی کبھی ان تصویروں سے کوئی توقع پیدا کرنے کی جرأت نہ کی تھی ـــــ ایک خوش قسمت آدمی پری کو ایک بار دیکھ تو سکتا ہے۔ لیکن وہ کبھی اُس کو اپنے لئے حاصل کرنے کی توقع قائم نہیں کرسکتا۔ پھر بھی وہ امید کے خلاف آرزوؤں کا ایک سمندر اپنے سینہ میں لئے ہوئے بُرہان نگر گیا۔ لیکن گھر اور باغ خالی تھا سنتری نے اُس سے کہا کہ گھر کے سب لوگ شملہ چلے گئے ہیں۔

اس طرح تین سال گزر گئے۔ اب آتول کی تنخواہ میں اطمینان بخش اضافہ ہوگیا تھا، غریب گوری پتی کبھی بستر علالت سے نہ اُٹھ سکا۔ اور اس لئے اب آتول سب سے بڑا فوٹو گرافر بن گیا۔ شلین نے ناراض ہوکر، بہت دن پہلے ہی اسٹوڈیو چھوڑ دیا تھا۔

ایک روز شام کو آتول چائے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب اس کی ماں چائے لے کر آئی۔ تو اُس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اور بولی۔ "سنو میرے بیٹے۔ میں اب بہت ضعیف ہوگئی ہوں، کیا مجھے کبھی گھر کے کام دھندوں سے نجات نہ مل سکے گی؟"

آتول نے اس کے مطلب کو نہ سمجھنے کا بہانہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "پھر میں کیا کرسکتا ہوں، امّاں جان؟ میں تو اپنا کاروبار چھوڑ کر، آپ کی مدد کے لئے باورچی خانہ میں نہیں آسکتا، کہیئے۔"

اس کی ماں بولی۔ "اُونہہ۔ تم تو ابھی بچے ہو۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ مجھے باتوں میں نہ اڑاؤ۔ آج گنگو لیوں نے پھر دیا سلائی فروش کو میرے مکان پر بھیجا تھا۔"

آتول نے جھنجھلاتے ہوئے کہا "لیکن میں نے سنا ہے کہ اُن کی لڑکی بہت بدصورت ہے"

ماں نے جواب دیا "لڑکے ہمیشہ بیوقوف ہوتے ہیں۔ ایک بنگالی لڑکی پری تو بن نہیں سکتی۔ اس کی شکل تو لڑکیوں کے مانند ہے۔ بلکہ کسی قدر اچھی ہے، اور خانہ داری کے کام سے بخوبی واقف ہے۔ اس کے علاوہ لڑکی والے بہت کچھ جہیز دینے کو کہتے ہیں"

لڑکے نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "آپ کو تو صرف روپیہ کی پڑی ہے، آپ اور کچھ نہیں دیکھتیں۔ آخر اس روپیہ سے کیا حاصل ؟"

ماں نے جواب دیا "تم کو یہ بھی نہیں معلوم ؟ لیکن تمہیں پریشان نہ ہونا چاہیئے روپیہ لے کر میں نہ خرچ کرونگی بلکہ تمہارے لئے محفوظ رکھوں گی۔ اس طرح تم موجودہ ملازمت چھوڑ کر، اپنی دکان علیحدہ رکھ سکتے ہو" ان الفاظ سے آتول بہت متاثر ہوا۔ وہ درحقیقت اس قسم کی غلامی سے تنگ آگیا تھا۔ لیکن جو کچھ اس نے لوگوں سے سُنا تھا، اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ لڑکی بہت بدصورت ہے۔ اس نے اپنی بہن بینا کو بلا کر پوچھا "کیا تم نے گنگولیوں کی اُس لڑکی کو دیکھا ہے"

اُس نے جواب دیا "ہاں دیکھا تو ہے۔ وہ میرے مدرسہ میں پڑھنے آیا کرتی تھی، جب اس کے باپ کا انتقال ہوگیا تو اُس نے آنا چھوڑ دیا"

آتول نے کسی قدر رنجیدگی سے پوچھا "کیا اس کا باپ مر چکا ہے ؟ تو پھر جہیز ملنے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں وہ لوگ ایک کوڑی نہ دیں گے"

بینا بولی "آپ کو تو صرف دولت کی فکر ہے۔ آپ کو گھبرانا نہ چاہیئے۔ وہ یقیناً جہیز دینگے۔ اس کا باپ مرگیا تو کیا ہوا، چچا تو زندہ ہے، اور وہ بہت دولتمند ہے، اس کے علاوہ اُس کے کوئی اولاد بھی نہیں ہے، وہ ضرور اچھا جہیز دیگا"

آتول نے پھر پوچھا "کیا لڑکی بہت بدصورت ہے ؟"

بینا نے جواب دیا "نہیں تو۔ نہ تو وہ کوہ قاف کی پری ہے اور نہ کوئی اژدہا۔ بس ایک معمولی شکل وصورت کی بنگالی لڑکی ہے" آتول یہ سنکر مطمئن ہوگیا۔

آتول کے والدین نے جب دیکھا کہ لڑکا شادی کی زیادہ مخالفت نہیں کرتا، تو اُنہوں نے بعجلت تمام، شادی کا معاملہ طے کرلیا۔ آتول میں نہ تو بہت خواہش تھی، نہ اس کے چہرہ سے جوش مسرت ظاہر ہوتا تھا، بلکہ

وہ دُلہن کو دیکھنا بھی نہ چاہتا تھا۔ پھر بھی اس نے بینا کے ذریعہ سے لڑکی کی تصویر منگوائی۔ اس کا دل، اس تصویر کو دیکھ کر افسردہ ہوگیا۔ تاہم جہیز کے خیال سے ڈھارس بندھ گئی۔

شادی کا دن جلد ہی آپہنچا۔ اور آتول برات کے ساتھ دلہن کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ دُلہن کے گھر پہنچکر اس کا بہت شاندار استقبال ہوا، جس سے اس کو بہت مسرّت ہوئی۔ کم سے کم ان چند گھنٹوں کے لئے تو اس کی حیثیت ایک بادشاہ کی سی تھی، وہ اس وقت تمام دلچسپیوں اور مسرتوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس وقت دُلہن کیا سوچ رہی ہوگی، اس کا نازک دل بلاشُبہ خوف اور مسرت کے جذبے سے زور زور سے دھڑک رہا ہوگا —— اس کا لطیف دل —— جو سوائے آتول کے اور کسی کے لئے نہ تھا۔ لڑکی سیاہ فام ضرور تھی، لیکن اسکا دل، بہت سی خوبصورت لڑکیوں کے مانند حسین، اور اُن کے رخساروں کی مانند تابناک تھا۔

وہ اندر بلایا گیا، شادی کی ابتدائی رسمیں عورتوں میں ہوتی ہیں اور سوائے نوشہ کے تمام مردوں کو باہر کر دیا جاتا ہے۔ آتول تن تنہا عورتوں کی اس راجدھانی میں داخل ہوا۔

وہ ایک رنگی ہوئی چوکی پر بٹھایا گیا۔ اس کے اردگرد عورتیں باتیں کر رہی تھیں، ہنس رہی تھیں، اور چل پھر رہی تھیں، ان عورتوں میں بوڑھیاں بھی تھیں، کمسن بھی، اور جوان بھی اور خوبصورت بھی۔ اُسے تعجب ہو رہا تھا کہ آخر دُلہن کہاں ہے؟ وہ "جلوہ" کی رسم ادا ہونے سے قبل نہ تو دلہن کو دیکھ سکتا تھا نہ دُلہن اُس کو۔ آتول نے سوچا۔ کیا پہلے کبھی اس لڑکی نے مجھے دیکھا ہے؟ شاید اُس نے دیکھا ہو۔ کیونکہ وہ میری بہن کی ہم جماعت تھی، اُس نے موٹر بس کے گھر پر آنے کے وقت جو بینا کو مدرسہ لے جانے کے لئے آتی تھی، مجھے دو ایک بار ضرور دیکھا ہوگا۔

درن کی رسم شروع ہوئی۔ لیکن آتول کی نگاہ اس لڑکی پر پڑی جو اس رسم کو ادا کر رہی تھی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اُس کی فراموش شدہ "جنگل کی پری" تھی، اب وہ سوچنے لگا۔ یہ یہاں کس طرح آئی۔؟ کیوں اس رسم کو خود ادا کر رہی ہے؟ کیا یہ دُلہن کی کوئی رشتہ دار ہے؟ اُس کی پیشانی پر سرخ بندی لگی ہوئی تھی، اور یہ اس وقت آتول کی نظروں میں دوزخ کی چنگاری معلوم ہو رہی تھی، افسوس بدشمتی نے اسکو یہاں، اور پھر ایسے وقت لاکر پھینک دیا تھا، وہ آتول کا خیر مقدم، دوسرے کا دولہا ہونے کی حیثیت سے، بہت پُرجوش انداز سے کر رہی تھی، وہ اُس کو دنیائے تصوّرات و خواب سے ایک نامعلوم مدت کے لئے جلاوطنی کا حکم دے رہی تھی، اور شاید اِس وقت سے اُسے، دل ہی دل میں اس کی پرستش کرنے کا بھی کوئی حق

باقی نہ رہے گا۔

لیکن اب "جنگل کی پری" اپنی اگلی دلکشی، رعنائی اور لڑکیوں کی سی دلربائی سے محروم ہو چکی تھی، وہ بہت سنجیدہ اور متین نظر آرہی تھی، وہ بہت قیمتی ملبوس اور ہیرے جواہرات کے زیوروں سے آراستہ تھی لیکن پھر بھی سنگِ مرمر کا ایک مجسمہ معلوم ہوتی تھی، ایک شخص اس سے محبت تو نہ کر سکتا تھا البتہ کچھ دور سے، اُسے دیکھ کر، اُس کے حسن کی تعریف ضرور کر سکتا تھا۔

عورتوں کی ساری رسمیں ختم ہو گئیں۔ اس نے دلہن کو دیکھنے کی کوشش کی، لیکن نہ دیکھ سکا۔ اس کے دل میں ایک سوزش سی تھی، "جلوہ" کی رسم، اس کی نظر میں، ایک انتہائی ناخوشگوار موقع پر ادا ہونے والی تھی، اور وہ ہوئی ـــــ شادی ختم ہو گئی۔ اور کوئی بات ایسی نہیں ہوئی جس سے اس کی شادی میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی، لڑکی والوں نے مہمانوں کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی، اس کے علاوہ انہوں نے جو کچھ جہیز دینے کا وعدہ کیا تھا وہ پائی پائی ادا کر دیا۔ لڑکی کا چچا بہت سلیم الطبع اور بُردبار آدمی تھا۔ آتول کے عزیز و اقارب نے اس کی بہت تعریف کی کہ کیسا بڑا آدمی ہے لیکن کیسا نیک اور متین۔ لیکن آتول کو اس سے بے حد نفرت ہو گئی تھی، وہ اس کے موٹاپے، اس کے سیاہ رنگ اور اس کی قابلِ نفرت دولت سے سخت متنفر تھا۔ کہ کس قدر بدصورت ہے! خاندان کا خاندان بدصورت! ان لوگوں نے دولت کا جال ڈال کر بیچارے آتول کو پھنسا لیا تھا، وہ اس وقت یہ بھول گیا کہ وہ خود ہی ان کی دولت کے خیال سے متاثر ہوا تھا۔

شادی کی آخری رسم بھی ختم ہو گئی۔ اور اب دولھا دلہن حجلۂ عروسی میں پہنچا دیئے گئے۔ لیکن آتول نے یہاں پہنچکر ناسازیٔ مزاج کا بہانہ کیا، اور دلہن سے کوئی بات نہ کی۔

دوسرے روز آتول دُلہن کو لے کر گھر آیا۔ اُس کے مضمحل اور افسردہ چہرے کی وجہ سے گھر کے تمام شور و غل اور گانے بجانے میں ایک بے لطفی پیدا ہو گئی تھی، باپ نے برہم ہو کر کہا۔ "بیوقوف! بیوی کو محض اس لئے نہیں پسند کرتا کہ وہ سادہ مزاج ہے۔ یہ جاہل لڑکے سوائے جسمانی حسن کے اور کسی بات کو نہیں دیکھتے۔"

ماں نے اپنے بیٹے کی طرفداری کرتے ہوئے جواب دیا "کچھ بھی ہو، ابھی تو وہ جوان ہے اور جوانی میں ہر شخص حسن کا شیدائی ہوتا ہے۔ کیا تم کو اپنی جوانی یاد نہیں۔ ہ تم نے مجھے، کبھی میری سادگی پر طعنہ دینے سے زبان نہیں روکی۔ پانچ لڑکوں کی ماں بننے کے بعد بھی تم مجھے طعنہ دینے سے باز نہ آتے۔ یہ تمام باتیں زمانہ کے ساتھ ساتھ گذر جاتی ہیں۔" یہ سُن کر آتول کا باپ چپ چاپ چلا گیا۔ اس کے لئے کچھ اور کہنے کی گنجایش نہ تھی۔

بینا نے اپنے بھائی کو بلا کر پوچھا "کیا آپ کو دلہن پسند نہیں ہے"؟
اُس نے کسی قدر خفگی سے جواب دیا "اگر تم میری جگہ ہوتیں تو کیا پسند کرتیں"؟
بینا نے ایک متین آدمی کی طرح جواب دیا۔ "یقیناً۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ نیک اور سلیقہ مند ہے۔ آپ سب لوگ محض جذباتی واقع ہوئے ہیں" یہ کہہ کر وہ آتول کا جواب سننے سے پہلے ہی چل دی۔
شادی کی تیسری شب کو آتول بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ جوان لڑکیوں اور عورتوں نے ان دونوں کو جلد ہی تنہا چھوڑ دیا تھا، کیونکہ ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ دولہا نے دلہن کی طرف سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ دلہن بالکل بے حس و حرکت اور خاموش پڑی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ سانس تک نہیں لیتی۔ آتول نے اپنا ایک ہاتھ اُس کے شانے پر رکھ کر کہا "کیا سو گئیں"؟
دلہن نے جواب دیا "نہیں!" آتول دو ایک منٹ تک خاموش رہا۔ پھر پوچھا "کیا تم بتا سکتی ہو کہ جس خاتون نے ورن کی رسم ادا کی تھی وہ کون ہے"؟
دلہن نے جواب دیا "وہ میری چچی جان ہیں" یہ سُن کر آتول کو سکتہ سا ہو گیا۔ اور اُس کا ہاتھ دلہن کے شانے پر سے نیچے سرک گیا۔ اور وہ سوچنے لگا۔ وہ حسین عورت اس بدہیئت موٹے آدمی کی بیوی ہے۔ اور خود اُس کی چچیا ساس ہے۔ ایک قابلِ احترام شخصیت!
تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر پوچھا "کیا یہ تمہارے چچا کی دوسری بیوی ہیں"؟
لڑکی نے آتول کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا "نہیں پہلی بیوی ہیں، اُن کی عمر بہت کم معلوم ہوتی ہے"
آتول یہ سنکر اس قدر حیرت زدہ ہو گیا کہ اس کی زبان سے آواز تک نہ نکلتی تھی۔ اس کے بعد وہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور پھر پوچھا "اُن کی کیا عمر ہے"؟
غریب دلہن نے سوچا۔ کیسا دولہا ہے، آج رات بولا بھی تو سوائے چچی کے اور کوئی بات ہی نہیں کرنی جانتا۔ اُس نے کھڑکی کے پاس جا کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا "اوہ! اُن کی عمر کم سے کم پینتیس برس کی ہو گی۔ وہ عمر میں، میری ماں سے بھی بڑی ہیں"
آتول نے پوچھا "اُن کے کوئی اولاد ہے"؟
دلہن نے جواب دیا "نہیں!" اور تبسم کو چھپانے کے لئے منہ پھیر لیا۔

آتول نے اس کے بعد کچھ نہ کہا۔ دلہن پھر جاکر بستر پر لیٹ گئی۔ اور سو گئی۔ آتول بہت بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

دوسرے دن تمام مہمان اور عزیز و اقارب رخصت ہو گئے۔ لڑکے بھی گذشتہ چند روز کی تھکن کی وجہ سے جلد ہی سو گئے۔ آتول نے دیکھا کہ دلہن اکیلی بیٹھی ہے وہ نہایت خاموشی اور آہستگی سے اندر داخل ہوا۔ وہ گذشتہ تمام واقعات کا خاتمہ دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے صندوق سے تینوں تصویریں نکالیں اور اپنی بیوی کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم ان کو جانتی ہو"؟

لڑکی نے کسی قدر متحیر نگاہوں سے ان کو دیکھا اور بولی "یہ میری چچی ہیں۔ یہ آپ کے پاس کیسے پہنچ گئیں"؟

"میں ہی وہ فوٹو گرافر تھا جس نے یہ تصویریں کھینچی تھیں۔ لیکن کیا تم نے یہ پہلے بھی کبھی دیکھی ہیں؟ یہ کہاں اور کب کھینچی گئی تھیں"؟

لڑکی نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "اُس وقت چچا جان عراق میں تھے، انہوں نے چچی کی تصویر منگوائی تھی، اس لئے یہ تصویریں کھنچوائی گئی تھیں۔ اس سے کچھ ہی پہلے چچی جان نے عورتوں کے ایک ڈرامے میں جنگل کی پری کا پارٹ لیا تھا۔ ہر شخص نے کہا کہ وہ اس لباس میں بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے اُنہوں نے پھر وہی لباس پہنکر تصویر کھنچوائی تھی"۔

آتول یہ سُن کر چلا گیا۔ اور شام کی دھندلی تاریکی میں چاند پال گھاٹ پہنچا، اور تینوں تصویروں کو نکال کر دریائے گنگا میں بہا دیا۔ "جنگل کی پری" اب جا چکی تھی ۔

(سیتا دیوی) **محشر عابدی**

کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے۔ پھر تعجب ہے کہ اکثر عشاق کو اپنے معشوق میں وہ کچھ نظر آتا ہے جو باقی دنیا کو نظر نہیں آتا ۔

گلچیں

آنکھوں کا فسوں

کیسے پھیلاتے ہیں تیری مدبھری آنکھوں نے جال !
میز کی سطحِ درخشندہ کو دیکھ،
کیسے پیمانوں کا عکسِ سیمگوں،
اِس کی بے اندازہ گہرائی میں ہے ڈوبا ہؤا !
ایسے میری روح، میری زندگی،
تیری تابندہ سیاہ آنکھوں میں ہے !
اور پھر پیمانے ہٹ سکتے ہیں یہ ہٹتی نہیں !

قہوہ خانے کے شبستانوں کی خلوت گاہ میں
آج کی شب تیرا دُزدانہ ورُود
عشق کا ہیجان، آدھی رات اور تیرا شباب !
تیری آنکھ اور میرا دل،

عنکبوت اور اس کا بے چارہ شکار!
تیرے ہاتھوں میں مگر لرزش ہے کیوں
تیرے ہاتھوں سے ترا پیمانہ گر جانے کو ہے!
یعنی جیسے اِک جواں ساحر کرے،
اپنے فن کو آشکار
اور اپنے آپ پر اُس کو یقیں حاصل نہ ہو؟

پھر بھی ہے تیرے فسوں کے سامنے مجھ کو شکست
میرے تخیلات، میری شاعری بیکار ہیں!
اپنے سر پر برق کی تنویر کا سیلاب دیکھ
جس سے تیرے چہرے کا سایہ ترے سینے پہ ہے،
اِس طرح اندوہ میری زندگی پر سایہ ریز،
تیری آنکھوں کی درخشانی سے ہے،
سایہ ہٹ سکتا ہے غم ہٹتا نہیں!

آہ، تیری مدبھری آنکھوں کے جال!

سامنے دیوار پر تصویر دیکھ،
یہ اگرچہ چاہے کہ اس کا آفرینندہ کبھی
اس کے ہاتھوں میں ہو مغلوب و اسیر
کیسا بے معنی ہو یہ اس کا خیال
اِس کو پھر اپنی ہزیمت کے سوا چارہ نہیں!
تُو مری تصویر تھی،
میرے ہونٹوں نے تجھے پیدا کیا!
آج لیکن میری مدہوشی کو دیکھ
میں کہ تھا خود آفرینندہ ترا،
پابجولاں میرے جسم و رُوح تیرے سامنے،
اور دل پر تیری آنکھوں کی گرفتِ ناگزیر!
ساحری تیری، خداوندی تری!
عکس کیسا بھی ہو فانی ہے مگر
تیری آنکھوں کا فسوں پایندہ ہے!

ن۔م۔راشد

ایپک یا رزمیہ شاعری اُردو زبان میں

محاکات کے لحاظ سے شاعری کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں - ایک تو وہ اشعار جن میں کیفیات و جذبات کی مصوری مدِ نظر ہو - دوسرے وہ جن میں مادی چیزوں، یا خارجی واقعات کا ذکر ہو - اس دوسری قسم کی شاعری کو عموماً واقعہ نگاری کہتے ہیں اور انگریزی ادب میں اسی کا نام (OBJECTIVE POETRY) ہے - پھر اس واقعہ نگاری کے دو حصے ہو جاتے ہیں ایک کا تعلق ڈرامے اور دوسرے کا ایپک سے ہو جاتا ہے -

دیکھنا یہ ہے کہ اردو شاعری میں ایپک یا رزمیہ شاعری کا واقعی فقدان ہے یا ہمارے شعرا کے ہاتھوں بہ صنفِ شاعری کسی اور طرح جلوہ آرا ہوئی ہے - بیجا نہ ہوگا کہ اس ایپک کی جستجو سے قبل ایپک ہی کے مفہوم کو متعین کر لیا جائے -

ایپک دراصل ایک منظوم قصہ ہے جس میں واقعات کے اعتبار سے، قصہ کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے اکثر دیگر قصوں کا بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے - ان جمع شدہ قصوں میں جو وسعتِ نظری، وسعتِ خیالی نظر آتی ہے - شاید کسی شعبہٴ شاعری میں اس کی مثال بمشکل ہی مل سکے - ان میں مہتم بالشان واقعات بھی ہوتے ہیں، اور بلند مرتبہ مکالمہ بھی، جہاں شاعر کو موقع ملتا ہے کہ مختلف کرداروں کو مشخص اور انہیں کی زبان میں اُن کے خیالات کی ترجمانی کر سکے - اس طرح ایپک بظاہر ڈرامے سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے - لیکن درحقیقت ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے - ایک کے لئے زمان و مکان کی قیدیں ہیں، دوسری کی آزادیاں اس کی متحمل بھی نہیں ہو سکتیں ایک کی کامیابی کا دارومدار اسٹیج کے بناؤ پر ہے دوسرے کا اسٹیج خود ذہنِ انسانی ہے - جہاں گوناگوں خیالات اور اعلیٰ جذبات دماغ کو روشن کرتے رہتے ہیں اور کردار افسانہ اپنے اپنے اثرات ذہن پر کچھ دائمی طور سے چھوڑتے جاتے ہیں ..... اس کے علاوہ ہر ایپک کے لئے خود اپنے زمانہ کے اخلاق و اطوار، علم و ہنر، طور اور طریقہ کا آئینہ ہونا ضروری ہے - اور یہی وہ دقت ہے جو بہ آسانی سر نہیں ہوتی - کسی ادب کو لے لیجئے، ہر صنفِ شاعری میں اشعار کی بہتات ہے - لیکن کسی قابلِ قدر ایپک کا ملنا دشوار ہو جائے گا - یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بہترین ایپک آج بھی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں - ہومر کی ایلیڈ اور اڈیسی، ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ، سنسکرت میں رامائن اور مہابھارت، فارسی زبان میں شاہنامہ - اللہ اللہ خیر صلاح -

اب ذرا ان کی اُن خصوصیات پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے جن کی بناء پر یہ نظمیں اس قدر مشہور ہیں یا ایپک کہے جانے کی مستحق ہیں۔ انگریزی ادب میں دو قسم کی ایپک ملتی ہیں ایک (Epic of growth) "ابتدائی ایپک" جو درحقیقت مختلف دماغوں کی کاوشوں کا یکجائی مجموعہ ہوتی ہیں۔ ان میں اس زمانہ کے قصے، گیت اور اکثر واقعات کا ذکر ہوتا ہے لیکن ایپک کی ایک دوسری قسم جس پر ایپک کا اطلاق صحیح معنوں میں ہوتا ہے (EPIC OF ART) یا "فنی ایپک" ہوتی ہے۔ اس میں ہمیں ایک ہیرو کے کارنامے اور اس کی زندگی کی چلتی پھرتی تصویریں ملتی ہیں، اس ایپک کا ہیرو ایک اعلےٰ شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ یہ اپنے زمانہ کا ایک سربرآوردہ آدمی ہوتا ہے۔ یا اپنی قوم کا پیشوا۔ اس کے عمل پر ایک عالم کی تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے، اس کی ایک لغزش سے ایک قوم کی تباہی کا اندیشہ رہتا ہے اور اس کی دُور اندیشی اور فراست قوم کے لئے باعثِ حیات ثابت ہوتی ہے۔

دوسری خصوصیت ان ایپکس کی حسنِ ترتیب میں نظر آتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح غیر مرتب واقعات سے داستان کا خاکہ تیار کرتے ہیں کہاں سے آغاز کرتے ہیں کن ضمنی واقعات سے گزر کر اصل قصہ تک آتے ہیں، تناسب کو کس حد تک مدنظر رکھتے ہیں۔ کن واقعات پر زور دیتے ہیں، کن کو اُبھارتے ہیں اور کن کو دھندلا چھوڑ دیتے ہیں۔ اخلاقی نتائج کس طرح پیدا کئے جاتے ہیں، پھر جذبات پر کس طرح اثر ڈالا جاتا ہے، کن سادہ اور پُرجوش الفاظ سے، کن استعارات و تشبیہات سے انداز بیان میں بلندی پیدا کی جاتی ہے۔

ایپک کی ایک اور خصوصیت کردار، اور کردار نگاری میں ملتی ہے۔ اس میں مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی، جن میں عزیزداریاں بھی ہوتی ہیں اور بیگانگی بھی، ہر قسم کی محبت کی گرم بازاری ہوتی ہے۔ لیکن ہر کردار ایک خاص شخصیت، ایک مخصوص انفرادیت رکھتا ہے۔ پھر ان کرداروں میں نہ صرف حفظ مراتب کو ہر جگہ مدنظر رکھا جاتا ہے بلکہ ہر کردار میں ایک استحکام ہوتا ہے۔ شریف شریف ہی رہتا ہے اور رذیل کی کم ظرفی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ مثال کے طور پر راماین کے ہیرو کی زندگی کو لے لیجئے جو ایک اعلےٰ شخصیت، پسندیدہ اخلاق اور سچے ایثار کا نمونہ ہے جس کے اردگرد مختلف اشخاص ہیں اور ہر ایک میں اتحاد کرداری پوری طرح موجود ہے۔ ہر شخص کا ایک خاص کیریکٹر ہے۔ اور جہاں بھی اس کردار کا ذکر آتا ہے کریکٹر بدلنے نہیں پاتا۔

چوتھی خصوصیت ان کی واقعہ نگاری میں ملے گی۔ جو کامیاب ایپک میں عام نقائص سے مبرّا نظر آتی ہے۔ ان میں جزئیات کو ایک ماہر فن کی طرح اخذ کیا جاتا ہے اور خصوصیات کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔ اگر کوئی فرضی قصہ بھی ان میں نظم ہوتا ہے تو وہ بھی اس طرح کہ سچ ہو کر سامنے آئے، اور کہیں بھی دو متضاد چیزیں نہ آنے پائیں

کہ قصہ کی صداقت پر حرف آئے۔ مثال کے طور پر شاہنامہ کو لے لیجئے۔ کیکاؤس کا عقابوں کے ذریعہ سے آسمان پر چڑھنا، رستم کا زمین پر گرنا، اور گھٹنوں تک دھنس جانا ناممکن سہی لیکن جس ماحول میں بیان کیا گیا ہے صداقت کا جامہ پہنے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔

ایپک کی آخری خصوصیت اس کا طربیہ انجام ہے۔ ہر رزمیہ نظم اپنے ہیرو کو تکالیف کے بعد منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔ کھوئی ہوئی سلطنتیں مل جاتی ہیں۔ لڑائی میں فتح و نصرت ان کے ہاتھ رہتی ہے۔ اور کامیابی کا سہرا اُن ہی کے سروں پر بندھتا ہے۔

اُردو شاعری میں ان خصوصیات کا اگر کہیں پتہ چلتا ہے تو مرثیہ میں! دیکھنا یہ ہے کہ مرثیہ کہاں تک ان ضروریات کو پُورا کرتا ہے۔

اگر رزمیہ شاعری کا اطلاق اُسکے اصلی معنوں میں ہوتا یعنی اس سے صرف وہ شاعری مراد لی جاتی جس میں بہادری اور شجاعت کا ذکر ہو تو شاید اُردو زبان کے مراثی کے سوا اس کی مثالیں اور کہیں ملنا مشکل ہوتیں لیکن جن معنوں پر لفظ ایپک کا اطلاق عموماً کیا جاتا ہے۔ مرثیہ میں بھی ایک بڑی حد تک ساتھ دیتے ہیں۔ ایپک کی ہر خصوصیت مرثیہ میں جلوہ گر ہے۔ سوائے اس کے کہ اس کا نام ایپک نہیں مرثیہ رکھا گیا، وہ بھی اس وجہ سے کہ ان کا اصل متشاوفت نہ ہونے پائے۔ اسی لئے وہ مرثیے جن میں بَین پر زور دیا گیا ہے کسی طرح ایپک میں نہیں لئے جاسکتے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ میر انیس سے قبل کے مرثیے اس صنفِ شاعری کے تحت مشکل بھی نہیں لائے جاسکتے۔ لیکن انیس نے جو وسعت مرثیہ کو دی، وہ ضرور ہمارے اس نقطۂ نظر سے بھی قابلِ قدر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انیس نے ان شاعرانہ عظمتوں کو حاصل کر کے مرثیے کہے ہیں کہ بَین سے زیادہ مرثیہ کا دیگر پہلو اُن کی شاعرانہ بلندیوں پر شاہد ہے۔ بہرحال ان کے مرثیوں کی وہ خوبی ملاحظہ ہو جہاں وہ ایپک کا ساتھ دے سکتے ہیں۔

مرثیہ درحقیقت نظم شدہ واقعات ہیں۔ اس طرح ان کو ایپک پر وہ فوقیت حاصل ہے جو صداقت کو شاعرانہ صداقت پر حاصل ہے۔ اس کے مہتم بالشان واقعہ سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، اس کے کرداروں کی شخصیت ان کا بلند مرتبہ، اُن کے اظہارِ خیال کے طریقے ہر طرح ارفع و اعلیٰ ہیں۔ جہاں تک ہیرو کی شخصیت کا تعلق ہے شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جس اعلےٰ اخلاق و تہذیب، ایثار و صداقت، صبر، حلم، بُردباری، انصاف اور خلوص وغیرہ کا نمونہ مرثیہ کے ہیرو کی بات بات، اس کے حرکات و سکنات سے ملتا ہے کہیں اور مشکل ہی نظر آئے گا۔ آپ صرف اُن مرثیوں کو لیجئے جو بالخصوص حضرت امام حسین علیہ السلام کے حال میں لکھے گئے ہیں۔ تو اُن کے پڑھنے کے بعد آپ کے ذہن کے سامنے

ایک ایسے شخص کی صورت قائم ہو جائے گی جو بچپن سے معصوم تھا اور اپنی شہادت کے وقت تک معصوم رہا جس کی پسندیدہ سیرت نہ صرف قابل قدر تھی بلکہ قابل تقلید بھی۔ یہ وہ شخصیت تھی جو دنیا اور عقبیٰ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی تھی۔ خاندانی عظمت میں کوئی اس کا ہم پلہ نہ تھا۔ دنیاوی اعزاز کی جگہ حب ایمانی کی جلوہ فرمائیاں تھیں۔ اس کی زندگی تبلیغ و جہاد کی دلچسپ بازی گاہوں میں شہسوارانہ کرتب دکھاتے ہوئے گزری۔ اس نے اپنی عمر کا عزیز ترین حصہ خاندان نبوی صلعم کی لاج رکھنے میں، اُمتِ مرحومہ کو زندہ کرنے میں، اس کی اصلاح میں بہر طور صرف کر دیا۔ عملی زندگی میں، زبان سے، تلوار سے، ہر طرح صداقت کو قائم رکھنے کے لئے جفاکشی کی اذیتیں برداشت کیں۔ اور اس وقت جبکہ دنیا میں اس کے صرف چند مددگار باقی تھے۔ جس وقت شہسواروں اور سُورماؤں کے دل کانپتے تھے۔ اُس نے اپنی جان پر کھیل کے صداقت کی شمع کو روشن رکھا۔ کیا ایسے ہیرو کے کارنامے جس کی زندگی اور حیات نے ایک عظیم الشان تبدیلی پیدا کر دی ایپک کہے جانے کے مستحق نہیں۔ درحقیقت اس نے دنیائے اسلام میں ایک نئی اور دائمی ایپک کا اضافہ کر دیا۔

رزمیہ شاعری کی دوسری خصوصیت حُسنِ ترتیب میں مضمر ہے۔ اس کے لئے صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ انیس و دبیر کا کوئی مرثیہ لے لیجئے اور دیکھ لیجئے کہ کس اہتمام کے ساتھ موضوع کو اُٹھاتے ہیں، کس طرح اس کو ایک مربوط سلسلہ میں جگہ دیتے ہیں اور کس طرح ختم کرتے ہیں، ان مراثی کا ہر بند ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر دست و گریباں نظر آئے گا کہ اپنی جگہ سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ہر بند الگ الگ ایک بڑی ایپک نہیں، کیونکہ ان شعرا کو ایپک نہیں مرثیہ ہی لکھنا منظور تھا لیکن اگر آپ حجم ہی کے متمنی ہیں تو ایک ہی موضوع پر ایک بزرگ کے حال کے ایسے مرثیے جمع کر لیجئے جو ایک ہی بحر میں ہوں اور مختلف واقعات کے ذکر میں ہوں تو یہ شکایت بھی رفع ہو جائے گی۔

کیریکٹر نگاری جو ایپک کی ایک خاص خصوصیت ہے۔ انیس کے مرثیوں میں جس طرح ملتی ہے دوسرے مراثی میں بمشکل نظر آئے گی۔ انیس کا یہ کمال ہے کہ وہ جس شخص کی جو شخصیت قائم کر دیتے ہیں۔ وہ کیریکٹر جب تک خود کردار میں ارتقانہ ہو نہیں بدلتا۔ سو سو طرح ایک کیریکٹر کا ذکر آتا ہے، ہر قسم کی حالتیں پیش آتی ہیں۔ لیکن کسی جگہ اور کسی موقع پر اوصاف بدلنے نہیں پاتے، یہی نہیں بلکہ دوسرے کردار جن کا ضمناً ذکر کیا جاتا ہے کردار نگاری پر پورے اُترتے ہیں۔ واقعہ نگاری جو ایپک کی ایک اہم خصوصیت خیال کی جاتی ہے اور رزمیہ شاعری جس کا جزو ہی مرثیہ میں جس آن بان سے ملتی ہے کہیں اور دستیاب نہیں ہوتی۔ اس سے انکار نہیں کہ جنوبی ہندوستان میں

ولی سے قبل ہی چند مثنویاں رزمیہ انداز میں لکھی گئیں لیکن وہ آج نایاب ہیں اور ان پر کوئی رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ انیس جزئیات کا بادشاہ تھا۔ اور انہیں جزئیات کے صحیح انتخاب نے ان کو ایک کامیاب شاعر بنا دیا تھا۔ لڑائی کی تیاری، معرکہ کا زور و شور، میدان کارزار کا ہنگامہ اور ہلچل، نقاروں کی گونج، گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں، ہتھیاروں کی جھنکار، نیزہ کی لچک، کمانوں کا کڑکنا، اور ان تمام باتوں کو جو میدان جنگ میں ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ لڑائی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ پھر حریفوں کے حملے اور ایک فوج قلیل کا مقابلہ اس زور و شور سے بیان کرتے ہیں کہ سورماؤں کے دل دہل جاتے ہیں۔ شکست اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ اسباب کا نتیجہ معلوم ہو لیکن فتح اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ بہادری اور شجاعت پر بیساختہ نعرۂ تحسین بلند ہوتا ہے۔ پھر اس لڑائی کے ہنگامہ میں عورتوں کی گفتگو، ان کی پریشانیاں، بچوں کی کیفیت اور ان کی معصوم گفتگو کے سچے نقشے بھی پیش کر کے جزئیات کی تکمیل کی ہے۔ اس رزمیہ کے دو چار بند ملاحظہ ہوں۔

فوج کی تیاری اور سامان کی تصویر یوں دکھائی جاتی ہے:-

اُمڈی ہوئی تھی فوج پہ فوج اور دَل پہ دَل ۔۔۔ تھے برچھیوں کے صورتِ مقراض پھل پہ پھل
خنجر وہ جن کی آب میں تھی تلخیٔ اجل ۔۔۔ وہ گرز جن کے ڈر سے گرے دیو منہ کے بل
دو دو تبر تھے پاس ہر ایک خودپسند کے
حلقے میں تھے بچھے ہوئے حلقے کمند کے

وہ دھوم طبلِ جنگ کی وہ بوق کا خروش ۔۔۔ کر ہوگئے تھے شور سے کرّوبیاں کے گوش
تھرائی یوں زمین کہ اُڑے آسماں کے ہوش ۔۔۔ نیزے ہلا کے نکلے سوارانِ درع پوش
ڈھالیں تھیں یوں سروں پہ سوارانِ شوم کے
صحرا میں جیسے آئے گھٹا جھوم جھوم کے

دوسرا موقعہ ملاحظہ ہو:-

دریا کی طرح لشکرِ کیں مارتا ہے جوش ۔۔۔ نیزے ہلا رہے ہیں سوارانِ درع پوش
ھل من مبارز کا ہر اک صف میں ہے خروش ۔۔۔ چلّے کھنچے ہوئے ہیں کمانوں کے تابہ گوش
نیزے تُلے ہوئے ہیں سنانیں چمکتی ہیں
ترکش کھلے ہوئے ہیں کمانیں کڑکتی ہیں

اب ذرا جنگ کا ہنگامہ بھی دیکھ لیجئے :-

نقارۂ وغا پہ لگی چوٹ یک بیک — اٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگا فلک
شہپور کی صدا سے ہراساں ہوا ملک — قرنا پھنکی کہ گونج اٹھا دشت دور تک
شور دہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

گھوڑوں سے گونجتی تھی وہ سب وادی نبرد — گردوں پہ مثلِ شیشۂ ساعت بھری تھی گرد
تھا چرخِ چارمیں پہ رخِ آفتاب زرد — ڈر تھا گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد
گرمی ہجوم فوج سے دہ چند ہو گئی
خاک اس قدر اڑی کہ ہوا بند ہو گئی

تھرا رہا تھا خوف سے مینائے لاجورد — ہلتے تھے کوہ کانپتی تھی وادی نبرد
تھا دن بھی زرد دھوپ بھی زرد اور زمیں بھی زرد — خورشید چھپ گیا یہ اٹھی کربلا میں گرد
اک تیرگی غبار سی تھی چشمِ مہر میں
ٹاپو پڑے ہوئے تھے محیطِ سپہر میں

مرثیہ میں ان خصوصیات کا جائزہ لینے کے بعد بادی النظر میں شاید وہ ضروری خصوصیت مفقود نظر آئے جس کو طربیہ اختتام کہتے ہیں۔ کیونکہ مرثیے دراصل رنج و غم کا آئینہ ہوتے ہیں نہ کہ خوشی کے نغمے، اس طرح ایک عام اعتراض مرثیہ کو ایک شاعری ماننے میں یہ ہوگا کہ چونکہ ہیرو کو لڑائی میں فتح و نصرت نہ ہوئی اس لئے اس کا ہیرو رزمیہ کا ہیرو ہی نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہاں اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ واقعی فتح کس چیز کا نام ہے اور ناکامی کس کو کہتے ہیں۔ تو شاید یہ قباحت بھی رفع ہو جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دنیاوی جاہ و حشم کو حاصل کر لینا ہی کامیابی ہے یا اپنی جان نثار کرکے ایک ایسی شمع کو روشن رکھنے میں کامیاب ہونا جس پر آیندہ قوموں کی حیات کا دارومدار ہے، جس سے آنیوالی ہستیاں روشنی حاصل کرسکیں کامیابی اور نصرت کی دلیل ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسرا نصب العین بلند ہے لیکن اب بھی یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ مذہبی کے شعائر ایمانی کو تازہ کیا جاسکتا تھا، تو زندہ رہ کر شاید اس کو روشن تر رکھا جاسکتا تھا۔ لیکن اسلامی تاریخ کی ورق گردانی بتائے گی کہ اسلام کو اپنی حیات کے لئے زندگی نہیں خون کی ضرورت تھی جس سے اس کی جڑیں از سر نو سینچی جاتیں۔ عزیز ترین ہستیوں کی ضرورت تھی جن کی شہادت اس قدر مہتم بالشان ہو کہ

دلوں کی مہلک آرزوئیں بدل جائیں۔ اگر اس وقت ایک ہیرو اس سخت مرحلہ کو بہ آسانی طے کر لیتا ہے۔ دنیا کی ناپائیدار ثروت سے اس کے قدم ڈگمگا نہیں جاتے۔ تمنائے زندگی اس کی راہ میں دام بچھانے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ اعزہ اور اقربا کی موتیں اس کی بلند نظری کو پستی کی طرف مائل نہیں کر دیتیں تو بے شک وہ اپنے نصب العین میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس کی موت اوراقِ تاریخی میں ایک خونیں حقیقت سہی لیکن اس کا انجام اس کے نقطۂ نظر سے ایک طربیہ انجام کہے جانے کا مستحق ہے۔ اگر وہ اپنے اس اعلیٰ مقصد میں کامیاب نہ ہوتا تو بیشک وہ رزمیہ کا ہیرو نہ ہوتا لیکن اس مشکل ترین جادہ کو اس اطمینان سے طے کر لینے کے بعد کوئی ہیرو اس سے بہتر کامیابی کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ پھر اگر اس کو ایک رزمیہ کا بہترین اور اعلےٰ ترین ہیرو خیال کیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

اس طرح وہ تمام خصوصیات جو رزمیہ کے لئے ضروری ہیں مرثیہ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اگر صرف ان خصوصیات کو معیار مان لیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ مرثیہ بہترین ایپک ہو سکتا ہے۔ مہابھارت لے لیجئے، لیکن وہ مختلف دماغوں کا نتیجہ ہے۔ پیراڈائز لاسٹ کا موضوع، اس میں شک نہیں، بلند ضرور ہے۔ لیکن وہ ہماری دنیا سے ایک الگ چیز ہے۔ قدرتاً ہمیں اس سے فطری ہمدردی پیدا نہیں ہو سکتی۔ شاہنامہ پر بجا طور پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں اشخاصِ قصہ اس قدر ہیں کہ پڑھنے والے کو کسی ایک شخص سے ہمدردی باقی نہیں رہتی۔ راماین کا موضوع بلند بھی ہے اور حقیقت بھی، لیکن اس کا طربیہ انداز مرثیہ کے طربیہ انداز سے بلند نہیں ہو سکتا۔ جہاں فتح نام ہی شہادت کا۔ قربانیٔ نفس کا۔

لیکن مرثیہ ایک ہی دماغ کا نتیجہ ہے۔ ایک مہتم بالشان واقعہ کی تفسیر ہے۔ ایک بلند مرتبہ، اور خلیق ترین ہستی کا آئینہ ہے۔ مخصوص محبت کی شرح ہے۔ اور پھر اس کا اختتام بھی وہ اختتام ہے جو دنیاوی جاہ و حشمت پر نہیں بلکہ تکمیلِ صداقت پر مبنی ہے۔

کیا مرثیہ بہترین ایپک نہیں ؟ ـ

سید حامد حسن بلگرامی

ایم ۔ اے

جو کرنا ہے تجھ کو کر

جو کرنا ہے تجھ کو کر
جو ہوتا ہے ہونے دے
فطرت ٹیڑھی سیدھی ہے
اُس کو ہنسنے رونے دے
جو ہوتا ہے ہونے دے
جو کرنا ہے تجھ کو کر!

ڈر کے قدم کیوں دھرتا ہے؟
جیتے جی کیوں مرتا ہے؟
دب کر بیج اُبھرتا ہے!
دُھل کر رنگ نکھرتا ہے!
پھر کیوں جی کو کھوتا ہے؟
ہونے دے جو ہوتا ہے!
تجھ کو جو کرنا ہے کر!

نام بڑے ہیں لوگوں کے
کام بڑے ہیں لوگوں کے
بکتے ہیں بازار میں، گو
دام بڑے ہیں لوگوں کے
اِن ناموں کا بن نہ گدا
اِن کاموں کو بُت نہ بنا
بن آئے جو تجھ سے کر
سوچ اور پھر بے سوچے کر!

ا۔ ب

بدُعا

ــــــــــ یکایک صاف آسمان کو کالے کالے بادلوں کے ٹکڑوں نے داغدار کرنا شروع کر دیا! بھاری، کالے ڈراؤنے بادل جنگل کے اس پار سے آہستہ آہستہ آکر آسمان کو چھپا رہے تھے۔ ہر طرف تاریکی پھیل گئی! تیز و تند ہوا اُنہیں اِدھر اُدھر ہانک رہی تھی اور وہ غضب آلود ہو کر دوڑ رہے تھے! ہوا انتہائی درشتی اور تیزی سے چل رہی تھی! غبار اُٹھ اُٹھ کر بادلوں سے مل رہا تھا!...... چھپّر اُکھڑ اُکھڑ کر ناچتے چلے جا رہے تھے! بستی میں سراسیگی پھیل گئی! روشن دن یکایک تاریک رات بن گیا! خوفناک تاریکی! ڈراؤنا اندھیرا!

لوگوں نے مکان کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر لئے! خدا کا قہر تھا! لوگوں نے عبادت شروع کر دی! دعائیں پڑھنی شروع کیں! اندھیرا بڑھتا گیا!

بوڑھی شبینہ نے دعاؤں کی کتاب سے آنکھیں اُٹھائیں! سڑک کی طرف دیکھا اور کانپتے دل سے ٹھنڈی سانس لیکر کہا "اوہو!" کچھ دیر تک وہ باہر کی طرف دیکھتی رہی! اس نے اپنا سفید بالوں والا سر ہلایا! اس کا دل خدا کے نور سے معمور تھا!

تاریکی کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی! بادلوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چلا ہی آ رہا تھا! اور ہوا چیختی چلاّتی گرد کے ڈھیر اُڑاتی چلی ہی جا رہی تھی۔

اُس نے کتاب بند کی، چشمہ رکھا اور بیٹی کے کمرے میں پہنچی۔

"بیٹی ذرا........"

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی! کمرہ خالی تھا! شبینہ نے کمرے میں غور سے دیکھا۔ باورچی خانے میں گئی! لیکن کہیں پتہ نہ تھا! آہ! اسی کمبخت الیاس کے یہاں گئی ہوگی! اور میں نے آج باہر جانے کو منع کر دیا تھا!!.....

اس کا چہرہ غصہ سے تمتما اُٹھا۔ اس کی غضب آلود نگاہیں کمرے میں اِدھر اُدھر گھومیں۔ وہ غصہ نکالنا چاہتی تھی۔ کسی کو مار کر! کچھ توڑ کر!.....

آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر انتہائی غیظ میں اُس نے کہا۔

"خدا کرے وہ ناشدنی، نافرمان میری بیٹی نہ رہے!"

اس بددعا نے جو ایسے خوفناک وقت میں اس کے منہ سے نکلی تھی، اُسے ذرا بھی خوفزدہ نہ کیا! اس وقت وہ غضب سے اندھی ہو رہی تھی! اس وقت وہ اس کے بال پکڑ کر اس کے منہ کو طمانچوں سے لال کر دینا چاہتی تھی!

اُس نے اپنی شال کندھے پر ڈالی اور باہر نکل گئی! میں دونوں کو ڈھونڈ نکالوں گی۔ اور دونوں کی خبر لونگی۔

بجلی زور سے چمکی اور بادل گرجے! اور پھر تو چمک پر چمک اور گرج پر گرج شروع ہوگئی! یہ اس سے زیادہ
ہِ کُن! وہ اس سے زیادہ سامعہ شکن!

تمام لوگوں پر دہشت چھا گئی! ایسی چمک! ایسی کڑک! معاذ اللہ! دل سینوں میں کانپ اُٹھے! لیکن بوڑھی شبینہ
خیال تک نہ کیا! ہوا اس کی آنکھوں میں گرد جھونک رہی تھی! اس کا دامن اُڑا رہی تھی، اس کے بال پریشان کر رہی
! لیکن وہ چلی جا رہی تھی! بے تحاشا! ان سب سے بے خبر! وہ نہ کچھ دیکھ رہی تھی! نہ کچھ سُن رہی تھی! اس کے سینہ میں
ـ طوفان تھا! ایک طاقت تھی جو اُسے لئے جا رہی تھی! اس کے سامنے بالکل ... تھی! اس کی آنکھیں سرخ
ں۔ خون آلود! وہ جا رہی تھی! ہوا سے زیادہ تیز! طوفان کو پیچھے چھوڑتی ہوئی! وہ اِدھر اُدھر کچھ نہیں دیکھ رہی تھی!
کھڑکیوں سے جھانکنے والی متعجب آنکھوں کا اس نے کچھ بھی خیال نہ کیا۔ وہ جا رہی تھی اندھا دھند! عناصر کی برہمی
ـ کے دل میں بھی سرایت کر گئی تھی! اس کے سر پر غصے کا بھوت سوار ہوگیا تھا! اس کے دماغ میں صرف ایک
ـ تھی، بددعا! سخت ترین! مہیب ترین!... زبان خاموش تھی لیکن اس کی رُوح، رُوح کا ذرہ ذرہ چیخ رہا تھا!
ج رہا تھا! اور طوفانی بادلوں کی کڑک اس دیوانی رُوح کی گرج کے سامنے کچھ بھی نہ تھی!

وہ الیاس کے مکان میں گھس پڑی، بگولے کی طرح! دروازہ زور سے کھلا اور ٹکرا کر بند ہوگیا! کمرے میں بیٹھے
ـے لوگ اُچھل پڑے!.... اس کی وحشی نظروں نے ہیبت ناک تیزی سے چاروں طرف دیکھا! وہ دونوں میں سے
ئی بھی وہاں نہ تھا! اسی تیزی سے وہ باہر نکلی! لوگ حیرانی سے آنکھیں پھاڑے رہ گئے! جاتے جاتے اس نے
ـمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا "خدا کرے شعلے اس مکان کو چاٹ جائیں!" اور پھر وہ سڑک پر تھی!

بادلوں نے پانی اور اولے انڈیلنا شروع کر دیا! طوفان زوروں پر تھا! شبینہ کے سینہ کا طوفان بھی جوش پر تھا! زمین
ـں کو اپنے پیروں کے نیچے سے غائب معلوم ہو رہی تھی! پانی سے تر بتر تھی لیکن اس کا جنون سرد نہ ہو رہا تھا!...

اس نے ہر جگہ تلاش کی! جہاں کہیں بھی اُسے اُمید تھی وہ گھُس گئی، ہوا کی طرح! بغیر ایک لفظ بولے ہوئے!
یا وہ انہیں ڈھونڈ نکالے گی! زمین کی تہ سے بھی!

وہ دوڑ رہی تھی۔ اور کوستی جارہی تھی! بارش کی طرح بددعائیں اُس کے منہ سے برس رہی تھیں!

آخر کار وہ گھر کی طرف لوٹی۔ شاید مینہ واپس آگئی ہو! اس کے سینہ کا طوفان اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا! ہوا اُس کی چیخوں، اس کی بددعاؤں کے بوجھ سے دبی ہوئی معلوم ہورہی تھی! ہوا کے ایک تیز جھونکے، بجلی کی ایک چمک اور بادل کی گرج کے ساتھ وہ اپنے مکان میں داخل ہوئی! ایک کرسی پر گر پڑی! اُس کے ہونٹ ہل رہے تھے! مکان خالی تھا!

بادل بڑے زور سے کڑکا! جیسے فطرت نے اپنی ساری قوت صرف کردی ہو! ساری بستی کانپ اُٹھی! لوگ خوف کے مارے اپنی اپنی جگہ سے ہل نہ سکے! اس بجلی نے کہاں آفت ڈھائی؟

لیکن شبینہ نے اس گرج کو بھی نہ سُنا! وہ بیٹھی بڑبڑا رہی تھی! آخر وہ اُٹھی اور چیخ کر کہا: "خدا کرے کہ وہ گھر آنے کو زندہ نہ بچے! خدا کرے اس کی لاش اس گھر میں آئے!" اور پھر باہر نکل گئی! ہوا اس کے ساتھ تھی! کبھی جھونکا اسے آگے دھکیل رہا تھا کبھی پیچھے! ہوا خاک کو پانی کے بڑے بڑے قطروں سے ملا رہی تھی! اور اس کی جلتی ہوئی آنکھوں سے گرنے والے کھولتے ہوئے قطروں سے!

وہ بستی سے باہر جانے والی سڑک پر جارہی تھی!

وہ یقیناً سیر کے لئے سڑک کے کنارے والے باغ میں گئے ہونگے! اُس نے کتنی بار دیکھا تھا!....

سڑک پر ہوا اور زیادہ تیز تھی! بادل کی گرج یہاں سامنے والے درختوں میں اور زور سے گونجتی تھی! شبینہ کی نظریں سامنے دیکھ رہی تھیں۔ دُور پانی سے بھیگی ہوئی فضا سے ہوکر! جلی ٹوٹی شاخوں سے راستہ اٹا پڑا تھا! دو چار درخت بھی جڑ سے اُکھڑ کر گرے ہوئے تھے! جلے ہوئے! اس کو بددُعا کے لئے ایک نیا مضمون مل گیا ـــــ "خدا کرے اُن پر بجلی گر پڑے!"

وہ غصہ سے پھنکی، دوڑی جارہی تھی!.....

یکایک وہ ٹھٹکی۔ سامنے دو قدم پر دو انسان پڑے تھے، ایک مرد! ایک عورت! ہاتھ پاؤں اینٹھے ہوئے! آنکھیں اُلٹی ہوئیں! چہرہ بگڑا ہوا! بالکل سیاہ! بجلی سے جلی ہوئی دو لاشیں!

بجلی چمکی اور بادل گرجے! اس نے اپنی لڑکی کو پہچان لیا! اس کے جلے ہوئے چہرے سے نہیں۔ اس کے کپڑوں سے!.... اس کی اُلٹی ہوئی سفید آنکھوں سے نہیں۔ اس کی مجموعی ہیئت سے!

بوڑھی شبینہ کے دل کا طوفان اور بھڑک اُٹھا! اس کی آنکھیں بجلی کی طرح چمکیں! وہ کوسنا چاہتی تھی! بددعا

اس کے منہ سے نکلنا چاہتی تھی!

یکایک اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا! اسے ایسا معلوم ہؤا جیسے پگھلا ہؤا سیسہ اُس کی رگوں میں انڈیل دیا گیا ہو! تکان اور لرزہ سے وہ مغلوب ہو رہی تھی! پانی سے بھیگے ہوئے کپڑے اس کے جسم سے چمٹ کر اُسے نیچے، زمین کی طرف، کھینچ رہے تھے! اس کا دماغ ماؤف ہو گیا!

بادل کی کڑک، بجلی کی چمک، ہوا کا زناٹا زور و شور سے جاری تھا! لیکن بوڑھی شبینہ کے دل میں بالکل سکون تھا! تاریکی! موت! اپنی مردہ لڑکی کے نزدیک وہ گھٹنوں کے بل جھک گئی! اپنے کانپتے ہوئے بازوؤں سے لاش سے لپٹ گئی! اس کی آنکھوں میں دھندلی سی چمک تھی! اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا! بھاری، گلوگیر آواز سے سِسک کر وہ صرف اتنا کہہ سکی:۔

"ہینہ! میری پیاری بیٹی!"......

(ماخوذ از ڈاؤڈینسکی)

تمنائی

تیر اور گیت

میں نے اِک تیر ہوا میں چھوڑا

جا گرا فرشِ زمیں پر وہ کہیں ... کس جگہ یہ مجھے معلوم نہیں

ایسی تیزی سے مرا تیر اُڑا ... کہ نظر دے نہ سکی ساتھ اس کا

میں نے اِک گیت ہوا میں گایا

گم ہؤا جا کے فضا میں وہ کہیں ... کس جگہ یہ مجھے معلوم نہیں

ہے بھلا ایسی سماعت کس کی ... دوڑ میں گیت کا پیچھا کرتی

سالہا سال گزر جانے پر

میں نے وہ تیر دوبارہ دیکھا ... ایک برگد کے تنے میں تھا گڑا

اور وہ گیت مرا سب کا سب ... دل میں اِک دوست کے موجود ملا

لانگ فیلو

سید محمد سلیم واسطی

بادہ و پیما

...ٹھ کہ اب خاتمۂ دورِ خزاں ہے ساقی
عالمِ آسودۂ آشوبِ زماں ہے ساقی

...وجزن ہر رگِ خاشاک میں پھر خونِ حیات
یعنی پھر عالمِ ایجاد جواں ہے ساقی

...پھر ابھرنے لگی تخلیق کی ڈوبی ہوئی نبض
رنگ اور نور سے تعمیرِ جہاں ہے ساقی

...پھر اٹھا قلبِ عناصر میں طرب کا طوفاں
رو کشِ خلد جھباں گذراں ہے ساقی

...آج ہر ذرّہ ہے سرچشمۂ رنگینیٔ حسن
آج ہر ریشۂ خس شاخِ جناں ہے ساقی

آج ہر غنچہ ہے اُلجھی ہوئی کرنوں کی گرہ
ہر پرِ کاہ رگِ کاہکشاں ہے ساقی

وہ اُمنڈتا ہوا گھرا سا دھندلکا سرِ کوہ
آتشِ لالۂ صحرا کا دھواں ہے ساقی

شرمِ نظارہ سے سمٹے ہوئے جلووں کا ہجوم
بزمِ گلشن میں تبسّم بدہاں ہے ساقی

دیکھ کر خاک پہ یہ فیضِ ہوا عالمِ قدس
آج انگشتِ تحیّر بدہاں ہے ساقی

وہ تجلّی جسے تھا عجزِ تخیّل پہ غرور
آج اِدراک کے پردہ میں نہاں ہے ساقی

دشِ گل، موجِ صبا، جلوۂ حُسنِ خوباں
وجہِ بالیدگیِ رُوح و رواں ہے ساقی

رقِ طوفانِ مسرّت ہیں چہ دنیا و چہ دیں
جوشِ مستی میں یقیں ہے نہ گماں ہے ساقی

اٹھ کہ یک موجِ صبا بیش نہیں عمرِ نشاط
فصلِ گل ہم سفرِ ابرِ رواں ہے ساقی

وہ مئے تلخ پلا پرتوِ رنگیں جس کا
غازۂ عارضِ شیریں دہناں ہی ساقی

جس کی خم کھائی ہوئی موج کی ہر جنبشِ نرم
باعثِ لرزشِ تارِ رگِ جاں ہی ساقی

جس کی ہر بوند کی ترکیب کا اِک جزوِ حقیر
خونِ صد شاہرگِ برقِ تپاں ہی ساقی

جس کے ساغر کو سرِ بزم جو گردش آجائے
دو جہاں مملکتِ بادہ کشاں ہی ساقی

بادۂ کہنہ، شبِ ماہ، مغنیِ حسیں
سرِ کہسار متاعِ دو جہاں ہی ساقی

مئے پارینہ و معشوقۂ نوخیز بغیر
زندگی مخمصۂ سُود و زیاں ہے ساقی

تجھ سے ممکن ہو تو اِس بوجھ کو ہلکا کر دے
زیست بے رطلِ گراں بارِ گراں ہی ساقی

ریاض عبّاسی

طب عربی

طب اور خلفائے اسلام

طبی کتب خانے اور دار التراجم

سلاطینِ اسلام کے عہد میں طبی کتب کے ترجمہ کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ اور خلفائے بنی عباس میں سے مامون الرشید نے ۲۱۳ھ میں نہایت وسیع پیمانہ پر ایک دار الترجمہ قائم کیا تھا۔ اور اس کے لئے یوحنا ابن ماسویہ۔ حنین ابن اسحاق اور دیگر مقتدر علماء اور حکماء کی خدمات حاصل کیں۔ یہ دار الترجمہ بعد کے خلفاء المعتصم۔ المتوکل اور المقتدر کے زمانوں میں بھی قائم رہا۔ حنین بن اسحاق اس محکمہ کا افسرِ اعلیٰ تھا۔ اس دار الترجمہ میں یونانی کتب کے ترجمہ کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ یونانی کتب کے علاوہ ایرانی اور ہندی زبان کی کتب بھی ترجمہ کی جاتی تھیں۔

دار الترجمہ کے علاوہ طبی لائبریریاں بھی قائم تھیں جن میں طب پر بے نظیر کتابیں فراہم کی گئی تھیں اور اطباء کے شغفِ مطالعہ اور ذوقِ علمی اور شاہانِ عرب کی علمی سرپرستیوں کا یہ شاندار نتیجہ تھا کہ بغداد میں طب کے متعدد سرکاری وغیر سرکاری کتب خانے معرض وجود میں آئے۔

فخر الدین ماروینی المتوفی ۵۹۴ھ کا کتب خانہ بہت بڑا تھا۔ اُس نے اپنی وفات سے قبل یہ کتب خانہ ماروین کے ایک ممتاز کتب خانہ میں شامل کر دیا تھا۔ امین الدولہ ابن التلمیذ کا کتب خانہ اس سے بھی زیادہ شاندار تھا اس کی وسعت کا اندازہ لگانے کے لئے یہ امر کافی ہے کہ جب مجد ابن صاحب وزیر نے اس کا کتب خانہ منگوایا تو اس کی کتابیں بارہ اُونٹوں پر بار ہو کر آئیں۔

اطباء کے مواجب و وظائف

علاج کے سلسلے میں شاہانِ اسلام اطباء کی بیحد قدر و منزلت کرتے تھے اور انہیں گرانقدر مشاہرے عطا کئے جاتے تھے۔ شریف شرف الدین اسمٰعیل کی ماہانہ تنخواہ جو علاء الدین محمد خوارزم شاہ کے دربار کا عالی مرتبت طبیب تھا ایک ہزار درہم تھی۔ جبریل بن بختیشوع کی ماہانہ آمدنی دس ہزار درہم تھی۔ ماسویہ کو خلیفہ ہارون الرشید کے خزانۂ عامرہ سے دو ہزار درہم وظیفہ ملتا تھا۔ ابو البیان ابن مدّور کو سلطان صلاح الدین کے دربار سے چونتیس دینار کی رقم ماہانہ پنشن کے طور

پر ملتی تھی اور یوسف واسطی کے شاگرد جبریل ابن عبید اللہ ابن بختیشوع کو تین سو درہم کے سرکاری مشاہرہ کے علاوہ اُس کے موروثی شفاخانہ کے لیئے تین سو درہم ماہانہ کی شاہانہ امداد تھی۔

جبریل ابن بختیشوع کی آمدنی بہت زیادہ تھی۔ اس نے اپنی بست و سہ سالہ طبی سرگرمیوں کے دوران میں لاکھوں روپیہ کمایا اور اپنے بعد بے شمار دولت چھوڑ گیا جس کی تفصیل اُس کے اپنے وصیت نامہ سے معلوم ہوتی ہے جس میں اس نے اپنی تمام املاک و دولت کا وارث اپنے فرزند کو ٹھیرا[یا] تھا۔

یہ تفصیل بقول مولف تاریخ الاطباء حسب ذیل ہے :۔

(۱) عوام سے ہر ماہ دس ہزار درہم فیس کے طور پر وصول ہوتے تھے۔ تیئیس سال میں ۲۷ لاکھ ۶۰ ہزار درہم۔

(۲) عوام کی طرف سے تحائف کی شکل میں پانچہزار درہم ماہانہ۔ تیئیس سال کی آمدنی ۱۳ لاکھ ۸۰ ہزار درہم۔

خواص سے جو رقوم حاصل ہوئیں اُن کی تفصیل :۔

(۱) ہر سال ماہ محرم میں پچاس ہزار درہم نقد۔ تیئیس سال کی آمدنی ۱۱ لاکھ ۵۰ ہزار درہم۔

(۲) ملبوسات کی شکل میں ہر سال پچاس ہزار درہم تیئیس سال کی میزان ۱۱ لاکھ ۵۰ ہزار درہم۔

(۳) خلیفہ مامون الرشید کی فصد کھولنے کی فیس پچاس ہزار درہم فی فصد کے حساب سے سالانہ آمدنی ایک لاکھ درہم۔ تیئیس سال کی آمدنی ۲۳ لاکھ درہم۔

(۴) بسلسلۂ معالجۂ خلیفہ موصوف ایک لاکھ درہم سالانہ۔ تیئیس سال کی آمدنی ۲۳ لاکھ درہم۔

(۵) امراء و اعیان سلطنت اور مصاحبین دربار کی طرف سے بشکل تحائف سالانہ ایک لاکھ درہم۔ تیئیس سال کی آمدنی ۲۳ لاکھ درہم۔

کل میزان ۔ ۱ کروڑ ۳۴ لاکھ ۸۰ ہزار درہم۔

اِن رقوم خطیرہ کے علاوہ اُسے تیئیس سال کے دوران میں ۷ لاکھ دینار اور ۲ لاکھ درہم سالانہ کی مزید آمدنی ہوتی جس میں جائداد کا کرایہ اور فراموش شدہ رقوم نذرانہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔

مؤلفین کی تنخواہیں

معالجین کی طرح مولفین اور مترجمین کے لئے بھی علیحدہ سرکاری مشاہرے مقرر تھے اور یہ تنخواہیں حسب قابلیت دی جاتی تھیں اور بعض اوقات ایک شخص کو کئی کئی شعبوں اور مدّوں سے وظائف ملتے تھے چنانچہ علیلی رقّی کو سیف الدولہ کے خزانہ سے ایک تنخواہ بسلسلۂ تراجم۔ ایک مشاہرہ بوجہ طبی فضیلت اور دو دو دوسرے وظائف بعض دیگر علوم میں مہارت

کے باعث عطا کئے جاتے تھے۔

مامون الرشید حنین بن اسحاق کو ہر طبی کتاب کے ترجمہ کے صلہ میں اس کے ہموزن سونا عطا کیا کرتا تھا۔

جیل خانوں کے معالج

خلفائے اسلام کے زمانہ میں جیل خانوں کا انتظام طبی نہایت معقول تھا اور قیدیوں کی حفظِ صحت کے لئے بھی خاص اہتمام کیا جاتا تھا جس کا ثبوت اس تاریخی واقعہ سے ملتا ہے کہ ایک مرتبہ سلطنت میں ایک سخت بیماری پھیل گئی۔ اس کی ہلاکت آفرینی سے متاثر ہوکر دولت عباسیہ کے وزیر علی بن عیسٰی جراح نے سنان بن ثابت کو قیدیوں کی خبرگیری کے لئے مقرر کیا اور بیمار قیدیوں کے لئے خزانۂ شاہی سے ایک گرانقدر رقم عطا کی تاکہ اُن کے لئے دوائیں اور دیگر ضروری سامان مہیا کیا جاسکے۔

سنان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ ہر روز جیل خانوں کا معائنہ کرے اور بیمار قیدیوں کا علاج نہایت توجہ سے کیا جائے۔

صحت عامہ کی رپوٹیں

اطبّاء بلاد اسلامیہ میں سلطنت کے طبی نظامات کے ماتحت دورِ حاضر کی طرح صحت عامہ کی رپوٹیں مرتب کیا کرتے تھے۔ اور وہ ملک میں شائع کی جاتی تھیں۔ چنانچہ ثابت بن سنان المتوفی ۳۶۳ھ نے خلیفہ الطائع للّٰہ کی حکومت اور اس کے حالات و سوانح پر جو کتاب لکھی ہے اِس میں اُس نے جابجا اپنے معالجات کے متعلق یادداشتیں درج کی ہیں اور طبی رپوٹیں ذکر کی ہیں۔ جو طبی معلومات کا بیش بہا خزانہ ہیں۔

ابن بُطلان اپنی سالانہ طبی رپورٹ کے دوران میں رقمطراز ہے:۔

"۴۴۶ھ کے موسم گرما میں قسطنطنیہ پر وبا کی مصیبت نازل ہوئی اور اس قدر کثرت سے موتیں ہوئیں کہ قبرستانوں میں مُردوں کی تدفین کے لئے گنجائش باقی نہ رہی۔ صرف ایک گورستان لوقا میں بارہ ہزار مُردوں کی تدفین عمل میں آئی۔ اسی سال دریائے نیل میں طغیانی آئی اور جب وہ کم ہوئی تو تمام مصر میں متعدی امراض پھیل گئے ورم طحال اور نوبتی بخار وغیرہ نے ایک اندھیر مچادیا۔ شام میں بکثرت اموات ہوئیں۔ شہر فسطاط کے اکثر باشندے ہلاک ہوگئے یہ وبا اس قدر سخت تھی کہ مصر و شام بڑی حد تک ویران ہوگئے۔ اور ان کے ہلاکت آفریں اثرات عراق تک جا پہنچے"۔

ہماری رائے میں یہ ملیریا کی سالانہ رپورٹ ہے جیسا کہ اس سے ظاہر ہو رہا ہے ÷

سیّد علی احمد نیّر واسطی

غزل

جاگے ہیں بخت عجز و نیاز و دعا کے بعد
وہ مہرباں ہوئے ہیں بڑی التجا کے بعد

پایا نہ بندگی کا مزہ زندگی میں کچھ
اے بُت تجھے بھی پُوج کے دیکھا خدا کے بعد

تمہیدِ التفات ہے اُن کی یہ بے رُخی
شوخی کے دن بھی آئینگے شرم و حیا کے بعد

دنیا میں غم نہ ہو تو خوشی کا مزہ نہیں
مہر و وفا کا لطف ہے جور و جفا کے بعد

داغِ جگر کا رنگ بھی دلکش ضرور ہے
لیکن نمک میں خالِ رُخِ دلرُبا کے بعد

بیزار ہوں وفا سے مگر یہ نہیں قبول
وہ بے وفا کہے مجھے ترکِ وفا کے بعد

کیا پھر گئے وہ غیر سے کیا میرے دن پھرے
تسکین سی آج دل کو ہوئی ہے دُعا کے بعد

ناصح اُسی کے ذکر پہ ختمِ کلام ہو
یہ تک تو جامِ زہر ہے دل کی دوا کے بعد

دیکھا بھی حسن چاہ کی کوشش بھی کی مگر
بھائے کسی کے ناز نہ اُن کی ادا کے بعد

جیسا بھی دردِ عشق ہو جینے کا لطف تھا
کیا زندگی وبال ہوئی ہے شفا کے بعد

لائے نہ صدق کو وہ نظر میں خدا کی شان
جو بُت اُسے عزیز ہوا اپنے خدا کے بعد

صدق جائسی

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنّا کون کرے
یہ دُنیا ہو یا وہ دُنیا اب خواہشِ دُنیا کون کرے

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنّا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنّا کون کرے

وعدہ تو وفا تم سے نہ ہوا لیکن مجھ پر الزام رہا
گر جھوٹا ہوں جھوٹا ہی سہی اب تم کو جھوٹا کون کرے

ہاں وادیٔ ایمن بھی ہے وہی۔ ہاں برق کا مسکن بھی ہے وہی
اور ہوش کا خرمن بھی ہے وہی پر اُن سے تقاضا کون کرے

جو آگ لگائی تھی تم نے اُس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اُس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

دُنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دُنیا کو
دُنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب دُنیا دُنیا کون کرے

معین احسن جذبی

خالہ زاد بہن

(ماموں زاد بہن، پھوپھی زاد بہن، چچا زاد بہن، اور آس پاس کی اسی قسم کی دوسری بہنیں)

کتنا پیارا نام ہے! اس لئے کہ ایک شعر انگیز ہستی کا نام ہے!

رفیقِ زندگی ہو نہ ہو، رفیقِ طفلی یہی ہے!

اِس سے آغاز ہوتا ہے!

اِس کا نشہ دو آتشہ ہے!

مہدی افادی کو آخر دم تک اس بات کی شکایت رہی کہ ہمارے ادبیات خالہ زاد بہن کے ذکرِ رنگیں سے خالی ہیں۔
ضمون اُن کی رُوح کو ثواب پہنچانے کے واسطے لکھا گیا ہے۔ اسے مرحوم کے باقیات الصالحات میں شمار کیا جائے۔

یں چھوٹا سا تھا۔ کوئی بارہ برس کا۔ محرّم کی چھٹیوں میں ابّا خالہ کے ہاں جانے لگے۔ میں نے کہا "مجھے بھی لے
چلیئے۔" میرے پاس ٹوپی نہ تھی۔ اور اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ اور لے لیتے۔ ابّا کی پرانی کلاہ پر ململ کی بڑی سی پگڑی باندھ
۔ وہاں پہنچے، تو پہلے میں اوپر گیا۔ خالہ۔ میری خالہ زاد بہن رُوحی (آٹھ نو برس کی) اور پڑوس کی دو تین عورتیں بیٹھی
تھیں۔ میں سلام کرکے کھڑا ہو گیا۔ اُٹھ کر پیار کرنے کے بجائے پہلے تو خالہ حیران ہو کر میرا منہ تکنے لگیں۔ پھر کہا "بیٹا تم
ن ہو؟" میں سمجھ گیا۔ عمامہ سر سے اتارتے ہی کو تھا کہ روحی نے بائیں ہاتھ سے خالہ کے منہ کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے
"یہ بھائی وقار ہیں!" میرے دل میں ایک لطیف سا ہیجان پیدا ہو گیا ——— ایسا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ عمر
پردے اُٹھ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔ اور کتنی ہی دیر تک پیار بھری نظروں سے میں اُس
طرف دیکھا کیا۔ ہاں، اُس لمحے سے، روحی میری روح کے قریب تر ہوتی چلی آئی ہے! اُس کی وہ پہلی دل میں اُتر
نے والی بات آویزۂ دل ہو گئی!

اب میرے لئے روحی اور خالہ اور منٹگمری میں ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اکثر اُن کا ذکر میری زبان پر رہتا۔
دو چار چھٹیاں ہوتیں، جی چاہتا اُڑ کر وہاں پہنچوں۔ پورے ڈھائی سال کے بعد وہاں جانے کا موقع ملا، تو خوشی کے
ت سے میرا دل معمور تھا۔ لاہور اسٹیشن، پلیٹ فارم نمبر ۱، کراچی میل، جنونِ مسرت اور سکونِ روح کے کیا کیا سامان لئے

ہوئے تھے! جب ادھر سے گزرتا ہوں، وہ باتیں یاد آتی ہیں، اور دل ہولے ہولے دھک دھک کرنے لگتا ہے۔

وہاں مجھے ایک مہینے کے قریب ٹھہرنا تھا۔ دوپہر کو، خالہ جان، روحی کا چھوٹا بھائی، اور میں کھانے کی چوکی کے تین طرف روحی کے انتظار میں بیٹھ جاتے۔ پانچ سات منٹ میں وہ اسکول سے آجاتی۔ مارے گرمی کے گھبرائی ہوئی۔ دھوپ میں چل کر آنے سے رخسار تمتمائے ہوئے، پسینے میں ڈوبی ہوئی۔ وہ ہمارے ساتھ بیٹھ جاتی۔ کبھی میرے سامنے، کبھی میرے ساتھ، میں اب بھی تصور میں وہیں بیٹھا اس چھوٹی سی روحی کو دیکھ رہا ہوں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پکے ہوئے انگوروں سے رس ٹپک رہا ہو۔

"گزاری ہیں خوشی کی چند گھڑیاں ‏ ‏ ‏ اُنہیں کی یاد میری زندگی ہے"

ایک روز میں نے اُس سے کہا "روحی، ذرا پانی دینا" اک سادگی، اک معصومیت سے اُس نے کہا "جی اچھا" میرے دل کو دوسرا آویزہ مل گیا!

پھر جانا ہوا، تو روحی چودھویں سال میں تھی! تین روز ٹھہرا۔ وہاں میں نے ایک شام گزاری ـــــ رومانوی، افسانوی نغموں اور نظاروں کی ایک نہ بھولنے والی شام! میں صحن میں کھانا کھا رہا تھا۔ وہ میری طرف منہ کئے باورچی خانے میں خالہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ خالہ کو مخاطب کر کے اور روحی پر نظریں جما کر میں زمین و آسمان کی باتیں کرنے لگا۔ جانے کونسی قوت میرے اندر کام کر رہی تھی۔ ایسی ایسی باتیں سوجھتی گئیں کہ روحی ہنستے ہنستے دوہری ہوئی جاتی تھی۔ اُف، وہ دلرُبا، وہ دلنشیں قہقہے، بہشتی نغمے جن کے آگے مات ہوں! پھر بات بات پر اُس کا میری طرف دیکھ کے ہنسنا! ایسی داد کبھی ملی ہے کسی کو! ایک بار نظریں مل گئیں۔ بجلی کی طرح تڑپتی ہوئی کوئی شے دل میں اُتر گئی۔ اب میں نے جانا کہ نگاہِ غلط انداز کسے کہتے ہیں۔

میں نے آواز دی "روحی، ذرا پانی دینا" شرمائی ہوئی مسکراہٹوں کے ساتھ اُس نے جواب دیا "جی اچھا!" گلاس پکڑتے ہوئے قصداً میں نے اُس کا ہاتھ چھو لیا۔ اُسکی انگلیاں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح گرم تھیں۔ یہ آگ ازل سے ابد تک کے ہر چاہنے والے دل کی حرارت لئے ہوئے تھی۔ یہ پانی نہیں، جامِ مے تھا جس میں بہار کی مستیاں اور ساون کی بجلیاں بھری ہوں!

چہل قدمی سے واپس آیا، تو روحی چھوٹی بہن کو سُلا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اپنے سرخ ریشمیں دوپٹے کو سنبھالتی ہوئی وہ اس طرح اُٹھی جیسے شفق کی روشنی میں چودھویں کا چاند طلوع ہوتا ہو!

ایک روز باتوں باتوں میں بہن کہنے لگیں "تم باہر جاتے ہوئے کپڑوں کا ذرا خیال نہیں کرتے۔ روحی کہتی تھی۔ "بھائی وقار نرا قمیص پہنے ہوں تو زیادہ اچھے نہیں لگتے لیکن کوٹ اور ٹوپی کے ساتھ بہت ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں"۔ میں وہاں جاؤں، یا روحی یہاں آئے، ہزار گرمی ہو، کوٹ اور ٹوپی کے بغیر اب مجھے کوئی نہیں دیکھے گا! میں نے کہا "روحی مجھے اتنا پسند کرتی ہے، تو اس کے ساتھ بیاہ کیوں نہ کر لوں"؟ کہنے لگیں "میں اُس کو حقیقی بہنوں کی طرح چاہتی ہوں لیکن

اُسے بھاوج بنانا مجھے پسند نہیں۔ میری ہمیشہ سے یہ آرزو رہی ہے کہ تمہارے لئے بے حد خوبصورت دُلہن لاؤں۔ اور روحی پر تو حُسن کا پرتو تک نہیں پڑا۔ سر چھوٹا سا، بال بہت ہی تھوڑے، ناک گھوڑے کی طرح، ٹانگیں کلنگ ایسی، بیٹھتی ہے تو گھٹنے سر سے اُونچے ہوتے ہیں، گرمیوں میں دس دس دن بغیر نہائے اور سر دھوئے گزر جاتے ہیں چغل خور اتنی کہ خدا کی پناہ۔ تمہیں کچھ ہو گیا ہو تو لے آؤ اُس کو۔ میں تو کبھی نہیں مانوں گی۔ ہاں، اور دونوں آنکھوں سے بھینگی"۔

خدایا!

اور روحی کو میں نے کنواروں کی نگاہ کے بجائے سائنسدان کی نظروں سے دیکھا، تو یہ سب کچھ صحیح تھا! میں سمجھتا تھا اُس کا رنگ سونے کی طرح ہے! ماہتاب آسا! اب معلوم ہؤا کہ کالے رنگ میں دیہاتی خون دمکتا تھا۔ میں اُسے غنچہ دہن کہا کرتا تھا، بے اختیار جسے چومنے کو جی چاہے۔ بات یہ تھی کہ اُس کا نچلا ہونٹ کسی قدر لٹکا ہؤا تھا! میں نے شکر کیا کہ محبت کے دھوکوں سے جلد ہی نجات مل گئی۔ اور فیصلہ کر لیا کہ بہن کو دکھائے بغیر اب کسی لڑکی کو نہیں چاہنے کا۔

میں اوپر کھڑا تھا۔ مکان کے سامنے تانگہ رُکا۔ خالو جان، اور —— خالہ؟ ابھی سیڑھیوں میں تھا کہ برقع پوش سامنے آگئی، اور رومال اُٹھا دیا۔ روحی! —— ایک جھلک میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا! خیال و خواب کی دنیا!

لیلےٰ کالی تھی، اور مجنوں نے اُس کے عوض قاف کی پریاں لینا قبول نہ کیا! بہن روحی میں نقص نکالتی ہے۔ ‌یرے لئے تو وہ یکسر شعریت، سراپا سحر، جمالِ مجسّم ہے! حُسن وہ ہے جو مجھے بے خود بنا دے، یا جسے لوگ اچھا کہیں! ‌بات روحی میں ہے، وہ اپالو بندر کی پارسنوں میں ہے نہ کشمیر کی برہمن زادیوں میں! روحی، میں تجھ کو چاہتا ہوں!

‌وحی! میں تجھ کو یاد کروں گا!

‌جی میں آتی ہے کہ جس پرچہ میں یہ مضمون چھپے رسالے کے دفتر کی طرف سے بطورِ نمونہ وہ خالہ کے گھر بھجوا دُوں۔ ‌خفا نہ ہوں؟ روحی کے سوا کون جانتا ہے کہ یہ سچ مچ کی باتیں ہیں! وہ بتا نہ دے؟ وہ کیا بتائے گی! اور وہ ‌وں بتانے لگی ہے!

یہ مضمون ایک خط ہے، ہر خالہ زاد بھائی کی طرف سے اُس کی خالہ زاد بہن کے نام!

میری کوئی خالہ نہیں۔ خدایا، آسمان سے ایک خالہ زاد بہن میرے لئے بھیج دے!

"ابنِ مریم"

دُعائے وصال

الہ آباد (پریاگ راج) میں گنگا جمنا کے سنگم پر

(کشتی رانی کرتے ہوئے)

واصلِ گُل ہو شمیمِ گُلِ رعنا جیسے!
حجلۂ ساز میں خوابیدہ ہو نغمہ جیسے!
شوخیٔ موج ہو، دامن کشِ دریا جیسے!
کبھی ہم تم بھی ملیں ——— کاش! یُونہی اے پیارے!

جب گُل افشاں ہو بہارِ چمن آرائے شفق
خلدِ آوارہ ہوں جب، گیسُوئے لیلائے شفق
دستِ خورشید ہو، اور دامنِ عذرائے شفق
کبھی ہم تم بھی ملیں ——— کاش! یُونہی اے پیارے!

ہوں حبابوں سے بغل گیر نجومِ خوشتاب

موج و ساحل ہو بہم صورتِ ساز و مضراب
سینۂ آب پہ ہو لیلیٰ شب رفتہ خواب
کبھی ہم تم بھی ملیں ـــــ کاش! یونہی اے پیارے!

دلِ شبنم میں فروزاں ہو شعاعِ خورشید
شوقِ نرگس میں فلک سے اُتر آئے ناہید
خاک سے نور کرے عہدِ وفا کی تجدید
کبھی ہم تم بھی ملیں ـــــ کاش! یونہی اے پیارے!

جیسے آفاق میں ہوں ـــــ شام و سحر دوش بدوش!
خلوتِ راز میں ہوں شمس و قمر دوش بدوش!
جیسے ہوں ـــــ منظر و پروازِ نظر دوش بدوش!
کبھی ہم تم بھی ملیں ـــــ کاش! یونہی اے پیارے!

جیسے دل، اور دلآرا کا ـــــ وصالِ معصوم!
جیسے ـــــ ہو طور و تجلّی کا ـــــ وصالِ معصوم!

جیسے ہو ـــــ صورت و معنی کا وصالِ معصوم!
کبھی ہم تم بھی ملیں ـــــ کاش! یونہی اے پیارے!

~~~~~~

رُوحِ میخانہ و مے نوش میں ہوں راز و نیاز
برہمن ـــــ اور بُتِ خاموش میں ہوں راز و نیاز
جیسے ـــــ حق ـــــ اور دلِ حق کوش میں ہوں راز و نیاز
کبھی ہم تم بھی ملیں ـــــ کاش! یونہی اے پیارے!

~~~~~~

دلِ سرشار ہو ـــــ بیدارِ محبّت طلبی!
نغمۂ شوق ہو، پروردۂ خاموش لبی!
عبد و معبود ہوں، اور حجلہ گہِ نیم شبی!
کبھی ہم تم بھی ملیں ـــــ کاش! یونہی اے پیارے!
کبھی ہم تم بھی ـــــ!
ملیں
کاش یونہی! ـــــ اے پیارے

روشؔ صدیقی

رُباعی

واعظ سے شب و روز لڑائی نہ گئی   رندوں سے کبھی آنکھ ملائی نہ گئی
دعوے تو بہت رہے قدح نوشی کے   اِک بُوند مگر لب سے لگائی نہ گئی

غزل

مذاقِ زندگی ہر شے کو حسبِ مُدعا سمجھا   فنا کے گھونٹ کو بھی جُرعۂ آبِ بقا سمجھا
ہر اک آفاق کے نغمے میں ہے اتنی ہم آہنگی   کہ میں اِک خاک کے ذرّے کو شرحِ "والسّما" سمجھا
میں اے تقدیرِ ہستی ممکناتِ اوجِ فطرت کا   خدا کو مبتدا سمجھا بشر کو منتہا سمجھا
یہ مشتِ خاک سرِ افلاک کا اِک دن جھکا دیگی   خدائی خود کہے گی میں نے بندے کو خدا سمجھا
کسی مشکل میں جب پائی نہ ہمت سرنگوں اپنی   تو قلبِ خود نگر شرحِ حدیثِ "ما قلیٰ" سمجھا
یہ دُنیا کیا ہے میدانِ وغا ابلیس و یزداں کا   وہی سمجھا اسے جو محشرِ کرب و بلا سمجھا

وہ میرے گوہرِ پاکیزہ کو سمجھا خذف ریزہ
لہو کی بُوند کو سرمایۂ برگِ حنا سمجھا

حامد علی خاں

رُباعیات

(۱)

پایا نہیں آوارۂ تخیل کوئی راہ

ادراک کی حد سے نہیں بڑھتی ہے نگاہ

مسدود ہیں سب عقل کی راہیں افسوس

انسان کے محدود تصور سے پناہ

(۲)

جو ہے سو جکڑ چکا ہے اے میرے خدا!

یہ کھیل المناک ہی اے میرے خدا!

مٹی سے یہ کھیل کیا بنایا تو نے؟

یہ ارض و سما خاک ہوئے اے میرے خدا!

(۳)

ہاں طعنۂ بے بسی کا نہ دینا یارب!

ناحق نہ لڑائی مول لینا یارب!

اس بحرِ فنا میں ناخداؤں سے یہ چھیڑ؟

کشتی اپنی اب آپ کھینا یارب!

(۴)

اے ظرفِ بلند! بادشا میں نہ ہوا

اربابِ جہاں کا رہنما میں نہ ہوا

کاش اس سے بڑی بھی آرزو ہو کوئی

ناچار یہ غم ہے کہ خدا میں نہ ہوا

حامد علی خاں

رُباعیات

(۱)

گاتا ہوں میں اک ترانہ ہر روز
گھڑتا ہوں میں اک فسانہ ہر روز
پہلو سے دلِ مُردہ اُچھلنے کے لئے
لاتا ہے نیا اک بہانہ ہر روز

(۲)

یہ ساز ہے اور وہی ترانہ اب تک
میں ہوں وہی اور وہی فسانہ اب تک
ہے ساز وہی، انجمن وہی، یار وہی
زنداں ہے وہی، تار پرانا اب تک

(۳)

ہر صبح یہ زندگی یہاں آتی ہے
ہر شام یہ زندگی کہاں جاتی ہے
اے کاش بنا کے صبح وہاں ہی پہنچے
ہر شام یہ زندگی جہاں جاتی ہے

(۴)

یہ روح، یہ دل، یہ جاں ملے یا نہ ملے
پھر آ کے کہیں اماں ملے یا نہ ملے
سجدوں میں کمی نہ کر او تیرہ نصیب!
پھر کعبہ یہ آستاں ملے یا نہ ملے

حامد علی خاں

محفلِ ادب

رادھا کے گیت

(۱)

سکھی دیکھ! چندرماں رو رہا ہے!!
آکاس کا وہ سماں کتنا پیارا تھا۔
جب میں پہلی بار اپنے پیتم سے ملی
پیتم مجھے روتا دیکھ کر بولے۔
"رادھا تم رو کیوں رہی ہو؟
پریم ملاپ کے ایسے بھلے سمے میں
رادھا تم کیوں رو رہی ہو؟"
"جس پیت میں رونا نہ آئے
وہ پیت کس کام کی!"
یہ کہہ کر میں پھر رو پڑی
سکھی دیکھ! چندرماں رو رہا ہے!!

(۲)

آہ سکھی پریم بہت اُداس ہے آج
آکاس پر ابھی ابھی
چھپتے چھپتے
چندرماں
تاروں سے یہ کہہ گیا
روتی ہوئی نینوں کے سپنے بھلے ہیں
ہنستے ہوئے بردے کی مٹ جانے والی خوشیوں سے"
آہ سکھی پریم بہت اُداس ہے آج

(۳)

اندر دیوتا کے سب سے اچھے گیت
برسے ہوئے بادلوں کے سپنے ہیں
اور رادھا کے سب سے اچھے گیت
اپنے روتے ہوئے پریم کے پچھتاوے
آکاس کے سب سے اچھے گیت
بیکنٹھ کی منوہر تا کی کلیاں ہیں۔
اور رادھا کے سب سے اچھے گیت
اپنے پریم کی ناچتی ہوئی خوشیاں
کوئل کے سب سے اچھے گیت
بیتی ہوئی بسنت کے پیار ہیں
اور رادھا کے سب سے اچھے گیت
جیون کے مرجھائے ہوئے سنگھار

(۴)

سکھی میری ہی طرح میرا پریم بھی ابھاگی ہے
پیتم کو اپنے ہردے کا پھول بنا کر بھی رادھا اُداس ہی رہی
سکھ کے میٹھے میٹھے گیت گا گا کر بھی رادھا اداس ہی رہی
جیون کی کلیاں کھل کھل کر بھی مرجھاتی ہی رہیں
بچھڑی ہوئی ڈالیاں مل مل کر بھی کملاتی ہی رہیں
پیت کے سپنے شانتی کی سیجوں پر بھی ڈرتے ہی رہے
خوشیوں کے ہار ملاپ کی پینگوں پر بھی ترستے ہی رہے
سکھی میری طرح میرا پریم بھی ابھاگی ہے

(۵)

سکھی میری پیت کا کام بن اُجڑ گیا
میری پیت کا کام بن پھولوں کی نیندوں سے بسا ہوا تھا!
میری پیت کا کام بن تاروں کی کرنوں سے کھلا ہوا تھا!
رادھا کا کام بن کام دیوتا کی سب سے انوکھی بھول تھی!
رادھا کا کام بن رادھا کے چھوٹے ہوئے سر پر کی بھول تھی!
سکھی میری پیت کا کام بن اُجڑ گیا

"ادبی دُنیا"

مطبُوعات

منشورات ۔ یہ علامۂ اجل پنڈت برج موہن صاحب دتا تریہ کیفی دہلوی صدر اُردو سبھا لاہور و صدر انجمن یادگار غالب دہلی کے حسب ذیل مضامین کا مجموعہ ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

(۱) اُردو لسانیات (۲) مبادیاتِ فصاحت (۳) اُردو کی موجودہ ضروریات (۴) تذکیر و تانیث (۵) تشبیہہ (۶) متروکات (۷) گل۔گلاب (۸) اُردو اور لکھنؤ (۹) نظر اور خود نظری (۱۰) شمس العلما حضرت آزاد مرحوم (۱۱) نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ (۱۲) اُردو اور پنجاب۔ ان مضامین کے متعلق ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اُردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اس میں ایسی کتاب شائع ہوئی۔ علامۂ ممدوح علم اللسان کے یکتا ماہر ہیں اور اُن کی ذات مشرقی و مغربی علوم کا سنگم ہے۔ کتاب کا حجم ۲۴۴ صفحات ہے۔ قیمت مجلد ۲ؒ۔ علامۂ موصوف سے کوٹھی ۳۸ ڈی ماڈل ٹاؤن لاہور کے پتے سے طلب فرمایئے +

تاریخ ہند قدیم جلد اوّل ۔ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے اپنی مفصل تاریخ ہند کی پہلی جلد بڑی تقطیع کے ۲۱۶ صفحات پر شائع کی ہے۔ فنِ تاریخ نویسی میں مولانا کی بصیرت مسلمہ ہے۔ تاریخ کا انہوں نے عمر بھر نہایت وسیع مطالعہ کیا ہے اور یہ کتاب اُن کی مہارتِ فن کی شاہدِ عادل ہے۔ یہ پہلی جلد نہایت گرانقدر معلومات کا خزانہ ہے اور اگرچہ مجوزہ تاریخ ہند کا دیباچہ یا تمہید ہے۔ لیکن یہ بجائے خود ایک جداگانہ حیثیت کی بصیرت افروز علمی تصنیف ہے۔ قیمت ۲؍ مع محصول پتہ یہ ہے۔ مینجر مکتبۂ عظمت نجیب آباد (یوپی)

شاہکار ۔ یہ ادبی و تعلیمی رسالہ علامۂ تاجور نے لاہور سے جاری کیا ہے۔ علامۂ موصوف بہ حیثیت ایک ادیب ایک شاعر اور ایک صحیفہ نگار کے ملک بھر میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ابتدا میں وہ مخزن کے ایڈیٹر رہے اس کے بعد "ہمایوں" کے جائنٹ ایڈیٹر جس کے بعد انہوں نے "ادبی دنیا" جاری کیا۔ یہ حُسنِ اتفاق اور شاہکار کی مزید خوش قسمتی ہے کہ اس کے حلقۂ ادارت میں علامہ موصوف کے علاوہ مسٹر راشد وحیدی ایم اے نے بھی اشتراک منظور کر لیا۔ راشد وحیدی ایک قابل نوجوان ادیب اور شاعر ہیں جنہیں مغربی ادبیات پر بھی عبور حاصل ہے۔ اور جو اس رسالے کو بہت سلیقہ سے مرتب کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ رسالہ کامیاب ہوگا۔ چندہ سالانہ چھ روپے۔ پتہ :- مینجر "شاہکار" مزنگ لاہور +

نیرنگستان ۔ یہ مصور ادبی رسالہ دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ اور اس کے ایڈیٹر مولانا عشرت رحمانی ہیں جو اپنے حُسنِ ذوق اور سلیقۂ ادارت کی وجہ سے اپنے رسالے کے لئے ایک مخصوص حلقۂ اثر پیدا کر چکے ہیں۔ نیرنگستان میں دلکش ادبی مضامین کے علاوہ علمی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ اور حصۂ شعر اساتذہ ملک کے جواہر افکار سے مزین ہوتا ہے۔ سالانہ چندہ دو روپے بارہ آنے ہے۔ جس میں ایک خاص نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ حجم تقریباً ۸۰ صفحات۔

پتہ :- دفتر "نیرنگستان" دہلی

آرایش جمال باتصویر

مصنفہ محترمہ وزیر بیگم صاحبہ ضیا... امیر موازی بیلے کی نئی تالیف، اس کتاب میں عورتوں کے سنگھار اور جسمانی آرایش کے تمام مشرقی و مغربی طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ دو درجن فوٹو کی خوبصورت تصاویر کے علاوہ زنانہ ...یات و دوسو مجرب نسخے جو معمولی لاگت پر گھر میں تیار ہو سکتے ہیں دیے گئے ہیں۔ کتاب کی خوبی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ (۱) ملک کے مشہور ڈاکٹر کرنل بھولا ناتھ صاحب آئی ایم ایس سی آئی ای نے کتاب کی نظرثانی کی ہے اور ایک طویل علمی دیباچہ بھی لکھا ہے۔ (۲) فخر نسواں محترمہ بیگم صاحبہ شاہنواز ممبر گول میز کانفرنس (لندن) نے اس کتاب پر تعارفی نوٹ لکھا ہے۔ ہر دوراندیش بی بی کو چاہیے کہ اپنے پیارے شوہر کو خوش رکھنے کیلئے آرایش جمال کے مطالعہ سے عملی فائدہ اٹھائے۔

قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنہ بلا جلد دو روپیہ علاوہ محصول

کتب خانہ لطف زندگی قاضی خانہ موچی گیٹ لاہور

...جمال
...کی مکمل گائیڈ
...
...لہ مجلد مصری و...
...یا مجلد سنہری ...
...ڈھلے
...علاوہ جامع مسجد دہلی
...کھاری باؤلی دہلی

برقعہ نو ایجاد ۱۹۰۵ء میں اول تھا اب بھی اول ہے

ہندوستان کے مختلف صوبوں کی نمائشوں سے ۲۴ طلائی و نقرئی تمغے حاصل کر چکا ہے

خوبصورت، آرام دہ، زمانہ کی حسب حال اور مکمل پردہ دار ہے۔

برقعہ نو ایجاد دو حصوں میں منقسم ہے

تشریح بالائی حصہ

...ے شروع ہو کر ہاتھوں کی لمبائی تک رہتا ہے۔ اس میں ...ی ایجاد کردہ کمانی دار ٹوپی لگی ہوئی ہے۔ یہ نقاب کو چہرہ ...ے نہیں دیتی۔ تاکہ چہرے پر نقاب لگنے سے دم نہ گھٹے ...فاصلہ کی چیز صاف دکھلائی دے۔ ٹوپی کا بالائی حصہ خوشنما ...ول کی شکل میں ہے

تشریح زیریں حصہ

...شل ڈھیلے و عمدہ کوٹ کے ہے۔ سامنے کے رخ بٹن لگے ہوئے ہیں۔ ہاتھ نکالنے کے لئے پہلو میں جگہ ہے۔ بند گاڑی یا ڈولی وغیرہ میں اگر پردہ کی ضرورت نہ ہو بالائی حصہ اتار دیں۔ اس کو زیب تن رکھیں۔ لباس کو گرد و غبار سے بچاتا ہے۔ پردہ کی ضرورت کے وقت بالائی حصہ پہن لیا جائے تو ہر دو حصے مکمل پردہ دار برقعہ بن جاتا ہے

...ط واپسی منگائیں آج ہی کندھے سے پیر کے ٹخنہ تک کا ناپ ارسال کریں برقعہ بن جاتا ہے۔ آپکی خواتین کو اسکی ضرورت ہے۔ خود معائنہ کریں اور دیگر ...۵ دار خواتین کو پسند کرنیکا موقع دیں قیمت سفید آٹھ روپے ۱۲ آنہ رنگین پاپلین سلک ۱۵ روپے آٹھ آنے رنگین خسرہ ۱۵ روپے رنگین سلک ۲۵ روپے

پتہ:- خاتون سٹور دہلی

معمّہ

ایک ہزار روپیہ مفت حاصل کیجیئے

پہلا انعام تین سو روپیہ۔ دوسرا انعام ایک سو پچاس روپیہ
تیسرا انعام۔ دو انعام (پچاس روپیہ) چوتھا انعام۔ دو انعام (پچیس روپیہ)
پانچواں انعام۔ دس انعام (دس روپیہ) چھٹا انعام ساٹھ انعام (پانچ روپیہ)

ذیل میں ہندوستان کے آٹھ مشہور شہروں کے نام ترتیب وار حروف سے دئے ہوئے ہیں۔ ایک ستارہ کے نشان * پر صرف ایک حرف لگانے سے شہر کا نام بن جاتا ہے۔ پہلے نمبر کا حل کراچی ہے۔ اسی طرح باقی کو حل کیجئے بہت آسان ہے

(۱) ک * م ج ی (۲) ر * گ۔ و۔ ن (۳) آ * * ہ (۴) ک۔ ل * * ت۔ ہ (۵) * ن۔ گ۔ ل۔ و۔ ر (۶) ب * ب۔ ئی (۷) پ * ن۔ ہ (۸) ل۔ ک * ن۔ ؤ۔

قواعد:۔ (۱) داخلہ فیس ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنا ضروری ہے (۲) حل منی آرڈر کوپن یا سادہ کاغذ پر مع نام و پتہ کے صاف خوشخط بھیجنا چاہیئے (۳) ایک شخص کئی حل بھیج سکتا ہے مگر ہر حل کے ہمراہ ایک روپیہ بھیجنا ضروری ہے (۴) کئی حل کی داخلہ فیس ایک ہی منی آرڈر سے بھیجنا چاہیئے (۵) حل دفتر میں مع داخلہ فیس کے ۵ار اگست ۱۹۳۵ء تک پہنچ جانا چاہیئے (۶) نتیجہ کے لیے ایک آنہ زیادہ بھیجنا چاہیئے (۷) نتیجہ ان صاحبان کے پاس جو ایک آنہ زیادہ بھیجیں گے ۱۵ار اگست کے بعد روانہ کئے جائیں گے (۸) کسی صاحب کو کسی قسم کی خط و کتابت کرنے کی اجازت نہیں ہے (۹) زیادہ صحیح حل آنے کی صورت میں انعام برابر برابر تقسیم کیا جائے گا (۱۰) جوابات کے متعلق تمام تر فیصلہ کرنے کا حق صرف منیجر صاحب کو ہوگا (۱۱) جو اصحاب ان قواعد کے خلاف عمل میں لائیں گے وہ مقابلہ میں شریک نہیں کئے جائیں گے۔

پتہ:۔

منیجر انڈین پزل کمپٹیشن للت پور (یو۔ پی)

معمہ

ایک ہزار روپیہ مفت حاصل کیجئے

پہلا انعام تین سو روپیہ۔ دوسرا انعام ایک سو پچاس روپیہ

تیسرا انعام۔ دو انعام (پچاس روپیہ) چوتھا انعام۔ دو انعام (پچیس روپیہ)

پانچواں انعام۔ دس انعام (دس روپیہ) چھٹا انعام ساٹھ انعام (پانچ روپیہ)

ذیل میں ہندوستان کے آٹھ مشہور شہروں کے نام ترتیب وار حروف سے دئے ہوئے ہیں۔ ایک ستارہ کے نشان * پر صرف ایک حرف لگانے سے شہر کا نام بن جاتا ہے۔ پہلے نمبر کا حل کراچی ہے۔ اسی طرح باقی کو حل کیجئے بہت آسان ہے

(۱) ک * ر۔ چ۔ ی (۲) ر * گ۔ و۔ ن (۳) آ * * ہ (۴) ک۔ ل * * ت۔ ہ (۵) * ن۔ گ۔ ل۔ و۔ ر (۶) ب * ب۔ ئی (۷) پ * ن۔ ہ (۸) ل۔ ک * ن۔ ؤ۔

قواعد:۔ (۱) داخلہ فیس ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنا ضروری ہے (۲) حل منی آرڈر کوپن یا سادہ کاغذ پر مع نام و پتہ کے صاف و خوشخط بھیجنا چاہیئے (۳) ایک شخص کئی حل بھیج سکتا ہے مگر ہر حل کے ہمراہ ایک روپیہ بھیجنا ضروری ہے (۴) کئی حل کی داخلہ فیس ایک ہی منی آرڈر سے بھیجنا چاہیئے (۵) حل دفتر میں مع داخلہ فیس کے ۱۵ اگست ۱۹۳۵ء تک پہنچ جانا چاہیئے (۶) نتیجہ کے لیے ایک آنہ زیادہ بھیجنا چاہیئے (۷) نتیجہ ان صاحبان کے پاس جو ایک آنہ زیادہ بھیجیں گے ۱۵ اگست کے بعد روانہ کئے جائیں گے (۸) کسی صاحب کو کسی قسم کی خط و کتابت کرنے کی اجازت نہیں ہے (۹) زیادہ صحیح حل آنے کی صورت میں انعام برابر برابر تقسیم کیا جائے گا (۱۰) جوابات کے متعلق تمام تر فیصلہ کرنے کا حق صرف منیجر صاحب کو ہوگا (۱۱) جو اصحاب ان قواعد کے خلاف عمل میں لائیں گے وہ مقابلہ میں شریک نہیں کئے جائیں گے۔ **پتہ:۔**

منیجر ایڈی پزل کمپٹیشن للت پور (یو۔ پی)

ہر ایک قسم کے بیرونی
درد دل کیواسطے مشہور معروف
انڈوبام
INDO BALM
ایک حیرت انگیز مرہم ہے
ایک دفعہ کے استعمال کرنے والے دوسروں سے بھی سفارش کرتے ہیں۔ ایجنٹ کی ہر ایک جگہ ضرورت ہے۔
اسٹاکسٹس بیلی رام برادرس لاہور
پتہ ۔ کرنک برادرس گورگانون بمبئی نمبر ۴

KARNIK BROTHERS
BOMBAY
INDO BALM
INDO
BALM
ہر ایک قسم کے بیرونی درد دل کیواسطے مشہور و معروف
انڈو بام
ایک حیرت انگیز مرہم ہے
ایک دفعہ کے استعمال کرنے والے دوسروں سے بھی سفارش کرتے ہیں۔ ایجنٹ کی ہر ایک جگہ ضرورت ہے۔
اسٹاکسٹس بیلی رام برادرس لاہور
پتہ:- کرنک برادرس گورگانون بمبئی نمبر ۴

بچّوں کی طاقت بڑھانے والی مشہور دوائی

ڈونگرے کابال امرت

ڈونگرے کابال امرت

میٹھا ہونے کے سبب چھوٹے بچے بہت خوشی سے پیتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کی کھانسی۔ بخار۔ بدہضمی۔ پیچش وغیرہ امراض جو اکثر ناطاقتی کی وجہ سے ہوتے ہیں اس کے استعمال سے رفع ہو جاتے ہیں اور اس سے بچوں کا بدن تھوڑے ہی عرصہ میں گوشت سے بھر کر جسم میں طاقت بڑھتی ہے

لاہور ایجنٹ

لالہ بھگت رام پوری اینڈ سنز سوتر منڈی۔ لاہور
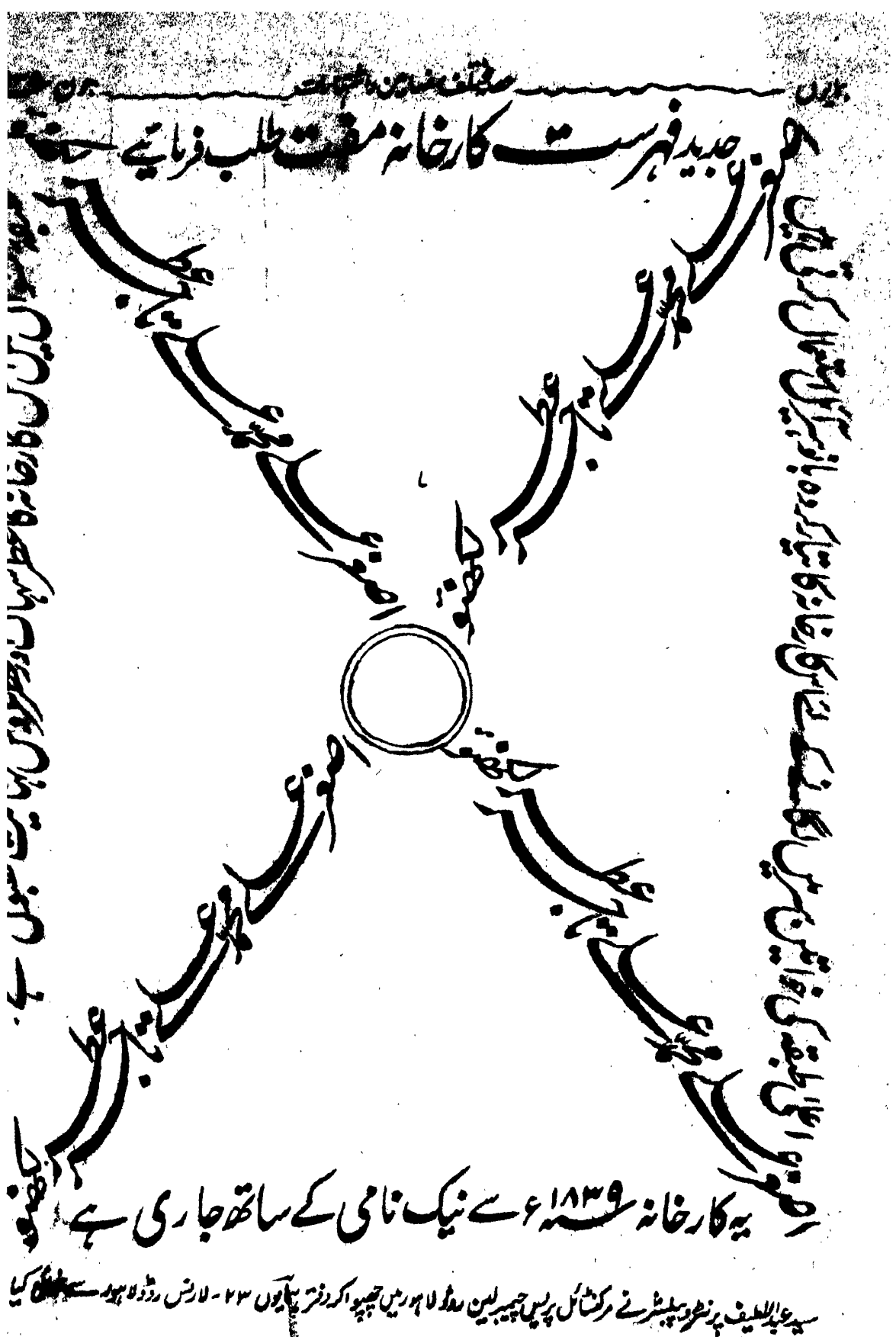
سید عبد اللطیف پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبر لین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں ۲۳-لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا

قواعد

۱- "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ ر

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے

منیجر رسالہ ہمایوں
۲۳- لارنس روڈ- لاہور

Title Printed by Halftone Press, Dev Samaj Road, Lahore.